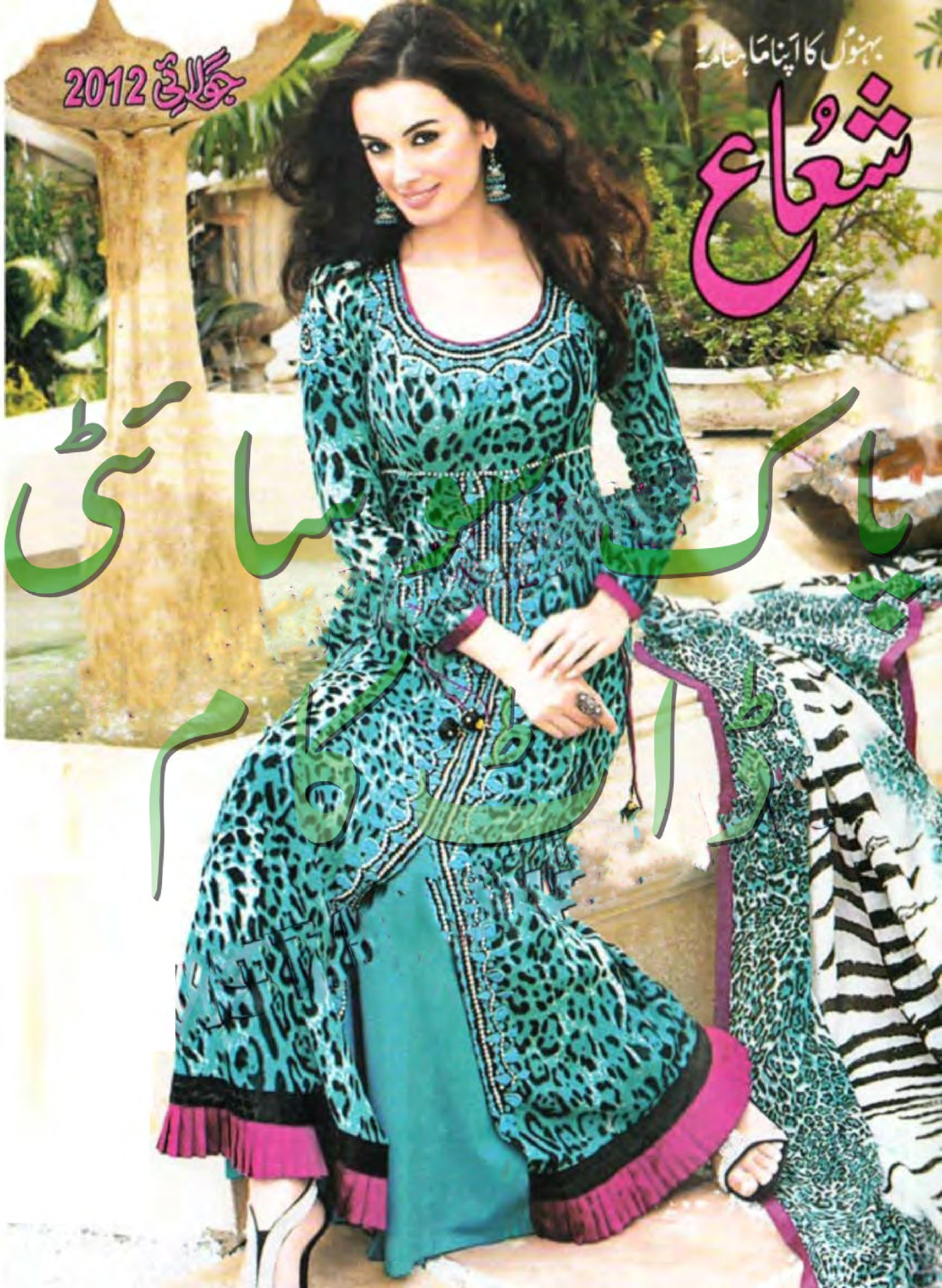


جولائی 2012

بہنوں کا اپنا ماسٹر

شعاع

پاکستان





مستقل سلسلے

281	خالہ جیلانی	خط آپ کے	28	رضیہ جمیل	کھٹا کیسی پیہ
288	خالہ جیلانی	مُسکراہٹیں	270	سارہ غلام نبی	موسم کے پگوان
290	ادارہ	آئینہ خلاتے ہیں	282	تبصیر نشاط	خوبصورت بنے
		بالوں سے خوشبو لائے	273	شگفتہ جاہ	
		تاریخ کے جھروکے	285	امت الصبور	
		سیر و جہاں	17	آمنہ قرین	

جولائی 2012
چند 26 تا 11
قیمت 50 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی۔

رضیہ جمیل فلوئٹن حسن پر شنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا - مقبول 32721777، 32726617، 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872

Email: zhuaa@khawateandigeat.com website: www.khawateandigeat.com

ناولٹ

164	فائزہ افتخار	سندریلا
184	مریم عزیز	زندگی کی رہ گزر

افسانے

60	بشری احمد	فیصلہ
70	سیمی کرن	میری الجھن
156	کنیز نبوی	ممتا
224	نعیمہ ناز	بلا عنوان

نظمیں، غزلیں

268	احمد فراز	غزل
269	معتن اسرار	غزل
269	خالد معین	نظم
268	صغریٰ یوسف	غزل

نو سالگرہ بننے کی تقریب چھٹی
پاکستان (سالانہ) 600 روپے
ایشیا بافریٹ، یورپ 5000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا 6000 روپے

10	رضیہ جمیل	پہلی شعاع
11	تنویر بھول	حمد
11	سلیم کوثر	نعت
12	ادارہ	نئی کی باتیں

انٹرویو

23	احسن خان	بندھن
278	شابین رشید	دستک
276	نوال افضل گھمن	شاعری

ناول

36	عالیہ بخاری	دلوار شب
132	آمنہ ریاض	ستارہ شام

مکمل ناول

228	منوہ احمد	جنت کے پتے
78	جوینہ قاضی	اندھیرا اجالا

انتباہ: ماہنامہ شعاع ڈائجسٹ کے جملہ حقوق محفوظ ہیں، وہ پیش کردہ تحریری اجازت کے بغیر اس رسالے کی کسی بھی کہانی، ناول، سلسلہ کو کسی بھی انداز سے نہ تو شائع کیا جاسکتا ہے، نہ کسی بھی ٹی وی چینل پر ڈراما کی تشکیل اور سلسلہ وار قسط کے طور پر یا کسی بھی شکل میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ خلاف ورزی کرنے کی صورت میں قانونی کارروائی عمل میں لائی جاسکتی ہے۔

شعاع کا جولانی کا شمار آپ کے حضور میں ہے۔
عبد حاضر کی برق رفتار بھاگتی دوڑتی زندگی کا ساتھ دینے کی کوشش نے ہماری فطرت سے ہم آہنگی ختم کر دی ہے جبکہ انسان جتنا فطرت سے قریب ہوتا ہے۔ روحانی طور پر اتنا ہی مضبوط ہوتا جاتا ہے۔ انسان کی روحانی طاقت اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور اس کے قرب سے ہے۔
اس مہینے ہم برکتوں اور رحمتوں کا مہینہ رمضان المبارک سائے نکلے ہوئے ہیں۔ اس مہینے میں ہم عبادت کا خصوصی اہتمام کرتے ہیں۔ گھروں کی صفائی اور پاکیزگی کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ اس ماہ مقدس کی برکتوں سے پوری طرح فیض یاب ہونے کے لیے دل کی صفائی بھی ضروری ہے۔ حمد، کینہ، بغض، نفرت کے جذبہ کو دل سے نکال کر انسان اور انسانیت سے محبت کا جذبہ پیدا کریں تاکہ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کر سکیں۔

سالگرہ نمبر

اس شمارے کے ساتھ شعاع نے اپنی طرزِ نثر کے 27 سال مکمل کر لیے ہیں سالگت کا شمارہ سالگرہ نمبر ہوگا۔ سالگرہ نمبر میں آپ کی پسندیدہ مصنفین کی تحریروں کے ساتھ خصوصی سلسلے بھی شامل ہوں گے۔ مصنفین سے درخواست ہے اپنی تحریریں جلد از جلد بھجوا دیں تاکہ شعاع میں شامل ہو سکیں۔

سرورے

حسب روایت سالگرہ نمبر میں قارئین کی شمولیت کے لیے خصوصی سرورے شامل ہوگا۔ سوالات یہ ہیں۔
1۔ آپ سالگرہ نمبر کی طرح سناتی ہیں؟ عمر کا ایک سال رخصت ہونے پر آپ کے احساسات کیا ہوتے ہیں۔ سالگرہ پر ملنے والا کوئی تحفہ، یا خوبصورت جملہ یا مبارک باد جو آپ کو بہت پسند آئی؟
2۔ شعاع میں شائع ہونے والی تحریروں میں کون کون سے جملے اتنے خوبصورت ہوتے ہیں کہ دل کو جھوٹے لیتے ہیں۔ ایسے دلیں گھر کرنے والے جملے انتخاب کیسے کریں؟
3۔ شعاع کب سے پڑھنا شروع کیا اور وقت کے ساتھ ساتھ اس میں کیا تبدیلی محسوس کی؟
ان سوالات کے جوابات اس طرح بھجوائیں کہ ہمیں 20 جولائی تک موصول ہو جائیں۔

اسٹل شمارے میں

زندگی کا ایک المیہ یہ بھی ہے کہ ہماری نظر صرف ظاہریت تک ہی محدود رہتی ہے۔ ظاہری خوبصورتی سے محروم لوگ ہماری توجہ حاصل نہیں کر پاتے۔ جویریہ قاضی نے اسی حساس موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔
• جویریہ قاضی کا مکمل ناول۔ اندھیرا اٹھالا،
• مریم عزیز کا ناول۔ زندگی کی رنگین روشنی،
• بشری احمد کینرہوی، نعیمہ ناز اور سہی کرن کے افسانے،
• احسن خان اور فاطمہ احسن کا بندھن،
• بیٹھ کر میر دو جہاں کرنا۔ جنس ایم آر کیانی کی کتاب پر تبصرہ،
• پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں،
• ہماری خواہش ہے کہ سالگرہ نمبر میں ہماری زیادہ سے زیادہ قارئین کے نام شامل ہوں۔ ہمیں خط ضرور لکھیے گا۔

اے خدا! اے خالق کون مکاں!
تو ہے بے شک بادشاہِ دو جہاں!
کس نے ہیں تیرے سوا پیدا کیے؟
چاند، سورج اور زمین و آسمان

در پہ آئے ہیں ترے کہتے ہیں اب
رحم کر ہم پر خدائے مہرباں!
سیدھے رستے پر چلا ہادی ہے تو
ہم کو دکھلا دے تو منزل کا نشان!

بحر و بر کو تو نے ہی پیدا کیا!
پھول بوٹوں سے سجایا گلستاں!
بے زباں عاجز تری تعریف سے
پھول کو بھی اب نہیں تابِ بیاں!

تنویر پھول

سارے حرفوں میں اک لفظ پیارا بہت اور یکساں بہت
سارے ناموں میں اک نام سونا بہت اور ہمارا بہت
اس کی شاخوں پہ آکر زمانوں کے موسم بھرا کر۔ یں
اک شجر جس کے دامن کا سایا بہت اور گھنیرا بہت
ایک آہٹ کی تحویل میں ہیں اس زمیں آسمان کی مدیں
ایک آواز دیتی ہے پہرا بہت اور گہرا بہت
جس دیے کی توانائی ارض و سما کی حرارت، نی
اس دیے کا ہمیں بھی حوالہ بہت اور اجالا بہت
میری بنائی سے اور مرے ذہن سے محو ہوتا نہیں
میں نے روئے محمد کو سوچا بہت اور چاہا بہت
برے ہاتھوں سے اور میرے ہونٹوں سے خوشبو جاتی نہیں
میں نے اسلم محمد کو لکھا بہت اور چومنا بہت
بے یقین راستوں پر سفر کرنے والے مسافر سوا
بے سہاروں کا ہے ایک سہارا بہت، مکمل والا بہت
سلیم کوثر

ظلم کے حرام ہونے اور مظالم کے دفع کرنے کے حکم کا بیان

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ”ظالموں کا نہ کوئی دوست ہوگا اور نہ سفارشی جس کی بات سنی جائے۔“
اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ”ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ہوگا۔“ اور اب احادیث۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”ظلم کرنے سے بچو! اس لیے کہ ظلم قیامت والے دن اندھیروں کا باعث ہوگا اور بخل سے بچو! اس لیے کہ بخل ہی نے ان لوگوں کو ہلاک کیا جو تم سے پہلے تھے۔ اس بخل نے انہیں اپنیوں کا خون بہانے پر اور حرام چیزوں کو حلال سمجھنے پر آمادہ کیا۔“ (مسلم)

فائدہ : شیخ بل کی شدید محبت کو کہتے ہیں۔ جب انسان کے دل میں دنیا اور دنیا کے مل و اسباب کی محبت حد سے تجاوز کر کے شدید ہو جائے تو پھر انسان حرام حلال کے درمیان تمیز بھی نہیں کرتا اور دوسرے انسانوں کا خون بہانے سے گریز بھی نہیں کرتا۔ جیسے آج ہمارے معاشرے کا حال ہے اور یہ حالت اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ اس معاشرے کی بقا کی کوئی ضمانت نہیں ہے۔ یہ دیر یا سویر ہلاکت سے دوچار ہو کر رہی رہے گا۔

حق

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
”تمہیں قیامت والے دن حق والوں کے حق ضرور ادا کرنے ہوں گے حتیٰ کہ سینگ والی بکری سے

بغیر سینگوں والی بکری کو بدلہ دلایا جائے گا۔“ (مسلم)
فائدہ : اس سے معلوم ہوا کہ قیامت والے دن بے لاگ بدل ہو گا حتیٰ کہ جانوروں نے بھی ایک دوسرے پر ظلم کیا ہو گا تو اللہ تعالیٰ مظلوم جانور کی داد دے فرمائے گا۔ اس میں انسانوں کے لیے سخت تنبیہ ہے کہ جب بے شعور جانوروں کو معاف نہیں کیا جائے گا تو عقل و شعور سے بہرہ ور ظالم انسانوں کی کس طرح معافی ہو سکتی ہے اگر انہوں نے دنیا میں ظلم سے توبہ کر کے اس کی تلافی نہ کی ہوگی۔

زمین پر قبضہ

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
”جس نے ایک باشت کے برابر زمین ہتھیا کر کسی پر ظلم کیا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے قیامت والے دن اسے سات زمینوں کا طوق پہنایا جائے گا۔“ (بخاری و مسلم)

فائدہ : اس سے معلوم ہوا کہ دنیا میں تھوڑا سا ظلم بھی اور کس کا معمولی سا حق بھی مار لینا قیامت والے دن عذاب شدید کا باعث ہوگا۔

مہلت

حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
”یقیناً اللہ تعالیٰ ظالم کو مہلت دیتا ہے، لیکن پھر جب اس کی گرفت فرماتا ہے تو اسے نہیں چھوڑتا۔“
پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔
ترجمہ۔ ”اور اسی طرح تیرے رب کی پکڑ سے جب وہ بستیوں (والوں) کو پکڑتا ہے جب کہ وہ ظالم

ہوتی ہیں۔ یقیناً اس کی پکڑ نہایت دردناک (اور) شدید ہے۔“ (بخاری و مسلم)

فائدہ : اللہ تعالیٰ اپنی حسب مشیت و مصلحت ظالم اور گناہ گار کو مہلت دیتا ہے لیکن جب مواخذہ فرماتا ہے تو پھر اس کی گرفت سے بچنے کی کوئی صورت نہیں ہوتی اس لیے ہر شخص کو ظلم و معصیت سے اپنا دامن بچا کر رکھنا چاہیے۔ مہلت سے دھوکے کا شکار نہیں ہونا چاہیے کیونکہ پتا نہیں کب اس کی مدت مہلت ختم اور گرفت کا آغاز ہو جائے۔

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن کے علاقے میں بھیجا تو فرمایا:

”تم ایسے لوگوں کے پاس جا رہے ہو جو اہل کتاب سے ہیں۔ چنانچہ تم (سب سے پہلے) انہیں اس بات کی دعوت دینا کہ وہ لا الہ الا اللہ اور محمد رسول اللہ کا اقرار کر لیں۔ اگر وہ یہ بات مان لیں تو پھر انہیں بتلانا کہ اللہ نے ان پر رات اور دن میں پانچ نمازیں فرض کی ہیں۔ اگر وہ اسے مان لیں تو پھر انہیں بتلانا کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر زکوٰۃ فرض کی ہے جو ان کے مل و داروں سے لی جائے گی اور ان کے فقراء پر تقسیم کر دی جائے گی۔ اگر وہ اسے مان لیں تو (زکوٰۃ وصول کرتے وقت) ان کے عمدہ مل لینے سے اجتناب کرنا اور مظلوم کی بددعا سے بچنا اس لیے کہ اس کی بددعا اور اللہ کے درمیان کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔“ (بخاری و مسلم)

فائدہ : کفار و مشرکین اور اہل کتاب سے اگر جہاد کی نوبت آئے تو قتل سے پہلے انہیں قبول اسلام کی دعوت دی جائے اور پھر انہیں نماز، زکوٰۃ اور دیگر احکام و فرائض کی تعلیم دی جائے۔

زکوٰۃ جس علاقے کے اغنیاء سے وصول کی جائے اسی علاقے کے فقراء پر تقسیم کی جائے۔ اگر بیخ جائے تو پھر دوسرے علاقوں میں تقسیم کی جاسکتی ہے۔

عالمین زکوٰۃ کے لیے ضروری ہے کہ وہ زکوٰۃ کی وصولی میں ظلم کرنے سے گریز کریں اور لوگوں کی بددعا

کے مستحق بن کر اللہ کے غضب و عتاب کے اہل نہ بنیں۔

سرکاری ملازمین کے تحائف

حضرت ابو حمید عبدالرحمن بن سعد ساعدی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے از قبیلہ کے ایک آدمی کو جسے بن تسمبہ کہا جاتا تھا، زکوٰۃ کی وصولی کے لیے عامل مقرر فرمایا۔

چنانچہ جب وہ (زکوٰۃ وصول کر کے واپس) آیا تو کہنے لگا ”یہ تمہارے لیے ہے (یعنی بیت المال کا حق ہے) اور یہ مجھے ہدیہ میں ملی ہوئی چیزیں ہیں تو (یہ سن کر) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر کھڑے ہوئے اور اللہ کی حمد و ثناء بیان کرنا پھر فرمایا۔

”اما بعد! میں تم میں سے کسی آدمی کو کسی کام کے لیے عامل مقرر کرتا ہوں جن کا والی و سرپرست اللہ نے مجھے بتایا ہے تو وہ (واپس) آتا ہے اور کہتا ہے یہ تمہارے لیے ہے اور یہ ہدیہ ہے جو مجھے لوگوں کی طرف سے دیا گیا ہے۔ یہ اپنے باپ یا ماں کے گھر کیوں نہ بیخار ہا حتیٰ کہ اس کا ہدیہ اس کے پاس آئے اگر وہ چاہے۔“

(مطلب یہ تھا کہ جس کو یہ ہدیہ کہہ رہا ہے وہ ہدیہ نہیں، یہ اس سرکاری منصب کا نتیجہ ہے جس پر اسے مقرر کیا گیا تھا۔ اگر یہ ہدیہ ہوتا تو اسے گھر بیٹھے بھی ملتا۔) ”اللہ کی قسم! تم میں سے کوئی شخص کوئی چیز اپنے حق کے بغیر لے گا تو وہ اللہ تعالیٰ کو اس حال میں ملے گا کہ قیامت والے دن وہ اسے اٹھائے ہوئے ہوگا۔ چنانچہ میں تم میں سے کسی شخص کو نہ دیکھوں کہ وہ اللہ سے ملاقات کے وقت (ناجائز طریقے سے حاصل کرے) اونٹ کو اٹھائے ہوئے ہو جو ہلکا رہا ہو یا گائے کو جس کی آواز ہو یا بکری کو جو میاں رہی ہو۔“

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں ہاتھ اٹھائے یہاں تک کہ آپ کی بغلوں کی سفیدی نظر آنے لگی، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”اے اللہ! کیا میں نے پہنچا دیا؟“
تین مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا۔
(بخاری و مسلم)

فائدہ : اس حدیث میں سرکاری اہل کاروں اور منصب داروں کے لیے بڑی تنبیہ ہے۔ آج کل سرکاری عہدوں سے بڑا فائدہ اٹھایا جاتا ہے اور لوگ ان عہدوں کی وجہ سے ان اہل کاروں اور عہدے داروں کو کثرت سے ہڈیے اور تحفے پیش کرتے ہیں۔ اس حدیث کی رو سے یہ تمام مل جو سرکاری عہدوں کی وجہ سے حاصل ہو یا حاصل کیا جائے، حرام ہے اور رشوت کے زمرے میں آتا ہے، جس کا لینا اور دینا دونوں ناجائز امور ہیں۔

مسلمان کا حق

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
”جس آدمی پر بھی اپنے (مسلمان) بھائی کا اس کی عزت و آبرو سے متعلق یا کسی اور چیز سے متعلق کوئی حق ہو (یعنی اس کی بے عزتی کر کے یا کوئی اور زیادتی کر کے اس پر ظلم کیا ہو) تو اسے چاہیے کہ آج ہی (دنیا میں) اس کا ازالہ کر کے اس حق سے عہدہ برآ ہو جائے، قبل اس کے کہ وہ دن آجائے جس میں (ازالے کے لیے) کسی کے پاس دینار و درہم نہیں ہوں گے۔ (اور وہاں ازالے کی صورت یہ ہوگی کہ) اگر اس کے پاس عمل صلح ہوں گے تو وہ اس کے ظلم کے یہ قدر لے لیے جائیں گے (اور مظلومین میں تقسیم کر دیے جائیں گے) اور اگر اس کے پاس نیکیاں نہیں ہوں گی تو اس کے سامنے (صاحب حق) کی برائیاں لے کر اس پر لاو دی جائیں گی۔“ (بخاری)

فائدہ : اس سے معلوم ہوا کہ دنیا میں کسی دوست و رازیاں، اگر ایسی دنیا میں معاف نہیں کروالیا گیا یا ان کی تلافی نہ کی گئی تو آخرت میں اس کا معاملہ نہایت خطرناک ہو گا جیسا کہ اس کی تفصیل اس حدیث میں ہے۔ اس لیے حقوق العباد میں کوتاہی، جس کی انسان

پروا نہیں کرتا سخت ہلاکت کا باعث ہے۔
مسلمان کون ہے

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں اور مباح ہو ہے جو اللہ کی منع کردہ چیزیں چھوڑ دے۔“ (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل : اس سے معلوم ہوا کہ کامل مسلمان وہ ہے جو دوسروں کو (ظاہر یا باطنی) کسی بھی قسم کی اذیت نہ پہنچائے اور حقیقی مباح ہو ہے جو اللہ کی نافرمانیوں سے باز رہے۔

اگر کسی نے ہجرت (حرک وطن) کے باوجود اللہ کی معصیت سے اجتناب نہ کیا تو ایسی ہجرت کا کیا فائدہ؟
ہجرت تو نام ہی اس چیز کا ہے کہ اللہ کی رضا کی خاطر ہر چیز کو چھوڑ دیا جائے۔ اب انسان اپنا وطن مالوف، خویش و اقارب اور جائیداد کا روبرو تو چھوڑ دے لیکن ممنوعات شرعیہ کے ارتکاب سے وہ باز نہ آئے تو عند اللہ اس کی ہجرت ایک سذاق ہی سمجھی جائے گی۔

خیانت

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مسلمان ہر ایک آدمی مقرر تھا جسے کرکہ کہا جاتا تھا وہ مر گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
وہ جنہم میں ہے۔“

(یہ سن کر لوگ اسے دیکھنے لگے کہ آخر کیا بات ہے) تو صحابہ رضی اللہ عنہ نے اس کے پاس ایک عبا (سیاہ عاریوں والی چادر) پائی جسے اس نے (مل غنیمت سے) چر لیا تھا۔ (بخاری)

فائدہ : اس سے معلوم ہوا کہ خیانت اور چوری کبیرہ گناہ ہے جس کی وجہ سے انسان حق جنم قرار پا سکتا ہے۔

حرمت

حضرت ابو بکرہ نفع بن حارث رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”بے شک زمانہ گھوم گیا ہے اپنی اسی حالت پر جس میں اللہ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا تھا۔ (یعنی روز آفرینش سے جس طرح سال اور مہینے تھے اب پھر وہی ہیئت قدیمہ لوٹ آئی ہے اور مشرکین عرب اپنی طرف سے جو مہینوں میں تقدیم و تاخیر کر لیا کرتے تھے اور جسے وہ نسبی کہا کرتے تھے اب اسے ختم کر دیا گیا ہے۔) سال کے بارہ مہینے ہیں۔ ان میں سے چار حرمت والے ہیں۔ تین بڑے درپے درپے ذوالقعدہ ذوالحجہ محرم اور (چوتھا) متفرق قبیلے کا رجب جو جلدی (الثلثی) اور شعبان کے درمیان ہے۔

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا۔ ”یہ کون سا مہینہ ہے؟“

ہم نے کہا۔ ”اللہ اور اس کا رسول زیادہ بہتر جانتے ہیں۔“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہے یہاں تک کہ ہم نے گمان کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے نام کے علاوہ اور نام سے اسے پکاریں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”کیا یہ ذوالحجہ نہیں ہے؟“ ہم نے کہا۔ ”کیوں نہیں۔“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا۔ ”یہ شرکون سا ہے؟“

ہم نے کہا۔ ”اللہ اور اس کا رسول زیادہ بہتر جانتے ہیں۔“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہے حتیٰ کہ ہم نے گمان کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے نام کے علاوہ کسی اور نام سے اسے پکاریں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”کیا یہ شرکہ نہیں ہے؟“

ہم نے کہا۔ ”کیوں نہیں۔“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم (پھر) پوچھا۔ ”یہ دن کون

سا ہے؟“ ہم نے کہا۔ ”اللہ اور اس کا رسول زیادہ بہتر جانتے ہیں۔“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہے یہاں تک کہ ہم نے گمان کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے نام کے علاوہ کسی اور نام سے اسے پکاریں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا۔ ”کیا یہ قربانی کا دن (10 ذوالحجہ) نہیں ہے؟“ ہم نے کہا۔ ”کیوں نہیں۔“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”بے شک تمہارے خون، تمہارے مال اور تمہاری عزتیں (تمہارے درمیان آپس میں) اسی طرح حرام ہیں جس طرح تمہارے اس دن کی حرمت تمہارے اس شہر میں اور تمہارے اس مہینے میں ہے اور غنیمت تم اپنے رب سے ملو گے۔ وہ تم سے تمہارے اعمال کے متعلق باز پرس کرے گا۔ خبردار! تم میرے بعد کافر نہ بن جانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں مارو! سن لو! جو یہاں حاضر ہے وہ غائب کو (یہ باتیں) پہنچا دے اس لیے کہ شاید وہ شخص جسے یہ باتیں پہنچائی جائیں ان سے زیادہ یاد رکھنے والا ہو بخینوں نے (براہ راست مجھ سے) سنا ہے۔“

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”خبردار! (میری بات سنو اور بتاؤ) کیا میں نے پہنچا دیا ہے؟ کیا میں نے پہنچا دیا ہے؟“

ہم نے کہا۔ ”ہاں۔“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”اے اللہ! گواہ ہو جا۔“ (بخاری و مسلم)

فائدہ : سالوں اور مہینوں کا یہ تعین (کہ مہینہ 30 یا 29 دن کا اور سال بارہ مہینوں کا ہوتا ہے وغیرہ) اس دن سے ہے جب آسمان و زمین کی تخلیق کی گئی اور اس کی وضاحت سے مقصد اہل جاہلیت کے طریقہ ”نسبی“ کا بطلان ہے۔

آپس میں ایک دوسرے کی جان، مال، عزت و آبرو کی حفاظت کی تاکید اور ان کی حرمت کا بیان۔

پہن کر آتا اور میں صرف مسکراتا تو وہ کہتا تھا کہ اگر ہم بزرگوں کا نام روشن نہ کریں تو اور کون کرے گلہ قصہ! اب پچھلے سال انیس سو ساٹھ میں پچیس سال گزرنے کے بعد میں نے دیکھا کہ وہی یونیفارم میرے بڑے بھائی کے بڑے لڑکے کے بڑے لڑکے نے پہنا ہے۔ وہی اسد جس کو بعض باتیں کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔ غالباً اردو کو وہ من بنانے کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ اسے مغرب کے لیے دل پذیر بنایا جائے مگر آپ بھول رہے ہیں کہ کسی زبان کی اہمیت اس کی اپنی خوب صورتی سے نہیں بڑھتی اس کے بولنے والوں کی خوب صورتی سے بڑھتی ہے۔ جب آپ اخلاقی طور پر صحت مند ہو جائیں گے تو آپ کی قومیت کا اعتبار قائم ہو جائے گا اور دنیا آپ کی اردو بھی سکھے گی اور اس کے رسم الخط کے نخرے بھی اٹھائے گی۔ کاف کلن اور قاف قد حار کے باریک فرق کو دیکھ کر لوگ کہیں گے سبحان اللہ! محض حروف کے امتیاز میں یہ لوگ کتنی دور چلے گئے ہیں۔ یہاں بھی اپنی اصل پر نظر ہے۔ ورنہ کاف کلن کے بجائے کاف کش کش اور قاف قد حار کی بجائے قاف بد قسمت زیادہ موزوں ہوتا۔ کیونکہ یہ کش کش جو ہم بلخ اور بائتر کی جانب سے اٹھتی ہوئی دیکھتے ہیں۔ واقعی قسمت کی ستم خیزی ہے الغرض جب ہم صحت مند ہو جائیں گے تو اردو کی ساکھ اتنی بڑھ جائے گی کہ گند حار اٹکھ بھی تعریفی لہجے میں کہنے لگے گلہ "اردو دیاں فوجاں آئیاں۔"

دیکھیے! واقعی حقیقت کو بیان کی لطافت کیا رنگ عطا کرتی ہے۔
 "ایک شام میں اندھیرے میں سڑک پر جا رہا تھا۔ اندھیرے میں سے آواز آئی اور آواز کے پیچھے ایک آدمی کی شکل نظر آئی۔ اچھا خاصا نوجوان تھا۔ کپڑے بھی اچھے بنے ہوئے تھے۔ اس نے کہا۔ "مجھے شرم آتی ہے یہ کہتے ہوئے مگر بیوی کو مرض دق ہے اور علاج ملے کیے پیسہ نہیں۔" میری جیب میں پانچ روپے تھے۔ مستحق تو زیادہ کا تھا۔ مگر وہی دے دیے۔ یہ پانچ روپے کا اعلان اس لیے کرتا ہوں کہ اگر آپ میں سے کسی نے مجھ پر اندھیرے میں حملہ کیا تو پانچ روپے سے

زیادہ نہیں ملیں گے اور پھر بدنامی الگ ہوگی۔ اب تو مجھے پانچ روپے رکھتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔ کچھ دنوں بعد مجھے پھر اس سڑک پر قریباً اسی وقت جانے کا اتفاق ہوا۔ اندھیرے میں سے پھر آواز آئی۔ "مجھے شرم آتی ہے یہ کہتے ہوئے مگر میرے بچے کو فالج ہے۔ دو سال کا تھا جب اس کی ماں چل بسی تھی۔" میں نے شرانے کی آواز پہچان لی اور کہا کہ "میں کو تو کچھ دن پہلے دق کی بیماری تھی نا؟" اس نے بھی میری آواز پہچان لی اور کہا "مجھے شرم آتی ہے یہ کہتے ہوئے مگر مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ وہی ہیں۔ میں معافی چاہتا ہوں۔"

اس کے بعد کئی سال تک یہ آواز نہیں سنی۔ اب کوئی تین ہفتے ہوئے ہوں گے کہ ایک ہشت سالہ بچے سے پھر یہی فقرہ سنا۔ اس کا نام اسد ہے۔ میرے بڑے بھائی کے بڑے لڑکے کا بڑا لڑکا ہے۔ اس نے کچھ جنر کے جج زمین میں جھینکے تھے۔ جو زمین بھر میں سات آٹھ فٹ اونچے ہو گئے۔ بعض پودے جلد اونچے ہو جاتے ہیں۔ بعض انسان بھی جلدی اونچے ہو جاتے ہیں۔ مگر جنر کی جز استوار نہیں ہوتی۔ کسی بھی ایسی چیز کی جز استوار نہیں ہوتی جو جلدی سے اوپر جانے کی کوشش کرتی ہے۔ آپ کو بھی اپنی جڑیں اپنی بنیادیں استوار کرنی چاہئیں۔ آپ تو ماشاء اللہ اونچے درختوں کی طرح ہیں جن کی اصلاح آسانی سے نہیں ہو سکتی۔ اپنے بچوں کی بنیادیں راستی پر رکھیں۔ ان کی نشوونما میں کوئی تیز مٹی نہیں نظر آئے تو اسے کٹ دیں۔ درخت سیدھا اٹھے تو خوب صورت معلوم ہوتا ہے۔ آپ نے سوچا ہے کہ سیدھے کے سارے محاورے نیکی کے ہیں۔ مثلاً "سیدھا گھر خدا کا" سیدھی بات کرنا، سیدھی چال چلنا اور تیز حیاں کے سارے محاورے بدی کے ہیں۔ مثلاً "تیز مٹی آنکھ سے دیکھنا، تیز مٹی چال اور تیز مٹی کھیر۔ اور اگر میرے افکار یوں ہی پریشان رہے تو تھوڑے دنوں میں فنی بھی تیز مٹی ہو جائے گی۔

بات جنر کے پودوں کی ہو رہی تھی جو چھوٹے اسد نے کاشت کیے تھے۔ مجھے جھجھج (جی جو) کے نام

سے بکارتا ہے۔ اس لفظ کا نہ کوئی ماخذ ہے اور نہ ہی اس کے کوئی معنی ہیں۔ شروع میں ایک بچے نے بولنے کی ابتدا اس طرح کی کہ مجھے جھجھج کہنا شروع کیا۔ اس کے بعد سارے بچے سنت طفلان کے طور پر یہ نام دوہراتے رہے۔ دوسرے لڑکے نے نعم البدل کے طور پر مجھے بیون (ب' پ' و' ن) کہا۔ والد مرحوم نے سنا تو فرمایا کہ "بچہ بیون کہنا چاہتا ہے جو کسی زبان میں بندر کو کہتے ہیں۔" ساتھ ہی فرمایا کہ "لڑکے ہو سیار ہوتے ہیں پہچان لیتے ہیں۔" لڑکا جھجھج ہو سیار تھا۔ آخر کیوں نہ ہو۔ جب ذرا زیادہ ہو سیار ہوا تو۔ بیون کہنا چھوڑ دیا۔

اپنی ذات کو اسی سہولت سے ہر نشست میں طنزو مزاح کا نشانہ بناتے رہنا، کن کا خصوصی وصف تھا۔ آج تو یہ سوچنا بھی محالات سے ہے۔

اقبل کا فہم رکھتے تھے۔ اور اقبل شناس قرآن فہم نہ ہو۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ اور قرآن نہیں رکھنے والا آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عملی محبت نہ رکھتا ہو۔ یہ بھی نہیں ہو سکتا۔

"میں نے کہیں پڑھا تھا کہ معاشرت سیاست اور فکر کی دنیا سے کہیں زیادہ گہرا انقلاب وہ تھا جو حضور رسالت ماب صلی اللہ علیہ وسلم نے دلوں کی دنیا میں پیدا کر دیا تھا اور اس کا حقیقی ذریعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بلند ترین کردار اور مقدس ترین سیرت تھی۔ جو گہرا اثر انہوں نے اپنی قوم پر ڈالا اپنے اعلان کردار سے ڈالا۔ آپ نے پڑھا ہو گا کہ بعض لوگوں نے اعتراض کیا کہ یہ گیسار رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے جو خود بازار سے سودا لاتا ہے۔ اعتراض کرنے والوں کا مقصد یہ تھا کہ جب کوئی فرشتہ ان کے پاس آتا ہے تو کہیں اسے سبزی خریدنے کے لیے نہیں بھیج دیتے؟ اب بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو آپ کے بازار میں جا کر سبزی یا کپڑا خریدنے کو آپ کے بچل پر غمبول کرتے ہیں۔ یہاں ایبٹ آباد میں میرے گھر سے ملحق ایک سڑک گزرتی ہے۔ جس پر آئے جانے والے مجھے ملی کا کام کرتے دیکھتے ہیں۔ ایک شخص نے ایک دفعہ ہمدردی سے پوچھا کہ "کپ کے پاس ملی نہیں ہے؟" میں نے

کہا ہے تو۔ مگر میں خود بھی کام کرتا ہوں۔" اس نے پوچھا۔ "آپ خود کیوں کام کرتے ہیں؟ آپ کے ہاتھ سخت ہو جائیں گے۔" میں نے کہا۔ "ہاتھ سخت ہو جائیں تو دل نرم ہو جاتا ہے اور پھر کیا معلوم کہ آگے جا کر دنیا کی کیا حالت ہو۔" زلمے نے کوئی انقلابی کڑواہی تو میں اپنے ہاتھوں کے چھالے دکھا کر یہ کہہ سکوں گا کہ میرے تو ہاتھ بھی مزدوروں کے سے ہیں اور دل بھی مزدوروں کا ہے کیونکہ میں بھی کبھی کبھی کام سے جی چراتا ہوں۔"

جب کسی دہائی اور مزدور میں یہ احساس پیدا ہو جائے کہ اپنے ہاتھ سے کام کرنا اچھا نہیں تو اس کام پر اس کو خیر کیا خاک ہو گا۔ یہ باتیں ہیں جو آپ عید میلاد کے علاوہ بھی جہاں جہیں لوگوں سے کہہ سکتے ہیں تاکہ ان میں وہ ذہنی انقلاب پھریا ہو جو کسی اور نے اپنے کردار سے پیدا کیا تھا۔ یہ کہنا کافی نہیں کہ وہ جو کی روٹی کھاتے تھے۔ یہ البتہ آپ بلند آواز سے کہیں کہ وہ دنیا والوں کا کردار اپنی مثال سے بناتے رہے۔ ایک مثل امانت اور دیانت کی تھی جس کی وجہ سے وہ امانت کھائے۔ ایک لن کے پاس ذہنی امانت تھی جو آپ کے پاس بھی ہے اور آج میں اس امانت پر زور دیتا چاہتا ہوں۔ یہ امانت عقل کی تھی جو بچ بولنے کی تلقین کرتی ہے اور ذہنی خیانت سے منع کرتی ہے۔ بس آپ یہ چھوٹی سی بات اپنے ذمہ لے لیں تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ ایک بڑی قوم بن جائیں گے۔

مگر اس وعدے سے جو میں آپ سے کر رہا ہوں کہ اگر آپ ذہنی امانتوں میں راست باز ہو جائیں تو ایک بڑی قوم بن جائیں گے، مجھے اس ملا کا وعدہ یاد آیا جو اس نے کسی بے نمازی سے کیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ اگر چالیس دن متواتر نماز پڑھو تو انعام دلاں گا۔ جب چالیس دن نماز پڑھنے کے بعد وہ انعام کے لیے آیا تو ملا نے کہا۔ "ابے الو کی دم اور گدھے کے سم! میں نے تو تمہارے فائدے کی بات کی تھی۔ میرا مطلب یہ تھا کہ چالیس دن نماز پڑھ لی تو ایسی علوت پڑ جائے گی کہ پھر نہیں چھوڑو گے۔ نماز کی علوت خود تمہارا بہترین انعام ہے۔" بے نمازی نے کہا۔ "تو گویا آپ نے

میرے ساتھ دھوکا کیا اور آپ وعدہ خلافی بھی کر رہے ہیں۔ چلو! نہ سہی۔ میں نے بھی نمازیں بغیر وضو کے ہی پڑھی تھیں۔“

موضوع سے مربوط بر محل قصے اور لطیفے آپ کو تازگی کا احساس دلاتے ہیں اور اور تو ثنائی کا دل نشیں احساس آپ کو اپنے حصار میں لیے رہتا ہے۔

”پاکستان بننے کے فوراً بعد ایک شوریدہ سر شاعر نے جو ریلوے میں ملازم بھی تھا، بڑے درد سے کچھ شعر کے مجن میں ایک یہ بھی تھا۔

دکھتا کیا ہے میرے منہ کی طرف قائد اعظم کا پاکستان دیکھ! میں ان دنوں حکومت کا قانونی مشیر تھا۔ وہ مجموعہ اشعار میرے پاس آیا کہ ”ہاؤ! اس پر کون سی دفعہ لگتی ہے؟“ میں نے کہا کہ ”خدا کے بندے! وہ تو صرف یہی کہتا ہے کہ میرے منہ کی طرف کیا دیکھتے ہو پاکستان کی طرف دیکھو۔ کیا یہ وہی ملک ہے جو قائد اعظم نے تراشا تھا۔ اگر آپ اس کے منہ کی طرف دیکھنا چاہتے ہیں تو خوشی سے دیکھیں۔“

ایک زمانہ تھا کہ میں خود بھی گانا تھا یعنی حکومت کا قانونی مشیر تھا۔ جب بھی حکومت کسی مشکل میں ہوتی تو مجھ سے مشورہ طلب کیا جاتا تھا۔ مجھے چونکہ قانونی طور پر رائے دینی ہوتی تھی اس لیے اکثر خاموش رہتا۔ ایک تو اس لیے کہ مجھے خود کم علم ہوتا تھا۔ خصوصاً جب پریس ایکٹ کے بارے میں مجھ سے سوال کیے جاتے۔ ”چھا فرمائیے کیانی صاحب! یہ فلاں اخبار بہت تنگ کر رہا ہے۔ اس کا کیا تذکرہ کریں؟“ میں کہتا۔ ”مہمانت ضبط کر لیجئے۔“ وہ پوچھتے کہ ”مگر اس نے ہائیکورٹ میں درخواست دے دی تو پھر؟“ میں کہتا ”درخواست تو ضرور منظور ہوگی۔“ وہ پوچھتے۔ ”پھر کیا کریں؟“ میں کہتا پھر مہمانت ضبط نہ لیجئے۔“ دیکھا! کیسی اچھی رائے دی۔“

”میں مترادف الفاظ کی مثل دے رہا تھا۔ مذکر“ مونث اور پھانوں وزیروں کے جھگڑے میں خواخواہ پڑ گیا۔ وکیلوں کو چھوڑ کر عام لوگ تو مترادف الفاظ کو اتنی جلدی سمجھتے ہیں کہ بعض ان میں سے عدالت کو

بے انصافی کا مترادف تصور کرتے ہیں۔

ہم تو ابھی تک عدل و انصاف کی پگھندیوں پر چل رہے ہیں۔ شاہراہیں تو ہیں ہی نہیں۔ شاہراہوں تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے کہ آپ اور ہم مل کر کوشش کریں۔ زندگی کے ہر شعبے میں دیانت داری سے کام لیں۔ دفتر میں باتوں سے زیادہ کام کریں، مل چلانا ہو تو زمین کو زیادہ کھودیں، لڑکوں کو پڑھانا ہو تو اس طرح پڑھائیں کہ چھٹی کے دن بھی دفتر سے کے خواب دیکھا کریں۔“

نصف صدی بیت گئی۔ امید اور خواب کی کیفیت سے نکل کر ہم امید و بیم کی حالت میں جا پہنچے ہیں۔ تبصرو کرنے کو بہت کچھ ہے، مگر کتاب کی گفتگو کا مزا کرنا ہو جائے گا۔

”اس سے پہلے اگر آپ اپنے دل میں استقلال کی گرمی پیدا کریں اور پھر بغداد کی طرح ڈاکوؤں کے سامنے اور میری طرح گھر کے اندر بھی جج بولنے میں تامل نہ کریں اور خیانت کو کسی شکل میں دیکھ کر خون نہ سہی“ آنسو ہی بہا میں تو آپ قوی حیثیت سے آپ وہ کچھ بن جائیں گے کہ خون بہانے کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔“

صحت پر کلن دھرے ہوتے تو آج۔ یہ حال نہ ہوتا!

ان کی بیشتر تقاریر یوم اقبال کے موقع کی ہیں۔ ہر دفعہ نئے خیال اور نئے طرز کی قسم لے۔

بے نفق نہیں اگرچہ فطرت جو اس سے نہ ہو سکا وہ توکر مگر جو کچھ کرنا ہوا اس طرح کہ وہ اس میں ایک ولولہ نظر آئے، اس میں تڑپ پیدا ہو۔ جیسے کسی کھوئی ہوئی چیز کو حاصل کرنے کی بے قراری ہو۔ اس کام کے لیے وہ جسم کو چھوڑ کر روح کو مامور کرتا ہے، کیونکہ جسم روح کے زور سے چلتا ہے اور جسم نوال پذیر ہے۔

روح کو لیکن کسی کم گشتہ شے کی ہے ہوس در نہ اس صحرا میں کیوں تالاں ہے یہ مثل جس طنز کو لطیف انداز اختیار کرتے ہوئے۔

”مفسرین کے کہنے کے مطابق کم گشتہ سے مترادف جائیداد اور مراد ہے جیسے آموں کا بلبل یا رہائشی مکان۔ میں انہی ایک گائے گورداسپور میں چھوڑ آیا تھا۔ بعد میں وہاں کے ناظر نے لکھا کہ ”وہ طغیانی میں بہ گئی ہے۔“ یہاں سے ایک ہندو دوست نے جاتے ہوئے اپنی گائے دی کہ یہ کسی تعالیٰ کے ہاتھ لگ جائے گی۔ اس سے تو آپ بہتر ہیں۔“ بعد میں جب میں نے سنا کہ گورداسپور والی گائے طغیانی میں بہ گئی ہے تو سوچا کہ بہہ کر ادھر ہی نکل آئی ہوگی۔ ممکن ہے وہی گائے ہو، زیادہ غسل کرنے سے صرف رنگ تبدیل کیا ہے اور رفتہ رفتہ یقین ہو گیا کہ یہ وہی گائے ہے، کیونکہ دودھ بھی ویسا ہی سفید تھا۔ مکان نہ ملا تو گائے ہی سہی۔“

کابلی ہمدانی اور بے عملی کی بیخ کنی پر زور دیتے ہوئے جنس صاحب نے باتوں ہی باتوں میں یہ راز بھی افشا کیا کہ ہر سال سلاٹھ سرکاری سجرکاری کے باوجود ہمارے درختوں میں آخر اضافہ کیوں نہیں ہوتا؟ کرپشن کے لعلاتے دور کا آغاز اتنا پرانا ہو چکا تھا، اب آخر میں خامے کی چیز کے طور پر 21 اپریل 1962ء کو کی گئی دلچسپ، مفصل، جامع اور آسان فہم تقریر میں سے اقتباسات، جو فکر کو جلا بخشتے ہیں، خودی کی وضاحت کرتے ہیں اور سوچ کے نئے امکان پیدا کرتے ہیں۔ اگر آپ بھی چاہیں تو۔

”یہ تو میں نہیں کہہ سکتا کہ اقبال کس طرح اس نتیجے پر پہنچے مگر آخری نتیجہ یہی تھا کہ اسلام ایک جلاہ حیات ہے۔ اسلام عمل سکھاتا ہے، حقیقت سے منہ نہیں موڑتا۔ حقیقت کی تلاش میں جس قلبی کے ذریعے ان مقالات تک پہنچا ہے، جہاں حواس خمسہ کے ذریعے سے نہیں پہنچ سکتے اور آخری حقیقت کو خدا کہتے ہیں۔ چونکہ حقیقت کی تلاش انسان کا کام ہے، اس لیے مذہب زندگی کا ایک ضروری جزو ہے اور ان سب مشکل باتوں کی تشریح دراصل خودی کی ایک تشریح ہے۔

مجھے کبھی شک ہوا کرتا تھا کہ ”خدا“ کا لفظ خود سے نکلا ہے مگر اب یہ کتاب پڑھ کر تو یقین ہو گیا ہے۔ ان بے پایاں چیزوں میں سب سے پہلے چیز جس پر

اقبال کی نظر پڑتی ہے، وہ قرآن ہے۔ اس کے نزدیک قرآن کا بڑا مقصد یہ ہے کہ انسان میں اس بات کا شعور پیدا کرے کہ اس کے تعلقات خدا سے ایک طرف اور کائنات سے دوسری طرف کیا ہیں۔“

”اسلام ہادی دنیا سے گریز نہیں کرتا، بلکہ اس کی تسخیر کر کے کوئی ایسی بنیاد تلاش کرتا ہے جس پر زندگی کی عمارت بادلوں میں نہیں، بلکہ زمین پر کھڑی کی جاسکے۔ آپ سمجھیں گے کہ میں انہی بات کر رہا ہوں کیونکہ ہادی دنیا کی تسخیر مسلمان تو نہیں کر رہے اور لوگ کر رہے ہیں۔

اقبال کہتا ہے اور میں بھی اوب کے ساتھ تائید کرتا ہوں کہ تعلیم قرآن یہ ہے کہ ان چیزوں کی حقیقت فکر کے ذریعے سے معلوم کرو۔

(ترجمہ) ”تمہیں کلن، آنکھ اور دل دیے۔“ کانوں سے تو سنتے ہیں۔ یہ ایک ذریعہ ہے، تحصیل علم کا دل سے آپ کیا کرتے ہیں، سوچتے ہیں۔ یہ دیکھئے! حواس خمسہ کے علاوہ ایک اور ذریعہ علم کے حاصل کرنے کا پیدا ہوا، بلکہ یوں سمجھئے کہ اس سنگ و خشت سے جن کا علم آنکھ، کلن اور دیگر حواس فراہم کرتے ہیں، دل کا معمار کوئی اور عمارت کھڑی کر دیتا ہے اور خدا اسی لیے کہتا ہے کہ دل بھی دیا ہے۔

اگر سورج اور چاند کو دیکھ کر آپ کو یہی گھرنا تھا کہ اللہ کو مبارکباد دیں کہ تو نے بہت اچھا دستور قائم کیا ہے، تاکہ وہ خوش ہو کر ایک اور چاند پیدا کر دے جو لاہور کی بجلیوں کے خراب ہونے پر کام آئے تو بحیثیت ایک غیر جانب دار تماشائی کے، مجھے یہ نظر آتا ہے کہ اللہ کی خودی نے تو خدا کی اختیار کر لی، مگر آپ کی خودی گدائی کے جذبے سے آگے نہیں بڑھی اور اگر یہی بات سمجھی تو پھر خدا نے کیوں کہا کہ یہ مخلوق بے کار کھیل کے طور پر پیدا نہیں کی ہے۔ پھر کیوں کہا کہ زمین و آسمان کو آپ کے لیے مسخر کیا ہے۔ زمین کو مسخر کرنے کے معنی تو یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ آپ اس میں کھیتی باڑی کریں۔ زمین نہایت فرماں برداری سے آپ کو فصل دے گی۔

سورج کی تسخیر آپ کس طرح بیٹھے بیٹھے کریں



پندھن

احسن خان بہر قاطرہ احسن

شاہین رشید

”گھر میں تو کم ہی ٹائم دے پاتے ہوں گے۔ فیملی لائف کو مس تو کرتے ہوں گے؟“
 ”بالکل! ایس کرتا ہوں۔ شر سے باہر اور ملک سے باہر تو مجبوری ہوتی ہے لیکن جب میں لاہور میں ہوتا ہوں تب فیملی لائف ڈسٹرب نہیں ہوتی اور بیٹی کو دیکھ کر تو لگتا ہے ساری محنت وصول ہو گئی ہے۔“
 ”شادی پسند کی بھی آپ کی؟“
 ”آپ ہماری شادی کو پسند اور ارجح کہہ سکتی ہیں۔ کیونکہ میری فیملی اور میری مسز فاطمہ کی فیملی کے آپس میں بہت اچھے تعلقات تھے تو آتا جانا لگتا تھا۔ فاطمہ سے بھی پیلو ہائے ہو جاتی تھی۔ پھر جب گھروالوں نے رائے پوچھی تو میں نے انکار نہیں کیا کیونکہ مجھے بھی فاطمہ اچھی لگتی تھی۔ بس اس طرح ہماری بات چلی

فنکار جب بہت زیادہ مشہور ہو جائیں تو پھر ان کے پاس بات کرنے کے لیے وقت نہیں ہوتا۔ احسن خان بھی آج کے دور کے مصروف ترین فنکار ہیں۔ اس لیے ”بندھن“ کے لیے ہم نے ان سے زیادہ وقت نہیں لیا۔
 ”کیسے ہیں۔ بہت مصروف رہتے ہیں؟“
 ”جی الحمد للہ! بالکل ٹھیک ٹھاک۔ آپ کی دعا سے کلنی مصروفیات ہیں۔ آج کل کلنی کام ہو رہا ہے۔“
 ”شادی شدہ لائف کیسی گزر رہی ہے؟“
 ”ماشاء اللہ بہت اچھی۔ اللہ تعالیٰ نے ایک عدد پیاری سی بیٹی بھی عطا کی ہے جس کا نام سکینہ ہے۔ اب وہ تقریباً چار سال کی ہو رہی ہے۔“

ہونا تھا ہو جاتا، جس کی قسمت میں چوری ہوتی ہو جاتی۔ اور خدا نے انسان کو قرآن کے مطابق ایک ذمہ دار شخصیت عطا کی ہے جو اپنے افعال کی مختار ہے۔ وہ کسی اور کا بوجھ نہیں اٹھاتا۔ صرف اپنے کیے کا بوجھ اٹھاتا ہے۔“

”اس کو پڑھتے بھی نہیں“ اس پر ریشم کے غلاف چڑھا دیتے ہیں۔ میں نے اس قسم کے ایک ریشمی غلاف میں لمبوس کتاب دیکھی ملباس بنادیا تو یہی قرآن نکلا جس کو آپ کبھی کبھی پڑھ بھی لیتے ہیں۔ میں نے تعجب سے کہا ”یہ تو قرآن ہے۔“ مگر اقبل کہتا ہے کہ ”یہ تو کتاب تقدیر ہے۔“ سنئے!

اسی قرآن میں ہے آپ ترک جہاں کی تعلیم جس نے مومن کو بنایا مہ و موس کا امیر تین بہ تقدیر ہے آج ان کے عمل کا انداز بھی نہیں جن کے ارادوں میں خدا کی تقدیر تھا جو نا خوب بتدریج وہی خوب ہوا کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر تو صاحبان! اس طرح تو میں جانتا ہوں کہ قرآن کتاب تقدیر ہے بشرطیکہ آپ یہ کہیں کہ اسی سے ہم نے اپنی تقدیر بنائی ہے اور خدا کی تقدیر کا ہمارے ارادوں میں نہیں ہونا اس طرح ہے جیسے خون کی جگہ ہماری رگوں میں فولاد گردش کرتا ہو اور تیسری بات ضمیر کی ہے جو غلامی میں بدل جاتا ہے۔ آپ وقتاً فوقتاً آئینہ دیکھا کریں کہ جب سے آپ آزاد ہوئے ہیں ضمیر کا کوئی حصہ واپس آیا ہے یا نہیں۔ اقبل کے مطابق تقدیر سے تو سبھی ہنگامہ چیز جو ناک میں رہتی ہے کہ اگر آپ کا عمل ذرا کند ہو جائے تو اپنی دودھاری نکوار آپ کے سر پر مارے۔

ہر لحظہ ہے قوموں کے عمل پر نظر اس کی برابری صفت تیغ دو پیکر نظر اس کی فہم داور اک کو روشنی روح کو تکفلی اور ایمان کو تازگی عطا کرنے والی اس کتاب کا مطالعہ آپ کے ذوق لطیف کی دوا کا خضر ہے!

مگر یہ تو مطلب نہیں ہو سکتا کہ دسمبر کے مہینے میں جب صبح ٹھنڈ ہو تو آپ سورج کی شعاعوں سے اپنے بدن کو گرم کر لیں۔ اگر یہ بات ہوتی تو جس دن بابل ہوتے سورج یہ کہہ دیتا کہ آج مجھے بادلوں نے تسخیر کر لیا ہے لہذا آپ کی تسخیر کو چھٹی ہے اور ایسی تسخیر یعنی دھوپ میں بیٹھنا تو کھوڑے اور گدھے کو بھی میسر ہے۔ مسخر کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ آپ اس کی ساخت پر راحت، اس کے ذرات، اس کی شعاعوں، اس کے شانہ روز اور سالانہ کرشموں کا جائزہ لے سکتے ہیں اور اسی کو سائنس کہتے ہیں۔ گویا سائنس مذہب کا حصہ ہے۔“

”اقبل کا خیال ہے کہ تقدیر کا ذکر جہاں قرآن میں ہوا ہے اس کا تعلق تمام وقت یا مجموعی وقت سے ہے۔ وقت کے تین حصے ہیں۔ ماضی، حال اور مستقبل۔ کیا آپ ماضی کو جچ چچے چھوڑ سکتے ہیں؟ وقت ایک جاری ندی ہے جو ماضی کو حل تک پہنچاتا ہے۔ مستقبل کوئی ایسی چیز نہیں ہے جیسے ایک طے کیا جانے والا فاصلہ، جس کو ابھی طے کرنا ہو، بلکہ وہ ایک کھلا امکان ہے اور جب قرآن کہتا ہے کہ خدا نے یہ سب چیزیں پیدا کیں اور ہر ایک کو اپنی تقدیر دی تو اس کا یہی مطلب ہے ایک مستقبل اس کے لیے مقرر کیا، جو ایک امکان ہے اور جو اس چیز کی ذاتی قابلیتوں اور ممکنات پر منحصر ہے۔ مستقبل سے مراد واقعات کے وہ سر بمبر پارسل نہیں ہیں جو وقت کے بطن میں خوابیدہ ہیں اور جو مقررہ ساعت پر معرض وجود میں آجاتے ہیں۔ مثلاً ”تقسیم ہند کو سمجھیے! جس کے نتیجے میں پاکستان بنا۔ پاکستان ایک صندوق میں بند تحفہ نہیں تھا جو چودہ اگست کو کھولا گیا۔“

”ہمارے روز موع کے کام بھی مشین کی طرح نہیں ہوتے۔ اغراض و مقاصد کے تانے بانے سے بنے ہوتے ہیں اور یہی مقصد یا ارادے کا عنصر ہمارے حل کو مستقبل کی طرف لے جاتا ہے۔ اور اگر یہ سب چیزیں پہلے طے ہو گئی ہوتیں تو ہمیں فوج رکھنے کی کیا ضرورت تھی؟ پولیس کی کیا ضرورت تھی؟ جسے مل



انگریزی اوب میں ماسٹرز کیا ہے۔ لندن سے میں نے
اوپر لیا اور جیسا کہ میں نے بتایا کہ اداکاری میں بھی
شارٹ کور سز کیے۔ میری ہائیٹ چھ فٹ ہے۔
”اپنی فیلٹی میں کس کے بہت قریب ہیں؟“

”میں اپنی فیلٹی میں سب کے بہت قریب ہوں۔
لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ کو میری شخصیت
میں جتنی اچھائیاں اور خوبیاں نظر آتی ہیں وہ سب
میری والدہ کی وجہ سے ہیں اور میری طبیعت میں جو
نرمی اور انکساری ہے وہ میرے والد صاحب کی بدولت
ہے۔ کیونکہ انہوں نے کبھی ہم بہن بھائیوں پہ سختی
نہیں کی اور نہ ہی کبھی مارا نہ ہی بلا وجہ ڈانٹا ہے۔ میری
شخصیت میں میرے والدین کا عکس نمایاں ہے۔“

”آپ کو غصہ آئے تو کس پر نکالتے ہیں؟“
”جس پہ آتا ہے اسی پہ نکالتا ہوں۔ تیز آواز میں
بولتا ہوں اور بات دل میں نہیں رکھتا۔ عموماً مجھے
لوگوں کے جھوٹ بولنے پر بہت غصہ آتا ہے۔ کیونکہ
کچھ بھی ہو، جھوٹ سامنے آئی جاتا ہے۔ پھر سوچیں
کہ جھوٹ بولنے والے کی کیا عزت رہ جاتی ہوگی۔“

”ہنی مون کے لیے کہاں گئے تھے اور فضول خرچ
کون ہے آپ فاطمہ؟“
”سری لنکا اور سنگاپور۔ بہت انجوائے کیا تھا۔
ایک یادگار ٹرپ تھا ہمارا اور فضول خرچ تو میں ہی
ہوں۔ اچھی چیزوں کو دیکھ کر میرا ہاتھ نہیں رکھتا۔“
”بہت شکریہ احسن خان! اب کچھ باتیں فاطمہ سے
کر لیتے ہیں۔“

فاطمہ کے بارے میں آپ کو بتائیں کہ فاطمہ کا
تعلق لاہور سے ہے۔ ان کی والدہ کا تعلق ملتان سے
ہے اور والد سری لنکا میں جاب کرتے ہیں۔ جبکہ والدہ
کافی عرصہ تدریس کے شعبے سے وابستہ رہی ہیں۔
فاطمہ کے دو بڑے بھائی ہیں اور یہ دو بھائیوں کی اکلوتی
بہن ہیں اور لاہور میں لنزیونیورسٹی سے بی ایس سی
آنرز کیا ہے۔

”جی فاطمہ! لائف کیسی گزر رہی ہے۔ بی بی کیسی
ہو گئی۔“
”شادی کیسا تجربہ ہے؟“
”بہت اچھا۔ فیلٹی بن جاتی ہے۔ لائف سہل
ہو جاتی ہے۔ گھر میں کوئی غصہ ہوتا ہے۔ کوئی پیار
کرنے والا ہوتا ہے۔ پھر بچے ہو جائیں تو زندگی مکمل
ہو جاتی ہے۔
میرے اور فاطمہ کے درمیان محبت بھی ہے اور ہم
آہنگی بھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے مسائل سننے
ہیں اور انہیں حل کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔“
”گویا زندگی خوش گوار اور مزے میں گزر رہی
ہے؟“
”بہت خوش گوار، بہت مزے کی اور بہت
پر سکون۔“
”بیگم آپ کے ڈرامے دیکھتی ہیں اور تنقید کرتی
ہیں؟“
”ہاں! کیوں نہیں۔ جب ٹائم مل جائے اور میرا
ڈراما آرہا ہے تو ضرور دیکھتی ہیں اور تنقید بھی کرتی
ہیں۔“
”ویسے کیا آپ نے بچپن سے ہی یہ ٹھان لیا تھا کہ
شوہر میں آتا ہے؟“
”بے شک! مجھے اس فیلڈ میں آنے کا شوق تھا
لیکن ایسا نہیں تھا کہ میں نے یہ سوچ لیا ہو کہ بس آتا
ہے تو اس فیلڈ میں در نہ کچھ کرنا ہی نہیں ہے۔ ہوا
یوں کہ میں جب لاہور میں تھا تو اپنے دوستوں کے
ساتھ فلم کی شوٹنگ دیکھنے گیا۔ وہاں جاوید فاضل
صاحب نے مجھے فلم میں کام کرنے کی پیش کش
کردی۔ میں حیران ہوا۔ میرے دوست جو میرے
ساتھ تھے انہوں نے اکیسایا کہ آفر کو مت ٹھکراؤ۔
میں نے ہاں بھری اور یوں اس فیلڈ میں آ گیا۔“
”پھر قاعدہ جاری رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔“
”ہاں۔ جی! کیونکہ مجھے مزا آیا تو میں نے لندن
سے اداکاری سے متعلق کچھ کورسز بھی کیے اور فلم
سے ہی اپنے کیریئر کا آغاز کیا اور میں نے سات فلمیں

اور متعدد ڈرامے کیے۔ اب تو صرف ڈرامے ہی کر رہا
ہوں۔“

”گھر میں بھی ڈرامے کرتے ہیں؟“
”نہیں ہرگز نہیں۔ گھر میں کوئی ڈراما
نہیں ہوتا۔ عام لوگوں کی طرح رہتا ہوں۔ بیوی اور بچی
کے ساتھ وقت گزارتا ہوں اور گھر میں مجھے ڈراما کرنا
آتا بھی نہیں ہے۔“

”آپنا فوج کس طرح کا دیکھتے ہیں؟“
”دیکھتا تو بہت براٹ ہوں۔ مگر ہونا وہی ہے جو
اللہ تعالیٰ نے قسمت میں لکھ دیا ہے، لیکن میری
خواہش ہے، بحیثیت اداکار تو لوگ مجھے جانتے ہی
ہیں۔ بحیثیت ڈائریکٹر اور پروڈیوسر بھی لوگ مجھے
جانتے ہیں اور میرے کام کو پسند کریں۔“

”تو پھر اصل فیلڈ کیا ہوگی؟“
”میں سب کو ٹائم دینا چاہتا ہوں لیکن فی الحال میری
پہلی ترجیح اداکاری ہی ہے۔ ماڈلنگ بھی ساتھ ساتھ
کر رہا ہوں۔“

”آپ کے خیال میں بیوی کو کمانا چاہیے؟“
”مگر بیوی تعلیم یافتہ ہے اور اس پر گھر کی کوئی ذمہ
داری نہیں ہے، مطلب کہ وہ فارغ ہے تو ضرور
کمائے۔ در نہ تو یہ ذمہ داری مرد کی ہے کہ وہ اپنے گھر
والوں کی کفالت کرے۔ ویسے شادی سے پہلے فاطمہ
نے جاب کی تھی اور شادی کے بعد بھی۔“

”شادی پر دھوم دھام سے ہوئی تھی؟ اور ساری
رسمیں ہوئی تھیں؟“
”جی بالکل! دھوم دھام سے ہوئی تھی اور تقریباً
ساری رسمیں ہوئی تھیں اور سب نے کافی انجوائے کیا
تھا۔“

”کچھ اپنے بارے میں بتائیں۔“
”میں 10 اکتوبر 1978ء کو لندن میں
پیدا ہوا۔ والدین لندن میں ہی رہتے ہیں۔ ہم تین
بھائی اور دو بہن ہیں۔ میں اور میرا ایک بھائی ہم دونوں
جڑواں ہیں۔ میں نے گورنمنٹ کالج لاہور سے

کرتے ہیں۔“
”عموماً جب لڑکیوں کی شادی ہوتی ہے تو امور خانہ داری سے بلاواقف ہوتی ہیں اور اس وجہ سے کبھی کبھی طعنے بھی ملتے ہیں۔ آپ کے ساتھ کیا صورت حال رہی؟“

”آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ لڑکیاں پر محالاً میں اتنی مصروف ہوتی ہیں کہ گھر داری پر توجہ نہیں دے پاتیں۔ میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ لیکن مجھے کسی نے کوئی طعنہ نہیں دیا اور نہ ہی کچھ کہا۔ بلکہ جو مجھے نہیں آتا تھا میری ساس نے مجھے سکھا دیا۔“

”جملہ دد برتن ہوں“ گھبراتے ضرور ہیں۔ آپ لڑتے ہیں تو کون مٹاتا ہے؟“
”جس کی غلطی ہوتی ہے وہی سوری کر لیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مرد کو طاقت اور رتبہ دیا ہے۔ اس لیے سوری کرنے میں اکثر میں پہل کرتی ہوں۔ مجھے پہل کرنے میں کوئی برائی نظر نہیں آتی۔“

”غصے کے تیز ہیں کیا؟“
”ہرگز نہیں! بہت پار کرنے والی شخصیت ہیں۔ میں مرضی کے خلاف کوئی بات ہو تو پھر ضرور غصہ کرتے ہیں اور یہ قدرتی بات ہے۔ غلط باتوں پر تو سب کو ہی غصہ آتا ہے۔“

”شوہر کے بارے میں بہت سی غلط اور صحیح باتیں مشہور ہیں۔ کبھی کلن دھڑے آتے ہیں؟“
”انسان کو بہننا ہو تو وہ کہیں بھی ہٹ سکتا ہے۔ ضروری نہیں کہ اس فیلڈ میں ہٹے۔ مجھے ان پر مکمل بھروسہ ہے۔ ان کی فیملی بہت پڑھی لکھی اور سلیجی ہوئی ہے اور اگر بیوی اچھی بیوی بن کر رہے اور شوہر کو شکایت کا موقع نہ دے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ مرد گھر سے باہر کسی کو دیکھے۔“

”میری خالی تو یہ ہے کہ مجھے بہت جلد غصہ آجاتا ہے۔ مگر ایسے ہی نہیں بلکہ اگر کوئی مجھ سے چلا کی

کرے یا دھوکا دینے کی کوشش کرے تب۔ اور احسن میں تو بہت خوبیاں ہیں اور یہ بات شاید بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگی کہ احسن پانچ وقت کے نمازی ہیں بلکہ قرآن کی تلاوت کرتے ہیں۔“

”چھٹی کا دن کیسے گزارتے ہیں آپ دونوں؟“
”من کی باقاعدہ چھٹی کب ہوتی ہے۔ ان کی تو کوئی روٹین لائف ہے ہی نہیں۔ آج شہر میں ہیں تو کل شہر سے باہر اور برسوں ملک سے باہر۔ تو جب کبھی قسمت سے چھٹی کا دن مل جائے تو پھر فیملی کے ساتھ ہی گزارتے ہیں۔ کہیں نہ کہیں گھومنے پھرنے کھانے پینے کے لیے نکل جاتے ہیں۔“

”آپ کو شادی کی کون سی رسمیں پسند ہیں اور منہ دکھائی میں ملتا تھا؟“

”میں شادی کے موقع پر غیر ضروری رسموں کے خلاف ہوں اور آج کے دور میں تو یہ ہونی ہی نہیں چاہیے، کیونکہ بہت زیادہ منگلی ہو گئی ہے۔ مجھے ماہوں کی رسم پسند نہیں ہے۔ البتہ مندی کی رسم اچھی لگتی ہے اور منہ دکھائی میں مجھے گولڈ اور ڈائمنڈ کا سیٹ ملتا تھا جو کہ بہت خوب صورت تھا۔“

”حسن نے کہا کہ وہ فضول خرچ ہیں۔ آپ بتائیں کہ احسن کن چیزوں پر زیادہ خرچ کرتے ہیں؟“
”یہ تو ہے کہ احسن فضول خرچ ہیں اور ویسے تو سب پر بہت خرچ کرتے ہیں۔ لیکن اگر اپنے اوپر خرچ کرنا ہو تو پھر کپڑوں پر اور جوتوں پہ خرچ کرتے ہیں۔“

”آپ کے ساتھ گھریلو کاموں میں ہاتھ بٹاتے ہیں؟“
”بہت مشکل سے، کیونکہ بہت زیادہ مصروف رہتے ہیں۔ پھر بھی گھر میں ہوں اور موڈ بھی بہت اچھا ہو تو پھر ضرور ہاتھ بٹالتے ہیں۔ انہیں گھر کی صفائی ستھرائی کا بہت شوق ہے۔ گھر میں گندگی برداشت نہیں کر سکتے۔“

”آپ احسن کو کس لباس میں زیادہ اچھی لگتی ہیں؟“

”میں انہیں ہر لباس میں ہی اچھی لگتی ہوں۔ خواہ جینز ہو، شلوار قمیص ہو یا ساڑھی۔ ساڑھی سے میں بہت گہرائی ہوں، کیونکہ اس کے ساتھ چلنا پھرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ مجھے خود تو بس شلوار قمیص ہی اچھی لگتی ہے۔“

”حسن کھانے پینے کے شوقین ہیں یا جوتے کھا لیتے ہیں؟“

”حسن کھانے پینے کے بہت شوقین ہیں۔ لیکن کھانے میں اس بات کا خاص خیال رکھتے ہیں کہ کھانا مرغن نہ ہو۔ بس فرائڈ ہو۔ ان کی فیلڈ ایسی ہے کہ انہیں اپنی اسمارٹنس کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔“

”آج کے دور میں جبکہ منگلی بے اندازہ ہوتی ہے۔ بچت کو اہمیت دیتے ہیں؟“

”انسان کی زندگی میں تو پیسہ ہمیشہ ہی بہت اہم رہا ہے۔ کیونکہ پیسے کے بغیر تو انسان کی زندگی کچھ بھی نہیں ہے۔ تو بچت کی اہمیت تو ہمیشہ سے ہی ہے۔ کب کیسا وقت آجائے سو انسان کو اس کے لیے ہر وقت تیار رہنا چاہیے۔“

”آپ کی شادی تو والدین کی پسند سے ہوئی۔ لو میرج کے بارے میں آپ کیا کہیں گی۔ کامیاب ہوتی ہے؟“

”میں تو سمجھتی ہوں کہ لوجوانوں کی یہ سوچ غلط ہے کہ لو میرج ہونی چاہیے۔ یہ سب لوجوانی کے فیصلے ہوتے ہیں۔ اولاد کے لیے بہتر تو یہی ہے کہ والدین کا فیصلہ مانیں، کیونکہ ان کی سوچ ہی اولاد کے لیے بہتر ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ تجربہ کار ہوتے ہیں۔“

”جن لوگوں کی شادی نہیں ہوئی ان کے لیے کیا کہیں گی؟“

”من کے لیے میں یہی کہوں گی کہ وہ چاہے لڑکا ہو یا لڑکی، پہلے اپنی تعلیم مکمل کریں۔ اپنے پیروں پہ کھڑے ہو جائیں، پھر شادی کا سوچیں، کیونکہ شادی تو ساری عمر رہتی ہوتی ہے۔ جدوجہد کا دور یوں ہی گزر جائے تو پھر زندگی میں کچھ حاصل نہیں ہوتا۔“

”بہت شکریہ! آپ نے ٹائم دیا۔“

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لئے خوبصورت ناول

غریب سہرت دروہی

غریب سہرت چھپائی

شان جوئے ہیں

منضبط جلد

آفٹ ہیپر

☆ ستاروں کا آنگن، نسیم سحر قریشی	قیمت: 450 روپے
☆ دروہی منزل، رضیہ جمیل	قیمت: 500 روپے
☆ اے وقت گواہی دے، راحت جبین	قیمت: 400 روپے
☆ تیرے نام کی شہرت، شازیہ چودھری	قیمت: 250 روپے
☆ امرنیل، عمیرہ احمد	قیمت: 550 روپے

منگوانے کا پتہ: مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37۔ اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361



خط بھجوانے کے لیے پتا
ماہنامہ شعاع - 37 - اردو بازار، کراچی۔

Email: info@khawateendigest.com
shuaamonthly@yahoo.com

آپ کے خط اور ان کے جوابات لیے حاضر ہیں۔
آپ کی عافیت، سلامتی اور خوشیوں کے لیے دعائیں۔
اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ آپ کو ہم کو اور ہمارے
پیارے ملک کو سلامت رکھے۔ آمین

پہلا خط کراچی سے یلحہ صدیقی کا ہے، لکھتی ہیں
اپنی پہلی تحریر کو شعاع کی زینت بنا دیکھ کر بہت خوشی
ہوئی۔ ان تمام قارئین کا شکریہ جنہوں نے تحریر پسند کی اور
تعریف و تنقید سے نوازا۔

شعاع کا مہندہ اساتذہ اور دلن جی کے لباس نے اچھا
تاثیر پیش کیا۔ نمروہ کے ناول کو بے صبری سے ختم کیا۔ خدیجہ
کی موت ایسے تو سوچا بھی نہ تھا نمروہ واقعی ایک بے حد جاندار
اور نایاب سا اضافہ ہیں۔

دیوار شب اور ستارہ شام بھی ٹھیک ٹھاک جا رہے ہیں
مگر صفحات کی کمی کی شکایت بہر حال ہے۔ مہوش افشار کے
ناول نے مزہ دیا۔ فائزہ افشار جی نام ہی کافی ہے۔ کہانی تو
آگے جا کر واضح ہوگی اور حویلی جیسے ماحول سے کچھ کھنسن
بھی ہوئی۔

اور جباب آسہ جی! اتنے سیدھے لوگ 'خاص کراتی
بھولی بیروین کہاں ملتی ہے جی؟

ایلیا یمن کا افسانہ الجھاساگا۔ "آگہی" اچھی کوشش
ہے "نمہ فکریہ" نے بھی معاشرتی دلوں کی تنگی واضح کی۔
"ملا کا موتی" بھی مختصر اچھی کوشش ہے مگر آخر میں مقصد کو
مزید واضح کرنا چاہیے تھا۔ آخر میں ایک تجویز کہ ایک ایسا
سلسلہ شروع کیا جائے جس میں عالم دین ہماری ذہنی

الجھنوں اور خواتین کے جسمانی و دیگر مسئلے مسائل کے
حل بتایا کریں جنہیں وہ جھجک کی وجہ سے دل میں دبا جاتی
ہیں۔

بیاری یلحہ! آپ یہ بتائیں، ایک افسانہ لکھ کر خاموشی
کیوں جبکہ آپ میں صلاحیت ہے اور لکھ سکتی ہیں، آسہ
جی کے ناول میں آپ نے نوٹ نہیں کیا بیروین بہت کم
عمر تھی۔ عقل بھی آتے آتے آتی ہے؟ شعاع کی پسندیدگی
کے لیے شکریہ قبول کریں۔ عالم دین کی تجویز نوٹ کر لی ہے۔

دشیقہ زمیرو اور کلثوم آصفہ نے فیض سے لکھا ہے

شعاع کے تمام سلسلے ہی بہت اچھے ہیں نمروہ احمد کے
ناول جنت کے پتے بہت زبردست ناول ہے اس میں مجھے
حیا کا کردار بہت پسند ہے اور اس کے ساتھ ستارہ شام میں
ماوی اور ثوی اور شبیہ العباس یہ تینوں میرے پسندیدہ کردار
ہیں۔

دشیقہ زمیرو اور کلثوم آصفہ! شعاع کی برسم میں خوش
آمدید۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے تمہارے دل سے شکریہ امید
ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

کوٹ مومن سے نیلم شنزادی شریک محفل ہیں، لکھا
ہے

زیست کی اونچی نیچی پگھلنڈیوں میں کچھ اس طرح سے
ابھی کہ سلجھاتے سلجھاتے ہاتھ زخمی ہو گئے ان دگرگوں
حالات میں رب لم یزل کی یاد کے بعد جو چیز سب سے

بھاری رہی وہ شعاع ہے۔ فروری، مارچ اپریل اور مئی کا
مہینہ مکملش میں گزرا، ان چار ماہ کے آٹھ رسالے
(خواتین بھی تو ہے نا...) پڑھنے میں اس قدر غرق ہوئی کہ
جون مہینہ آپہنچا۔

جس چیز نے مجھے لکھنے پر مجبور کیا۔ وہ ہے ماہنامہ شعاع
اپریل میں صفحہ نمبر 263 سلسلہ "اس ماہ کی مسکراہٹیں"
میں "جنم میں جاؤ" لطیفہ تھا۔ میری سب مسلمان بہنوں
سے گزارش ہے کہ مہینہ جہز پہ بھی ایسے لطائف سے گریز
کریں۔

دیوار شب میں جو یا مجھے بہت پسند ہے۔ مجھے تو دوسری
قسط سے یقین ہو گیا تھا کہ خیام یوسف کمال کا بیٹا ہے۔
ستارہ شام بہت بہت اچھا ہے۔ گزارش ہے کہ فائزہ افشار
سے بھی کچھ لکھوائیں (ترس گئی ہوں) خط لکھنے کی دوسری
وجہ ماہنامہ شعاع اپریل میں ممتاز افسانہ دل کی گہرائیوں میں
اترا۔ برگزیدہ ہستیوں کے نام کے ساتھ احرام کے سانچے
لاحقہ لگانا مت بھولا کریں۔

بیاری نیلم! اللہ تعالیٰ سے آپ کی بہتری اور خوش گوار
زندگی کے لیے دعا گو ہیں۔ جہاں تک زندگی کی دشواریوں
اور حالات کے گرداب کا سوال ہے تو بہت کم لوگ ہوتے
ہیں۔ جنہیں آسان زندگی ملتی ہے۔ زندگی میں خوشیاں اور
غم ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ کامیاب وہی لوگ ہوتے ہیں جو
مشکل حالات میں بہت اور حوصلہ قائم رکھتے ہیں۔

آپ کے پچھلے خط شائع نہ ہو سکے۔ اس کے لیے
معذرت۔ جن کو ماہیوں اور سمو کی نشان دہی کی ہے۔ ان کا
خیال رکھیں گے۔

زینب رانجھا، عائشہ رانجھا، اوراق رانجھا نے کنڈن

سیان ڈسکہ سے لکھا ہے

شعاع ایک ایسا استاد ہے جو نہایت عمر کی دشائستگی سے
اپنے فرائض انجام دے رہا ہے اور اس کی خوش قسمتی ہے
راکش بھی ہمیشہ بہترین ملے۔

F.M-101 سیالکوٹ کے آر جے عثمان اکبر کا انٹرویو
+ تصویر شائع کریں۔

زینب، عائشہ اور اوراق! شعاع کی پسندیدگی کے لیے
شکریہ۔ اس میں شک نہیں کہ خواتین میں لکھنے والی
تمام مصنفین ہی بہت اچھا لکھتی ہیں آپ کی فرمائش ضرور
پوری کریں گے تھوڑا انتظار کریں۔

سونیا غوری اپنے شہر کا نام لکھنا بھول گئی ہیں، لکھا ہے

شعاع ہمارے گھر میں تقریباً "دس سال سے آ رہا ہے
جب سے بھائی نے پڑھنا شروع کیا ہے باقاعدگی سے آ رہا
ہے۔ بھائی کی وجہ سے موبائل ہی موبائل، اس دفعہ آکھٹے
تین مکمل ناول؟ نمروہ جی آپ کے ناول نے ہمیں کھماکے
رکھ دیا۔ چکر اٹھ کر رکھ دیا۔ مشتعل سلسلے سب ہی پسند ہیں
خاص طور پر بیٹہ کر سیر دو جہاں کرنا بہت پسند ہے۔ ہمارے
گھر نہ کیبل ہے نہ ہی ٹیلی ویژن ہاں کپیوٹر ہے۔ جس پر
"جنوں کا" میرا مطلب ہے بھائیوں کا قبضہ ہے۔ اس لیے
شعاع گھر اور خواتین باقاعدگی سے منگواتے ہیں۔

ہاں میری کہانی کا کیا بنا؟

سونیا! شعاع بھائی کی وجہ سے آسانی اور باقاعدگی سے
مل جاتا ہے۔ یہ جان کر خوشی ہوئی۔ اس کا کریڈٹ بھی
آپ کو جانا ہے کہ آپ نے شعاع کو ان سے متعارف
کرایا۔

آپ کی کہانی وصول نہیں ہوئی۔ کب بھجوائی تھی اور

سانچہ ارتحال

مجسم تہذیب و شائستگی، خوش بیاں، معلم و ادب کا خزینہ، دانش ور، ادیب و محقق عبید اللہ بیگ اس دار فانی سے
رخصت ہو گئے۔

اللہ وانا الیہ راجعون

ان کی وفات بہت بڑا سانحہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور متعلقین کو صبر جمیل عطا
فرمائے۔ آمین

کوٹ مومن سے سعدیہ مہرین نے لکھا ہے

جون 2012ء کا خوب صورت ٹائٹل سے آراستہ شمارہ دو تارتی کو ملا۔ نمبر دیر میرے پاس الفاظ نہیں ہیں تعریف کے لیے اور نمبر کیا آپ ترکی جا چکی ہیں اس قدر ترکی کے متعلق معلومات۔

”میں بہت اکیلی ہوں۔ میرے پاس ابھی کوئی نہیں ہوائے آپ کے، میرے پاس بچانے کے لیے کوئی کھٹی نہیں ہے۔ کھٹکانے کے لیے کوئی دروازہ نہیں بلانے کے لیے کوئی زنجیر نہیں ہے۔ پہلی امید بھی آپ ہیں آخری بھی آپ ہیں۔ اگر آپ نے میری مدد نہ کی تو کوئی مدد نہیں کسے گا۔ اگر آپ نے چھین لیا تو کوئی دے نہ سکے گا اور اگر آپ دے دیں تو کوئی روک نہ سکے گا۔ آپ ہمیں ڈی جے کی زندگی دے دیں آپ ڈی جے کو ٹھیک کر دیں“

یہ وہ الفاظ تھے جنہوں نے مجھ پر نجانے کیا اثر کیا کہ میں نے خود میں جیسا سلمان کو دکھا رشتوں سے دور اللہ کی مدد کے لیے اٹھنے والے ہاتھ، میری آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

آمنہ ریاض جی آپ بھی بہت اچھا لکھ رہی ہیں باقی رائزہ موش افتخار کا ناول ”گلے ملتا ہے“ بہت اچھا تھا رباب سحر نے بھی بہت خوب صورت لکھا سنڈر بلا بھی فائزہ جی نے بہت خوب لکھا۔ آسیہ صاحبہ نے بھی خوب صورت انداز اپنایا۔

سعدیہ! آپ کا خط پڑھ کر بہت خوش ہوئی اس لیے کہ آپ ایک حساس دل اور پرکھنے والی نظر رکھتی ہیں۔ آپ نے نمبر کے جن جملوں کی تعریف کی ہے وہ بلاشبہ بہت خوب صورت ہیں۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

جزائوالہ فیصل آباد سے کوثر خالد نے لکھا ہے

بچپن میں میری تحریریں کبھی ضائع نہیں ہوئی تھیں۔ حیران ہوں مگر سوچتی ہوں کہ شاید رش بہت سے باری نیر آتی۔ رسالوں کی عاشق میں اپنا تعارف لکھ کر بھیجا

تھا۔ اگر آپ پڑھتے تو پتا چلتا کہ میں تو تبصرہ بھی نہیں بھیج سکتی کیونکہ میں تحریروں سے غای نکالنے کے لیے نہیں پڑھتی بلکہ ہر کہانی سے کوئی نہ کوئی سبق حاصل کرتی ہوں اور علم میں اضافہ۔

ج پاری کوثر! شعاع کے لیے آپ کے جذبات کی دل سے قدر کرتے ہیں۔ شعاع کی سالگرہ پر مبارک باد کے لیے آپ نے جو نظم لکھی ہے۔ معذرت خواہ ہیں شعاع کی سالگرہ پر یہ منظوم مبارک باد شائع کرنا ہمارے لیے ممکن نہیں۔ نہ ہی یہ ہماری پالیسی ہے۔ آپ شعاع کی باقاعدہ قاری ہیں۔ کیا آپ نے اس طرح کی تحریریں کبھی ہمارے رچوں میں پڑھی ہیں؟ آپ کا افسانہ بھی پڑھا۔ آپ میں لکھنے کی صلاحیت ہے لیکن کچھ اور لکھیں۔

کراچی سے مسرت الطاف احمد نے لکھا ہے

برائٹ سی دلمن دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔ اس ماہ کا ٹائٹل بہت سی شاندار تھا۔

میں نے 30 مارچ کو ایک افسانہ ”کچھ ارمان کچھ خواہشات“ کے نام سے بھیجا تھا میرے لاکھ پوچھنے پر بھی کوئی خاطر خواہ جواب نہ مل سکا۔ میری برتھ ڈے پر بھی آپ نے مجھے دش نہیں کیا کیا آپ مجھ سے ناراض ہیں۔

جہاں تک بات ہے جون کے شمارے کی تو میں یہی کہوں گی کہ اس ماہ کا شمارہ ”اے دن“ تھا مکمل ناول ٹائٹل اور ہر سلسلہ قابل تعریف تھا دیوار شب کی یہ قسط بھی پرفیکٹ تھی۔ پڑھ کر جج میں مزہ آگیا جب کہ ستارہ شام کی یہ قسط بس سو سو لگی۔ نمبر آپ نے جس طرح حیا کی بے بسی اس کا اللہ پر بھروسہ امید اور خدجہ کے لیے اس کی تڑپ دکھایا کب میری آنکھوں سے آنسو رواں ہوئے یہ تو مجھے بھی پتا نہیں چلا ”یو آر نو گڈ“ آسیہ رزائی نے اپنے اسٹائل سے ہٹ کر ہلکی پھلکی سوفٹ سی اسٹوری لکھ کر میراجی اندر تک خوش کر دیا۔ آپ کا ناول پڑھ کر اتنی خوشی ہوئی دل چاہا دھمال ڈالوں۔ خوشی کا کردار اس کے بات کرنے کا انداز سب کچھ بہت ہی زبردست تھا۔ طرز تحریر بہت ہی خوب صورت، موضوع انٹریٹنگ اور دل کو چھو لینے والا تھی۔

رباب سحر کے مکمل ناول نے جج میں دل جیت لیا تحریر نے شروع سے آخر تک اپنے سحر میں گرفتار کیا۔ آخری سطر تک پڑھنے میں دلچسپی رہی موش افتخار کا مکمل ناول پڑھ کر مزا آیا۔ فائزہ افتخار کا ناول ”اک نئی سنڈر بلا“ نام کی طرح یہ قسط بھی بہت خوب صورت تھی۔ پہلی قسط پڑھ کر آپ کے لیے واہ واہ نکلا۔

ج پاری مسرت! آپ کا خط پڑھ کر بہت افسوس ہوا بلاشبہ آپ کے ساتھ زیادتی ہوئی کہ آپ کی تحریریں کسی اور نام سے شائع ہوئیں اور کسی ماہ نام ہی غائب تھا۔ آپ یقین کریں۔ یہ سوا ہوا ہے۔

افسانے کے لیے معذرت۔ آپ محنت کر کے کچھ اور لکھیں۔

کھجڑی کراچی سے حوالی بی نے لکھا ہے

سرورق پر نظر دوڑائی۔ آہا! یہ نچ جو ککے سے کہاں سے اٹھتے ہیں۔ ہر چند کہ خط دیر سے بھجوا رہے ہیں۔ چھپنے نہ چھپنے کا خفا ہم نہیں پالتے کہ بقول شاعر۔

نہ ہوا نہ جو میرا اس نہیں کہ یہ عاشقی ہے ہوس نہیں میں ان ہی کا تھا میں ان ہی کا ہوں وہ میرے نہیں تو نہیں کبھی

ساتھ کو بھائی کی شادی کی کامیابی کے لیے دعائیں۔ یہ کیا الیہ ہے ہمارا کہ مغرب کی اندھی تھلید میں ہم بھی

اس طرح کے طے اپنانے والوں پر انتہا پسندی کا لیبل لگا کر روشن خیالی کا ثبوت دے رہے ہیں۔ آزاد خیالی کی دوز میں سبق لے جانے کی سعی میں ہم نے یہ بھی فراموش کر دیا ہے کہ یہ انداز دہلیہ، یہ وضع و قطع تو اس بے مثال اور عظیم الشان انسان اور تاریخ ساز۔ شخصیت سے منسوب ہے جو محسن انسانیت تھے۔

آمنہ بہت خوب تبصرہ کرتی ہیں۔ کہاں والی کا تبصرہ اور پھر برابر ہر ماہ ایک نئی کتاب کا تحفہ دیتی آمنہ سے گزارش کہ ازراہ کرم یہ مفرد سلسلہ قسط کا شکار مت کیجئے گا۔

شاعری اور شعاع کے ساتھ ساتھ کا سلسلہ نثارو تھا۔ شکوہ کرنا عبث ہے کہ صفحات کے سکڑنے کے عمل نے ایسے کئی دلچسپ سلسلوں کو قسط کا شکار کر دیا ہے۔

اب آتے ہیں تحریروں کی جانب عالیہ بخاری زبردست اسلام صاحب کی محبت اور خلوص بھری خواہش خیام کے دل میں ابھرتی نیکی کی ترغیب اور معاذ کی زری کے حوالے سے فکر تینوں باتوں کی تان آکر ٹوٹی ہے یہاں۔ جی ہاں یقیناً آپ بھی جان گئے ہوں گے خیام اور زری زری اور خیام۔

معذرت کے ساتھ ایک منظر میں زری کی کیفیت بیان کرتے ہوئے اس نے معاذ کے لیے پوجا کا لفظ استعمال کیا تھا۔ براہ کرم ایسے لفظ ایڈٹ کر دیا کریں۔ محبت کی بھی کچھ حدود ہوتی ہیں۔

سانحہ ارتحال

معروف افسانہ نگار بمن اختر بیگانہ اس دار فانی کو الوداع کہہ گئیں۔

اللہ وانا الیہ راجعون

اختر بیگانہ بے حد محبت کرنے والی، مہشوق اور پر خلوص خاتون تھیں۔ ادارہ خواتین ڈائجسٹ سے دیرینہ وابستگی تھی۔

وہ مصنفین جنہوں نے خواتین ڈائجسٹ کی ابتدا سے ہی لکھا ان میں اختر بیگانہ کا نام بھی شامل ہے۔ ان کی کہانیوں کے دو مجموعے ”زندگی کی راہ میں“ اور ”مرکبانی“ شائع ہو چکے ہیں۔ شاعری کا مجموعہ زیر طبع ہے۔

اختر بیگانہ کی وفات ایک بڑا سانحہ ہے۔ ادارہ خواتین ڈائجسٹ ان کے متعلقین کے غم میں برابر کا شریک ہے اور دعا گو ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحومہ کو خشت الفردوس میں اعلا مقام سے نوازے اور متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے آمین۔

سوری نوے۔ آمنہ ریاض کی تحریر میں اس بار بھی قائل تبصرہ کچھ نہ تھا۔ نمبر واحد اسرار جوں کا توں برقرار میجر احمد 'ذولی' عبدالرحمن پاشا؟؟؟ پورا ایک ماہ مزید انتظار۔ اسکی ججز بھی خوب ہوتے ہیں۔ خاص طور پر کمائی کی تہیم سے مطابقت رکھتے خاکے بہت اچھے لگتے ہیں۔ انٹرویوز میں فواد خان اور مایز کا تفصیلی انٹرویو لائیں شاہین اور ہاں ادبی شخصیات کا بھی انٹرویو کیا کریں۔ پیاری خواہ! آخر سے موصول ہونے کے باوجود خط شامل اشاعت ہے۔ ہمیں احساس ہے شعاع لیٹ ہوتا ہے تو ہماری قارئین کو کتنی تکلیف اٹھانا پڑتی ہے۔ پچھلی کمائی کے لیے معذرت۔ عید کے شمارے کے کچھ لکھیں ضروری شامل کریں گے۔

انٹرویو کی فرمائش نوٹ کر لی ہے۔ ان شاء اللہ جلدی پوری کریں گے۔

ماریہ عابد یعنی عابد اور مریم عابد نے صادق آباد سے شرکت کی ہے لکھتی ہیں

"دیوار شب" بہت سلو چل رہی ہے۔ پلیز تھوڑا تیز کریں اور جو یا کو اب بغاوت کر دینی چاہیے۔ آمنہ ریاض کا ناول "ستارہ شام" اس کا نام مجھے پسند ہے۔ یہ صحیح جا رہی ہے مطلب نہ سلونہ بہت تیز۔ سب سے آخر میں رسالہ کی جان۔ وہ ہے نمبر واحد کا ناول "جنت کے پتے" نمبر واحد کی تعریف کس طرح کروں ان کے ہی ناول ہوتے ہیں جن میں میں پہلے سے کوئی اندازہ نہیں لگا سکتی۔ کردار نگاری زبردست ہوتی ہے۔ کچھ فرمائش کرنا تھی۔ پلیز پلیز علی ظفر کا انٹرویو کریں اور کسی بڑے رائٹر کا بھی۔ ایک کمائی پڑھی تھی شاید نایاب جیلانی کی تھی اس میں ہیروئن کا نام عنوہ تھا تو پلیز نایاب آپ یا کسی نے وہ کمائی پڑھی ہو اور اسے مطلب پتہ ہو تو بتا دے۔

ج ماریہ یعنی اور مریم نایاب جیلانی کی کمائی تھی جس میں ہیروئن کا نام عنوہ تھا۔ عنوہ کے معنی ہیں۔ دوستی رفاقت۔ خالہ بننے پر ہماری جانب سے مبارک باد۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

عمیرہ غفور نے صدیق آباد (موڑ کھنڈا) تحصیل و ضلع نکانہ صاحب سے لکھا ہے

شعاع مجھے بے حد عزیز ہے۔ شعاع سے میں نے بہت کچھ سیکھا معاف کرنے کا وصف سمجھنے کی ہمت، تکلیف سنے کا حوصلہ سب کچھ بھلا کر آگے بڑھنے کا جذبہ اور زندگی کو ہر زاویے سے دیکھنے کا فن۔

میں پنجاب کے ایک چھوٹے سے گاؤں صدیق آباد کی رہنے والی ہوں۔ جہاں زندگی کی بنیادی سہولتیں بھی میسر نہیں۔ حتیٰ کہ پینے کے لیے صاف پانی بھی میسر نہیں ہے۔ لڑکیوں کا اسکول ملل تک اور لڑکوں کا پرائمری تک۔ اتنی کم سہولتوں کے باوجود یہاں کے لوگوں میں خلوص، مروت، بھائی چارہ اور مہمان نوازی بہت ہے۔

سب سے پہلے ٹائٹل گرل آف اتنی گرمی ورنی ڈریس اتنی جیولری اور میک اپ۔ دیوار شب آپ کو کیا بتاؤں کتنی خوشی ہوئی اپنے اندازوں کی تصدیق پر اور "ستارہ شام" میں مادی کا انداز بہت اچھا لگا اور جنت کے پتے بہت سی الجھنیں دور ہوئیں اور بہت افسوس ہوا ڈی جے کی موت کا۔ واقعی موت ہمارے تعاقب میں ہے کب زندگی ختم ہو جائے پتہ ہی نہیں۔ ناول روشنی کے جگنو آسیہ رزاقی کا بہت اچھا تھا۔

"اک نئی سنڈرلٹا" فاترہ افتخار کا نام پڑھ کر ہی بہت خوش ہوئی تھی۔

افسانے سب ٹھیک تھے۔ عظمیٰ محمود کا "لمحہ فکر" بہت اچھا تھا۔ مستقل سلسلے سیر دو جہاں میں رحیم گل کی جنت کی تلاش پڑھ کر بھی اپنی کتاب یاد آتی رحیم گل کی جنت کی تلاش میری ایک دوست نے ہتھیالی ہے جو کہ واپس کرنے کا نام ہی نہیں لے رہی ہے ہو سکتا ہے اب نام دیکھ کر ہی واپس کر دے۔

ج ماریہ عابد! شعاع کی بزم میں خوش آمدید اور دعا میں آپ ہمارا شکریہ اپنی چھوٹی بہن تک پہنچا دیں کہ ان کے کہنے پر آپ نے ہمیں خط لکھا۔ انسان کو کسی بھی کام کو یہ سوچ کر نہیں چھوڑنا چاہیے کہ اس میں ناکامی ہو گی۔ کسی کام کو کر کے ناکام ہو جانا بہتر ہے بجائے اس کے کہ سرے سے کام کیا ہی نہ جائے۔ اب ہمیں باقاعدگی سے خط لکھتی رہیے گا۔ اگر آپ کا خط شائع نہ ہو سکا تب بھی ہم آپ کی رائے سے تو آگاہ رہیں گے۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے تمہ دل سے شکریہ۔

کائنات عابد فیصل آباد سے لکھتی ہیں

سرورق پر وجود مائل کا انداز اچھا لگا۔ جس چیز نے مجھے خط لکھنے پر مجبور کیا وہ نمبر واحد کا "جنت کے پتے" تھا اس دفعہ کی قسط بہت اچھی تھی جیسا، دعا مانگنا ہی تھا جس نے مجھے رونے پر مجبور کر دیا اس وقت جب وہ ڈی جے کی زندگی کی دعا کر رہی تھی۔ اس کا دعا مانگنے کا انداز بہت اچھا لگا۔ اس کے علاوہ "ستارہ شام" بھی اچھا تھا افسانوں میں مجھے "اجالا ہونے کو ہے" بہت پسند آیا۔ ناول دونوں اچھے تھے۔ فاترہ افتخار کے ناول کا بے چینی سے انتظار رہے گا۔ مسکرائیں تو مجھے بیشہ سے اچھی لگتی ہیں۔ "باتوں سے خوشبو آئے" میرا فیورٹ سلسلہ ہے۔

موش افتخار اور رباب سحر کے ناول کے بارے میں تو میں بھول ہی گئی۔ رباب سحر کا ناول بہت اچھا تھا۔ پیاری کائنات! شعاع کی بزم میں خوش آمدید متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

نوال افضل گھمن گجرات سے شریک محفل ہیں

پہلی مرتبہ شعاع 2000ء میں خریدی تھا۔ شعاع کی جائے بدائش سے یعنی کراچی سے ہی تب رخصانہ جی کی خوشبو کا گھر کی پہلی قسط تھی۔ پھر کسی نشنی کی طرح ایسا چسکا لگا کہ بس آج تک جان پھنسی ہوئی ہے پھر رفتہ رفتہ خواتین اور کرن بھی خریدنا شروع کر دیا۔ گھر میں کوئی پابندی نہیں۔ ڈائجسٹ یقیناً ایک اچھے رہبر کی طرح کام سرانجام دے رہے ہیں۔ بس اتنی ہی گزارش ہے کہ ہماری رائٹرز اپنے ناولوں۔ افسانوں اور اسٹوریز میں انگلش ورڈز کی بھراور استعمال ذرا کم کیا کریں ہماری قومی زبان کوئی گوئی زبان نہیں کہ ہم سمجھ نہ سکیں۔ میری بات اگر بری لگی تو معذرت خواہ ہوں حالانکہ میں خود بھی

انگریزی ادب میں ماسٹرز کر رہی ہوں۔ جامعہ پنجاب نیو کمپس لاہور سے۔

ج نوال جی! کسی بھی کردار کی صحیح عکاسی کرنے اور اسے پورے طور پر واضح کرنے کے لیے ضروری ہے کہ کردار وہی زبان بولے جس طبقے اور ماحول سے اس کا تعلق ہے انگلش الفاظ کا استعمال ضروری ہو تب ہی کیا جاتا ہے ورنہ بلا ضرورت انگلش الفاظ کی بھراور ہمیں بھی پسند نہیں۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

شائستہ کرن راجپوت نے جینیوٹ سے شرکت کی ہے لکھتی ہیں

شعاع خواتین اور کرن کے ٹائٹل بہت خوب صورت ہوتے ہیں۔ میں شعاع اور خواتین ہر ماہ خرید کر پڑھتی ہوں۔ ہر ماہ کرن نہیں خرید سکتی اس لیے پاپا سے خرید کر پڑھ لیتی ہوں ان تینوں شماروں کا ہر سلسلہ زبردست ہے کسی چیز کی کمی نہیں ہے میری آلی صرف انٹرویوز پڑھتی ہیں میں نے F.M-94 کے عتیق الرحمان جینی کے انٹرویو کی فرمائش کی تھی پلیز پوری کر دیں۔ جمع تصویر کے۔

پیاری شائستہ! ہمارے ادارے سے شائع ہونے والے تینوں پرچے آپ کو پسند ہیں یہ جان کر بہت خوشی ہوئی۔ آپ کی فرمائش نوٹ کر لی ہے جلد پوری کرنے کی کوشش کریں گے۔

افراہ ڈی جی خان سے شریک محفل ہیں لکھا ہے

میں پہلی مرتبہ کسی ادارے کو خط لکھ رہی ہوں۔ سو تھوڑی گھبراہٹ ہوئی ہوں۔ بابا جان شعاع و خواتین نہیں بڑھنے دیتے حالانکہ انہوں نے خود کما تھا کہ 9th کلاس کے بعد پڑھنا۔ لیکن انہیں کون سمجھائے گی؟ شعاع اور

دعائے صحت

صوفیہ امجد کی ہمیشہ شدید علالت کا شکار ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے ان کے مرض کو رفع کرے اور انہیں شفا ملے علی عطا فرمائے۔ (آمین)

قارئین سے دعائے صحت کی درخواست ہے۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام آپکو تمام ڈائجسٹ

ڈائریکٹ ڈاؤنلوڈنگ لنک کے ساتھ

ڈاؤنلوڈ کرنے کی سہولت دیتا ہے

آج ہی وزٹ کریں

www.paksociety.com

آل جون کا پورا شمارہ بہت زبردست رہا۔ آپ کی کنیز نبوی کیوں اشتہاری ہو گئی ہیں؟ انہیں کہیے کہ اب لوٹ آئیں۔ سندھ دھرتی کو اندر تک محسوس کرنے کو دل بے قرار ہے کہ اب انتظار بھی نہیں ہوتا۔ پلیز کنیز نبوی جی پلیز قلم اٹھائیے اور اک نئی عشق کی داستان ”شاہ معنائی“ کے بیت اور جینجی کی نصب حنین لکھ ڈالیے۔ پلیز۔

جج کوثر، مریم اور سائرہ! آپ کی فرمائش پر کنیز نبوی کی تحریر شامل اشاعت ہے۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ کتابوں کے لیے آپ مکتبہ عمران ڈائجسٹ کو فون کریں۔ نمبر یہ ہے 021-32216361

شاملہ کرن توشین کنول قانزہ جیس اور ندا کلکیل بوہڑی والا موہڑہ نکل سے شریک محفل ہیں۔ لکھا ہے

سب سے پہلے حمد باری تعالیٰ اور نعت رسول کریم پر مبنی دیوار شب کی 52 قسط پر مبنی۔ ٹاڈل خوب سے خوب تر ہوتا جا رہا ہے۔ اجالا ہونے کو ہے اور آگہی بھی اچھی تحریریں تھیں۔ لمحہ فکر یہ اور اک نئی سنڈریلا بھی اچھی کمائیاں تھیں مالا کاموتی بھی خوب تر تھی۔ ٹاڈل زندگی موسم اور خوشبو بھی اپنی خوشبو کی طرح پھول بکھیرتا ہوا ملا۔ آسیہ رزاقی کا ٹاڈل ردیسی کے جگنو بھی اپنی مثال آپ تھا۔ ماہ جون کا شعاع اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ خوب سے خوب تر تھا۔

جج شاملہ ”توشین“ قانزہ اور سائرہ! آپ لوگوں نے خط لکھا بہت خوشی ہوئی۔ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچانی جا رہی ہے۔



خواتین میرے فیورٹ رسالے ہیں۔ پہلی مکمل تحریر میں نے ”نمرواحمد کی“ ”مصنف“ ”پڑھی۔ تب سے باقاعدگی سے پڑھتی ہوں رکھ والوں سے چھپ کر (بھئی اجازت جو نہیں پڑھنے کی) ”پلیز“ ”ستارہ شام“ کے صفحات بڑھا دیں۔ بہت کم صفحات ہوتے ہیں پڑھنے میں مزا نہیں آتا حالانکہ اچھی تحریر ہے۔

نیکم منیر، احسن خان اور نیوز کا سرشار مرزا ان میں سے کسی کا انٹرویو ضرور شائع کریں۔

افزا! گھبرانے کی تو بات ہی نہیں ہے، ہم آپ کے اپنے ہی تو ہیں۔ شعاع اور خواتین آپ اپنے گھر والوں کو پڑھنے کو دیں یا انہیں اس کے سلسلوں کی تحریریں پڑھ کر سنائیں پھر وہ آپ منع نہیں کریں گے۔ انٹرویو کی فرمائش ضرور پوری کریں گے۔ تمہارا انتظار کر لیں۔

مسز کوثر منیر، مریم منیر احمد اور سائرہ منیر احمد نے لاہور سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

ڈائجسٹ ملتے ہی فوراً ”نمرواحمد کی“ کا ٹاڈل نکالا اور بیٹھ گئے کوٹا سنبھل کر۔ حیار بہت غصہ آیا، کچھ بھی ہو، جہان کے بھلے کے لیے سہی چاہے لیکن اسے عبدالرحمن پاشا سے رابطہ نہیں کرنا چاہیے تھا اور یہ کیا کیا نمرانجی آپ نے۔ ڈی جے کی ڈبہ۔ لگا تو تھا کہ سرور کے پیچھے بھی کچھ بات ہے مگر اس اچانک موت نے ہمیں ہلا کر رکھ دیا۔ ”دیوار

شب“ بہت زبردست جا رہا ہے۔ عالیہ جی کا زری کے لیے راجو کا فیصلہ دل کو چھو گیا (مزا آگیا) شاگ کا اس دعوت سے اٹھ کر جانا اس بات کا ثبوت ہے کہ اب جویا کے بھی دن پھر گئے ”ستارہ شام“ بورنگ ہو گیا ہے اور دوسری شکایت یہ کہ کمائی شروع ہوتے ہی ختم ہو جاتی ہے تو پلیز صفحات میں اضافہ کیجئے۔ ”نئی سنڈریلا“ کی دوسری قسط کا انتظار ہے۔ ”گلے ملتا ہے خواب کوئی“ ”اف موش انتظار نے کن موتیوں کو لفظوں میں پرویا ہے ”زندگی موسم اور خوشبو“ ”مچی کاوش تھی۔ ”ردیسی کے جگنو“ ”آسیہ جی نے اچھا لکھا۔ آمنہ زریں سے کوئی ٹاڈل بھی لکھو امیں۔ اور

ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ اور ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے رجسٹرڈ ماہنامہ شعل میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بھی ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی ڈی جی جیکل۔ ڈراما ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پبلشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ صورت دیگر لوانہ قانونی کارروائی کا حق رکھتا ہے۔



خیام کا تعلق اس دنیا سے ہے جہاں دن سوتے اور راتیں جاگتی ہیں۔ ستارہ نانی، نگینہ خالا اور دلدادہ نانی نے اس کی پرورش بے مدنازد و نعم سے کی ہے۔ پھر بھی وہ اس زندگی سے سخت کبیدہ خاطر ہے۔ جتنی کہ ایک دن وہ اس گھر سے کسی کو تلے بغیر نکل آتا ہے۔ راستے میں اس کا نگر اوٹا مالا لڑنے ہوتا ہے جس سے اس کی شناسائی ہے، جو بد پر کام کر رہا ہے۔ سالہ تمام معاطرفی انور کچھ جاتا ہے۔ گھر سے نکلے ہوئے خیام رقم کے علاوہ نانی کے زیورات بھی اٹھا لاتا ہے، جس پر اسے کوئی پشیمانی نہیں ہے۔ سالہ لالی افسانے تک خیام کو جھوٹا ہے۔ خیام کے لیے سالہ لالی جہاں کس ہے۔ شہر کا رستہ کئی روز تک بے روزگار رہنا پڑتا ہے۔ وہ بالوشوکت کے ہوٹل میں قیام کر رہا ہے۔ زیورات کے ساتھ گئی آرا کی پڑیل دیکھ کر خیام کو شدید جھٹکا لگتا ہے اور پہلی مرتبہ اپنے پیچھے رہ جانے والی کا بھر دسا ٹوٹ جلتے کا ٹکڑا ہوتا ہے۔

ریو کا تعلق سفید پوش خاندان سے ہے۔ اس کے والد سرکاری محکمے کے ایمان دار میڈیکرک ہیں جبکہ جانی معاذ بالکل بابا پروردہ کی بہنوں میں وہ ہر چیز بھولے رکھتا ہے۔ جتنی کہ اپنی پڑھائی بھی۔ اماں اور دادی ہر دم معاذ اور ریو کے لیے دعا گو ہیں۔

دوسرا گھرانہ انبار چھا کا ہے جو ظاہری نمود و نمائش اور بے کوسب کچھ سمجھتے ہیں۔ سرکاری محکمے میں کرک، ہوسٹ کے باوجود وہ اوپر کی کمائی سے اتنا خاصا کمایکے ہیں۔ خاندان بھر میں ان کی امارت کی دھوم ہے۔ بچپن میں ریو نے بیٹے سلمان کی نسبت ریو کی جاک جاک بات معاذ سے ملے ہوئی تھی لیکن بدلے حالات نے اس فیصلے پر ناک ڈال دی ہے۔ چلنے سلمان کی منگنی شہر کے مقبول بزنس میں یوسف کمال کی بیٹی زویہ کمال سے کر دی، جس پر سب کو صدمہ ہوتا ہے۔ ریو اس اقدام پر نسبتاً مطمئن ہے۔ جو یا اور معاذ دل ہی دل میں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں لیکن حالات موافق نہیں ہیں۔

قسط ۵۳



خود پر جی نیل کی مذاق اڑاتی نگاہ گلناز کو کانٹے کی طرح چبھی تھی۔
 ”برامت ماننا گلناز بیگم! عزت دار، خاندانی۔ ایسا لہلہا ہوا شخص، جب پہلی بار بیوی کا انتخاب کرتا ہے تو اس کی ترجیح کچھ اور ہوتی ہے۔ یہاں تک تو وہ بعد میں آتا ہے، منہ کا مزہ بدلنے کے لیے گھر میں بیٹھی تنگ دل، بد شکل، بد مزاج عورت سے نفرت ہونے کے بعد۔“

اس کی زبان لڑکھارہی تھی۔
 وہ اپنی برداشت سے زیادہ پیچکا تھا۔ مگر ابھی تک ہوش میں تھا اور ٹھیک اپنی اوقات کے مطابق ہی باتیں کر رہا تھا۔
 ”یہاں آکر کسی کے بھی عشق میں مبتلا ہو جانا انوکھی بات نہیں ہے، بلکہ اگر کوئی تمہیں دیکھ کر بھی تمہارا دیوانہ نہ ہو وہ حیرت کی بھی بات ہے اور بے عزتی کی بھی۔ کیوں؟ ٹھیک کہنا!“
 وہ گلناز کی طرف اتنا جھکا کہ اسے سرک کر بیٹھنا پڑا۔
 ”بد ذات کہنے!“ ابھی تازہ دیے گئے لاکھوں کے تحائف کا ذرا سا لحاظ تھا اور نہ وہ اسے باہر کا راستہ دکھانے میں دیر کرنے والی نہیں تھی۔

”نصیب کی بات ہے سب اپنی جگہ آپ بھی ٹھیک ہیں لیکن جو میں نے کہا وہ بھی غلط نہیں، میری بھانجی کیتی آرا پورے عزت اور وقار کے ساتھ رخصت ہوئی ہے اور وہ اپنے میاں کی دوسری، تیسری، چوتھی بیوی نہیں، پہلی محبت ہے۔ نکاح کی تصدیق آپ مسجد کے امام صاحب سے کر سکتے ہیں۔ کیتی آرا کا نکاح انہوں نے پڑھایا تھا۔“

”کیتی آرا!“ وہ زیر لب نام لیتے ہوئے مسکرا دیا۔ ”بہت خوب صورت نام ہے۔“
 ”وہ خود بھی بہت خوب صورت ہے!“ گل نااز نے پہلی بار اپنی کسی بھانجی کے حسن کی تعریف اپنے ہاں آئے ہوئے مہمان سے کی۔

”ضرور ہوگی۔ اس نام کی لڑکیاں خوب صورت ہی ہوتی ہیں۔“ نیل کے لہجے میں حسرت سی اتری، گل نااز نے کچھ حیرت سے اس کی کم ہوتی مسکراہٹ کو محسوس کیا۔

”اور یقیناً“ اس کا شوہر بہت ہی معمولی شکل کا ہو گا نہ گوری رنگت، نہ قد اور نہ مردانہ وجاہت۔ بابا!“ اپنی دانست میں اس نے اپنی خوبیاں گنوائی تھیں۔ مگر گل نااز اب مزید متاثر ہونے کے موڈ میں نہیں تھی۔ نیل کے انداز الفاظ، رویہ سب ہی کچھ ایک قرض سا چڑھاتے جا رہے تھے جسے بروقت نہ چکاٹی تو دونوں ہفتوں کی بے سکونی مول لیتی پڑتی۔

”خوب صورتی تو عورتوں کا دمف ہے نیل صاحب! مرد کی شان تو اس کی بہادری، وقار اور قول کا پکا ہونے میں ہوتی ہے، خالی خوبی باتیں بنانے والے مرد تو مرد کہلانے کے لائق ہی نہیں ہوتے، نرے ذہول کا پول۔“ اپنی بات اور دھڑکی چھوڑ کر وہ جس حقارت سے ہنسی تھی، نیل کو اپنی پیشانی چھکتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔
 محلے کے سب سے اونچے چوہارے پر بیٹھی سونے کے زیورات سے لدی ہوئی گلناز کے پاس اظہارِ فخر کے لیے ابھی کچھ اور بھی باقی تھا۔

”اور سالار جیسا بادمف تو ہزاروں لاکھوں میں ایک ہی ہوتا ہے، بڑا پیسے والا اور نخی کراچی کا ہی ہے، آپ تو جانتے ہی ہوں گے ضرور!“
 اور وہ یقیناً ”جانتا تھا۔“
 کیتی، سالار۔

سالار، کیتی۔

ان دونوں ناموں کا ساتھ ساتھ ہونا اب حیرت کی بات کہاں رہ گئی تھی پھر بھی وہ چند لمحے کچھ بولنے کے قابل نہ رہا۔

گلناز نے اس کے چہرے کے اترے ہوئے رنگ کو اپنی فتح جان کر دل ہی دل میں خود کو شاباش دی۔ یقیناً ”سالار کی پوزیشن سے واقف ہے، تب ہی چہرے کا رنگ اڑا ہے۔“

”میں نے کہا تھا کہ آپ ضرور جانتے ہوں گے۔“ وہ کھلکھلا کر ہنسی۔
 ”نہیں! میں نہیں جانتا!“ نیل کا لہجہ کھردرا تھا اور آواز قدرے اونچی۔ گلناز نے حیرت سے اسے اٹھ کر کھڑا ہوتے دیکھا۔

”مجھے کچھ ضروری کام ہے۔ پھر کسی وقت آؤں گا۔“ وہ اتنی جلدی میں تھا کہ اس نے الماس سے الوداع لینے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔

”شکر جو بلا ٹلی!“ بظاہر بڑے تپاک سے اسے رخصت کرتے ہوئے گلناز نے سکون کی گہری سانس لی اور واپس پلٹ آئی۔

ایکین آباد والی سرکار پرانی کرم فرما تھی۔
 ”لاکھوں لٹا دیا، مگر کبھی منہ پر نہ لائے اور یہ نوڈ لٹیا اس جیسے کتنے آئے اور گئے۔“ اس نے بیزاری سے سر جھٹکا اور بڑے ہال سے گزرتی ہوئی اندر چلی گئی۔

میٹھیوں پر سے تیزی سے اترتا ہوا نیل ابھی تک شاک میں تھا۔
 اس کے ذرا نیور نے اسے خلاف توقع جلدی آتے دیکھ کر کچھ عجیب سا تو محسوس کیا تھا، مگر سارا دے کر اسے گاڑی کی پچھلی سیٹ پر لا کر ڈالنے میں اس نے دیر بھی نہیں کی تھی۔

گاڑی کیس سے تنگ اور کیس سے کشادہ ہوتی اس گلی سے نکلتی چلی گئی۔
 ”سو اس حسن بے مثال کا سراپا یہاں سے جڑا تھا۔“ پچھلی سیٹ پر نیم دراز نیل کا ذہن پوری طرح بیدار ہو رہا تھا۔

”اور میں کتنا بڑا احمق جو یہ بھی نہ سمجھ سکا کہ اس آوارہ گرد، معمولی شکل والے سالار کو، جسے کوئی لڑکی شاید ہی توجہ کے قابل سمجھتی، یہ سبز بری اور کہاں سے ملنی تھی بابا!“ اس نے پہلے اپنی کم عقلی پر افسوس کیا اور پھر اس معاملہ کے حل ہو جانے کی خوشی میں مبتلا ہوا۔

”سو ثابت ہوا کہ وہ دوپار سائی کے بڑے دعوے دار ہیں، وہ بھی اسی گلی کے مہمان ہیں اور مہمان بھی کیا خریدار، نہ مانگی ادائیگی پر بیش قیمت ہیرے کا مالک بن بیٹھا۔“

اس نے بیک وقت سالار پر رشک اور حسد محسوس کیا تھا۔
 ایک بار پھر اس کا موبائل بج رہا تھا۔ زر تاج یوں ہی منٹ منٹ پریشان کرتی تھی۔

”نیل!“ اب کیسی طبیعت ہے تمہاری؟“
 ”بہتر ہوں پہلے سے۔“ وہ اس کے مروت نبھانے پر ابھی حیران ہی ہوا تھا کہ ”دوسرا الحمد واپس حقیقت کی دنیا میں لے آیا۔“

”ایسا کرو، کسی ڈاکٹر سے میڈیکل سرٹیفکیٹ نہ والو، کسی ایسی بیماری کا جس میں تمہنی الحال چلنے پھرنے کے قابل نہ ہو، شدید بیماری کا عذر عدالت میں پیش ہو جائے گا تو تمہاری غیر حاضری کی وجہ مل جائے گی۔ کوئی فاج کا انیک

وغیرہ۔“ بے تاثر سے لہجے میں وہ جس طرح تیز تیز بول رہی تھی اس میں کسی بھی طرح کی ہلکی سی بھی اپنائیت کا شائبہ نہیں تھا۔

”جسمانی بیماری ذہنی عارضہ میں نے بھی کسی سے کہا ہے کہ وہ تمہارے لیے ذہنی بیماری کے کچھ ثبوت پرانی تاریخوں کے بنادے۔ ایک نہ پاگل شخص کو خاصی رعایت مل جاتی ہے ہماری عدالتوں سے۔“

اگر آج وہ اس کے سامنے ہوتی تو شاید پہلی بار وہ اس کے منہ پر زور سے پھڑپھڑانے کی آواز کو پورا کر رہی لیتا۔ غصہ کی ایک تند لہر نے نیل کو اپنی پیٹ میں لیا۔

”ہیلو۔ ہیلو!“ دوسری طرف سے زرتاج اس کی مستقل خاموشی سے گھبرا کر پار رہی تھی سوہ بمشکل ہی خود پر قابو پاسکا تھا۔

”تمہیں بھاگ دوڑ کی ضرورت نہیں ہے زرتاج! میں آ رہا ہوں اور میں دیکھ لوں گا کہ کیا کرتا ہے کیا نہیں۔“

ذہنی معذوری کے سرٹیفکیٹ تم ضرور لو مگر کم از کم میرے لیے نہیں۔“

اپنی بات ختم کر کے اس نے فون منقطع کیا اور ساتھ ہی آف بھی۔ وہ پوری تسلی کے ساتھ کچھ سوچتا چاہتا تھا جس میں کسی کی شراکت گوارا نہیں تھی۔ یہ ٹرمپ کارڈ جو آج اتفاقاً ہی ہاتھ لگا تھا کام کی چیز تھا اگر عقل سے استعمال کیا جاتا اس کا شاطر دماغ بہت تیزی کے ساتھ چل رہا تھا۔ اور اس بار پھر وہ زرتاج کو ٹھنک بھی دینے والا نہیں تھا۔



کئی دن کی بولا دینے والی گرمی کے بعد رات کے پچھلے پہر کھل کر بارش برسی تھی۔

صبح ہر شے کیلی کیلی اور ہوا مٹی اور سبزے کی مٹک سے بوجھل۔

معاذ نے گیٹ کے اندر قدم رکھتے ہی اسے دیکھ لیا تھا۔ وہ برآمدے کے آگے نکلے سرخ کھیرل کے شیڈ کے نیچے بیٹھا ڈک ڈک کر قطرہ قطرہ کرتے بارش کی پانی کو بہت انہماک سے دیکھ رہا تھا۔

اسکول کی نئی عمارت میں منتقل ہونے کے درمیان کے ان چند دنوں میں کچھ اور کام توجہ طلب تھے۔ سو آج کل پڑھنے پڑھانے کا سلسلہ وقتی طور پر رکا ہوا تھا۔

معاذ نے خیام کی افسردگی اور شنائی پسندی کو ان دنوں میں ہی بار بار نوٹ کیا تھا۔ اس وقت بھی وہ پتا نہیں کہاں تھا؟

معاذ بے آواز قدموں سے چلتا ہوا اس کے پیچھے جا کھڑا ہوا۔ تب ہی کچھ احساس ہونے پر اس نے پلٹ کر دیکھا تھا۔

”آپ!“ وہ اٹھ کر کھڑا ہونے لگا تھا مگر وہ منع کرتے ہوئے خود بھی قریب پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔

”کیا ہو رہا تھا؟“

”کچھ نہیں ہنس ایسے ہی۔“ جھنجھکی ہوئی سی مسکراہٹ خیام کے چہرے پر آئی۔

معاذ نے ایک خاموش سی نگاہ اس پر ڈالی۔

پرانی سی جینز کے ساتھ سفید ٹی شرٹ پہنے اس سرخ کھیرل کے نیچے بیٹھا ہوا وہ اتنا خاص لگ رہا تھا جیسے کوئی بہت پسندیدہ رومانٹک ہیرو۔

”خیام! تم نے شو بڑیوں نہیں جوائن کیا مذاق نہیں سیرسلی کہہ رہا ہوں اتنے خوب صورت لڑکے ایسی پرسنالٹی کہاں دیکھنے کو ملتی ہے ہماری فلموں میں۔ یہاں تو سنا ہے ابھی بھی۔“

”مجھے نہیں پسند یہ فلموں و لموں کا چکر یہ بھی کوئی کام ہے بھلا۔“ بڑی تیزی سے اس نے معاذ کی بات کاٹی تھی۔

”کیوں برائی کی کیا بات ہے باقاعدہ پروفیشن بن گیا اب تو مجھے گھروں کے لڑکے لڑکیاں فنی وی میں آرہے ہیں اکیڈمیاں کھل رہی ہیں۔ کم سہی اچھی فلمیں بھی بننا شروع تو ہوئی ہیں۔ میرے ایک دو اچھے جاننے والے ہیں۔“

”کو تو بات کروں کسی فنی وی سیریل کے لیے۔“

اس بار خیام نے باقاعدہ ہاتھ جوڑے تھے اس کے آگے۔

”پلیز معاذ بھائی!“ اس کے چہرے پر اتنی بے جا رنگی تھی کہ معاذ مسکرا بھی نہ سکا۔

”پتا نہیں کیا ہے جو اس پیارے سے لڑکے کو کھل کر جینے نہیں دیتا۔“ معاذ نے اضطراب سے پہلو بدلا۔

”مصیبت یہ تھی کہ کچھ بھی نہ پوچھنے کا وعدہ ابتدا میں ہی ہو چکا تھا بمصورت دیگر وہ یہاں سے فوراً جاسکتا تھا۔“

گو اب اس کے یہاں سے جانے کا خطرہ نہ ہونے کے برابر ہی تھا مگر معاذ کو اپنے وعدے کا احترام تھا۔

”چند دن رہ گئے ہیں اسکول کی ادھننگ میں ایک دم ہی مصروفیت برپا ہو جائے گی تمہاری پھر اس طرح خالی بیٹھنے کی مصلحت بھی نہیں ملے گی تمہیں۔“

”اچھا ہے بلکہ بہت ہی اچھا ہے!“ خیام اس بار مسکرایا تھا۔

”اچھا وہ تم ساجد کی امی کو کہہ آئے تھے کہ وہ زری کے نکاح میں ضرور آجائیں۔ ان کا آنا بہت ضروری ہے۔“

وہ ان لوگوں کی بہت قریبی محلے دار رہی ہیں۔“ معاذ کو یاد آیا۔

”وہ ضرور آئیں گی معاذ بھائی! میں انہیں کہہ آیا تھا اور سعیدہ بھابی نے بھی انہیں فون کر دیا تھا سکھر سے۔“

”اللہ کرے یہ کام بھی خیریت سے ہو جائے۔ مجھے زری کی طرف سے بڑی فکر ہے خیام! بے سوچے سمجھے بہت سے کام کر لیتا ہوں لیکن زری کی ذمہ داری نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ اب سوچتا ہوں تو امی کی مخالفت کی وجہ سمجھ میں آتی ہے۔“

”لڑکیاں تو بھوتی ہی مصیبت ہیں معاذ بھائی! آزمائش شرمندگی خوف سب میں ان ہی کی وجہ سے جھٹا ہونا پڑتا ہے انسان کو۔“ وہ دھیمے لہجے میں بے ساختہ کہہ اٹھا۔

معاذ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا وہ سامنے ہاتھ پھیلائے کھیرل سے گرتے پانی کے قطروں کو اپنی ہتھیلی پر جمع کر رہا تھا۔ اور ذاتی زندگی کے بارے میں یہ پہلا خیال تھا جس کا اس نے اظہار کیا تھا۔

”ایسا نہیں ہے خیام! عورت کا رتبہ تو بہت بلند ہے دنیا میں محبت کی سب سے مضبوط علامت قربانی دینے کا وصف اللہ نے ان ہی میں رکھا ہے۔ زندگی کو گزارنے کے سلیقہ وہ ہی دیتی ہیں مرد کو درس۔“

”مجھے نہیں لگتا۔“ اس نے تیزی سے معاذ کی بات کاٹی اور ہاتھ میں جمع شدہ پانی کو جھٹک کر نیچے گرایا۔

”جس چیز کو آپ محبت کہتے ہیں وہ صرف ان کی مجبوری ہوتی ہے انہیں پتا ہوتا ہے کہ وہ سوسائٹی میں اکیلی نہیں رہ سکتیں اسی لیے وہ مرد چاہے کوئی بھی ہو باپ بھائی شوہر بیٹا یا پھر کوئی اور۔ کسی کو بھی پکڑے رکھتی ہیں جب تک دیہائی دوسرا سہارا نہیں ڈھونڈ لیتیں۔ اب آپ اس خود غرضی کو محبت کا نام دیتے ہیں تو آپ کی مرضی یہ ایک سخی مسکراہٹ کے ساتھ اس نے اپنی بات کو ادھورا چھوڑا۔

”میں آپ کے لیے چائے بنا کر لاتا ہوں۔“ وہ اٹھ کر کھڑا ہوا ”کچھ کھائیں تو میں سامنے سے جا کر لے آتا ہوں۔“

نئی میں سر ہلاتے ہوئے معاذ نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔

خیام کے چہرے پر سرخی سی پھیلی تھی اور اس کی آنکھوں میں ہمہ وقت ٹھہری اداسی اور بھی گہری۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام آپکو تمام ڈائجسٹ

ڈائریکٹ ڈاؤنلوڈنگ لنک کے ساتھ

ڈاؤنلوڈ کرنے کی سہولت دیتا ہے

آج ہی وزٹ کریں

www.paksociety.com

وہ ضبط کی آخری حد کے آس پاس ہی کھڑا تھا۔
”ہماری مائیں بھی تو عورت ہی ہیں نا خیام، ہمیں اس دنیا میں لانے والی ہماری جنت ان کے قدموں کے نیچے ہے۔“

معاذ نے جوابات اس کی کڑواہٹ کو کم کرنے کے لیے کتنا چاہی تھی، درد کے ایک سب سے پرانے سلسلے کو تازہ کرنے کا سبب بنی۔

”ہر ماں اولاد کو پیدا کر کے احسان نہیں کرتی ہے معاذ بھائی! بہت سی اولادیں، زندگی بھر یہ تمنا کرتی ہیں کہ کاش وہ اس دنیا میں نہ آئی ہوتیں اور نہ ہی ہر ماں کے قدموں تلے جنت ہوتی ہے۔ اور یہ بات وہ مائیں خود ثابت کرتی ہیں۔“

وہ بات ختم کر کے تیزی سے کچن کی طرف چلا گیا۔ معاذ کو لگا تھا جیسے وہ اب بس رونے ہی والا ہے اور کیا پتا، کچن میں اپنے آنسو ہی صاف کر رہا ہو معاذ نے آسف سے پہلو بدلا۔

ہر بار جب وہ کسی نہ کسی کو نادانستہ طور پر کسی دکھ میں مبتلا کرنے کا سبب بنا، ایسا ہی بھاری بوجھ دل پر آکر گرتا تھا۔ اس وقت خیام کے اندر چھپی انتہا درد بے کی کڑواہٹ کا ایک اور رخ سامنے آیا تھا۔

”حقیقت کتنی بھی تلخ محسوس لیکن اسی تلخ ترین گہرائی سے خیر کا چشمہ بھی پھوٹنے کا شکر ہوتا ہے بالکل ویسے ہی جیسے گہری سیاہ رات کے قریب تر سحر کی پہلی کرن۔“

اسے ابائی کبھی کی بات یاد آئی۔
”سو خدا کرے کہ خیام کی زندگی کی صبح بھی قریب تر ہو!“ اس نے دل کی گہرائی سے دعا کی۔

فی الوقت زری اور راجو کا نکاح ساری توجہ لے رہا تھا۔ ایک بار وہ رخصت ہو کر اس گھر سے چلی جاتی تو وہ ایک بڑی فکر سے آزاد ہونے والا تھا۔

زری کی شدت پسندی نے اسے پہلی بار کسی عورت سے خوف زدہ کیا تھا اور ہر بار کی طرح وہ اس خوف کو ابائے ساتھ شیر کرنے کی بہت بھی نہیں پاسکا تھا، مگر وہی تھے جو اس الجھن کو دور کرنے کا سبب بنے تھے۔

ورنہ اس کے پاس تو لے دے کر بس یہی ایک خیام تھا، جس پر نظر تو جاتی تھی مگر ساتھ ہی ایک بڑی بے انصافی کا احساس بھی دل میں جگمگاتا تھا۔

وہ اتنا پیارا معصوم اور افسردہ سالز کا، کچھ اور ڈیڑھ روکڑا تھا!
”شکر ہے جو اپنے اسے اس غلطی سے بچالیا، ورنہ خیام یقیناً ”یہاں سے چلا جاتا!“

آج کی اس گفتگو سے اس کے یہ تو سمجھ میں آگیا تھا وہ اس کے کہنے پر زری سے شادی کرنے پر رضامند ہو جاتا۔
ناممکن!

سامنے کچن میں خیام نے اپنی جلتی ہوئی آنکھوں کو ہتھیلی سے سختی سے رگڑا۔
”کاش وہ معاذ بھائی کو ان عورتوں کے چہرے دکھا سکتا جو اس کی کئی ہر بات کی تصدیق کرتی ہیں، فیوزہ، عکینہ،

صندل اور اب۔۔۔ کتنی آرا!“
سب کسی نہ کسی قیمت پر بکتی رہیں، یہاں تک کہ کتنی بھی جس کے بارے میں اسے پورا یقین تھا کہ وہ چاہے

اب زندگی بھر بھی واپس پلٹ کر نہ دیکھے تب بھی وہیں مانی ستارہ کے چوہا رہے پر زندگی گزارنے والی ہے۔
برآمدے کے بالکل آخری سرے پر بنے گھرے میں دنیا کی رنگینیوں سے منہ چھپا کر محض اس کی یاد میں۔

مگر وہ بھی!
اس کی نظروں میں کتنی کاپر سکون چہرہ، قیمتی لباس، بڑی سی گاڑی اور گاڑی کا دروازہ کھولتا ہوا ذرا نیور سب ہی

کچھ کتنے دن سے اگلے تھے اندر کہیں انا پر ضرب تو بڑی ہی تھی۔
اور عجیب تو یہ کہ سب کچھ چھوڑ کر آنے پر بھی ٹھوہینے کا جو احساس کبھی نہیں جاگتا تھا وہ گیتی کی ایک جھلک کا
ہی خنجر تھا۔

”خیام! تمہاری چائے میں اور کتنی دیر ہے؟“
باہر سے معاذ آواز دے رہا تھا اور اس کی آواز میں وہی تسلی دلاتا ہوا انداز تھا جو بار بار سنبھلنے کا موقع فراہم کرتا
تھا۔
”آ رہا ہوں معاذ بھائی۔“ اس نے ٹرے اٹھا کر باہر کا رخ کیا۔

زرتاج بیگم نے انیکسی کی طرف ہوتی چہل پہل کو حیرت سے دیکھا۔
وہاں کچھ سامان اتارا جا رہا تھا۔ فرنیچر وغیرہ اور کچھ اور بھی مفاصلہ زیادہ تھا وہ بہت دورست اندازہ لگانے میں
کامیاب نہ ہو سکی۔
”اے! اس نے قریب سے گزرتی ہوئی ملازمہ کو آواز دی۔“ یہ سب کیا ہے؟ کہاں سے آ رہا ہے یہ سامان؟
کس نے منگایا ہے؟“
”مجھے نہیں پتا۔ میں تو یہاں اندر گھر کا کام کرتی ہوں بیگم صاحب! وہ اطمینان سے جواب دے کر آگے بڑھ گئی۔
زرتاج کی الجھن اب بھی برقرار تھی۔

ایک کے بعد دوسرے اور پھر تیسرے ملازم کی لاعلمی کے بعد اس پر اچانک ہی ایک اور تکلیف کا انکشاف یہ ہوا
کہ سارے ملازم اس کے دائرہ کار سے تقریباً نکل چکے ہیں۔ ان کے دو نوک جواب اور انداز میں آئی بے نیازی یوں
ہی نہیں تھی ورنہ کسی کی مجال جو اس کے پوچھے گئے سوال کا یوں نکال سا جواب دے سکے۔
”کسی ایک کو نہیں رکھوں گی“ نکال دوں گی تم سب حرام خوروں کو تو کروں گی کی نہیں بڑی ہی ایک اشارے پر
سینکڑوں میری جوتیاں چائے کو تیار ہیں تم لوگوں نے سمجھ کیا رکھا ہے۔ یہ میرا گھر ہے یہاں کا پتا بھی میری مرضی
کے بغیر کبھی نہیں ہلا ہے۔ سیاہ سفید کی مالک ہوں یہاں کی میں۔“
لاؤنج میں کھڑے ہو کر وہ حلق کے بل چلا رہی تھی۔ گئے دنوں کی وہ مطلق العنانی اب بھولا بھرا قصہ ہوئی جا
رہی تھی مگر وہ یہ ماننے کے لیے تیار نہیں تھی۔
”اپنا اپنا حساب کرو اور دفع ہو جاؤ بے غیر تو۔“

مگر وہ سارے بے غیرت کھڑے کھڑے نکالے جانے کا حکم سن کر بھی وہیں کھڑے ایک دوسرے کی شکلیں دیکھ
رہے تھے۔
”سنا نہیں تم لوگوں نے۔ کیا کہہ رہی ہوں میں۔ منظور! وہ اپنے منہ سے پرائے وفادار کی طرف مڑی۔“ ان
سب کا حساب کر کے نکالو باہر میں اپنے گھر میں کسی کی شکل نہیں دیکھنا چاہتی ہوں۔“ انیکسی میں آئے سامان کی
انکوائری شروع ہونے والا قصہ چند منٹوں میں کہیں سے کہیں پہنچنے لگا تھا۔
منظور نے آنکھ کے اشارے سے ان سب کو وہاں سے ہٹنے کے لیے کہا تب ہی انہیں وہاں سے ہٹا دیکھ کر وہ پھر
سے چلائی تھی۔

”جا کہاں رہے ہو اپنا حساب کرو اور دفع ہو۔“
”آپ انہیں نہیں نکال سکتیں بیگم صاحب! یہ اس طرح نہیں ہٹائے جاسکتے۔“ منظور کو مجبور ہو کر وہ اطلاع

دینی بڑی جو ابھی تک زرتاج کی چند خوش فہمیوں کو برقرار رکھے ہوئے تھی ”سالار صاحب کا حکم ہے کسی بھی
ملازم کو ان کی مرضی کے بغیر نکالا اور رکھا نہیں جاسکتا یہ فیصلہ صرف وہی کر سکتے ہیں یا پھر ان کی بیگم۔“
زرتاج نے بہت بے یقینی سے ان سب کی طرف دیکھا۔

ان کے انداز کی بے نیازی اور چہرے کا سکون منظور کی کسی باتوں کی تصدیق کر رہے تھے۔
وہ چند لمحوں ہی گم صمم سی کھڑی رہی اور پھر تیز قدموں سے اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔
ادھر انیکسی میں راجو کی گھر گھر ہستی کا سامان پورا ہوا تھا۔
”لجیجے راجو بھائی! اب صرف آپ کی دلمن کی کمی رہ گئی ہے وہ آجائیں گی تو گھر مکمل ہو گا۔“
گیتی نے ہاتھ میں تھامے بچے کھمے پھول بھی ایک گل دان میں ڈال کر سائیڈ ٹیبل پر رکھے اور مڑ کر راجو کی
طرف دیکھا۔ تو وہ افسردگی سے مسکرا دیا۔

”سب آپ کی اور سالار صاحب کی مہمانی ہے بھابھی! پتا نہیں کیا کیا کیے جا رہے ہیں میرے لیے ورنہ میں تو
اب تک کسی فینٹل اسپتال میں جمع کرایا جا چکا ہوں یا پھر۔“
”پھر شروع کروں آپ نے وہ بے کار کی باتیں۔“ گیتی نے بڑی اپنائیت سے اسے ٹوکا۔ ”ایک نئی زندگی کا آغاز
کرنے جا رہے ہیں آپ ساری تکلیف باتوں کو پیچھے چھوڑ دیجئے پلیز!“
”ساری کہاں چھوڑی جاسکتی ہیں بھابھی!“

رام کالجہ دھیمہ ہوا اور چہرے سے وہ افسردہ سی مسکراہٹ بھی گم!
”مجھے پتا ہے کہ آپ کے لیے روزی کا غم بہت بڑا ہے راجو بھائی! آپ ساری زندگی اسے نہیں بھول سکتے۔ مگر
آپ دیکھیے گا کہ ظالم اپنے انجام تک ضرور پہنچیں گے اور ان کو ملنے والی سزا ہی آپ کے دکھ کا دوا کرے گی۔“
وہ اپنی بات کہتے ہوئے زرتاج کی راجو نے شاید گیتی کی تسلی کے لیے ہلکے سے اثبات میں سر ہلایا تھا۔
”دوا دوا ہو گیا نہیں، لیکن اتنے پیارے لوگوں کو پریشان رکھنا بھی تو اچھا نہیں لگتا۔“ اس نے اپنے دل میں کچھ
ایسا ہی سوچا تھا۔

باہر سے سالار کے بولنے کی آواز آرہی تھی۔ تیز تیز بولتا ہوا وہ اسی طرف آ رہا تھا۔ گیتی اور راجو دونوں ہی
دروازے کی طرف دیکھنے لگے۔

”سب کچھ مکمل ہو گیا ہے یا ابھی کچھ کمی ہے؟ اچھی طرح دیکھ لو گیتی! اور تم بھی راجو! وہ بولتا ہوا اندر آیا تھا۔
راجو کے لیے انیکسی کا فرنیچر کراگری اور دیگر سامان کی مکمل تبدیلی کا آئیڈیا سرا سراسر اس کا تھا۔ راجو مع ہی کرتا رہ
گیا تھا۔ اس کے خیال میں انیکسی میں پہلے ہی ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ سو اس فضول خرچی کی قطعی ضرورت
نہیں تھی۔ مگر اس نے ایک نہیں سنی تھی۔

”زری اور راجو دونوں ہی نے بہت سی محرومیوں کے ساتھ زندگی گزاری ہے۔ پیسے وسائل رشتے، محبتیں کچھ
بھی نہیں رہا ان کے پاس۔ الگ الگ بھی کہانی دیکھو تو دل بیٹھتا ہے گیتی! اور میں جانتا ہوں کہ محرومیاں کس طرح
روح کے اندر رنجے گاڑ کر جینے کا حوصلہ ختم کرتی ہیں۔ یہ چھوٹی چھوٹی خوشیاں تبدیلیاں انہیں پھر سے جینے کی امنگ
عطا کریں گی تم دیکھ لیتا۔“

اس نے تنہائی میں گیتی سے کہا تھا اور وہ اس کی باتوں فیصلوں پر حیران ہونا اب بالکل چھوڑ چکی تھی۔
زری اور راجو کی شادی پر اس کی ابا کے ساتھ واحد شرط بھی زری کے ساتھ کوئی ایک پیسے کی بھی چیز ساتھ نہ آنا
تھی۔
”گیتی! ذرا کچن پر ایک نگاہ اور ڈال لو۔“

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام آپکو تمام ڈائجسٹ

ڈائریکٹ ڈاؤنلوڈنگ لنک کے ساتھ

ڈاؤنلوڈ کرنے کی سہولت دیتا ہے

آج ہی وزٹ کریں

www.paksociety.com

وہ اس کا حکم سننے ہی باہر نکل گئی تھی۔ راجو غریب روکتا ہی رہ گیا۔
”آپ بھابی پر بہت کام ڈال رہے ہیں۔ بے چاری ہر وقت لگی رہتی ہیں، مجھے تو سخت شرمندگی ہو رہی ہے۔“
وہ واقعی شرمندہ تھا۔

سالار ہلکے سے ہنس پڑا۔ ”تمہیں نہیں پتا وہ ایسی ذمہ داریوں سے بہت خوش رہتی ہے اور میں ویسے بھی نہیں چاہتا کہ وہ زیادہ وقت زرتاج بیگم کے زیر اثر رہے، سمجھ رہے ہوتا۔“
راجو نے ہلکے سے سر ہلایا تھا۔

”اور سب سے اہم بات یہ کہ تمہیں تمہاری ذاتی زندگی میں خوش و خرم دیکھنا میری اور کیتی دونوں ہی کی دلی آرزو ہے، جو وہ کر رہی ہے اسے کرنے دو، یہ سمجھ کر کہ یہ اس کی خوشی ہے۔“
راجو اس بار ہلکے سے مسکرایا تھا۔

زندگی میں کبھی کبھی سب کچھ ایسا ہونے لگتا ہے سالار بھائی! جس کے بارے میں وہ ہمہ گمان بھی نہیں ہوتا ہے، اب یہی دیکھ لیں میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ روزی کے بعد زندگی میں ایسی کسی بات کی گنجائش باقی ہے۔ مگر۔۔۔ اس کی آواز کہیں کم ہوئی۔

سالار نے محبت سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔
”میں تمہارا دل سے شکر گزار ہوں راجو، کہ تم نے میرا مان رکھا، مجھے اچھی طرح احساس ہے کہ تم نے یہ فیصلہ اپنی خوشی کے لیے نہیں بلکہ میری خوشی کے لیے کیا ہے۔ احسان ہے یہ تمہارا مجھ پر۔“

”ایسا نہ کیس، آپ کے لیے تو میری جان حاضر ہے۔ یہ تو کچھ بھی نہیں۔“ راجو کی آواز وہی مگر لہجے میں بڑی پراثر سچائی تھی۔

”میں روزی کو بھولنے کے لیے نہیں کہہ رہا، کیونکہ کسی کو بھولنا اتنا آسان نہیں ہوتا، لیکن کوشش کرنا کہ زری کے ساتھ زندگی کا آغاز محبت کے ساتھ کرو دیکھنا جواباً ”وہ تمہاری زندگی کو بدل کر رکھ دے گی۔“

”مجھے صرف نبیل کی فکر ہے۔ وہ اس رشتے پر بہت شدید غمے میں آئے گا۔ بہر حال زری اس کی بہن تو ہے نا۔“

”بہن!“ سالار تنہی سے مسکرایا۔ ”سالوں سے منہ موڑ کر خود زندگی کے مزے لوٹ رہا ہے۔ اس کی بلا سے بہن، بھائی، ماں، باپ کا جو حشر ہو۔ مجھے تو یقین ہے کہ وہ اگر زری کو دیکھے گا بھی تو پہچاننے کی غلطی نہیں کرے گا اور اگر پہچانتا ہے تو بھی یہ ان دونوں کا معاملہ ہے۔ زری کو شدید نفرت ہے اس سے۔ تم چھوڑو۔ یہ ان لوگوں کو خود چننا ہے۔ اگر ایسا موقع آیا۔“

سالار نے نرمی سے اس کا کندھا تھپتھپایا۔

”شادی کے چند دن بعد تم زری کو لے کر ویسے بھی اپنے گھر جاؤ گے، وہاں ایک بہت اچھی سی دہلیہ کی دعوت کرنی ہے تمہیں۔ میں چاہتا ہوں تمہاری ہی اور بہنوں کی ہر خوشی دو بالا ہو اور پھر جب تک تم وہاں آؤ گے تو تب تک خدا نے چاہا تو نبیل یہاں سے جا چکا ہو گا۔“

”اور روزی کا کیس؟“

وہ بے ساختہ کہہ تو گیا۔ مگر دل میں شرمندہ بھی ہوا۔ اتنا کچھ جو سالار اس کے لیے کر رہا تھا۔ اس کے بعد بھی؟
”وہ تو یہاں سے پہلے وہاں ورج ہو چکا ہے راجو!“ سالار نے اوپر کی طرف اشارہ کیا۔ ”بہت جلد فیصلہ آئے گا۔ بے فکر رہو، زرتاج بیگم کے اختیارات اور تعلقات کا اندازہ مجھے ان ہی دنوں میں ہوا ہے، لیکن کب تک۔۔۔ عدالت نے نبیل کو حاضر ہونے کا حکم دے دیا ہے۔ اب دیکھتے ہیں کیا گھنیا حربہ استعمال کرتا ہے۔“

”چھوڑ دو ان لوگوں کی پروا کرنا؟ انہوں نے کون سا تمہارا ذرا بھی خیال کیا ہے۔ اب امی کو ہی دیکھ لو۔“
اوجھڑا دھڑکے کر انہوں نے کسی کے نہ ہونے کا یقین کیا۔

”ہیں تو ماں، کچھ کہنا اچھا تو نہیں لگتا مگر انہوں نے کب انصاف سے کام لیا۔ سارا بوجھ تم پر ہی ڈالانا، مسلمان پر کوئی ایک فکر، ایک ذمہ داری ڈالی ہو تو بتاؤ۔ تمہاری خون پسینے کی کماٹی کو اس کی زبان کے چٹکاروں میں اڑایا ہے انہوں نے اور لکھ کر رکھ کر رکھ کر میری بات، تم اگر اسی گھر میں بیٹھی رہیں تو وہ اور مسلمان ساری زندگی تمہیں استعمال کریں گے۔ تم یوں ہی کما، کما کر اس گھٹو، ٹاکارہ مسلمان کو پالتی رہو گی۔ اور وہ نہ آج کچھ کرے گا اور نہ کل۔“
”محسن کے کوٹنے پر کھڑی وہ بڑی اپنائیت بھری رازداری جو اسے برت رہی تھیں۔ تب ہی مسلمان اپنے کمرے سے نکل کر وہاں چلا آیا۔“

”کیا باتیں ہو رہی ہیں چکے چکے۔ کہیں میری تو برائیاں نہیں ہو رہی ہیں۔“
”نہیں! ہم کیوں کریں گے تمہاری برائی! ایک اکلوتے تو بھائی ہو ہمارے۔ اللہ سے ہر وقت تمہاری سلامتی کی دعا مانگتی ہوں صبح شام۔“ اسے ٹھیک اپنے سر پر کھڑا دیکھ کر وہ ذرا بھی گھبرائے بغیر اپنا بیان بدل چکی تھیں۔
مسلمان نے یوں ہی بے فکری سے اپنا سر ہلایا۔

”دعاؤں کا شکریہ۔ لیکن صاف بات ہے کہ تمہارا کچھ بھی بھروسہ نہیں ہے تپا لویسے کیا بات ہو رہی تھی بتاؤ تو سہی۔“ گھر میں ہمہ وقت فارغ رہتے رہتے جاہل عورتوں کی طرح ارد گرد کی سن سن لینے کی بری عادت پڑ چکی تھی۔

تپا گل نے برا سامنہ بنایا۔ ”کچھ نہیں“ ایسے ہی جو یا کو سمجھا رہی تھی کہ امی کی بہت زیادہ ٹینشن مت لو اب ظاہر ہے عمر ہے، فکریں ہیں طبیعت تو خراب چلتی ہی ہے، ہر وقت ان کی پریشانی میں مت گھلا کر۔“
جو یا نے اپنی نم ہونی آنکھوں کو تھیلی سے رگڑا۔

”صرف بخار ہے وہ بھی کمزوری کا“ میں بتا رہا ہوں دو چار دن اچھا سا کھانا کھائیں گی تو خود بخود ہی اٹھ کر کھڑی ہو جائیں گی۔ تم آج بخنی والا پلاؤ بنا لو راتنے کے ساتھ۔ آہا! مزا آجائے گا۔ امی نہ اٹھ کر بیٹھی ہوں تو میرا نام بدل دیتا۔“

وہ جو یا سے مخاطب تھا اور اپنے بتائے ہوئے حل کا مزا اسے ابھی سے آنے لگا تھا۔ تپا گل جیسی عقل مند نے بھی تردید کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔
”میں اسکول ہو کر ابھی کھنے بھر تک آتی ہوں تپا اور امی کے لیے میں نے۔ کچھ پی بنا کر رکھ دی ہے۔ اگر وہ کھائیں تو آپ کھلا دیجیے گا۔“

مسلمان کی بات کو ان سنا سکتے ہوئے اس نے تپا گل کی طرف دیکھا اور اپنے کمرے کی طرف جانے لگی۔
مسلمان اور تپا گل دونوں ہی کی آنکھوں میں معنی خیزی سی اتری۔ ”اسکول تو بند ہیں وہاں کیا کرنے جارہی ہو؟“
”افس کھلا ہوتا ہے میرے پیسے بانی ہیں ان پر۔ اس کا پتا کرنے جارہی ہوں۔“
”ٹھیک ہے جاؤ مگر دیر مت کرنا۔“ تپا گل کو پیسوں کا سن کرنی الفور اطمینان حاصل ہوا تھا۔ خود وہ مسلمان کو لے کر دوسرے کمرے میں جا بیٹھیں۔

سارے اختلافات کے باوجود وہی ایک مضبوط اتحادی تھا گھر میں اور فرید الدین جیسے سنجیدہ معاملے میں اس کا ساتھ ہونا بہت بڑی سپورٹ تھی۔

”میں نے تو صاف کہہ دیا ہے کہ ہم شادی گھر پر ہی کریں گے۔ چار آدمی لا کر نکاح کریں۔ بعد میں کریں ولیمہ کہیں بھی قایم فور اشار والے ہوٹل میں۔“

مسلمان کے چہرے پر طنزیہ سی مسکراہٹ آئی۔
”تم بھی تپا گل! جب کسی کو چڑھانے پر آتی ہو تو بالکل ہی آنکھیں بند کر لیتی ہو قایم فور اشار والی شکل نہیں ہے فرید الدین کی کسی تھکے ہوئے شادی ہال یا پھر گلی میں ٹینٹ لگا کر ولیمہ ہو گا جو یا کا۔ دیکھ لیتا۔“
”اچھا اور مہر کتنا؟“

”مہر۔“ وہ سوچ میں پڑا۔ ”ایک نہیں، سو پانچ لاکھ رکھو الو!“
”پانچ بہت زیادہ ہے لاکھ سے زیادہ نہیں رکھنے والا وہ آدمی۔“ انہوں نے قطعیت سے سر ہلایا۔ مگر وہ پھر بھی اصرار کے گیا۔

”کو شش تو کرنا، دیکھو وقت کا کچھ پتا نہیں۔ میری مثال تمہارے سامنے ہے۔ کیا شان و شوکت کی زندگی تھی میری یہ تمہارا فرید الدین تو تیل بیچتا ہے زوبیہ کے آگے۔“
اپنی بات کہہ کر اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔
حسرتوں کا کچھ شمار نہیں تھا۔

کیا شان تھی محلے میں، جب زوبیہ اور مسلمان کی ملگنی کا سامان اتر رہا تھا۔ وہ درجنوں پھلوں، مٹھائیوں اور ڈرائی فروٹ کے ٹوکڑے، تحفے میں آئے سونے کے زیورات۔
زمن پر ہیر رکھنے کو دل نہیں چاہتا تھا۔

ایک بچھوٹے سے پل میں تپا گل فرش سے عرش پر اور پھر واپس بڑے زور سے فرش پر پھینکی گئیں۔
انہوں نے بے چین سا ہو کر پلو بولا۔ جو یا اتنی دیر میں ان لوگوں کے سامنے سے گزر کر جا چکی تھی۔
”کچھ پتا نہیں ہو تا فرید الدین جیسے لوگوں کا کل کو کوئی بیوی یا جوان اولاد اٹھ کر سامنے آئی تو فیصلہ کروانے میں آسانی ہو گی۔“

”وہاں دعوت میں تو تم بہت فرید الدین کی تعریفیں کر رہے تھے۔ بھائی بنالیا تھا اسے اب سارے شکوک شبہات یاد آ رہے ہیں۔“ تپا گل چڑھی گئیں۔

”اس وقت تعریف ضروری تھی مگر اس وقت تحفظات، ہم ہیں۔ اس بار غلطی نہیں کرنی اور دیر بھی نہیں۔“
تپا گل نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

”میں نے بے وقت بستر پکڑ لیا ہے۔ دیر تو ہماری طرف سے ہی ہو رہی ہے۔ کیا سوچتا ہو گا فرید الدین کہ دعوت کھا کر گئے تو خود ایک بار بھی جھوٹے منہ نہیں پوچھا۔ وہ تو میں ہی امی کی بیماری کو برہا چڑھا کر سنائے جارہی ہوں۔ ایک دن تو اسپتال تک میں داخل کر دیتا تھا۔“

”اچھا کیا“ اسی لیے کہہ رہا ہوں کہ آج کل میں ہی بلا لیں۔ گھر میں پریشانی کا بہانہ ہے۔ کوئی خاطر دارات بھی نہیں کرنی پڑے گی۔“ مسلمان کے لہجے میں دبا دبا سا جوش تھا۔
تپا گل نے پر سوچ نگاہوں سے مسلمان کی طرف دیکھا۔

”میں نے تو جب ان کی مرضی ہو گی تب ہی ٹھیک ہوتا ہے۔ والد صاحب وہاں جیل میں جا کر ایسے بیٹھے ہیں کہ اللہ ہی ہے جو وہاں سے واپسی ہو سارے مسائل ہم لوگوں کے لیے ہی رہ گئے ہیں۔ پتا نہیں کون سی خوش قسمت اولادیں ہوتی ہوں گی جن کے ماں باپ انہیں سیٹ کرتے ہوں گے۔ یہاں تو ماں باپ خود مسئلہ بنے ہوئے ہیں۔“

یہاں آکر تپا گل اس سے سو فیصد متفق تھیں۔

”اب دیکھ لو اس روز کیا باؤ لے پن کا مظاہرہ کیا امی نے فرید الدین کے ہاں کیا تک تھی نیچے جا کر بیٹھنے کی ہر

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام آپکو تمام ڈائجسٹ

ڈائریکٹ ڈاؤنلوڈنگ لنک کے ساتھ

ڈاؤنلوڈ کرنے کی سہولت دیتا ہے

آج ہی وزٹ کریں

www.paksociety.com

دل گھبرایا تھا۔
جویا واپس آئی تب تک وہ دونوں اسی طرح محو گفتگو تھے۔
”نیچے کا دروازہ پورا کھلا ہوا تھا سلمان بھائی! وہ دروازے میں کھڑی کہہ رہی تھی تب ان دونوں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”ہاں مجھے پتا تھا کہ تم جلدی آجاؤ گی اس لیے نہیں بند کیا تھا۔ پیسے مل گئے تمہیں، کتنے ہیں؟“
”آپ نے امی کو۔۔۔ کچھ ہی کھلا دی تھی۔“ ان دونوں کے کہنے کو ان سنا کر کہ وہ پریشانی سے پوچھ رہی تھی۔
آپاگل کا جواب ان کے چہرے کے تاثرات سے مل رہا تھا۔ بنا کوئی دوسرا سوال کیے وہ تیزی سے شاگرد امی کے کمرے کی طرف دوڑتی ہوئی گئی تھی۔
دروازہ نہ ہوا تھا۔

اور شاگرد امی کچھ آڑے ترچھے سے انداز میں بیڈ پر ہی تھیں۔
عجیب غیر معمولی سا احساس۔

ایک لمحے کے لیے تو جویا کو پیروں پر کھڑا رہنا بھی محال ہوا تھا۔
”امی!“ تو اس کے لبوں سے بھی نہیں نکل سکی۔ اپنی ساری ہمت جمع کر کے اس نے انہیں سیدھا کیا۔
وہ ہوش میں تھیں۔ لیکن کچھ کہہ نہیں پا رہی تھیں۔

شاید انہیں پیاس لگی تھی اور کسی کو نہ پا کر انہوں نے خود سائیڈ ٹیبل سے پانی کا گلاس اٹھانا چاہا تھا۔ جویا نے سہارا لے کر انہیں کچھ اوپر کیا اور پانی کا گلاس ان کے منہ سے لگایا۔ بہت ذرا سادہ پلیٹیں اور باقی یوں ہی بنے لگا۔ جویا نے انہیں لٹا کر ان کا چہرہ صاف کیا۔

تب ہی اسے دروازہ۔۔۔ میں زویا نظر آئی۔ وہ ابھی کالج سے واپس آئی تھی۔ جویا کے بری طرح دھڑکتے ہوئے دل کو سہارا ملا۔

”زویا! ایسوی لینس بلوا لو، ہم امی کو اسپتال لے چلتے ہیں۔ وہاں ایک بہتر دیکھ بھال تو ہو جائے گی ان کی۔ یہاں تو اتنے دن سے کس یوں ہی۔“

زویا نے اس کی بات کے دوران ہی ایسوی لینس کے لیے نمبر دیا تھا۔
جویا نے بڑی تیزی سے ضروری چیزیں اٹھی کئی شروع کی تھیں۔

عصر کی نماز ابھی کچھ دیر پہلے پڑھ لی گئی تھی اور روشنی کھلے کھلے بڑے ہال میں ایک سعد ساعت اتر رہی تھی۔
”زیرینہ بیگم، بنت وزیر علی، آپ کا نکاح ہمراہ راجہ ولد۔“

آسمانوں پر ہوا فیصلہ آج وقوع پذیر تھا۔

زری نے جھکی جھکی نگاہوں سے اطراف میں دیکھا۔ سب ہی جمع تھے۔ سکھر سے آئے اس کے رشتے دار خالہ بتول، راجہ کے ساتھ آئے چند قریب ترین لوگ اور یہاں گھروالے۔

اس کی نگاہ ایک چھوٹے سے پل میں جائزہ مکمل کر کے معاذ پر ہی رکی تھی۔
وہ قریب بیٹھا نکاح خانے کے کاغذات کو دیکھ رہا تھا اور چہرے پر بڑا نمایاں سا اطمینان پھیلا تھا۔

زری نے ایک گہری سانس اندر ہی اتاری۔

وہ بھی سکون دیکھنے کی منتہی تھی، جس کی درخواست خود معاذ نے اس سے کی تھی۔

”میری خاطر زری! تم شادی کر لو گی تو مجھے سکون مل جائے گا۔ بہت بڑا بوجھ ہے۔“
سو آج وہ بوجھ ہمیشہ کے لیے اتر ا۔

نقدیر کا فیصلہ اپنی جگہ مگر اس نے تو صرف اس ایک حکم کی تعمیل ہی کی۔
تب ہی معاذ نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا تو زری نے جلدی سے نظریں جھکا لیں۔ معاذ نے شاید کچھ بھی محسوس نہیں کیا تھا۔ وہ اس سے نکاح کے پیپر سائن کروانے کے لیے قریب آ گیا تھا۔
”یہاں سائن کرو زری!“ وہ اس سے کہہ رہا تھا۔
سامنے کھلے کانڈر سائن کی جگہ پر انگلی رکھے اس آخری مرحلے پر بھی وہی مددگار تھا۔
زری نے دل حلق میں آتا ہوا محسوس کیا۔

”بس یہ چند آخری پل پھر تو شاید تنہائی میں بھی اس کے بارے میں سوچنا اپنے آپ سے شرمندہ کرے گا۔“
”سائن کرو زری!“ اس کے برابر میں ایک طرف ابا اور دوسری طرف سعیدہ بھابی کے سکھر سے آئے چچا بیٹھے تھے۔

کون گواہ تھا کون وکیل۔
اس کی نگاہ صرف معاذ کی انگلی پر جمی تھی۔
خالی جگہ جو اس ایک نام کی خنجر تھی بھری گئی۔
یہاں اور یہاں اور۔۔۔
وہ صدمے پلٹ کر جہاں کہتا گیا وہ اپنا نام لکھے گئی۔
کارروائی تمام ہوئی۔

معاذ نے اس کے قریب سے اٹھتے ہوئے چند لمحوں کے لیے اس کے سر کو چھوا تو اس کے ضبط کی ہر حد ختم ہوئی تھی۔

مرد حضرات کا یہ چھوٹا سا مجمع چھٹ کر اب سامنے ہال کے دوسرے حصے میں بیٹھے دو لہما کی طرف منتقل ہوا تھا۔
نکاح کی کارروائی وہاں مکمل ہوئی تھی۔ یہاں دادی تھیں جو روٹی بلکتی زری کو تسلی دیتے ہوئے خود کتنے ہی آنسو بہا چکی تھیں اور دادی کو سنبھالتی ہوئی ربیعہ۔
دل کی گہرائی کو چھوٹی ہوئی یہ گھڑیاں ہر آنکھ کو پر غم کر رہی تھیں۔ زری سے ہمہ وقت خائف رہنے والی شائستہ۔

ایک ناگوار بوجھ کی طرح بچ کر جانے والی سعیدہ تک بار بار اپنے آنسو صاف کر رہی تھیں۔
نکاح کے بعد کی دعا ختم ہوئی تو مبارک باد کا سلسلہ دادی نے قریب ہی بیٹھی گیتی کو گلے لگا کر مبارک باد دی۔
”ہم تو خیر بیٹی والے ہیں مگر بیٹا! تم تو دو لہما کی خاص بہن ہو۔ تم کس خوشی میں آنسو بہا رہی ہو۔“
گیتی شرمیلے سے انداز میں ہنس پڑی تھی۔
معاذ نکل کر راندے میں آیا تھا۔

سامنے کے احاطے میں کھانے کی میزیں بڑے سلیقے سے لگی تھیں۔ لیکن کھانے میں ابھی دیر تھی۔ فی الحال ڈپرکس اور اسٹیکس وغیرہ کی سرونگ تھی۔ یہ سارا انتظام ابا نے خاص طور پر خود کیا تھا۔ سو بڑی بے فکری سی تھی۔

فضائیں اڑتی مزے دار سی خوشبو نمایاں ہو رہی تھی۔ وہ آج واقعی بہت خوش تھا۔

ایک فرض جو بخوبی ادا ہوا اور ایک خوف جو دل و دماغ پر بوجھ سا طاری کرتا تھا، رفع ہوا۔ اوپر آسمان کی طرف

دیکھتے ہوئے معاذ نے تہ ذہل سے رب کا شکر ادا کیا۔

آس پاس چند لڑکے نظر آ رہے تھے جو مد کی غرض سے آئے ہوئے تھے۔ لیکن خیام کہیں نہیں تھا۔
بہت دیر سے وہ اس کا منتظر تھا۔ ابا بھی پوچھ چکے تھے۔ معلوم نہیں کیوں وہ اب تک غائب تھا۔ اس نے وہیں کھڑے کھڑے خیام کا نمبر لایا تھا۔ دو تین بار کی کوشش کے بعد وہ مل ہی گیا۔
”اس طرف اچانک ہی فائرنگ ہو گئی ہے۔ معاذ بھائی! میں تو نکل چکا تھا مگر بھگدڑ اتنی تھی کہ واپس آنا پڑا۔ سب کچھ بند ہے اس طرف۔“

کراچی کے حالات کی برسوں سے ایک سی غیر یقینی صورت حال۔
”ٹھیک ہے تم بس اپنا خیال رکھو۔ خواجواہ نکلنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ فون بند کر کے پلٹا تو اندر سے سالار آ رہا تھا۔

معاذ بلکے سے مسکرا دیا۔
”شکر ہے سب کچھ خیریت سے ہو گیا۔ آپ نے ایک بڑی ذمہ داری میرے اوپر سے ختم کی ہے سالار! اللہ آپ کو جزائے خیر دے۔“

”ہماری نیت اچھی تھی معاذ! اب خدا کرے کہ یہ دونوں اپنے اپنے دکھ بھول کر بہت محبت بھری زندگی گزاریں۔“ سالار اس کے قریب آ کر ہوا تھا۔

”میں بہت خوش ہوں معاذ! مجھے لگنے لگا ہے کہ اللہ مجھ پر بہت مہربان ہے۔ ورنہ وہ مجھے تم لوگوں جیسے پیارے انسانوں سے کیوں ملواتا۔ گیتی جیسی بیوی کیوں عطا کرتا یہ سب اس کی مہربانی ہی ہے نا۔“

سالار کی آواز بوجھل سی ہوئی۔ معاذ اس کی دلی کیفیت کو سمجھ رہا تھا۔ وہ بیک وقت کئی محاذوں پر لڑ رہا تھا اور زندگی کا ایک لمبا عرصہ سخت تنہائی کے عالم میں کاٹ چکا تھا۔

”مجھے اب لگتا ہے جیسے میرا بھی ایک خاندان ہے، سر پر بزرگ ہیں اور تم جیسا بھائی۔“ اپنی جذباتیت پر قابو پاتے ہوئے اس نے بے تکلفی سے معاذ کے کندھے پر ہلکے سے ہاتھ مارا۔ ”اور تم جیسا بھائی جو اب تک کنوارا پھر رہا ہے۔ ربیعہ کے ساتھ تمہاری شادی بھی ہو جانی چاہیے۔ سات کروں گا کسی وقت فرصت سے۔“

معاذ صرف اس کا دل رکھنے کے لیے مسکرایا تھا۔ زندگی کو لگے جو یا نام کے دکھ سے سالار ابھی تک ناواقف تھا۔
تو یہ بھی اچھا ہی تھا۔

”چلیں آئیں اندر چلتے ہیں۔ میں اور آپ دونوں ہی ایک ساتھ وہاں سے غائب رہے تو اور کوئی نہ سہی ابا ضرور ہمیں ڈھونڈتے ہوئے اُدھر آجائیں گے۔“

اس نے کہتے ہوئے سالار کے ساتھ واپس ہال کا رخ کیا۔
زری بالکل سامنے بیٹھی تھی اور اب نکاح کے بعد راجو کو بھی ساتھ لاکر بٹھار دیا گیا تھا اور وہ دونوں ایک ساتھ کتنے اچھے لگ رہے تھے۔ اس میں کوئی دو رائے نہیں ہو سکتی تھی۔

سالار کو اندر داخل ہوتے ہی ابا نے آواز دے لی تھی مگر وہ چند لمحوں کے دروازے میں کھڑا زری اور راجو کو ہی دیکھے گیا۔ زری اب بالکل بھی نگاہ نہیں اٹھا رہی تھی۔ خاموش معصوم بے ضرر۔

اودھ جتنی بار بھی اس کی طرف دیکھتا دل کا اطمینان پہلے سے بھی بڑھتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔
سو شکر ہے جو وہ اس مشکل مقام سے سرخرو ہو کر گزرا۔

ربیعہ فونو سیشن کے لیے آواز دے رہی تھی۔ معاذ کو متوجہ ہونا پڑا۔



ہسپتال کی پرہجوم ایمرجنسی کے باہر گزرا وقت صبر آزمائے مگر اس کے اختتام پر شاکرہ امی کی طبیعت سنبھلنے کی اچھی خبر تھی۔

زویا اور جویا نے اطمینان کی سانس لی تھی۔
”دو دن ہسپتال میں انڈر آیزرویشن رکھ کر چشمی دے دیں گے ان شاء اللہ۔“ مہمان لیجے والی ڈاکٹر بیماری کی تفصیل کے ساتھ آگے کا پروگرام بتا کر جا چکی تھی۔
تب ہی آپاگل کافون ایک بار پھر آیا تھا۔

”جب طبیعت سنبھل گئی ہے تو گھر ہی لے آؤ۔ یہ ہسپتال والے تو اپنا بل بنانے کے چکر میں یوں ہی مریض کو داخل کر لیتے ہیں۔ چاہے ضرورت ہو یا نہ ہو۔ مگر تم تو قتل پکڑو۔“

وہ سرے سے ہسپتال لانے کی ہی مخالف تھیں نہ کہ اب ایڈمٹ ہونا۔
جویا نے فون خاموشی سے زویا کو پکڑا دیا۔ وہ ان سے نیٹے کی بہتر صلاحیت رکھتی تھی۔
”دو دن کی تو بات ہے۔ امی کالی پی بے حد بڑھ رہا تھا۔ اب کہیں جا کر نارمل ہوا ہے۔ پھر کتنا تیز بخار تھا۔ میں نے آپاگل سے کہہ دیا ہے کہ ہم انہیں دو دن ہسپتال میں ہی رکھیں گے۔“
زویا۔ لے پاس آکر اسے بتایا تو وہ صرف سر ہلا کر رہ گئی۔

شاکرہ امی اب ٹھیک تھیں۔ کمرے میں شفٹ ہونے کے بعد انہوں نے زویا اور جویا سے دو چار باتیں بھی کیں۔ تھوڑا سا دلیہ کھایا اور پھر گہری خند سو گئیں۔
”دواؤں کی وجہ سے آج رات غفلت بھی رہے گی اور جتنا مومیں کی اتنا ہی اچھا ہے ان کے لیے۔ بہت اچھا ہوا جویا جو ہم امی کو یہاں لے آئے۔“

”ہاں!“ اس نے تھکے تھکے سے انداز میں زویا کو دیکھا۔ ”میں بہت ڈر گئی ہوں زویا! امی اس طرح کبھی بہت نہیں ہارتیں۔ مگر یہ پورا ہفتہ ایسا گزرا جس میں وہ ایک بار بھی اٹھ کر کھڑی نہیں ہوئیں۔ بخار تو انہیں پہلے بھی کئی بار آیا ہے۔“

زویا کی آنکھوں میں کچھ الجھن سی تھی۔ ”اس روز فرید الدین کے ہاں کچھ ہوا تھا کیا؟ وہیں سے بہت اپ سیٹ آئی تھیں۔ آپاگل اور سلمان بھائی نے تو داغی دورہ تک قرار دے دیا تھا۔ تمہیں کیا لگتا ہے؟“
”ہاں نہیں۔ مجھے نہیں اندازہ زویا!“ اس کی آواز بہت دھیمی تھی۔

زویا بہت غور سے اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔
اس کی رنگت بالکل پھلکی پڑ چکی تھی اور شاید وہ اتنا صبر کر چکی تھی کہ اب اس کے احساسات کا اندازہ لگانا بھی آسان نہیں رہا تھا۔

”تمہیں فرید الدین کے رشتے پر کوئی اعتراض نہیں ہے کیا؟“ پچھلے موضوع کو اوہورا چھوڑ کر زویا نے بے ساختہ ہی اس سے پوچھا تھا۔

وہ یوں ہی خاموشی سے فرش کو دیکھنے لگی۔
”کچھ پوچھ رہی ہوں تم سے۔“ کسی کسی وقت زویا کو اس پر بڑے زور کا غصہ آتا تھا۔
”اس وقت اس بات کی کوئی تک نہیں ہے زویا! ابھی یہ فرید الدین کہاں سے آگیا؟“ اس بار جویا کو اس کی طرف دیکھنا پڑا۔

”وہ آپاٹھیں آچکا ہے اور اگر تم یوں ہی خاموش بیٹھی رہیں تو ان لوگوں کو جو کچھ کرنا ہے مگر گزریں گے۔“ آپا گل کا پھر فون آ رہا تھا۔

اس بار جویا نے خود ہی ریسو کر لیا۔ زویا کے سوالوں کے جواب ڈھونڈنے سے فرار ہی سی۔
دوسری طرف آپاگل جنملائی ہوئی تھیں۔

”تم سب تو آرام سے ہسپتال میں جا کر بیٹھ گئے ہو کسی ایک کو تو گھر پر بھی رہنا چاہیے تھا۔ سلمان کا کھانا ہی بنا جاتیں وہ اتنا پریشان بیٹھا ہے میں نے تو کہہ دیا کہ ایک اینڈ اینا لے اور ڈبل روٹی سے کھالے، مگر اس کے تو خیرے ہی اتنے ہیں کہ۔“ وہ اپنے گھر پر بیٹھیں اور یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ جب بھی انہیں کوئی ذمہ داری بانٹنے کا خدشہ ہوتا وہ اسی طرح راہ فرار اختیار کر گیتی تھیں۔
جویا نے خاموشی سے سیل فون آف کیا۔

”تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا جویا۔“ زویا بات کا سرا تھاے خطر تھی اور وہ آپاگل نہیں تھی جو آسانی سے ہمیشہ بھاگ نکلنے کا رستہ ڈھونڈ سکتی۔

”میرے پاس کسی کے سوال کا جواب نہیں ہے زویا! امت پوچھو کچھ بھی پلیز۔“ اس کے انداز میں عجیب سی بے بسی تھی۔

”تو تم انہیں کچھ نہیں کہو گی۔ ٹھیک!“
اس بار اس نے زویا کی بات کی تردید یا تصدیق کی بھی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔

ہسپتال کے اس خاموش سنان کمرے میں بڑا بوجھل سا احساس پھیلا تھا۔
”ٹھیک ہے، پھر اس بار یہ لڑائی میں اکیلی لڑوں گی۔ دیکھوں گی کون کرتا ہے من مانی اور اگر وہ سب زبردستی کریں گے تو میں اور تم کہیں اور شفٹ ہو جائیں گے۔ چاہے اسلام پچا کے گھر میں۔“

”داغ خراب ہو گیا ہے تمہارا زویا۔“ بہت تیزی سے جویا نے اس کی بات کالی تھی۔ ”اور ذلیل کروانا ہے کیا اپنے گھرانے کو سوچ سمجھ کر بولا کرو۔“

بہت دن بعد وہ اس طرح غصے میں آئی تھی۔ ”اور میرے بارے میں اتنی فکر مند مت ہو تم ہزاروں ملاکھوں لڑکیاں یوں ہی جی لیتی ہیں۔ اپنی زندگی کے مطلب یعنی کھو کر۔ مجھ سے بھی کہیں زیادہ تکلیف دہ حالات میں تو میں کوئی زمانے سے علیحدہ تو نہیں ہونے لگاؤں تو نہیں ہو رہا میرے ساتھ جو پہلے کسی کے ساتھ نہ ہوا ہو۔“

زویا نے بہت حیرت سے اسے دیکھا۔ ”مجھے یقین نہیں آتا جویا! کہ تمہیں وہ سب قبول ہو گا۔“
”مجھے وہ سب قبول ہے زویا! جو امی کہیں گی۔ میں ان کے کئے کسی حکم سے باہر نہیں ہوں گی۔ میرا بس یہی فیصلہ ہے۔“ وہ اٹھ کر شاکرہ امی کے قدموں کے پاس جا کر بیٹھی تھی۔

(باقی ان شاء اللہ آئندہ ماہ)

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لئے خوبصورت ناول

شان ہو گئے ہیں

خوبصورت روم

خوبصورت چمچی

مضبوط جلد

آفٹ پی

- ☆ تتلیاں، پھول اور خوشبو راحت جیس قیمت: 225 روپے
- ☆ بھول بھلیاں تیری گلیاں فائزہ افتخار قیمت: 500 روپے
- ☆ محبت بیاں نہیں لہنی جدون قیمت: 250 روپے

شکوئے کاچہ: مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37۔ اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

قصیدہ

تینوں تپائیں آج پھر مجھے سمجھانے کے لیے
اکٹھی ہوئی تھیں۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اکٹھی کی
گئی تھیں۔ اسی مجھ سے عاجز آئی ہوئی تھیں۔ کل بوا
جی میرے لیے جو رشتہ لے کر آئی تھیں وہ اسی کے
حساب سے بہت مناسب تھا لیکن میں نے اس پر کئی
اعتراض لگا کر رد کر دیا۔ اسی تو میری مرضی اور رائے کو
درخور اعتنائی نہ جانتی تھیں لیکن بابا نے کہہ رکھا تھا کہ
میری رضامندی کے بغیر کوئی رشتہ فاسل نہیں کرنا۔

امی کا خیال تھا کہ بابا نے مجھے بگاڑ رکھا ہے۔ میں بابا
کی داعی بہت لاڈلی تھی۔ حالانکہ بظاہر اس کی کوئی وجہ
سمجھ نہیں آتی۔ عموماً بڑا بچہ لاڈلا ہوتا ہے یا سب سے
چھوٹا یا پھر اکلوتا۔ میرا کیس ان میں سے کوئی بھی نہ
تھا۔ میں چھ بہن بھائیوں میں چوتھے نمبر پر تھی۔ مجھ
سے بڑی تین بہنیں پھر میں اور اس کے بعد دو بھائی۔
اسی تو برملا اعتراف کرتی ہیں کہ مسلسل چوتھی بیٹی
کی پیدائش پر انہیں دھوکا لگا تھا۔ وادی بھی منہ سے
کچھ نہ کہتی تھیں مگر مجھے دیکھ دیکھ کر ٹھنڈی آہیں
بھرتی تھیں۔ ایسے میں بابا نے مجھے اللہ کی رحمت قرار
دیتے ہوئے مجھ پر بے تحاشا پیار نچھاور کیا۔ وہ کہتے تھے
کہ میں نے تو ان کا جنت میں داخلہ بالکل ہی کنفرم
کر دیا ہے، خیر! بات کہاں سے کہاں نکل گئی۔ میں بتا
رہی تھی کہ اسی تین بہنوں کے فرض سے نمٹنے کے
بعد سنجیدگی سے مجھے بھی ٹھکانے لگانے کا سوچ رہی
تھی، لیکن میں فی الحال اس معاملے میں غیر سنجیدہ
تھی۔

مجھ میں ضبط اور برداشت کی نہ صرف کمی ہے بلکہ
اگر کوئی مجھ سے ناروا رویہ اپناتا ہے تو میں اس سے ہنس
ہنس کر بات کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔
چھوٹی آیا کہتی ہیں کہ ”کڑیا! سسرال میں زندگی
گزارنے کے لیے مفاہمت اور مصلحت سے کام لینا
پڑتا ہے۔“ لیکن میں ایسی مصلحت کو منقہ شام کرتی
ہوں۔ اسی لیے تو میں نے امی کے سامنے شادی کی

صرف ایک ہی شرط رکھ دی کہ میرے لیے ایسا لڑکا
ڈھونڈیے جس کا گھرانہ مختصر ہو اور ساس کا ٹھکانا تو ہرگز
نہ ہو یعنی میں جس کو پیاری ہوں اس کی والدہ محترمہ
اللہ کو پیاری ہو چکی ہوں۔
اسی نے میری اس فرمائش کو احقانہ گردانے ہوئے

ذرا برابر اہمیت نہ دی اور بواجی کو میرے لیے رشتہ
ڈھونڈنے کا ٹاسک سونپ دیا۔
بواجی بہت بھروسے کی خاتون ہیں۔ میری بہنوں کی
شادیاں بھی ان ہی کے توسط سے انجام پائی ہیں اور آج
کل بواجی میرے لیے دھڑا دھڑ رشتے لا رہی ہیں۔



لیکن ان سب رشتوں میں قدر مشترک بڑی فیملی ہوتی تھی۔

میں جانتے بوجھتے اندھے کنویں میں چھلانگ کیسے لگاتی، سو سہولت سے انکار کر دیتی اور اسی لیے تنگ آکر امی نے مجھے سمجھانے کے لیے آپاؤں کو بلوا بھیجا تھا اور اب مٹیوں آپاؤں مجھے گھیرے بیٹھی تھیں۔

”تصویر تو دیکھو ذرا لڑکے کی، کتنا پند سم ہے، پھر ویل کو الیغائیہ۔۔۔ لڑکیاں خواب دیکھتی ہیں ایسے رشتوں کا۔“ منجھلی آپا نے لڑکے کی تصویر میرے سامنے رکھتے ہوئے سمجھایا۔

”جھ میں اور دوسری لڑکیوں میں یہ ہی تو فرق ہے آپا، کہ میں خواب نہیں دیکھتی بلکہ حقیقت کی دنیا میں رہتی ہوں۔“ میں نے رسائیت سے کہتے ہوئے تصویر پیچھے بٹا دی۔

”پتا تو چلے برائی کیا ہے اس رشتے میں۔“ بڑی آپا نے زچ ہوتے ہوئے پوچھا۔

”برائی کا تو مجھے پتا نہیں لیکن بواجی کے ساتھ دوصوف کی والدہ محترمہ بھی تشریف لائی تھیں۔ مجھے تو انہوں نے دیکھتے کے ساتھ ہی اوکے کر دیا مگر میں انہیں اوکے نہ کر سکی، اتنی یک سی لگ رہی تھیں وہ خود۔ اگر خراث قسم کی ساس ثابت ہو میں تو ان کے مرنے کے انتظار میں ہوں تو خود بڑھی ہو جاؤں گی۔“

”دیکھ رہے ہو نام لوگ، کیسی ناواقفیت اندیش لڑکی ہے، اب میں بغیر ساس کا سسرال کہاں سے ڈھونڈوں اس کے لیے۔“ امی نے مجھے غضب ناک نگاہوں سے گھورا۔

”ضروری نہیں چند! کہ ہر ساس خراب ہی ٹھکے۔“ بڑی آپا نے مجھے پکارا۔

”تو انسان رسک لے ہی کیوں؟“ میں اپنی بات سے پیچھے ہٹنے کو تیار نہ تھی۔

”اچھا تو پھر شہناز خالہ کے فواد میں کیا برائی ہے، بے چہری شہناز خالہ تو تقریباً ”بستر مرگ“ پر ہی ہیں۔“

منجھلی آپا کو ایک اور رشتہ یاد آیا۔ شہناز خالہ امی کی

دور پرے کی کزن تھیں۔ وہ بھی اپنے بیٹے کے لیے میری طلب گار تھیں۔

”آپا! آپ کو یاد ہے، آپ کی ساس بھی شادی سے قبل بستر مرگ پر دکھائی دیتی تھیں لیکن انہوں نے شادی کے بعد آپ سے اتنی خدمتیں کروائیں کہ پھر سے بجلی چلتی، دو گیس اور شہناز خالہ تو توبہ کتنی ہنظر ٹائپ خاتون ہیں۔ بڑی دودھوں کا کیسے ٹاک میں دم کر دکھاتے۔“

”اچھا، شہناز خالہ کے دودھ کا بیٹا۔ اس کی والدہ تو بے چہری شکل سے ہی بہت مسکین اور سیدھی سی لگتی ہیں۔ وہ اتنی خراث ساس ثابت نہیں ہوں گی۔“ چھوٹی آپا نے رشتوں کی بنیاد میں سے ایک اور رشتہ باہر نکالا۔ مجھے ہنسی آئی تھی۔

”پلیز آپا! آپ لوگوں کو میری شادی کی ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ آپ لوگوں کی شادیوں کے بعد میں نے بڑھائی کے ساتھ ساتھ گھر کی ذمہ داری بھی سنبھال رکھی ہے۔ آصف، آصف ابھی چھوٹے ہیں۔ آصف کی شادی میں ابھی کم از کم چار پانچ سال ہیں، میری بھی شادی ہوگئی تو گھر کا انتظام کیسے چلے گا۔ کچھ عرصہ تو مجھے امی بابا کی خدمت کر لینے دیں۔“

میں نے امی کے شانے پر لاؤ سے سر نہ کیا تھا۔

”اللہ میرے ہاتھ پاؤں سلامت رکھے۔ چار ہندوں کا کھانا پکانا میرے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہے ابھی یہ جو گھر چمکاتی رہتی ہو تو دو چار سو روپے دے کر کوئی ماسی رکھ لوں گی۔ غضب خدا کا گھر کے کاموں کے لیے تمہاری عمر نکال دوں؟ ہم باز آئے تمہاری ایسی خدمتوں سے۔“ امی کو آج مجھ پر زیادہ ہی غصہ آ رہا تھا۔

”اچھا اب چھوڑیں بھی امی! صبح تو کہہ رہی ہے، ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے۔ اپنے گھر میں جتنے پیش کرنے ہیں کر لے۔ شادی کے بعد تو گھر داری کے جذبہ میں پختہ ہو جاؤ گی۔“

منجھلی آپا نے اپنے بیٹے کو تھکتے ہوئے بڑی حمایت لی۔ بڑی اور چھوٹی آپا نے بھی ان کی ہاں میں ہاں ملا دی، یوں میٹنگ بغیر کسی نتیجے کے برخاست ہوئی۔

لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

چار دن بعد بواجی خراں خراں پھر تشریف لارہی تھیں۔

”اب تو ایسا رشتہ لائی، ہوں بیٹا! کہ تمہیں ہاں کرتے ہی بنے گی۔“

کسی حد تک وہ میری ذمہ انداز سے واقف تھیں، جب ہی ہشت ہوئے مجھے مخاطب کیا۔

”جلدی تائیں بواجی! کیسا رشتہ لائی ہیں آپ۔“

میں نے مزے لے کر پوچھا۔ بوا سے ہم بہن، بھائیوں کا تکلف کا رشتہ تو تھا نہیں وہ ہمارے مزاجوں سے آشنا، شفیق مزاج خاتون تھیں۔ میرے انداز پر ہنس پڑیں۔ البتہ امی کو اس بے تکلفی پر غصہ آیا تھا، جب ہی مجھے کڑے تیروں سے گھورا تھا۔

”جداؤ چائے بناؤ بواجی کے لیے۔“ اس سے پہلے میں بواجی سے کچھ سن گئی لے پاتی، انہوں نے مجھے منظر نامے سے غائب کرنا چاہا۔

”انورہ امی! رشتے کے متعلق تو جان لینے دیں۔“ میں ٹھنکی۔

”سارے! اپنی مجھ سے۔ کم عمر لڑکیاں اپنی شادی سے متعلق یوں منہ پھاڑ کر باتیں کرتی اچھی نہیں لگتیں۔“ امی نے اس بار مجھے ڈنٹ ہی دیا۔

”کوئی! کم عمر لڑکیاں شادی کر سکتی ہیں مگر شادی کے متعلق بات نہیں کر سکتیں۔“ میں منہ پھلا کر کمرے سے نکل گئی۔ بواجی کے جانے کے بعد امی مسکراتے ہوئے میرے پاس آن پہنچیں۔

”سات بہن، بھائیوں میں آخری نمبر ہے لڑکے کا۔“ انہوں نے تمہید باندھی۔

”آخری پیش انوکھا لاؤلا ہوتا ہے۔ میری طرف سے انکار۔“ میں جھٹ بول اٹھی۔ امی نے ذرا سا گھورا، مگر بات جاری رکھی۔

”ایک ٹریکل انجینئر ہے۔ تنخواہ بھی ٹھیک ٹھاک ہے اور فیملی بھی خاصی دل آف ہے۔“

”اسی لمبی چوڑی کیلی، ہرگز نہیں۔“

”سارے بہن، بھائی شادی شدہ ہیں۔“ امی نے جیسے میرا اعتراض سنا ہی نہیں۔

”پھر تو اور بھی مسئلہ ہے۔ شادی شدہ ہندوں کے ساتھ، جیٹھائیوں کا رعب بھی سہتا پڑے گا۔“ میں اب بھی انکاری تھی۔

”والدین کا ایک عرصہ ذوالانتقال ہو چکا ہے۔ سب بہن، بھائیوں کی الگ الگ رہائش ہے۔ آخری الحال تو اپنے بڑے بھائی کے ساتھ رہتا ہے، لیکن شادی کے بعد وہ بھی الگ رہائش رکھے گا۔“

امی نے سب سے اہم بات آخر میں بتائی۔

”اوہ گریٹ! میں اچھل ہی تو پڑی۔“

”منظور ہے امی! سو فیصد منظور۔“ میں خوشی سے چمکتے ہوئے بولی۔ ساس فری سسرال تو میرا دیرینہ خواب تھا اور یہاں ساس تو کیا کسی بھی سسرالی رشتے دار کے ساتھ رہنے کا مخنا تھا ہی نہیں۔

”تمہارے منظور کرنے سے کیا ہوتا ہے۔ دعا کرو وہ بھی تمہیں پسند کر جائیں۔“ امی نے جلتا یا تھا۔ میں ہنس پڑی۔

”آپ کی بیٹی ماشاء اللہ بہت پیاری ہے امی! یہ پاپٹ رشتے ایسے ہی تو نہیں آ رہے۔“ میں نے شوخی سے کہا۔

”اچھا اب اتراؤ مت۔ اللہ نے اچھی صورت دی ہے تو شکر کرو اس کا اور دعا کرو کہ اللہ نصیب بھی اچھے کرے۔“

امی نے نامحانہ انداز اختیار کیا۔ میں نے فرماں برداری سے گردن ہلا دی تھی اور دو دن بعد لڑکے کی دو بڑی بہنیں اور دو بھابھ جیس بواجی کے ساتھ مجھے دیکھنے آن پہنچیں۔

آج سے پہلے میں نے کبھی لڑکے والوں کی خاطر تیار ہونے کا تردد نہیں کیا تھا، بس منہ پر پانی کے چھپکے اور بالوں میں برش مار کر لڑکے والوں کے سامنے چلی جاتی، لیکن آج میں نے اپنی تیاری پر خصوصی توجہ دی تھی۔ کچن سنبھالنے کے لیے منجھلی آپا وجود نہیں۔ میں نے صرف ٹرائل اندر گھسٹ کر لے جانے کا فیصلہ

انجام دیا۔
 بھائی آپا نے فراخ دلی سے اپنے سارے دن کی محنت کو میرا نام دے کر مہمانوں کو چیزیں سرودکیں۔ میں نے اس جھوٹ کو نظریہ ضرورت قرار دے دیا۔ یہ تھوڑا ہی تھا کہ مجھے یہ چیزیں بھائی نہیں آتی تھیں بس آج اپنی تیاری پر خصوصی توجہ دینے کی وجہ سے مجھے کچن میں جانے کی فرصت نہیں ملی تھی اور اس تیاری کا فوری نتیجہ لڑکے والوں کی آنکھوں میں ستائش سے ظاہر ہو گیا تھا۔
 خاصی مہذب اور پڑھی لکھی فیملی تھی۔ رکھ رکھاؤ میں تو خیر ہم لوگ بھی کم نہ تھے۔ خاطر تواضع کے بعد لڑکے کی بڑی بہن نے شائستگی سے امی کو مخاطب کیا۔ ”دیکھیے آنٹی! بچی ہمیں پسند آتی ہے۔ ہم رسی باتوں میں وقت ضائع کرنے کے قائل نہیں ہیں اور سچی بات تو یہ ہے کہ ہمارے پاس ضائع کرنے کے لیے وقت ہے ہی نہیں۔ بواجی نے آپ سے ذکر کیا ہو گا کہ میرے دوسرے بھائی نے آپ کی کل اپنی فیملی کے ساتھ امریکہ سے چھٹیاں گزارنے پاکستان آئے ہوئے ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ احمر کی شادی ان کی موجودگی میں ہی ہو جائے۔ ڈیڑھ مہینے بعد ان کی واپسی ہے۔ دراصل احمر ہم سب کا لاڈلا چھوٹا بھائی ہے، اس کی خوشیاں دیکھنے کا سب کو ہی ارمان ہے۔“ انہوں نے منانت سے بات مکمل کی۔
 ”تو ٹھیک ہے پر اتنی جلدی۔“ امی تو بوکھلا ہی گئیں۔
 ”مجبوری ہے آنٹی! چیز وغیرہ کی ہماری طرف سے کوئی ذمہ داری نہیں۔ یہ بات ہم محاورہ ”نہیں بلکہ حقیقتاً“ کہہ رہے ہیں کہ آپ شادی کی تیاریوں کی وجہ سے وقت مختصر جان کر پریشان نہ ہوں۔ ہم صرف آپ کی بیٹی کے طلب گار بن کر آئے ہیں۔ جتنی جلدی ہو سکے آپ احمر کو آکر دیکھ لیں اور اگر اس رشتے پر دل مطمئن ہوتا ہے تو ہمیں آگاہ کر دیجیے، پھر ہم باہمی مشورے سے شادی کی تاریخ طے کر لیں گے۔“

ان کے لیے کا یقین ظاہر کر رہا تھا کہ امی ان کے بھائی کو ناپسند کرنی نہ پائیں گی اور ہوا بھی یہی۔ دو تین دن بعد امی بابا بڑی آپا اور بھائی جان (بہنوئی) جا کر احمر کو سند قبولیت بخش آئے۔
 میرے تو حواس ہی کام نہ کر رہے تھے۔ من پسند رشتہ مانا الگ بات تھی مگر یوں اتنے شارٹ نوٹس پر اپنا گھریا والدین چھوٹے لاڈلے بھائیوں کو چھوڑ جانا دوسری بات۔ میں اتنی جلدی ذہنی طور پر شادی کے لیے تیار نہ تھی۔ لیکن اس بار امی تو امی بابا نے بھی میری ایک نہ سنی اور مجھے احمر کے سنگ رخصت کر کے ہی دم لیا۔



احمر کی رفاقت میں چند روز گزارنے کے بعد مجھے اندازہ ہو گیا کہ امی بابا کا انتخاب میرے لیے ہر لحاظ سے بہترین تھا۔ میں اللہ کا شکر ادا کرتے نہ تھکتی جس نے مجھے احمر جیسے شخص کا ساتھ دیا۔ احمر بہت محبت کرنے والے خیال رکھنے والے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ شریک حیات کی عزت کرنے والے انسان تھے۔ میں اپنی زندگی سے بے حد مطمئن تھی اور امی بابا مجھے مطمئن دیکھ کر مجھ سے بڑھ کر مطمئن ہو گئے تھے۔
 شادی کے ابتدائی چند دن میں نے اپنے بیٹھ کے گھر گزارے، جہاں پہلے احمر کی بھی رہائش تھی، لیکن کچھ دنوں بعد احمر نے ان کے قرب و جوار میں ایک چھوٹا سا خوب صورت تعمیر کیا گیا گھر کرائے پر لے لیا۔ ویسے تو میرے سرسالی ملنسار اور خوش اخلاق ثابت ہوئے تھے۔ لیکن میں جانتی تھی کہ یہ دوریوں کا اعجاز ہے۔ بڑی آپا وغیرہ جب بھی میرے گھر آتے تو ہنس کر مجھے چھیڑتے۔
 ”واقعی سامعہ! تمہارے فلسفے پر ہمیں یقین آگیا۔ ساس اور سرسالی رشتہ داروں کے بغیر گھر میں کتنا سکون ہوتا ہے۔“
 ”اللہ نظر بد سے بچائے اور یہ سکون ہمیشہ قائم و دائم

رکھے، لیکن بنوا چند ماہ بعد جب تمہاری گود میں خیر سے ننھا مہمان آئے گا تب تمہیں سرسالی رشتہ داروں کی قدر و قیمت کا کسی حد تک اندازہ بھی ہو گا۔ اکیلی جان کو سو طرح کے مسئلے ہوتے ہیں۔ کوئی تجربہ کار بندہ پاس ہو تو یہ مرحلے آسانی سے نپٹ جاتے ہیں۔ اب میری ساس زبان کی لاکھ تیز سہی مگر زچگی سے پہلے اور بعد کے مرحلوں میں ان کا بہت تعاون رہا میرے ساتھ۔“
 چھوٹی آپا مجھے کسی قدر ڈرا دیتیں، لیکن اللہ کا ٹھہر پر خاص کرم تھا۔ یہ سب مرحلے بھی بخیر و خوبی نپٹ گئے۔ ماٹھ کے ہونے سے پندرہ، بیس دن پہلے میری بڑی نند فرخندہ آیا اپنی دونوں بیٹیوں کے ساتھ میرے پاس رہنے آچکیں۔

وہ مزاج کی بہت اچھی خاتون تھیں۔ ان کی دونوں بیٹیوں کی بھی مجھ سے اچھی خاصی دوستی ہو چکی تھی۔ فلزہ انیس سال کی اور عفرہ سترہ سال کی تھیں۔ دونوں ہی بہت پیاری بچیاں تھیں۔ فلزہ کی پڑھائی میں دلچسپی ذرا کم تھی۔ فرخندہ آپا کی ڈانٹ ڈپٹ سن کر کتابیں اٹھا لیتی تھیں۔ باں بگھر گئے سارے کام جھٹ پٹ پٹا لیتی، کچن سے تو اسے خصوصی شغف تھا۔ آج کل تو دونوں بچیاں اپنے پیپر ز بھگتا کر فارغ تھیں۔ انہوں نے مجھے گھر کے کاموں سے بالکل ہی بے دخل کر دیا۔ فرخندہ آپا بھی سلائی مشین سنبھالے ننھے مہمان کا ساز و سامان تیار کرتی رہتیں۔

ایک چمکیلی صبح میری گود میں ننھی ماٹھ نے آنکھیں کھولیں تو گویا میری اور احمر کی زندگی مکمل ہو گئی۔ ماٹھ دو سال کی تھی تو اللہ نے ریان کی صورت میں اس کا پارا سا بھائی بھی دے دیا۔ زندگی بہت بھرپور، مکمل اور خوب صورت ہو گئی تھی۔ ہاں اگر تھوڑی بہت پریشانی تھی تو امی وغیرہ کی طرف سے تھی۔ امی کی طبیعت خراب رہنے لگی تھی۔ شوگر اور بلڈ پریشر کے عارضوں نے میری ہر دم متحرک رہنے والی امی کو بہت کمزور اور نڈھال سا کر دیا تھا۔ بابا کے اپنے جوڑوں میں درد رہنے لگا تھا۔ آصف و آصف اپنی پڑھائیوں میں ملن، کبھی

کالج، کبھی اکیڈمی تو کبھی یازدستوں کے ساتھ باہر گھر میں تنہائی اور سناٹے کا راج رہنے لگا تھا۔
 میں ہر دیک ایند وہاں گزارتی یا جب بھی امی کا تنہائی سے دل گھبراتا تو مجھے فون کھڑکا دیتیں۔ باقی بہنیں تو سرسالی والی تھیں۔ گھر داری کے جھنجھٹ میں ایسی ابھی بڑی رہتیں کہ مہینوں بعد آنے کی فرصت ملتی۔ میرے ساتھ ایسا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ کبھی تو احمر کے ساتھ چلی جاتی۔ ورنہ آصف، داصف میں سے کوئی لینے آجاتا۔ میں جاتی تو امی کے منع کرنے کے باوجود کتنے کام پٹاؤ لیتی۔ کبھی گھر کی تفصیلی صفائی پر کمر باندھ لیتی۔ کچن میں مستی تو تین چار طرح کے کھانے بنا کر فریز کر دیتی۔ دونوں بچے تو ٹانا، ٹانی اور ماسوؤں سے لاڈ اٹھوانے میں مصروف رہتے ہیں گھر کے کام پٹا لیتی رہتی۔ امی خفا بھی ہوتیں۔

”لڑکیاں میکے آکر آرام کرتی ہیں اور تم پھر کی کی طرح گھومتی رہتی ہو۔ میرے بچے! دو گھنٹی سکون سے ماں کے پاس بیٹھ جایا کرو۔ گھر کے کاموں کا کیا ہے، یہ کبھی ختم ہوتے ہیں بھلا۔“
 ”گھر کے کاموں میں تو ہر وقت آپ ابھی رہتی ہیں۔ صحت دیکھی ہے اپنی، کتنی کمزور ہو گئی ہیں۔ ذرا جو اپنا خیال رکھتی ہوں۔“ میں جواباً ”اُن سے زیادہ خفا ہوئی۔“

”خیر سے آصف کی پڑھائی ختم ہو جائے، پھر ہولے آؤں گی۔“ امی مسکراتے ہوئے مجھے تسلی دیتیں۔ سچ تو یہ تھا کہ امی سمیت ہم سب بہنوں کو آصف کی شادی کا بہت ارمان اور انتظار تھا۔

اللہ اللہ کر کے آصف کی پڑھائی پایہ تکمیل کو پہنچی اور فوراً ہی ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں زیر دست سی جاب بھی مل گئی۔ ماشاء اللہ قابلیت میں میرے دونوں بھائی کسی سے کم نہ تھے۔ اب ہم ساری بہنوں نے بھابھی ڈھونڈنے کی مہم شروع کر دی۔ بلکہ سب سے پہلے تو آصف صاحب کو ہی پکڑ کر پوچھا تھا۔
 ”دیکھو! تمہارے لیے لڑکی ڈھونڈنا شروع کر رہے

ہیں۔ تم بتاؤ اگر پہلے ہی کوئی لڑکی پسند کر رکھی ہے پھر نہ کہنا کہ پوچھا نہیں۔“

”میں شریف ساندہ بھلا اپنے لیے لڑکی کیسے ڈھونڈ سکتا تھا۔ یونیورسٹی میں قدم رکھنے سے پہلے آپ سب لوگوں نے وارننگ دے دی تھی کہ خیردار! کسی لڑکی کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا تو تمہاری خیر نہیں۔“ آصف جل کر رہا تھا۔

”تو نہ ہرے یونیورسٹی تمہیں پڑھنے بھیجا تھا یا لڑکیاں تارنے۔ خاندان برادری کی کوئی لڑکی پسند ہے تو بتاؤ۔“ بڑی آپا نے اسے مخاطب کیا۔

”اجماعت خاندان برادری کی لڑکیاں تارنے کی اجازت دے رہی تھی آپ نے۔ سوری! مجھے پہلے سے علم نہ تھا۔ ورنہ کوئی ڈھونڈ کر رکھتا۔“ آصف کے انداز پر ہم سب کو ہی ہنسی آگئی۔

”چلو اب اجازت ہے اپنے آس پاس کی سب لڑکیوں پر نگاہ دوڑاؤ اور کوئی پسند ہے تو بتاؤ۔“

میں نے دوستانہ انداز میں اسے مخاطب کیا اور آصف صاحب نے اس آفر سے بہت جلدی فائدہ اٹھالیا۔ میرے جینھ کی بڑی بیٹی کی شادی تھی۔ میرے میکے والے بھی مدعو تھے اور وہیں آصف صاحب کو فرخندہ آپا کی فلزہ پسند آگئی۔ سمجھتے ہوئے اس نے ہم بہنوں کے سامنے اپنی پسند کا اظہار بھی کر دیا۔

”ارے وا! اس سے اچھی بات کیا ہو سکتی ہے۔ وہ تو سمجھو گھر کی بچی ہے۔“

ہم بہنوں نے اس کی پسند کو فوراً ”او“ کے کر دیا تھا اور فلزہ واقعی ایسی لڑکی تھی جس پر کسی قسم کے اعتراض کا جواز ہی نہ تھا۔ میں تو اسے قریب سے جانتی تھی۔ ہنس مکھ خوش اخلاق، مفسار اور سکھڑ ہمارے گھر کو ایسی ہی لڑکی کی ضرورت تھی۔

فرخندہ آپا کی سختی اور ڈانٹ ڈپٹ نے اسے ماسٹرز کے مرحلے تک پہنچا دیا تھا۔ آج کل ایم اے انگلش کر رہی تھی وہ۔ مجھے حیرت تھی کہ یہ خیال مجھے خود سے کیوں نہ آیا۔ پہلے مرحلے میں میں نے امر سے

بات کی۔ ظاہر ہے انہیں بھی کوئی اعتراض نہ ہوا۔ لاڈلی بھانجی کے لیے آصف کا رشتہ انہیں ہر لحاظ سے بہترین لگتا تھا۔

اب فرخندہ آپا کا عندیہ لینا باقی تھا۔ امید تو یہی تھی کہ وہ یہ رشتہ بلا تامل قبول کر لیں گی۔ ہماری شادی کو اتنے برس گزرنے کے باوجود ہم نند، بھانج کے مثالی تعلقات تھے۔ پھر آصف بڑھا لکھا، خوب صورت، برسر روزگار تھا۔ کوئی بھی بات ایسی نہ تھی جس کو بنیاد بنا کر انکار کیا جاتا۔ پھر بھی امی نے مجھے ہی ذمہ داری سونپی کہ پہلے میں فرخندہ آپا سے بات کروں۔ اگر وہاں سے مثبت عندیہ ملے تو امی اور باقی بیٹیں جا کر باقاعدہ رشتہ ڈالیں۔

میں اور امر فرخندہ آپا کے ہاں جا کر بات کرنے کے لیے کوئی مناسب دن سوچ رہے تھے کہ وہاں سے خود باوا آگیا۔ فرخندہ باجی اور اتفاق بھائی کے بچے ان کی شادی کی پچیسویں سالگرہ منارہے تھے۔ سلور جوبلی کے موقع پر ہمیں بھی انوائٹ کیا گیا۔ سارے خاندان والے ہنسی خوشی تقریب میں شرکت کے لیے اکٹھے ہو گئے۔ فرخندہ آپا تو بچوں پر خفا ہو رہی تھیں۔ لیکن ہم سب نے تقریب کو خوب انجوائے کیا۔

یہ غیر رسمی یادگار تقریب رات گئے اختتام پذیر ہوئی۔ باقی سب مہمان تو رخصت ہو گئے۔ لیکن فرخندہ آپا نے ہمیں رات کے لیے روک لیا۔ ویسے بھی اگلے دن امر کا آف تھا۔ پہلے بھی دو چار میٹوں میں میں ایک دو دن فرخندہ آپا کے ہاں گزارنے جاتی تھی۔ اس بار تو ان سے ضروری بات بھی کہنی تھی جو تسلی اور سکون سے بیٹھ کر ہی کی جاسکتی تھی سو میں بخوشی رکنے پر راضی ہو گئی۔

مہمانوں کے رخصت ہونے کے بعد میں فرخندہ آپا کے ساتھ مل کر کچن سمیٹ رہی تھی جب ہی مناسب موقع جان کر میں نے آصف اور فلزہ کے رشتے کی بات چھیڑ ڈالی۔

کچن سلیب صاف کرتے ہوئے فرخندہ آپا کے ماتھے

رک گئے۔ ان کے لیے یہ بات یقیناً غیر متوقع تھی، لیکن ذرا دیر بعد ان کے چہرے پر جو مسکراہٹ پھیلی وہ بڑی حوصلہ افزا تھی۔

”آصف تو میرا دکھا بھلا بچہ ہے، مجھے پسند بھی بہت ہے، لیکن میں تمہارے بھائی جان اور بچوں سے مشورے کے بعد ہی کوئی جواب دے سکوں گی۔“

”ظاہر ہے اتفاق بھائی سے پوچھنا سب سے اہم ہے آپ ان سے بات کر بیٹھیے اور فلزہ کی رضامندی بھی ضرور چھیجے گا۔ یہ نیا دور ہے ہمارے بچے بے حد سمجھ دار ہیں۔ ان کے مستقبل کا فیصلہ ان کی رضامندی سے ہونا چاہیے۔“

میں نے مسکراتے ہوئے ان کی بات سے اتفاق کیا تھا اور اگلی صبح کی بات تھی۔ میں نماز اور تلاوت سے فارغ ہو کر اپنے لیے چائے بنانے کچن کی طرف جا رہی تھی کہ عفرو، فلزہ کے کمرے کے پاس سے گزرتے ہوئے رک گئی۔ کمرے سے باتوں کی آواز آرہی تھی۔

فرخندہ آپا کی فیملی بھی سحر خیز تھی۔ سب باقاعدگی سے نماز فجر ادا کرتے تھے۔ یقیناً ”فلزہ اور عفرو بھی نماز سے فارغ ہو کر حسب معمول بستر میں گھسی پگیں لڑا رہی ہوں گی۔ دونوں بہنوں میں بلا کی دوستی تھی۔ میں بھی مسکراتے ہوئے کمرے میں جھانک کر انہیں چائے کی آفر کرنا چاہ رہی تھی کہ عفرو کی آواز نے مجھے اپنے ارادے پر عملی جامہ نہ پہنانے دیا۔

”کیا ڈھنگ اور اسماٹ شخص ہیں آصف بھائی۔ میں تمہاری جگہ ہوتی تو فوراً ”ہاں کر دیتی۔“ عفرو نے کہا تھا۔ مسکراہٹ میرے ہونٹوں پر رنگ گئی۔ گویا فرخندہ آپا نے رات کو ہی بچوں سے معاملہ ڈسکس بھی کر لیا۔ فطری تجسس نے مجھے چھپ کر بات سننے کی غیر اخلاقی حرکت پر مجبور کر دیا۔ میں فلزہ کا جواب جاتا جا رہی تھی۔

”تم میری جگہ ہو تیں تو تم بھی فوراً ”ہاں نہ کرتیں۔ جب اپنی زندگی کا معاملہ ہوتا ہے تو ہر شخص سوچنے کا

وقت چاہتا ہے۔“ فلزہ کچھ چڑ کر بولی تھی۔ مجھے دھچکا سا لگا۔ میں تو اس کی کھنکھتی ہنسی کے ساتھ کچھ اور سننے کی منتظر تھی۔

”بی بی! یہ میں تمہیں پہلے بتاؤں کہ وقت تمہیں ہرگز نہ ملے گا۔ جہاں تک میرا خیال ہے، مایہ و غیرہ جلد از جلد اپنے بھائی کی شادی چننا چاہ رہے ہیں۔ ان کی امی کی طبیعت آج کل کچھ ٹھیک نہیں رہتی۔ دیکھ لینا وہ لوگ تو چٹ منٹنی اور پٹ بیاہ کرنا چاہیں گے۔“ عفرو نے اسے شوخی سے چھیڑا۔

”اس بات کا تو مجھے بھی اندازہ ہے۔ پرو پوزل بے شک اچھے اور مجھے تو ڈر ہے کہ ممانورا“ اقرار بھی کروں گی، لیکن میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتی۔“ فلزہ رو ہانسی ہو کر بولی تھی۔

”کیا وجہ بتاؤ گی ماما کو۔ دیکھا نہیں ماما کتنی خوش خوش ہمیں یہ خبر دینے آئی تھیں۔“ عفرو نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”کیا یہ وجہ کافی نہیں ہے کہ ابھی میری عمر کم ہے۔ شادی بہت بڑی ذمہ داری ہے اور میں فی الحال خود کو یہ

ذمہ داری اٹھانے کے قابل نہیں سمجھتی۔ پہلے ممانے نور زہرہ سنی کر کے مجھے ماسٹرز میں ایڈمیشن دلادیا اور جب مجھے واقعی پڑھائی میں مزا آنے لگا ہے تو ایک انوکھی بات سامنے لے آئی ہیں۔ میں سنجیدگی سے اپنا ماسٹرز کیمپلٹ کرنا چاہتی ہوں۔ پھر پڑھائی سے فارغ ہو کر اپنے گھر میں کچھ ٹینشن فری وقت گزارنا چاہتی ہوں۔ میں اتنی جلدی شادی کے لیے ذہنی طور پر تیار نہیں ہوں۔“ فلزہ صاف گوئی سے بولی تھی۔

”یہ باتیں تم ممانے کہہ کر دیکھو، ممانیں گی بے وقوفی کی باتیں مت کرو فلزہ! اچھا رشتہ ٹھکرانا کفران نعمت ہوتا ہے۔“ عفرو نے فرخندہ آپا کے سے انداز میں کہا تھا۔

”پتا ہے مجھے بھی۔“ فلزہ نے یقیناً ”منہ بسور“ اٹھا دیا۔ ”ویسے فلزہ تم سوچو تو سہی، کتنی اچھی فیملی ہے مایہ

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام آپکو تمام ڈائجسٹ

ڈائریکٹ ڈاؤنلوڈنگ لنک کے ساتھ

ڈاؤنلوڈ کرنے کی سہولت دیتا ہے

آج ہی وزٹ کریں

www.paksociety.com

ہیں تو یہ لڑکی کے ضبط اور تربیت کا امتحان ہوتا ہے اور اللہ کا شکر ہے کہ مجھے اپنی تعلیم اور تربیت دونوں پر بھروسہ ہے۔ لہذا جو انٹیکشن تمہیں اس رشتے میں نظر آرہی ہے، مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ میں اپنا ماسٹرز کمپلیٹ ہونے سے پہلے شادی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی۔ تم امی کو کہہ دینا کہ اگر مای وغیرہ اتنا انتظار کر سکتے ہیں تو فحک دور نہ انہیں شائستہ طریقے سے انکار کر دیجئے۔“

فلزہ کا انداز سادہ اور دو ٹوک تھا اور بس ایک لمحے کی بات تھی، میں شرمندگی اور ندامت کے سمندر میں غرق ہو گئی۔ اس چھوٹی سی لڑکی نے گویا مجھے آئینہ دکھا دیا تھا۔ جس میں میرے ماضی کا بہت بھیاںک عکس مجھے منہ چڑھا رہا تھا۔ مجھے اپنا آپ دیکھ کر نگاہ چرائی پڑ گئی تھی۔ کتنے تعجب کی بات تھی کہ آج تک مجھے احساس ہی نہ ہوا تھا کہ میرا ماضی کا طرز عمل کتنا نامناسب اور غلط تھا۔ میں خوش باش اپنی زندگی جیسے جا رہی تھی۔ اگر آج بھی میں عفرہ اور فلزہ کی باتیں نہ سنتی تو مجھے احساس ہی نہ ہوتا کہ میں ماضی میں کتنی کھو رہے رحم اور سنگدل تھی۔

آج جب میری اپنی ماں کو کسی نے ساس کی کھچھکوی میں کھڑا کر کے ویسے ہی کمٹشس دیے، جیسے کبھی میرا معمول ہوتا تھا تو میں لرز رہ رہ گئی۔ میں پشیمان تو تھی، لیکن شاید خوش بھی۔ آصف نے اچھا انتخاب کیا تھا۔ ظاہر اور باطن دونوں کا حسن رکھنے والی لڑکی۔ ہم لوگ واقعی آصف کی شادی جلد از جلد کرنے کے خواہش مند تھے لیکن فلزہ جیسی لڑکی کو کھونا بھی تو نری حماقت ہی ہوگی نا۔ ہمیں اس کی پڑھائی مکمل ہونے کا انتظار کرنا ہی پڑے گا۔



وغیرہ کی۔ مختصر ترین سرال سے پالا پڑے گا تمہیں۔ لڑکیوں کی تو سسرالی رشتہ داروں سے ویسے بھی جان جاتی ہے۔ تمہیں کوئی لمبا چوڑا سرال بھگتنا نہیں پڑے گا۔ بے شک چار بہنیں ہیں مای وغیرہ، مگر پہلی بات تو یہ کہ سب کی سب بائے پھر بہت اچھی ہیں اور پھر سب اپنے اپنے گھریلو کی۔ ایک چھوٹا دیو روہ بھی سال دو سال میں اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جائے گا اور مای کے والدین وہ بے چارے بھی کتنا عرصہ جیئیں گے۔ ان کی امی تو ویسے بھی بیمار یوں میں گھری پڑی ہیں۔ چند سالوں میں سرال کے جتنی بھٹ سے بالکل آزا ہوگی تم۔“ عفرہ جانے اور بھی اسے کیا کچھ سمجھا رہی تھی۔ مگر میں اپنی جگہ کھڑی سن کی سن رہ گئی۔

”اللہ میرے ماں باپ کو درازی عروے انہیں صحت و تندرستی سے نوازے۔ ان کا سایہ ہمیشہ ہماری ہمارے سروں پر قائم رہے۔“ میرا رواں رواں دعا گو تھا۔

عفرہ پر مجھے شدید ترین غصہ آیا۔ کس بے رحمی سے اس نے اس رشتے کے پس پوائنٹ گنوائے تھے۔ ”اسٹاپ اٹ عفرہ!“ فلزہ نے اسے ناگواری سے ٹوکا تھا۔

”سچ تو کہہ رہی ہوں فلزہ! اتنی بے چاری تو بمشکل چند سالوں کی خدمت لیں گی۔ اپنی دوست صبوحی کا حال دیکھا ہے تم نے۔ کس ہنسی کئی ساس سے پالا بڑا ہے۔ اتنی تیز طرار کہ خدا کی پناہ! مجھے تو اسٹاپ لیں گے ڈرامے دیکھ کر ساسوں سے ویسے بھی بہت ڈر لگنے لگا ہے، اتنی بے چاری تو۔“

عفرہ اپنی ہی رو میں بولے جا رہی تھی۔ ”پلیز عفرہ! خاموش ہو جاؤ اور برائے مہربانی اشار پس کے ڈرامے دیکھنا بند کر دو۔ کسی کی ماں کے متعلق ہم اتنی بے رحمی سے تذکرہ کیسے کر سکتے ہیں۔ اللہ ہر کسی پر اس کی ماں کا سایہ سلامت رکھے۔ بزرگ تو اللہ کی رحمت ہوتے ہیں۔ اگر کچھ تیز مزاج کے ہوتے

سیری لکھنؤ

لیڈی ڈاکٹر نے پن ایک طرف رکھا اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے مجھے گھورا۔
”جی جناب! یہ سب کیا ہے۔“
میرے پاس اس کے سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔
اس ڈاکٹر سے میری اچھی خاصی بے تکلفی بلکہ کافی حد تک دوستی ہی تھی۔ میرے خاندانی پس منظر، تعلیم، مشاغل ہر بات سے وہ آگاہ تھی۔ کوئی پروہ نہیں تھا۔ پہلے یہ مثل مشہور تھی کہ ”خاوند اور وانی سے کیا پیٹ چھپاتا۔“ اب یہ مثل لیڈی ڈاکٹر پر اسی طرح صادق آتی ہے۔
اس نے دوبارہ مجھے گھورتے ہوئے بڑی بے تکلفی سے کہا۔

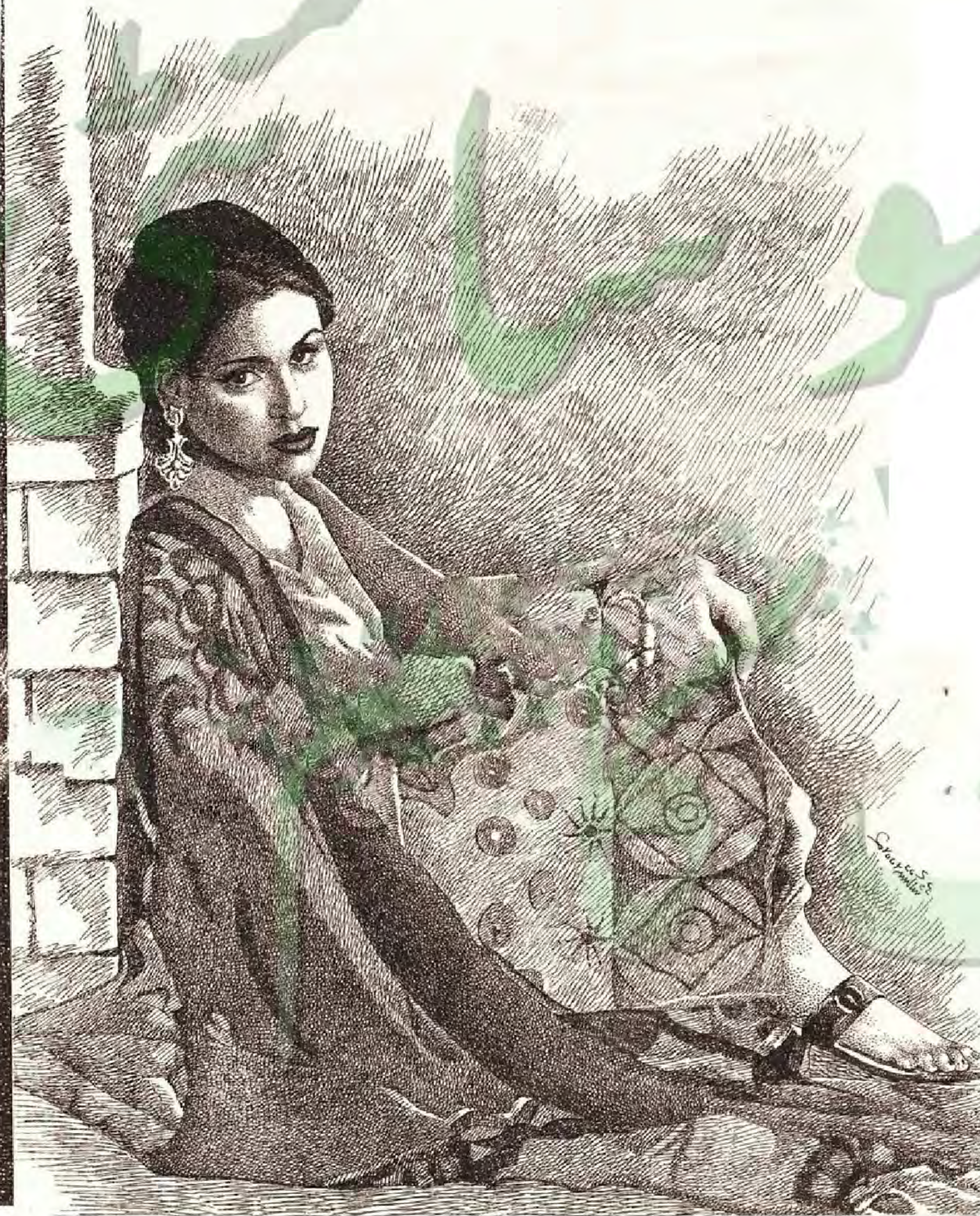
”شائستہ! دراصل تم ایک ڈپرسلڈ پرسن ہو، کوئی بات نہیں۔ تمہارے سب ٹیسٹ اور رپورٹس بالکل صحیح ہیں۔ تمہارا یہ مسئلہ صرف بار موشن نظام میں گڑبڑ کی وجہ سے ہے اور بار موشن میں گڑبڑ کی ایک بہت بڑی وجہ ذہنی تناؤ اور ڈپریشن ہے۔ نکالو خود کو اس خود ساختہ ذہنی تناؤ سے۔ بھلا کیا مسئلہ ہے تمہیں ہاں! ہمیش کرتی ہو۔ ہر آسائش اور شوہر کی محبت حاصل ہے تمہیں“
پھر یہ سب کیا ہے۔ مجھے تو تمہاری یہ خود ساختہ بیماری صرف ذہنی فرار لگتا ہے اور کچھ نہیں۔“
اس کی صاف گوئی کا میں نے بالکل برا نہیں مانا۔ میں جانتی تھی حقیقت بھی یہی ہے۔ پھر وہ ہنستے ہوئے بولی۔

”ایک مشورہ دوں؟ پارلر جایا کرو بلکہ اکثر جایا کرو دیکھنا! حیرت انگیز طور پر اس تناؤ سے نکل آؤ گی۔“

پھر وہ گویا فلسفیانہ انداز میں بولی۔
”پارلر دراصل عورتوں کا بازار ہے۔ ہر عورت کے ساتھ آگ نئی کہانی منسک ہے۔ یہ نئی کہانیاں یہ عجیب خانہ اور اپنی ہم جنس کا ساتھ تمہیں اس تناؤ سے نکل لائے گا۔“
میں نے ہنستے ہوئے کہا۔
”اور جو پارلر کے بلوں سے میاں کا موڈ خراب ہوا اور ان کو ڈپریشن ہو گیا تو؟“
وہ اپنے سابقہ موڈ کے تحت بولی۔
”نہیں بلکہ حسین بیوی جب مزید نکھر جائے گی تو میاں کا موڈ مزید خوش گوار ہو جائے گا۔“

پارلر واقعی عورتوں کا مینا بازار تھا۔ ہر عورت کے ساتھ کوئی کہانی لگی تھی۔ زمر گس کی ایک اور بات سے مجھے اتفاق ہوا۔ یہاں تو ہر طرف نئی نئی کہانیوں اور دکھوں کا ڈھیر لگا تھا۔ حتیٰ کہ فوزیہ جو پارلر کی مالک تھی اس کے بارے میں بہت کچھ عجیب و غریب سننے کو ملا۔
یہ سب ایسی باتیں تھیں جنہوں نے میرے فطری تجسس کو ابھار دیا اور میں نے فوزیہ کی کہانی میں دلچسپی لینی شروع کر دی۔
فوزیہ کی کہانی کوئی ایسی غیر متوقع اور غیر روایتی تو نہیں تھی۔ وہی عام سی لواشوری جو ہر طرف آپ کو بکھری نظر آئے گی مگر

تھہرے! پہلے مجھے آپ کو فوزیہ سے ملوانا ہے۔ سانبی سلونی پٹلی دلی بے حد تیکے نقوش کی مالک



سرو قد فوزیہ اچھی خاصی خوب صورت اور باوقار سی خاتون ہے۔ پانچ بچوں کی ماں ہوتے ہوئے بھی کوئی یقین نہیں کر سکتا کہ یہ شادی شدہ ہے۔ بے داغ تنی ہوئی جلد مناسب اور پتلا دماغ بدن وہ یقیناً "ایسی سے کہ دوسروں کو متاثر کر سکے۔ پھر حجب زبان یعنی اپنے کام میں ماہر آنے والی خواتین کو اتنے عقل مندانہ اور ہنرمندانہ مشورے دیتی کہ اس کے گاہک اس کے گردیدہ ہیں۔

یہ تو مجھے شروع سے معلوم تھا کہ فوزیہ نے شادی اپنی پسند سے اور گھروالوں سے مکمل طور پر بغاوت کر کے کی تھی۔ خیر یہ قطعی اس کا ذاتی مسئلہ و فیصلہ تھا۔ مجھے اس سے کیا سروکار! میری ذاتی رائے اس معاملے میں جو بھی تھی سو تھی مگر میں نے کبھی اسے کریدنے کی کوشش نہیں کی۔ لیکن اس معاملے نے شروع شروع میں اس کی ساکھ کو کافی متاثر کیا۔ حتیٰ کہ جب میری کانوپی میں یہ پارلر بنایا کھلتا تھا تو میرے میاں نے مجھے بڑی سختی سے یہ کہتے ہوئے منع کیا تھا۔

"اُدھر کا رخ بھی مت کرنا۔ اس عورت کی شہرت کچھ اچھی نہیں۔ سنا ہے غلط قسم کی عورتوں کا آنا جانا ہے۔"

میں نے خاموشی سے سر ہلادیا تھا۔ پھر کانوپی میں ہی ایک دو اجتماعات پر میری اس سے ملاقات ہوئی اور جہاں خواتین بیٹھی ہوں اس قسم کی باتیں تو ایک چٹارے کے ساتھ دوہرائی جاتی ہیں اور ایسے ہی اجتماعات میں فوزیہ کی غالباً "کسی ہمدرد خاتون نے مجھے بتایا۔

"مارے نہیں مسز احمد ایسی کوئی بات نہیں۔ اچھی خاصی شریف فیملی کی لڑکی ہے۔ وہ یزدانی صاحب کو تو آپ جانتی ہی ہوں گی، ان کی بیٹی ہے۔ بس خانہ خراب ہو اس محبت کا جو اچھے خاصے انسان کو کیا سے کیا بنا دیتی ہے۔ اسی محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر خاندان سے بغاوت کی۔ مگر لوگوں کو تو باتیں کرنے کا موقع چاہیے۔ اچھی خاصی شریف لڑکی کے لیے جانے کیسی کیسی باتیں کرتے ہیں۔ لوگوں کو تو خدا کا

خوف ہی نہیں۔ ٹھیک ہے اس کا طریقہ غلط تھا۔ ہمارے ہاں اس بات کو اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ مگر" وہ خاتون سانس لینے کو رکھ کر کہیں تو میں نے کچھ پوچھنا چاہا۔

"مگر میں نے تو سنا ہے کہ۔"

وہ مجھے کانٹے ہوئے بولیں۔

"ہاں ہاں یہی تو میں آپ کو بتا رہی ہوں کہ آپ نے بہت کچھ سنا ہو گا مگر سب سچ نہیں۔ میں کوئی اس کی حمایت نہیں کر رہی۔ ظاہر ہے محبت کے جوش میں اس نے بہت سی غلطیاں کیں مگر کسی کی کردار کشی کرنا تو بہت ہی گھٹیا حرکت ہے۔"

اور پھر یوں ہوا کہ ہم دونوں کے درمیان اس موضوع پر بحث چل پڑی کہ جو لڑکیاں گھر سے بغاوت کر کے شادی کرتی ہیں معاشرہ ان کو کس نظر سے دیکھتا ہے اور وہ بات اوصوری ہی رہ گئی۔ جو میں پوچھنا رہی تھی۔

لیکن اس ملاقات کا یہ فائدہ ہوا کہ میرے اور میرے میاں کے ذہن پر چھائی گرد چھٹ گئی۔ خاص طور پر جب انہیں یہ پتا چلا کہ فوزیہ یزدانی صاحب کی بیٹی ہے تو وہ بولے۔

"ہاں یار! یزدانی صاحب کو کون نہیں جانتا۔ ان کی شرافت کی تو سنا اچھا تھا۔ کچھ سنا تو تھا میں نے کہ ان کی ایک بیٹی نے اپنی مرضی سے خود سے شادی کر لی تھی مگر یہ نہیں جانتا تھا کہ فوزیہ ہی ان کی بیٹی ہے۔ خیر! ہمیں کیا کسی کے داخلی معاملات سے۔" وہ اخبار سے سر اٹھا کر بولے۔

"ٹھیک ہے تم اپنا کام کروانے چلی جایا کرو گھر کے قریب ہے۔ بجائے اس کے کہ کہیں دور جاؤ۔ مگر بہت زیادہ دوشی برصانے کی ضرورت نہیں۔"

اور یوں آہستہ آہستہ وہ تھمک اور تکلف کی دیوار گرنی شروع ہو گئی۔ میں ضرور تھا اپنے کام کے سلسلے میں اس کے پاس چلی جاتی تھی اور یہ تو ماننے والی بات تھی کہ اس کا کام بہت اچھا تھا۔ بڑی مہارت تھی اس کے ہاتھ میں اور یوری دیانت سے وہ اپنا کام کرتی تھی۔

اور اب جبکہ میں نے اپنی ڈاکٹر کے مشورے کو کچھ زیادہ ہی سیریس لے لیا اور بطور بہت قریبی نہ سہی دور ہی کی سہی بڑوسن کی حیثیت سے بھی میرا ایک آدھ چکر لگ جاتا۔ ایک دوسرے کے گھروں میں پکوان وغیرہ کا تبادلہ بھی ہونے لگا تو ظاہر سی بات ہے ایک دوسرے کی ذات میں دلچسپی بھی بڑھی۔

فوزیہ جب کبھی پارلر میں نہ ہوتی پارلر سے ملحقہ اپنے پورشن میں کسی گھریلو مصروفیت میں مصروف ہوتی تو وہاں بیٹھی خواتین میں بعض اوقات ہی وہ زیر بحث آجاتی۔ لے دے کر موضوع وہی اس کی پسند کی شادی ہوتا، میں تو بعض اوقات چڑ کر برا کہہ دیتی۔

"لوگ کبھی انسان کو معاف نہیں کرتے۔ بس وہ رب ہی ہے جو بندے کی غلطیاں بھلا دیتا ہے اور اس طرح کے معاملات میں تو لوگوں کی یادداشت بہت اچھی ہوتی ہے۔ ایسی باتیں کرنے میں لطف جو ملتا ہے میرا لہجہ کچھ زیادہ ہی طنزیہ ہو گیا تھا کہ وہاں بیٹھی ایک خاتون بڑے غصے سے بولیں۔

"ہاں تو ایسی باتیں بھلا بھولتی ہیں۔ اب وہ کتنی ہی اچھی کیوں نہ بنے، آپ کی دوست ہو، بڑوسن ہو، مگر حقیقت تو حقیقت ہی رہے گی ناں کہ آخر اس نے اتنے چاہنے والے ہاں باپ کو چھوڑ کر گھر سے بھاگ کر شادی کی اور وہ بھی ایک ایسے مرد سے جو نہ صرف پہلے سے شادی شدہ تھا بلکہ دو بچوں کا باپ بھی تھا۔ ارے ایسی عورت نہیں ہے۔"

وہ خاتون تو ابھی جانے کیا کیا بولتیں مگر میرا دماغ گویا سن ہو گیا۔ یہ ایک نیا انکشاف تھا میرے لیے بلکہ نیا کیا اک لرزائے والی حقیقت! میں اپنے آپ کو جانے کیسے سنبھال کر واپس آئی اور تمام دن خاموشی سے سر لیٹ کر لیٹی رہی۔ ایک عجیب سی کشمکش اور بے کلی میری ذات میں جاری تھی۔ مجھے سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ آخر مجھے کیا ہوا ہے۔ میرے میاں نے مجھ سے بار بار پوچھا اور جب میں نے انہیں حقیقت بتائی تو وہ بڑے آرام سے بولے۔

"سیدھی سی بات ہے تم اس کی ذات میں کافی حد تک انوالو ہو چکی ہو اور جب انسان کسی ایسے شخص کے بارے میں کچھ ایسا دیکھتا ہے جس کے لیے دل میں ہمدردی یا چاہت ہو تو فطری طور پر دکھ ہوتا ہے۔" میں نے حیرت سے دیکھا وہ کتنے آرام سے میری تکلیف کو سمجھ گئے تھے۔ میں نے محبت اور ممنونیت سے ان کے کندھے سے سر ٹکا دیا۔

اور پھر واقعی میں نے خود اپنا تجزیہ کیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ اک طرف دل کو یہ خبر سن کر شدید دھچکا لگا ہے۔ فوزیہ سے شدید نفرت محسوس ہو رہی ہے اور دوسری طرف دل چاہ رہا ہے کہ اسے اس کی کم عمری، نادانی اور حماقت کی رعایت دے دوں۔ مگر عورت ہو کر اتنی سنگ دلی کہ اپنی ہی ہم صنف کا گھیر اجاڑ کر خود اپنا گھر بسالیا۔ بس یہی کشمکش جاری تھی۔ ایک دو دن تو میرے اسی پریشانی میں گزرے۔ مگر پھر میں نے خود کو اس پرانی آگ سے یہ سمجھا کر نکالا کہ "۲۱ مئی نیر تو۔"

آہستہ آہستہ حالات پھر نارمل ہونے لگے۔ کچھ دن اور بہتے تو میں واقعی اس سے پچی اور بدظن رہی۔ مگر اس کی محبت اور خوش اخلاقی۔ باوجود مصروف ہونے کے وہ کبھی کبھار پکار کر بھیج دیتی۔ کبھی فون پر میری خیریت دریافت کرنے لگتی۔ ایک دن اس نے فون کر کے کہا۔ "ماجی! آئے گا، نیا کیشل لائی ہوں، بڑا اچھا رزلٹ ہے، دیکھیے گا کیسے چہرہ چمک اٹھے گا۔ احمد بھائی تو خدا ہی ہو جائیں گے۔"

میرا دل چاہا کہ اسے کہوں۔

"مرو کا کیا ہے وہ تو ہر دم خدا ہونے کو تیار رہتا ہے۔ یہ تو عورت ہی کو سنبھلانا پڑتا ہے۔" مگر میں خود پر ضبط پا کر بات ختم کر گئی۔ لیکن ہوا یہ کہ بہت عرصے تک میں خود کو اس سے روک نہیں پائی اور دوبارہ میرا میل جول کافی بڑھ گیا اور چونکہ اب دل کو کرید لگ چکی تھی تو پتا چلا کہ فوزیہ اور اس کے شوہر کی ملاقات بھی تب

ہوئی، جب فوزیہ اپنے دو کیشل سینٹر کے ہاسٹل میں تھی اور اس کا شوہر حبیب پروڈکٹ مینجر یہ ملاقات کب دل کی واردات میں بدل گئی پتا ہی نہ چلا اور جب احساس ہوا تو دونوں نے اپنے خاندان سے بغاوت کر کے شادی کر لی!

میں نے یہ سوچ کر اپنے دل کو بہلا لیا کہ کم عمر لڑکیاں اسی طرح شکاریوں کے ہتھے چڑھ جاتی ہیں۔ جو ہوا برا ہوا مگر جو بھی ہے اب تو شرافت سے دونوں اس شادی کو بھار ہے ہیں اور اس کا ثبوت ان کے پانچ بچے ہیں۔ مگر کبھی کبھار یہ پچاس ضرور دل کو تنگ کر لئی کہ اس کے شوہر سے پوچھوں کہ کبھی اس کو اپنے پہلے دو بچے یاد نہیں آئے۔ مگر اتفاق کی بات ہے کہ میری کبھی حبیب سے ملاقات نہ ہوئی تھی اور نہ ہی میں نے اسے کبھی دیکھا تھا اس کی ایک سوچ تو پار لاس کے گھر سے بالکل علیحدہ تھا اور وہ سارا وہ کوئی میری بہت قریبی پرزوں نہ تھی۔

فوزیہ کے گھر سے کھیر آئی تھی۔ خالی برتن کافی دن کے آئے رکھے تھے۔ اس دن میں نے کڑھی بنائی تو سوچا کہ اس بہانے چکر بھی لگ جائے گا اور برتن بھی دے آؤں گی۔ جب میں گئی تو فوزیہ پارلر میں نہیں تھی۔ پارلر سامنے والے پورشن میں تھا اور رہائشی حصہ پیچھے! میں نے پارلر میں ملازم لڑکی کو ڈونگہ لٹھایا اور فوزیہ کی بابت دریافت کیا۔ وہ یہ کہتے ہوئے اندر چلی گئی کہ باجی بس ابھی آرہی ہیں۔ میں اطمینان سے صوفے پر بیٹھ گئی۔ کافی ریش تھا۔ سب ایک دوسرے سے باتوں میں مصروف تھیں۔ زیادہ تر خواتین اپنی کالونی کی ہی تھیں۔ اسی لیے کوئی اجنبیت اور گھبراہٹ نہیں محسوس ہوئی تھی۔ میں جس صوفے پر بیٹھی تھی وہاں سے پوری نظر آتا تھا۔ میں نے اس دن حبیب کو پہلی بار دیکھا اور میرا دل تاسف سے بھر گیا۔

لبا ترنگا پہلو انوں جیسے جنسے کا مالک مونے مونے نقوش سیاہ رنگت، سریر صاف لگ رہا تھا کہ دگہ تھائی

ہوئی ہے۔ مطلب یہ کہ وہ گنجا تھا۔ گدلی اور سرخ آنکھیں جیسے کسی عادی شرابی کی ہوتی ہیں۔ وہ مجھے پہلی نظر ہی میں اچھا نہ لگا۔

اسے دیکھ کر خواتین میں تسخرانہ چہ گویاں شروع ہو گئیں۔ میرے دل کو ایک اور شدید دھچکا لگا تھا کہ اچھی خاصی خوب صورت لڑکی نے کیا سوچ کر اس آدمی کے لیے اپنے گھر والوں سے مخالفت مول لی۔ ایک عورت کا گھر اجاڑا۔ بچوں سے ان کا باپ چھین لیا۔ اتنے میں فوزیہ آئی دکھائی دی تو سب جیسے موضوع بدل گئیں۔ میں نے دل میں سوچا کہ یہ بھی دراصل اک سزا ہی تو ہے کہ لوگ اس کا جرم معاف کرنے پر تیار نہیں!

سچ تو یہ ہے کہ حبیب کو دیکھ کر اس کے جرم کی نوعیت کچھ اور بھی شدید محسوس ہوتی تھی۔ میں اس دن زیادہ دیر فوزیہ کے پاس نہیں بیٹھ سکی۔ گھر آکر بھی مجھے اک ملال نے گھیرے رکھا۔ کبھی فوزیہ پر ترس آتا کہ کیسے وہ اس شکاری مرد کے ہتھے چڑھ گئی اور کبھی نفرت اور بدگمانی جنم لے لیتی۔ میں نے احمد سے بھی بڑی افسردگی سے تذکرہ کیا تو وہ ہنستے ہوئے بولے۔

”بھئی دل ہے اب گدھی بلکہ گدھے پر آجائے تو کیا کیا جائے۔ خواتین کو یوں ہی تو احمق نہیں کہا جاتا۔“

ان کے اس جواب پر میں بھنا گئی اور ہماری اپنی بحث چھڑ گئی۔

گو کہ حبیب کو دیکھ کر مجھے شاک لگا تھا۔ دل اک بار پھر بدگمان ہوا تھا۔ مگر میں ان لوگوں میں سے ہوں جو تعاقبات کو آخری حد تک جا کر موقع دیتے ہیں۔ میں نے خود کو ملامت کی کہ کسی کی ظاہری صورت سے اس کی سیرت کا کیا اندازہ کیا جاسکتا ہے؟ ہو سکتا ہے کہ وہ شخص اتنی خوبیوں کا مالک ہو کہ فوزیہ جیسی اچھی خاصی خوب صورت اور بظاہر مضبوط عورت اس کی گرویدہ ہو گئی۔ مگر اس کی ان دیکھی خوبیوں پر اس کی پہلی بیوی اور نیچے اک پچاس کی طرح چھینے لگتے ہیں پھر یوں

ہوا کہ مجھے اک مزید کریدی لگ گئی۔

اس دن فوزیہ کا فون آیا۔ وہ مجھے کہہ رہی تھی کہ اپنی صفائی والی کو کچھ دن کے لیے اس کی صفائی کا بھی کہہ دوں کہ اس کی کام والی چھٹی پر تھی۔ کالونی میں وہ میرے ساتھ کافی مروت اور اعتماد و خلوص سے پیش آتی تھی کہ میرا رویہ شاید اس کو معقول لگتا تھا۔ گو کہ کہ وہ سری خواتین بھی بظاہر تو کام کی خاطر بہت خوشامد انداز اختیار کرتیں مگر جو گفتگو پیٹھ پیچھے ہوتی اس کی کچھ نہ کچھ خبر تو اسے بھی ہو ہی جاتی ہوگی جبکہ میں کوشش کرتی تھی کہ اس ”چغلی پروگرام“ سے بچنے کی کوشش کروں۔ کالونی میں میرا کوئی بہت زیادہ دوستانہ بھی نہ تھا۔ خوشی غم کے موقعوں پر اکٹھے ہو جاتے یا پھر جب سے فوزیہ کی طرف چکر لگتا تو وہاں کبھی کبھار کسی سے ملاقات ہو جاتی۔ شاید اسی وجہ سے اس نے مجھے کہا تھا کہ میں اسے کچھ بے ضرر لکھی تھی۔ مگر کیا کیا جائے وہ بے خبر تھی کہ اس کے بارے میں میں بھی بری طرح تجسس میں مبتلا تھی۔

اس دن جب میری ماسی اس کے گھر سے صفائی کر کے آئی تو میں نے سرسری سا ذکر اس کے سامنے چھیڑ دیا اور وہ تو شروع ہی ہو گئی۔

”باجی! آپ کو کیا بتاؤں۔ تو تو یہ ایہ فوزیہ باجی اوپر سے کتنی اخلاق والی بنتی ہے۔ مگر میں کو کیسے گھر سے دیکھی کر کے نکالا اور فون پر بھی کتنی لڑائی ہوئی۔“ میں نے اپنے لہجے کو نارمل رکھتے ہوئے پوچھا۔

”تمہیں نے تو سنا ہے کہ اس کے ماں باپ نہیں ملتے اس سے چھوڑ دیا ہے انہوں نے اسے۔“ وہ گویا جھکتے ہوئے رازداری سے بولی۔

”وہ باجی جی! جب فوزیہ کا بیٹا ہوا تھا تو ماں باپ آخر میں باپ ہوتے ہیں معاف کر دیا تھا انہوں نے۔ مگر اب وہ اسے سمجھاتے ہیں کہ تم اپنے میاں کو گھر بٹھا کر کھلانے کی عادت نہ ڈالو۔ اسے کہو کہ کام کرے۔ کب تک تم اسے مفت کی روٹیاں تڑواؤ گی۔“

برطانیہ میں محرمات شہری جموں کے خالق میچوں کے خوش نوا شاعر



سید حسن علی

کے سندرہ ہوئی۔ مگر کچھ کا ۲۰۲۰ مجموعہ شائع ہو گیا ہے۔

سہن راہی گیت نگاری میں ایک بڑا نام ہیں، انہوں نے گیت کے کیسوں کو بڑی وسعت اور کشادگی عطا کی ہے، انہوں نے سرنگیت کے سوتوں سے گیت کی نئی دنیا میں تخلیق کی ہیں۔
افتخار عارف

گیتوں کی قدیمی روایت میں پیش نظر گیتوں کے دل کی دھڑکن اور معاشرتی شعور کا نرم و نازک اسلوب سہن راہی کا افسانہ معلوم ہوتا ہے۔

ڈاکٹر فخر حسین

بذریعہ ذاک منگوانے کے لئے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

Idara-e-Adab London

63 - Hamilton Avenue Surbiton,
Surrey, KT67PW. U.K.

Phone: 0044-0208-397-0974

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام آپکو تمام ڈائجسٹ

ڈائریکٹ ڈاؤنلوڈنگ لنک کے ساتھ

ڈاؤنلوڈ کرنے کی سہولت دیتا ہے

آج ہی وزٹ کریں

www.paksociety.com

میں نے جیسا سمجھا، ویسا ہی پایا۔ اس نے بلاشبہ ایک سونے کی چڑیا پھانسی تھی اور اس کے نبھانے کی وجہ بھی یہی تھی کہ فوزیہ اسے پال رہی تھی۔

مجھے ابجھن یہ نہیں تھی کہ فوزیہ اس کے ساتھ کیوں اور کیسے نباہ کر رہی تھی۔ وہ اپنی تمام تر غلطیوں، حماقتوں اور خود غرضیوں کے باوجود ایک شریف عورت تھی۔ پانچ بچوں کی ماں تھی۔ اسے اس شادی کو ہر حال میں نبھانا ہی تھا۔

مجھے ابجھایا اس بات نے تھا کہ آخر وہ کیا شے تھی۔ وہ کون سا ایسا جذبہ تھا جو فوزیہ کو اس سب تک لے گیا۔ اس کی شادی کوئی اتنی زیادہ عمر میں نہ ہوئی تھی کہ بھوک اور نفسانی جذبے صحیح اور غلط کی تمیز نہ دے۔

میری ابجھن یہ تھی کہ میں فوزیہ کی شخصیت کو بالکل دو مخالف اور متوازی خانوں میں کیسے رکھوں؟ اک خانہ کہ جس میں وہ ایک نادان، جذباتی، کم عقل اور مظلوم و مجبور عورت نظر آتی تھی، جو اپنی غلطی کا خمیازہ بڑی خوشی سے بھگت رہی تھی۔ وہ اپنے شکاری کی محبت میں مبتلا تھی یا سب کو باور کرواتا تھی۔

دوسرا خانہ بالکل الگ، غلط رنگوں سے اٹا ہوا، غفونت بھرے جذبات کی کثافت لیے ایک ایسے خود غرض انسان کا جو گرد و پیش سے بے خبر صرف اپنی ذات کو ادا جانتا ہے اور اپنے منہ زور جذباتوں کے آگے معاشرے کی ہر ریت و روایت کو روند ڈالتا ہے۔

میں ابجھن میں ہوں کہ فوزیہ کو میں ان دونوں خانوں میں بیک وقت کیسے رکھوں۔ مگر وہ بھول بھلوں میں بھٹکتے مسافر کی طرح کبھی ایک خانے سے دوسرے خانے میں سرایت کر جاتی ہے اور میں سمجھ ہی نہیں پاتی کہ وہ کہاں ہے۔ کیا ہے۔

آپ سمجھ جائیں تو مجھے ضرور اس ابجھن سے نکالے گا!



بچوں کا ساتھ ہے۔ اس کو اتنا نہ بگاڑو، کل کو تمہیں بھی دھکا مار کر چلا گیا تو مگر تو یہ تو یہ! فوزیہ باجی نے جو اپنی ماں کی بے عزتی کی ماں کس دھکی دل سے گھر سے نکلی۔ بس وہ تو کہتی ہے کہ جس کو میرا میاں نہیں اچھا لگتا وہ میرا کچھ نہیں، ہمارے معاملے میں کوئی نہ بولے۔ فن پر بھی یہی بات چل رہی تھی۔ اللہ معاف کرے ایسی اولاد سے۔“

وہ تو اور بھی جانے کیا بولتی رہی مگر مجھے جو اس کے متعلق جاننے کا تجسس تھا اب لگا کہ میں کچھ اور ابجھ گئی ہوں۔ فوزیہ کی شخصیت اک ابجھی ریشمی تھئی کی مانند تھی جس کا کوئی سرا میرے ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔

کبھی وہ اک رنگین و نادان تھئی کی مانند لگتی۔ معاشرے و روایات کی باغی جو ہر خطرے سے بے خبر ڈال پر اپنے پھول کے ہمراہ مست و مگن ہو کر اڑتی پھرتی تھی۔

کبھی یہ رنگین تھئی اک خون آشام چمکاؤ کا روپ دھار لیتی جو کہ مظلوم عورت کے ارمانوں کا خون کر گئی تھی۔

کبھی وہ مظلوم لگنے لگتی۔ اک ایسی روح جس نے اپنے تمام دکھ، رنج اور تکلیف کو اپنے اندر اتار کر خوشنما پرو لٹکا رکھا تھا، ایسا قیدی جو اپنے شکاری کی محبت میں مبتلا تھا۔

اور کبھی وہ اک ایسی آن بان والی عورت کے روپ میں نظر آتی جو اپنے شوہر، گھر، بچوں کی حفاظت کے لیے پوری طرح سینہ سپر تھی۔ جو حالات کا ہر جبر سے اپنے گھر کی حفاظت کرنا جانتی تھی اور اس کی خاطر اپنے ماں، باپ کی بد اخلاقت بھی برداشت نہیں کرتی۔

کبھی مجھے وہ ایسی خود سر اور باغی نافرمان اولاد لگنے لگتی جسے اس کے ماں، باپ کی ناراضی، گھماؤ میں لے لیا تھا مگر ہنوز وہ اپنی شکست اور غلطی تسلیم کرنے پر تیار نہیں تھی۔

مگر جو بھی تھا، حبیب کے بارے میں مجھے کوئی شک شبہ نہ رہا۔ اس کے کردار میں کوئی ابہام نہ تھا۔ اسے



جوئے قاضی

اندھیرا جلال

”ساجدہ! او ساجدہ!“
 وہ تنور پر روٹیاں پکار کر پینے سے شرابور کپڑے
 سکھانے کے لیے ابھی چارپائی پر بیٹھی ہی تھی کہ اہل
 کی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔
 ”جی اہل۔“ اس کے منہ سے کمزور سی آواز نکلی۔
 ”مسراب کے کپڑے دھو لیے؟“ مسراب اس کے
 بڑے بھائی کا نام تھا۔
 ”نہیں اہل! وہ دراصل صبح سے کام ہی اتنے تھے
 کہ مہلت ہی نہیں ملی۔ رات کو آندھی آنے کی وجہ
 سے سارا گھر مٹی دھول اور گرد و غبار سے بھرا ہوا تھا۔
 پہلے اس کی صفائی کی گئی۔ پھر برتن دھونے کے بعد
 دوپہر کا کھانا پکایا تھا اور اب اتنی گرمی میں تنور پر روٹیاں
 لگانے کے بعد اپنا پسینہ سکھانے کے لیے دو منٹ بیٹھی
 تھی۔“

مکمل بناؤں



”ایک سوٹ ہی دھونا تھا۔ اس میں وقت ہی کتنا لگتا ہے۔“ ماں اس کے لیے تمام کاموں کو نظر انداز کر کے آرام سے کہہ رہی تھیں۔

”چل اب جلدی سے دھو دے۔“

”وہ ابا!۔“ اس نے ایک نظر انتہائی دلچسپی سے لی دی دیکھتی سونیا پر ڈالی اور اچکچاتے ہوئے بولی۔

”اماں! آپ سونیا سے کہہ دیں وہ دھو دے گی۔ میں تھک گئی ہوں۔“

اس کی اس بات پر سونیا نے خاصی بیڑھی نگاہ سے اسے دیکھا۔ سونیا اس سے دو سال چھوٹی تھی اور یہ بھی قدرت کی ستم ظریفی ہی تھی کہ وہ جتنی بد صورت تھی۔ سونیا اتنی ہی خوب صورت واقع ہوئی تھی۔ لانا قد، سرخ و سفید رنگت، انتہائی مناسب سرپا، گہری جمیل جیسی آنکھیں اور اس پر گھنے سیاہ بال اس سب کے ساتھ اسے اپنے حسن کا احساس بھی بہت تھا۔ ساجدہ کو تو وہ کسی خاطر میں ہی نہیں لاتی تھی ذرا ذرا سی بات پر بے نقط سناوتی تھی اور ساجدہ سر جھکا کر سب سن لیتی تھی۔ شاید اس کی وجہ اس کا گھر بھر کا چیتا ہونا بھی تھا۔ ابا تو جیسے ہی حسن پرست، لیکن اماں بھی اس کا بہت خیال کرتی تھیں۔

”پتا تو ہے وہ کسی کام کو ہاتھ نہیں لگاتی اور دیے بھی ابھی تو وہ کالج سے سسکی ہاری آئی ہے۔“ اماں کی بات پر وہ بالکل چپ ہو گئی البتہ سونیا کے ساتھ بیٹھ کر بیٹھ کر دیکھتا تو چپ نہیں رہ سکا۔

”اماں! سونیا کو آئے ہوئے ایک گھنٹے سے اوپر ہو چکا ہے اور تھکے ہوئے کی بھی خوب کمی، تپا بھی تو سسکی ہوئی ہیں۔ ابھی اتنی گرمی میں شور پر روٹیاں لگا کر آرہی ہیں۔“

”تم چپ کرو۔“ سونیا نے اسے ڈانٹا۔ ”تم سے کس نے کہا ہے بولنے کو۔“

”کیوں کیا میں نے کچھ غلط کہا ہے۔ گھر کا سارا کام تپا کرتی ہیں۔ تمہیں بھی تو کچھ ان کی مدد کروانی چاہیے۔“

”اگر ان کا اتنا ہی خیال ہے تو کروادنا کرونا

اس کے ساتھ گھر کا کام چلو مستقبل کی بھی پرمیش ہو جائے گی۔“ سونیا نے لاپرواہی سے کہا۔

”میرے نہیں اپنے مستقبل کی فکر کرو۔ تم کیا کرو گی مستقبل میں۔“ قوی تپ کر بولا۔

ان دونوں کی لڑائی طول پکڑتی جا رہی تھی۔ ساجدہ ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کپڑے دھونے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اسے پتا تھا کہ کپڑے آخر کار اسے ہی دھونے پڑیں گے۔ سونیا گھر کے کسی کام کو ہاتھ لگانا کسر شان سمجھتی تھی۔

وہ کپڑے دھو رہی تھی جب ابا گھر میں داخل ہوئے ان کے ہاتھوں میں خوبالی اور آلو بخاروں کی تھیلیاں تھیں۔

”السلام علیکم ابا!۔“ اس نے بہت جذب سے ابا کو سلام کیا جس کا جواب انہوں نے سر ہلا کر دیا۔ ساجدہ ابا سے بہت پیار کرتی تھی یہ بات وہ اچھی طرح جانتی تھی لیکن ابا اس سے کتنا پیار کرتے تھے اور جانے کرتے بھی تھے کہ نہیں یہ بات وہ کوشش کے باوجود کبھی بھی نہیں جان سکتی تھی۔

سونیا ابا کو دیکھ کر فوراً لی وکھٹنا چھوڑ کر باہر آئی اور ٹھنڈے پانی کا گلاس لے کر ابا کے پاس آئی۔

”السلام علیکم ابا!۔“ اس نے پانی کا گلاس ابا کی طرف پڑھایا۔ ایسے موقعوں پر وہ بہت فرماں بردار بن جاتی تھی۔

”وعلیکم السلام۔ جیتی رہو، خوش رہو بیٹا۔“ ابا نے خوش ہو کر اس کے سر پر ہاتھ رکھا پھر گھونٹ گھونٹ پانی پینے لگے۔ نجانبے کیوں ساجدہ کے اندر ڈھیر ساری شگنی اتر آئی۔

”دیکھا، خوبانوں اور آلو بخاروں کو دیکھ کر کیسے باہر آئی ہے۔“ نعمان نے فوراً سونیا پر چوٹ کی۔

”تم چپ کرو۔ میں تو لے کر ہی اپنی بیٹی کے لیے آیا ہوں۔“ ابا نے پیار سے سونیا کی طرف دیکھا۔

سونیا کی گردن غر سے مزید تر گئی۔ اس نے جتانی ہوئی نظروں سے نعمان کو دیکھا۔ نعمان ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔

ساجدہ نے ایک نظر سب کو دیکھا۔ نعمان اور سونیا خوبائیاں اور آلو بخارے کھا رہے تھے اور ابا ان دونوں کو کھاتے دیکھ کر خوش ہو رہے تھے۔ نجانبے کیوں ساجدہ کا دل چاہنے لگا کہ ابا اسے آواز دے کر کہیں ”ساجدہ! چل بس کر کپڑے دھونا۔ تو بھی آکر کھا لے۔“ لیکن۔۔۔

”اب بس بھی کر سونیا! ساجدہ کب سے کام میں لگی ہے۔ اسے بھی دینے ہیں تھوڑے سے سہراب کے لیے بھی رکھوں گی۔“ وہ کپڑے تار پر پھیلانے کے بعد واش بیسن پر ہاتھ دھو رہی تھی جب اس نے اماں کو سونیا سے کہتے سنا۔

”لیس۔ نہیں کھاتی میں۔“ سونیا غصے سے اٹھ کھڑی ہوئی ”وے دیں سارے آپ اپنی چیمٹی کو۔“ وہ زور زور سے پاؤں پختی اندر جانے لگی اور ابا فوراً بے چین ہو گئے۔

”کھانے دیتیں تم سونیا کو۔ ساجدہ کے لیے میں اور لے آتا۔“ وہ اماں سے مخاطب ہو کر بولے پھر سونیا کو آواز دینے لگے۔

ساجدہ چپ چاپ اندر پلٹ گئی۔ اسے کسی نے رکھنے کے لیے کہا بھی نہیں تھا۔



وہ لاپٹے پر کدو شیشے کی ٹیل بنا رہی تھی جب اسے بیرونی دروازہ کھلنے اور زور زور سے باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں اس نے کھڑکی سے دیکھا۔ سونیا کے ساتھ دو لڑکیاں تھیں۔ وہ تھوڑا سیر کی اسٹوڈنٹ تھیں غالباً یہ لڑکیاں اس کے ساتھ کالج سے گھر آئی تھیں کیونکہ انہوں نے کالج یونیفارم پہن رکھے تھے۔ سونیا انہیں لے کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ جس میں وہ لوگ عام طور پر مہمانوں کو بٹھاتے تھے۔

”کون ہیں یہ؟“ تھوڑی دیر بعد سونیا اس کے کمرے میں آئی تو ساجدہ نے دھیرے سے پوچھا۔

”یہ۔۔۔ یہ میرے ساتھ کالج میں پڑھتی ہیں۔ کب

سے کہہ رہی تھیں، سونیا تمہارے کھرچتے ہیں۔ میں ہی انہیں ٹال رہی تھی لیکن آج تو انہوں نے اتنا اصرار کیا کہ لے کر آنا ہی پڑا۔“ سونیا نے کمر پر ہاتھ رکھے جلدی جلدی تفصیلات بتائیں۔

”تم انہیں ٹال کیوں رہی تھیں؟“ اس کا موڈ اچھا دیکھ کر ساجدہ نے ایک اور سوال بھی کر لیا۔

”بس گھر کی کنڈیشن کی وجہ سے ہی ٹال رہی تھی۔ اب دیکھو نا ہمارا گھر اس قابل ہے کہ ہم اس میں کسی اچھے اور بڑے گھر کے افراد کو بلا سکیں۔“

”کیوں، گھر میں کیا خرابی ہے؟ اتنا اچھا تو ہے۔“ ساجدہ کے بغیر نہیں رہ سکتی۔

”بس رہنے دو۔ تمہیں کیا پتا“ اچھا اور بڑا گھر کے کہتے ہیں۔ تمہاری تو ساری زندگی کنویں کے مینڈک کی طرح اسی گھر میں گزری ہے نا۔“ سونیا نے استہزائیہ انداز میں کہا اور ساجدہ نے شرمندہ ہو کر سر جھکا لیا۔

سونیا ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھی سوہ بھلا کب کسی کے گھر جاتی تھی۔ وہ تو محلے میں بھی بہت کم جاتی تھی۔

”خیر میں یہ کہنے آئی تھی۔ اچھی سی چائے تو بنا دو اور ساتھ میں کچھ کھانے کے لیے بھی ہو۔ یہ نوی کہاں

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے فار و افتخار کے 4 خوبصورت ناول

”

”

”

ناول منکوانے کے لئے فی کتاب ڈاک خرچ - 45/- روپے

منکوانے کا پتہ:

مکتبہ عمران ڈائجسٹ: 37 - دروازہ 1، کراچی - فون نمبر: 32735021

بہاوی سے کچھ کھانے کے لیے منگوالیتی ہوں۔“ اس نے کہنے کے ساتھ ہی ادھر ادھر دیکھا۔
”نوی گھر نہیں ہے۔“ ساجدہ نے بتایا۔

”اوہ تو پھر اب بازار کون جائے گا؟“
”تم فکر مت کرو۔ میں چائے کے ساتھ کباب تل لیتی ہوں اور بسکٹ اور نمکونے گھر میں۔“

”چلو ٹھیک ہے۔ میں اپنی دوستوں کے ساتھ جاکر بیٹھتی ہوں۔ تھوڑی دیر بعد خود ہی آکر سب کچھ لے جاؤں گی۔“ وہ سر ہلا کر اندر چلی گئی۔

اس نے کچن میں جاکر کباب تلے چائے بنائی پھر ٹرے میں ساری چیزیں سیٹ کر کے سونیا کا انتظار کرنے لگی لیکن جب سونیا نہیں آئی تو وہ چائے اور کباب ٹھنڈے ہونے کے خیال سے ان کے کمرے کی طرف گئی۔ کمرے کے دروازے کا ایک پٹ بند تھا اور ایک کھلا ہوا تھا۔ اندر سے سونیا کی اور اس کی دوستوں کی باتیں کرنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ اس نے دروازے پر دستک دی۔ ”سونیا!“

”یہ کون ہیں؟“ شاید اس کی کسی دوست نے متحس انداز میں پوچھا تھا۔

”ساجدہ ہوگی۔“ سونیا کی آواز آئی۔

”ساجدہ تمہاری بڑی بہن۔ تو انہیں اندر بلاؤ۔“ اس کی دوست نے کچھ حیرت سے کہا۔

”آجائیں نا پلیز۔ آپ باہر کیوں کھڑی ہیں؟“ سونیا کی ایک اور سہیلی نے اسے آواز دی۔

”ساجدہ! آجاؤ۔“ سونیا کو بلول خواستہ کہنا پڑا۔
وہ جھجکتے ہوئے اندر داخل ہوئی اور ٹرے ٹیبل پر جا کر رکھ دی۔ پھر دھیرے سے کانپتے ہوئے لہجے میں انہیں سلام کیا: ”السلام علیکم!“

وہ دونوں ہی بہت ماڈرن قسم کی لڑکیاں تھیں لیکن اس وقت دونوں ہی حیرت کے سمندر میں غوطہ زن نظر آرہی تھیں۔

”یہ یہ تمہاری بہن ہے۔ میرا مطلب ہے ساجدہ۔“ سونیا کی ایک دوست نے اٹکتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں!“ سونیا شرمندہ نظر آرہی تھی۔ ”ساجدہ تم

کیوں لے کر آئیں۔ میں نے کہا تھا میں خود آکر لے جاؤں گی۔“ سونیا شفر سے بولی۔

”آپ بیٹھیں نا۔“ سونیا کی دوسری دوست نے بڑے ”اخلاق“ سے کہا۔

”نہیں۔ ہم میں چلتی ہوں۔“ وہ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے باہر نکل آئی۔

اپنی دوستوں کو رخصت کرنے کے بعد سونیا سیدھی اس کے پاس آئی تھی۔ ”بہت شوق ہے لوگوں کو خود کو دکھانے کا۔“

”سونیا!“ اس نے دکھ سے کہا۔ ”میں صرف چائے اور دوسری چیزیں ٹھنڈی ہونے کے خیال سے لے کر گئی تھی۔“

”اگر چائے ٹھنڈی ہو رہی تھی تو یہ میرا مسئلہ تھا لیکن تمہیں وہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ تم ان لڑکیوں کو نہیں جانتی ہو اب یہ بات پورے کالج میں پھیلا دیں گی۔“

”تو تو کیا ہو جائے گا۔“ ساجدہ کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ ”کیا میری بد صورتی اتنا برا گناہ ہے کہ جس کا لوگوں کو پتا چل جانے سے تم بدنام ہو جاؤ گی۔ لوگ تم پر باتیں کرنا شروع ہو جائیں گے۔“

”آخر میں نے ایسا کیا کہہ دیا ہے کہ تم رونا شروع ہو گئی ہو۔“ سونیا نے بے حد الجھن سے اس کو دیکھا روتے ہوئے تو وہ اور بری لگ رہی تھی۔

”کو کچھ سمجھتی کچھ ہو تم۔ تم سے تو بات کرنا ہی فضول ہے۔“ وہ پیر پختے ہوئے وہاں سے چلی گئی۔



چھٹی کا دن تھا مگر اس کے لیے ہفتے کا کوئی دن چھٹی کا نہیں ہوتا تھا۔ اور چھٹی کے دن تو اس کے کاموں میں کہیں زیادہ اضافہ ہو جاتا تھا۔ اس دن گھر کے سارے افراد اپنی اپنی مرضی کا ناشتا اور ایک پر تکلف لچ کرنا چاہتے تھے۔ اس دن اسے تمام گھر والوں کے کپڑے بھی دھونا ہوتے تھے۔ جس میں شاید سب سے زیادہ کپڑے سونیا کے ہی ہوتے تھے لیکن وہ گھر

کے تمام کاموں سے مکمل طور پر بے نیاز تھی۔
آج دوپہر کے کھانے میں وہ کرپٹے گوشت اور پلاؤ بنا رہی تھی۔ پلاؤ بنانے کی فرمائش صبح سراب کر کے کیا تھا۔ وہ اپنے کسی دوست کی فیکٹری میں سپر وائزر تھا اور معقول تنخواہ پاتا تھا لیکن آدمی تنخواہ اپنے اوپر خرچ کرنا تھا اور باقی آدمی اہل کو دیتا تھا۔

البتہ سونیا کو اپنا حصہ وصول کرنا خوب آتا تھا۔ وہ مختلف جیلوں بمبائوں سے اس سے رقم اینٹھتی رہتی تھی اور ساجدہ سوچتی تھی کہ یہ دنیا صرف خوب صورت اور چالاک لوگوں کے لیے ہے۔ اس جیسے بد صورت کم اعتماد اور بزدل لوگوں کی شاید اس دنیا میں کوئی جگہ نہیں۔

”السلام علیکم خالہ!“ وہ واشنگ مشین سے کپڑے نکال کر پالٹی میں ڈال رہی تھی جب خالہ صغریٰ اندر داخل ہوئیں۔ اسے خالہ اچھی لگتی تھیں کیونکہ وہ اس سے ہمیشہ پیار سے بات کرتی تھیں۔ دوسروں کے برعکس ان کی آنکھوں میں اس کے لیے حقارت یا ترحم کے نہیں بلکہ خلوص کے جذبات موجزن ہوتے تھے۔

”وہیکم السلام۔“ انہوں نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور ادھر ادھر نظرس دوڑائیں۔ سامنے ہی سونیا برآمدے میں کولر لگا کر تخت پر نیم دراز ہوئی ڈائجسٹ پڑھنے میں مصروف تھی۔ نعمان داک مین چڑھائے شاید گانے سن رہا تھا جبکہ سراب موبائل پر کسی سے گپیں بانٹنے میں مصروف تھا۔

”اہل کہاں ہے تمہاری؟“ اہل کے نظر نہ آنے پر انہوں نے پوچھا۔

”اہل اندر کمرے میں ہیں۔ بلاؤں انہیں؟“ ساجدہ نے مستعدی سے پوچھا۔

”نہیں۔ نہیں۔ میں اندر چلی جاتی ہوں وہیں بات کر لوں گی۔“ خالہ صغریٰ نے اپنا شٹل کاک برقع اتار کر ہاتھ میں پکڑا اور اندر چلی گئیں۔ ساجدہ نے ایک ٹھنڈی سائیں لے کر انہیں اندر جاتے ہوئے دیکھا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ اہل سے کیا بات کریں گی۔ خالہ صغریٰ رشتے کرانے کا کام کرتی تھیں اور اہل نے

ان کے ذمہ ساجدہ کے رشتے کی تلاش کا کام لگایا تھا اس سے پہلے ثریا آپا جو ساجدہ اور سراب سے بھی بڑی تھیں، کارشتہ بھی انہوں نے ہی کروایا تھا اور آج وہ اپنے گھر میں اپنے دو بچوں کے ساتھ خوش تھیں۔

وہ اپنے کام سے پوری طرح مخلص تھیں لیکن ساجدہ کی بد صورتی یہاں بھی آڑے آرہی تھی جو لوگ ساجدہ کو دیکھنے آتے تھے وہ سونیا کو پسند کر کے چلے جاتے تھے اور ساجدہ کو ان لوگوں سے کوئی شکایت بھی نہیں تھی۔ بھلا اندھیرے اور اجالے میں سے کس کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے اجالے کا اور سونیا روشنیاں بکھیرنے والا اجالا ہی تو تھی اور وہ سر تپا اندھیرا۔

”سارا دن کولہو کے ٹیل کی طرح کام میں جتی رہتی ہے۔“ وہ کسی کام سے اس کمرے کے پاس سے گزری تو اسے خالہ صغریٰ کی آواز آئی۔ ”کچھ تو احساس کرو اس کا۔ کیا تمہاری کچھ نہیں لگتی وہ۔“

”اے تو کمرے کے کام بچیاں ہی کرتی ہیں۔ مجھ سے تو اب کام نہیں ہوتا۔ ساری زندگی کام کیا ہے۔“ اہل برامان گئی تھیں شاید۔

”اس گھر میں صرف ساجدہ ہی لڑکی نہیں ہے۔ میں سونیا کی بات کر رہی ہوں۔ اس بھی گھر کے کاموں میں کچھ دلچسپی لینی چاہیے۔“

”نا کالج میں پڑھتی ہے نا۔ پڑھائی کی وجہ سے ٹائم ہی نہیں ملتا اسے کہ وہ گھر کے کاموں میں حصہ لے۔ پھر باپ کی بھی بہت لاڈلی ہے وہ۔ وہ ذرا سختی نہیں کرنے دیتے مجھے اس پر۔“

”معاف کرنا صرف باپ کی ہی نہیں مجھے تو وہ تمہاری بھی بہت لاڈلی لگتی ہے اور پڑھائی کی بھی خوب کسی میں تو جب بھی آؤں وہ یا تو رسالہ پڑھ رہی ہوتی ہے یا پچھلی وہ دیکھ رہی ہوتی ہے اور آج تک اسے کبھی اتنی توفیق تو نہیں ہوئی کہ مجھے سلام ہی کر لے۔“ خالہ صغریٰ کو سونیا سے بہت سی شکایتیں تھیں۔

”اے بھی بچی ہے نا۔ سمجھ جائے گی آہستہ آہستہ۔“ اہل نے جیسے کلن پر سے مکھی اڑائی۔ ”تم

”اہل اندر کمرے میں ہیں۔ بلاؤں انہیں؟“ ساجدہ نے مستعدی سے پوچھا۔

”نہیں۔ نہیں۔ میں اندر چلی جاتی ہوں وہیں بات کر لوں گی۔“ خالہ صغریٰ نے اپنا شٹل کاک برقع اتار کر ہاتھ میں پکڑا اور اندر چلی گئیں۔ ساجدہ نے ایک ٹھنڈی سائیں لے کر انہیں اندر جاتے ہوئے دیکھا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ اہل سے کیا بات کریں گی۔ خالہ صغریٰ رشتے کرانے کا کام کرتی تھیں اور اہل نے

”اہل اندر کمرے میں ہیں۔ بلاؤں انہیں؟“ ساجدہ نے مستعدی سے پوچھا۔

بتاؤ وہ جو کام میں نے تمہارے ذمہ لگایا تھا اس کا کیا بنا؟“ ساجدہ جانتی تھی کہ اہل کون سے کام کے بارے میں استفسار کر رہی ہیں۔ اس کا جی ایک دم اچاٹ ہو گیا وہ مڑ کر جانے لگی لیکن اسی وقت خالہ کی آواز آئی۔

”ساجدہ! ایک گلاس پانی لانا۔“

”اچھا خالہ لاتی ہوں۔“ اس نے فریج میں سے پانی کی بوتل نکالی اور اسے گلاس میں انڈیلنے لگی پھر کچھ سوچ کر اس نے روح افزا کی بوتل نکال کر شربت بنا لیا۔

”کیسے لوگ ہیں ہلڑ کا کیا کرتا ہے؟“ وہ کمرے میں گئی تو اہل خالہ سے پوچھ رہی تھیں اس نے شربت کا گلاس خالہ کی طرف بڑھایا۔

”ایسے ہی متوسط طبقے کے لوگ ہیں۔ لڑکا کسی فیکٹری میں کام کرتا ہے شاید۔“ خالہ نے کچھ چونک کر شربت کو دیکھا پھر گھونٹ گھونٹ بننے لگیں۔

اس نے دوسرا گلاس اہل کی طرف بڑھایا جو انہوں نے فوراً لے لیا اور اسے باہر جانے کا اشارہ کیا۔ صاف ظاہر تھا اہل اس موقع پر اس کی غیر حاضری چاہتی تھیں۔

وہ کمرے سے تو باہر آگئی۔ لیکن آگے جانے کے بجائے وہیں دروازے کے ساتھ ٹھہری رہی۔

”وہ لوگ ساجدہ کو پسند کر لیں گے؟“ اہل کی آواز سنائی دی۔

”کہہ تو رہے تھے کہ ہمیں خوب صورت نہیں خوب سیرت لڑکی کی تلاش ہے جو خاندان والوں کے ساتھ مل جل کر رہے اور گھر کا کام کاج کرنا بھی اچھی طرح جانتی ہو۔“

”نہنے کو سب ہی کہہ دیتے ہیں۔“ اہل کی آواز تلخ ہو گئی۔ ”لیکن یہاں آکر اور ساجدہ کو دیکھ کر ان کے تیور ہی بدل جاتے ہیں۔“

”بس بس! آج کل لوگوں کے دیدوں کا پانی ہی مر گیا ہے۔“ خالہ صغریٰ کچھ ابدیدہ ہو گئیں۔ ”خود ان کے بیٹے چاہے جتنی خوفناک شکلوں کے ہوں لیکن ہو میں ان کو حور پریاں ہی چاہئیں۔“

”میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ ساجدہ کی شادی کیسے ہوگی۔“ اہل نے ٹھنڈی آہ بھری ”کیا ساری زندگی وہ ایک بھاری پتھر کی طرح ہمارے سینے پر دھری رہے گی۔“

ساجدہ نے قدم آگے بڑھانے کی کوشش کی لیکن وہ تو بالکل سن ہو چکے تھے۔ اس نے بڑی مشکل سے خود کو کھینٹا اور واشنگ مشین کے قریب جا کر اس میں سے کپڑے نکالنے لگی۔ اس کے ذہن میں اہل کے الفاظ کسی ہتھوڑے کی طرح برس رہے تھے۔

”بھاری پتھر۔ بھاری پتھر۔“

”اچھا بیٹی! میں جا رہی ہوں۔“ وہ مڑ نکال رہی تھی جب خالہ واپسی کے لیے جاتے ہوئے اس کے پاس سے گزریں۔

”خالہ! بوسہ۔“ اس نے خالہ کو پکارا۔ خالہ جاتے جاتے رک گئیں اور اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگیں۔

”خالہ! وہ۔۔۔ وہ دراصل۔“ وہ خالہ سے کہنا چاہتی تھی کہ وہ رشتہ دیکھنے کے لیے آنے والوں کو منع کر دیں اس میں اب مزید مسترد ہونے کی ہمت نہیں رہ گئی تھی۔

”خالہ! وہ آپ پلیر کھانا کھا کر جائے گا۔ بس تیار ہونے والا ہے۔“ آخر اس نے فقرہ مکمل کر ہی لیا لیکن ان الفاظ سے نہیں جن سے وہ مکمل کرنا چاہتی تھی۔

”نہیں بیٹی! دیر ہو رہی ہے پھر کبھی کھانوں گی۔ جیتی رہ خوش رہ بیٹا۔“ انہوں نے جاتے جاتے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی تو اس کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔ اسے لگا خالہ نے اسے دعا نہیں بلکہ بد دعا دی ہو۔



جس دن رشتہ دیکھنے والوں نے آنا تھا اس دن اہل نے ٹریا آپا کو بلا بھیجا تھا۔ اپنے ساتھ وہ ساجدہ کے لیے اپنے جینز کا ایک گھسا پٹا اور آؤٹ آف فیشن قسم کا سوٹ لائی تھیں جو اہل نے ان سے لانے کے لیے کہا

تھا۔ کیونکہ ساجدہ کے پاس ایک بھی ایسا ڈھنگ کا سوٹ نہیں تھا جسے وہ رشتہ دیکھنے کے لیے آنے والے والوں کے سامنے پہن سکتی۔ پہلے اہل نے سونیا سے اس سلسلے میں مدد چاہی تھی لیکن اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا تھا کہ اس کے اتنے ”اسمارٹ اسمارٹ“ سے کپڑے بھلا ساجدہ جیسی ”اچھی خاصی“ ٹڑکی کو کہاں پورے آئیں گے۔ نتیجتاً ”ٹریا آپا“ سے اس سلسلے میں مدد چاہی گئی تھی اور وہ اپنے ساتھ بقول اہل کے اپنے جینز کا سب سے اچھا سوٹ لائی تھیں۔ یہ بلیک کلر کا رنگینی سوٹ تھا جو کڑھائی سے لبالب بھرا ہوا تھا۔ اسے پہن کر ساجدہ اچھی تو کیا لگتی مگر خالہ کیسے لگنے لگی۔ اور جب اہل نے مہمانوں کے آنے سے کچھ دیر پہلے سونیا سے کہا کہ وہ بڑوس میں چلی جائے تو وہ مستحضرانہ نظروں سے ساجدہ کی طرف دیکھنے لگی۔

”کیا میرے یہاں سے چلے جانے سے وہ لوگ ساجدہ کو پسند کر لیں گے؟“

”یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے سونیا! تم یہاں سے جاؤ۔“ اہل نے رکھائی سے کہا۔

”اچھا بابا! جاتی ہوں۔ ناراض کیوں ہوتی ہیں۔“ اہل کے تیور خطرناک دیکھ کر اس نے مصالمانہ انداز اختیار کیا پھر ذرا جھک کر آہستہ سے بولی۔ ”اگر تھوڑے سے پیسے دے دیں تو اچھا ہو گا۔ اب ساتھ والوں کے گھر کیا میں خالی ہاتھ بیٹھی رہوں گی۔“

اہل نے اسے گھور کر دیکھا۔ ”ابھی دو دن پہلے ہی تم نے اپنے باپ سے اتنے خاصے پیسے اٹھائے ہیں۔ وہ کہاں گئے ہیں۔“

”وہ۔۔۔ وہ تو خرچ ہو گئے ہیں۔“ سونیا نے شاہانہ انداز سے کہا۔

”تمہارا باپ کون سا وزیر اعظم ہے کہ جتنے پیسے آئیں خرچ کر دالتی ہو۔ کان کھول کر سن لو میرے پاس کوئی پیسہ نہیں ہیں۔ تمہارے ابا تمہیں تو جھٹ سے پیسے پکڑا دیتے ہیں اور مجھے وہ ہزار منتوں اور ترلوں کے بعد کہیں جا کر دیتے ہیں۔“ اہل کو صبح والا واقعہ یاد آیا کہ جب انہوں نے صبح ساجدہ کو دیکھنے کے لیے

آنے والے مہمانوں کی خاطر تواضع کے لیے ان سے پیسے مانگے تو وہ کتنا غصے میں آگئے تھے۔

”کیا میں کسی خزانے پر بیٹھا ہوا ہوں جب دیکھو پیسے مانگنے آ جاتی ہو۔“

”آپ کو بتایا تو تھا کہ ساجدہ کو دیکھنے کچھ لوگ آ رہے ہیں۔“ اہل نے بتایا۔

”بتائے مجھے۔ ہر دو تین ہفتے کے بعد ہی ڈر لانا ہوتا ہے۔ لیکن کیا کبھی اس کا کوئی نتیجہ بھی نکلا ہے؟ تمہیں یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ایسے لوگ صرف کھانے پینے کے لیے آتے ہیں اور بس۔“

”تو آپ ہی بتائیں مجھے کہ میں کیا کروں۔ رشتہ کرنے کا یہی طریقہ رائج ہے۔ دعا کریں کہ آج آنے والے ساجدہ کو پسند کر لیں۔“

”میں تو کروں گا دعا۔ لیکن مجھے نہیں لگتا کہ ایسا ہو گا۔ سہرحال یہ پیسے لو اور میری جان چھوڑو۔ پیسے لیے بغیر کہاں ٹلو گی تم۔“ اہل نے کہا گویا احسان کیا اور اہل خون کے گھونٹ پی کر رہ گئیں۔

اہل سے تھوڑی بحث کے بعد سونیا برا منہ بناتے ہوئے وہاں سے رخصت ہو گئی۔ اہل نے ساجدہ سے کہا کہ وہ تیار ہو جائے۔ صبح سے کام کر کے وہ خاصی تھک چکی تھی۔ دیسے تو ٹریا آپا اس کی مدد کے خیال سے صبح جلدی آگئی تھیں لیکن یہاں آکر انہوں نے سوائے اپنی سانس نندوں کی برائیوں کے اور کچھ نہیں کیا تھا۔

اور اسے کون سا کوئی آج کل کی لڑکیوں کی طرح تیار ہونا آتا تھا۔ منہ صابن سے دھو کر ٹریا آپا کے لائے کپڑے پہنے۔ بالوں کی لمبی سی چوٹی بنائی اور اس کی تیاری مکمل ہو گئی۔ کس کے چوٹی کیے اور بے حد لمبا اور کھلا بلیک کلر کا لبالب کڑھائی سے بھرا سوٹ پہنے وہ بے حد مضحکہ خیز لگ رہی تھی اور اسی مضحکہ خیز چلنے میں وہ مہمانوں کے سامنے آئی۔ مہمانوں میں ایک بڑی بی اور ان کی دو بیٹیاں شامل تھیں لڑکیوں نے جی بھر کر منہ پر میک اپ تھوپا ہوا تھا اور کڑھائیوں والے کرتے پہن رکھے تھے اور وہ خود کو ملکہ حسن سے کم

سمجھنے پر تیار نہیں تھیں۔

اماں مہمانوں کے سامنے ہنسی جاری تھیں۔ موضوع گفتگو ساجدہ کی تعریفیں تھیں۔ تینوں خواتین اماں کی باتیں سننے سے زیادہ کھانا کھانے میں مصروف تھیں۔

”تو یہ ہے آپ کی بیٹی۔“ ساجدہ کے سامنے آنے اور سلام کرنے پر بڑی بی نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔

”ہاں یہی ہے ساجدہ۔ گھر کا سارا کام یہی کرتی ہے اور یہ سارا کچھ بھی اسی نے بنایا ہے۔“

خالہ صفی نے ان کو بتایا تھا کہ لڑکی خوب صورت نہیں ہے بلکہ قبول صورت ہے یعنی عام سی۔ لیکن وہ تو عام درجے سے بھی خاصی کمتر تھی۔ اور جس قسم کے کپڑے اس نے پہنے ہوئے تھے اس قسم کے کپڑے تو آج کل مایاں بھی پہننا پسند نہیں کرتیں۔ انہیں ایک دم ماسی صفی پر طیش آنے لگا جنہوں نے ایسی فضول اور بد صورت لڑکی ان کے ”مہیرا“ جیسے بیٹے کے لیے پسند کی تھی۔

ساجدہ ان کے ساتھ والے صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس کے ہاتھ لرز رہے تھے اور سر بالکل جھکا ہوا تھا۔ ایسے موقعوں پر اس کا تھوڑا بہت اعتماد بھی رخصت ہو جاتا تھا اور وہ شکل سے ہی حواس باختہ لگنے لگتی تھی۔

”یہ یہ فروٹ چاٹ لیں نا آپ۔ بہت اچھی بنائی ہے ساجدہ نے۔“ اماں کو ان کے چہرے کے تاثرات خوف زدہ کر رہے تھے۔ اسی لیے وہ گڑبڑا کر بولیں۔

”ہاں۔ ہاں کیوں نہیں۔“ بھلا کھانے سے کیا دشمنی تینوں نے ہی اپنی پلیٹیں فروٹ چاٹ سے بھر لیں واقعی بہت مزے کی بنی ہوئی تھی۔ بانی ساری چیزیں بھی بہت اچھی بنی ہوئی تھیں۔ انہوں نے پوری طرح انصاف کیا۔ اماں درمیان میں ساجدہ کی تعریفیں کرتی رہیں لیکن بھلا ایسی احمق اور بد صورت لڑکی کا انہوں نے اچار ڈالنا تھا۔ سنی ان سنی کر کے ہنسی رہیں۔

”آپ کی تیسری بیٹی بھی تو ہے تو کہیں ہے؟“ خوب جی بھر کر کھانے کے بعد فیشن کی ستائی ہوئی فریبی مائل لڑکی نے اماں سے پوچھا اس کا رنگ

گہرا سانولا تھا لہذا میک اپ اور ہلکی ہلکی جیولری کی وجہ سے کچھ بہتر لگ رہی تھی۔

”ہاں ہے تو۔“ اماں انکار نہیں کر سکتی تھیں۔ ”لیکن وہ اپنی دوست کے گھر گئی ہوئی ہے۔“

”اسے پتا نہیں تھا کہ گھر میں مہمان آنے والے ہیں۔“ دوسری لڑکی نے اعتراض کیا۔ وہ فیشن کے معاملے میں اپنی بہن سے بھی چار ہاتھ آگے تھی۔ اس کا ٹراؤزر کٹنوں سے خاصا اونچا تھا۔ اور اوپر انتہائی چھوٹی اور تنگ سی شرٹ پہنی ہوئی تھی۔

”پتا تو تھا اسے لیکن کام بہت ضروری تھا۔ نوٹس لینے تھے اس نے۔“ اب کی بار ٹریا تپانے لگا۔

”چھا کون سی جماعت میں پڑھتی ہے وہ؟“

”تھرڈ ایر میں۔“ ٹریا تپانے بتایا۔

”چھا۔ اچھا۔“ لڑکی کی سمجھ میں آیا یا نہیں لیکن اس نے سر ضرور ہلایا۔

”اور۔۔۔ آپ۔ آپ پڑھتی ہیں؟“ اب کی بار روئے سخن ساجدہ کی طرف تھا۔

”مم۔ میں۔۔۔ نہیں۔ میں تو نہیں پڑھتی۔“ ساجدہ نے ہٹا کر کہا۔

اماں کا جی چاہا کہ وہ اپنا سر پیٹ لیں۔ اس کے انداز اور اس کی بات پر۔ اس نے نوٹس کلاس میں پڑھائی چھوڑ دی تھی لیکن وہ خود کو میٹرک بھی تو ظاہر کر سکتی تھی۔ وہ کون سا جا کر تحقیق کرتے۔

”تو یہ ہے یہ تو ہلکی بھی ہے۔“ بڑی بی نے کوفت سے سوچا۔

”چھا تو آپ پڑھی ہوئی بھی نہیں ہیں۔“ لڑکی نے اس طرح غوث بھرے انداز میں کہا جیسے وہ خود پی ایچ ڈی ہو۔

”نہیں“ اس نے میٹرک کیا ہوا ہے۔ لیکن پھر اس نے پڑھائی چھوڑ دی تھی۔ اس لیے کہ وہ یہی ہے۔“ ٹریا تپانے اس کا بھر م رکھنے کی کوشش کی۔

”چھا!“ اس نے جواب میں کندھے اچکا کائے اس کے چہرے پر اس کا شک صاف پڑھا جاسکتا تھا۔

”چھا جی! ہم چلتے ہیں۔“ بڑی بی اور اس کی بیٹیاں

اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”بس جاری ہیں آپ؟ کچھ دیر اور رک جائیں۔“ اماں نے انہیں روکنے کی کوشش کی۔

”نہیں۔ بس چلتے ہیں دیر ہو رہی ہے۔“ ان کی بے زاری ان کے انداز سے صاف ظاہر ہو رہی تھی۔

”چھا پھر کب آئیں گی آپ؟“ اماں نے ایک امید سے پوچھا۔

”ہم صفی کو جواب دے دیں گے۔“ بڑی بی نے ایک اوائے بے نیازی سے کہا۔ اور کچھ کہنے سے بغیر باہر نکل گئیں ان کی دونوں فیشن زدہ بیٹیاں بھی ان کے پیچھے غائب ہو گئیں۔

اماں دل تھام کر رہ گئیں۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ انہیں ساجدہ پسند نہیں آئی ان کی ناپسندیدگی ان کے روئے انداز سے صاف ظاہر ہو رہی تھی اور اگلے دن اس بات کی تصدیق خالہ صفی نے آکر کر دی۔

”بڑی باتیں سنائیں جی انہوں نے مجھے۔“ خالہ صفی کا چہرہ بچھا ہوا تھا ”کہہ رہی تھیں کہ ہمارے بیٹے کے لیے کیا یہ کالی بد صورت سی رہ گئی تھی۔“

”چھا تو وہ ایسا کہہ رہی تھیں۔“ اماں غصے سے بولیں۔ ”خود کیا کوہ قاف کی پریاں تھیں۔“

”بس جی۔ کیا بتاؤں اور بھی بہت کچھ کہہ رہی تھیں۔“ خالہ صفی کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ خود ان کی بھی بڑی بے عزتی ہوئی ہے۔ ساجدہ کا شرمندگی سے برا حال ہو گیا یہ سب کچھ اسی کی وجہ سے تو ہوا تھا۔

”جہیں ایسے فضول لوگوں کو لانا ہی نہیں چاہیے تھا۔“

”لو جی مجھے کیا پتا تھا خالہ صفی کچھ برا مان گئیں۔ ابا کو پتا چلا تو انہوں نے فوراً اماں کو حتمیٰ۔“

”کہا تھا میں نے کہ نہ کرو فضول خرچیاں۔ نہ اڑاؤ میسے۔ ایسے لوگ صرف کھانے پینے کے لیے آتے ہیں لیکن نہیں تم تو اپنی بات منوائی ہو۔ اب آئندہ مجھ سے اس مقصد کے لیے ہرگز پیسے نہ مانگنا۔ ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہو گا۔“

اماں جواب میں چپ رہیں۔ البتہ ان کی باتوں کا غصہ بعد میں انہوں نے ساجدہ پر نکالا کہ اللہ نے ایسی بد صورت اور احمق بیٹی ان کے ہی نصیب میں رکھی تھی۔ ساجدہ جواب میں صرف آنسو ہی بہاتی رہی وہ اور کبھی کیا سکتی تھی۔



مندی لگا کے رکھنا
ڈول سجا کے رکھنا

ساتھ والی روئینہ خالہ کے بیٹے سمیر کی شادی تھی۔ اس لیے شادی والے گھر سے بہت زور زور سے ڈیک سے گانوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ سمیر روئینہ خالہ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ وہ کسی بزنس فرم میں ایک اچھی پوسٹ پر ملازمت کرتا تھا۔ دوران ملازمت ہی اس کا اپنے باپ کی بیٹی سے کوئی چکر چلا تھا جس کے نتیجے میں اس کی شادی اب اپنے باپ کی بیٹی سے ہو رہی تھی۔

روئینہ خالہ نے بڑے فخر سے پورے محلے کو بتایا تھا کہ ان کے بیٹے کی شادی کتنے اونچے گھرانے میں ہو رہی ہے۔ شادی کسی بڑے مین جہاں میں ہو رہی تھی۔

اماں سے ان کی خاصی ہمتی تھی۔ اس لیے وہ ان لوگوں کو بطور خاص انوائٹ کر کے گئی تھیں۔

سو نیا اس شادی میں شرکت کرنے کے لیے خاصی پر جوش تھی اسے ویسے بھی ایسی تقریبات میں شرکت کرنے کا بہت شوق تھا۔

ساجدہ کا شادی میں جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا لیکن وہ اس وقت حیران رہ گئی جب اماں نے اس سے بھی شادی میں چلنے کے لیے کہا۔

”کیا میرا جانا ضروری ہے؟ میں نہیں جاؤں گی۔“ ساجدہ نے صاف انکار کر دیا۔

”تو کیا گھر میں اکیلی بیٹھی رہو گی۔ تمہارے ابا اور سراب بھی آج کہیں والی ہیل چھوڑنے جا رہے ہیں۔“

”اماں! میں ساتھ والوں کے گھر چلی جاؤں گی۔“ ساجدہ نے راہ فرار ڈھونڈنے کی کوشش کی۔

”وہ لوگ بھی شادی پر جا رہے ہیں۔“ اماں نے

اسے بتایا پھر کچھ افسوس کا اظہار کرتے ہوئے بولیں۔ ”نجانے تم کیوں لوگوں سے چھپتی پھرتی ہو۔ کہیں دو چار لوگ اکٹھے دیکھ لو۔ فوراً ہوتی بن جاتی ہو۔“

”ہاں۔۔۔“ ساجدہ نے اپنی صفائی میں کچھ کتنا چاہا لیکن کہہ نہیں سکی۔

”بس رہنے دو۔“ ماں نے بیزاری سے اس کی بات کاٹی۔ ”جاؤ جا کر تیاری کرو۔“

اسے شادیوں کے لیے تیاری کرنا کہاں آتا تھا۔ تیاری کرنا تو سونیا کو آتا تھا۔ وہ ایسے تیار ہوتی تھی کہ اس کے حسن کو چار چاند لگ جاتے تھے اب بھی وہ پوری دل جمعی سے اپنے آپ کو سنوارنے میں لگی ہوئی تھی۔

وہ لوگ شادی والے گھر پہنچے تو وہ لوگ بارات لے جانے ہی والے تھے اماں روئینہ خالہ کو مبارک باد دینے کے لیے آگے بڑھ گئیں۔ جبکہ وہ اور سونیا سمیر کی بہن صوفیہ کے پاس آگئیں۔

”ہائے سونیا! آج تو تم بہت پیاری لگ رہی ہو۔“ صوفیہ نے سونیا کو دیکھتے ہی چسکتے ہوئے کہا۔

”صرف آج؟“ سونیا نے ادائے خاص سے پوچھا۔

”نہیں۔۔۔ نہیں وہ تو ہمیشہ سے ہی ہو۔ لیکن آج تو کچھ زیادہ ہی لگ رہی ہو۔ کہیں نظر نہ لگ جائے۔“

”نہیں لگتی۔“ سونیا نے کندھے جھٹکے۔

”وہ کیوں بھی۔ کیا نظر کا تعویذ باندھ کر لے جا رہی ہو۔“ ماں نے شوخی سے پوچھا۔

”نہیں مجھے یہ ساجدہ جو میرے ساتھ ہے اس کے ہوتے ہوئے نظر لگ سکتی ہے مجھے۔“

اس کی بات پر صوفیہ نے ہنسنے لگا اور۔۔۔ سونیا ہنسنے لگی۔

ساجدہ کو اچانک وحشت ہونے لگی۔ وہاں پر موجود خوب صورت اور بنے سنورے لڑکے لڑکیوں سے۔

اسٹیج پر موجود دو لہو لہاؤں سے وہاں پر چلنے والے گانوں اور ان کے بولوں سے

اس کے لیے وہاں کھڑے رہنا دشوار ہو گیا۔ اس نے چپکے سے سونیا کو بتایا کہ وہ تھوڑی دیر کے لیے باہر جا رہی ہے۔ ابھی آجائے گی۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی اعتراض کرتی وہ وہاں سے چلی آئی۔ شادی کا سارا انتظام ایک بڑے ہال میں تھا۔ ہال سے باہر ایک کھلا احاطہ تھا۔ وہاں پر اکا دکا لوگ موجود تھے۔ اس کا خیال تھا کہ وہ باہر چپ چاپ کسی کونے میں بیٹھی رہے گی سو وہ تیزی سے چل رہی تھی جب کسی سے ٹکرائی۔ وہ کوئی لڑکا تھا۔ وہ تھوڑا سا لڑکھائی پھر سنبھل گئی۔

”یا اللہ خیر۔“ لڑکے نے اسے دیکھ کر کہا۔ ”یہ شادی کی تقریب میں چڑیلیں کہاں سے آگئیں۔“

اس نے یہ بات سرگوشی کے سے انداز میں کہی تھی لیکن اس کی سرگوشی اتنی بلند ضرور تھی کہ پاس کھڑے کچھ لوگوں نے سن لیا۔ ان میں سے کچھ لوگوں کے دانت نکل آئے اور کچھ نے فہمائی نظروں سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

ساجدہ کا مارے خفت اور شرمندگی کے برا حال ہو گیا۔ اس کی آنکھیں پانیوں سے لہلہاں بھر گئیں اور قریب تھا کہ وہ چٹک جاتی کہ اس نے ایک آواز سنی۔

”آپ کو لڑکیوں سے بات کرنے کے مہنوز نہیں ہیں؟“ ساجدہ نے دیکھا وہ ایک نازک سی لڑکی تھی جو اس لڑکے سے سخت لمبے میں کہہ رہی تھی۔

”آپ کی تعریف؟“ لڑکے نے جوابی خاصی دلچسپی سے اس کے خوب صورت سراپے کو جانچا تھا۔

”میری تعریف کو آپ چھوڑیں۔ ابھی جو آپ کی تعریف میں کروں گی وہ آپ ہمیشہ یاد رکھیں گے۔“

”جی؟“ لڑکے نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔

”پہلے آپ خود کو تو آئینے میں دیکھ لیں پھر دوسروں کو بددعیاں کہتے پھرے گا۔“

”آخر آپ ہیں کون۔ اور خواہ مخواہ میرے گلے کیوں پڑ رہی ہیں؟“ لڑکے نے جھنجھلا کر کہا۔

”دوشت آپ مجھے کیا ضرورت ہے آپ کے گلے پڑنے کی۔“ اس کی صبح پیشانی پر غصے کے مارے بل

پڑ گئے۔

اس سے پہلے کہ بات مزید بڑھتی۔ اس لڑکے کو اس کا کوئی دوست اندر لے کر چلا گیا اور وہ غصے سے بڑبڑاتا ہوا وہاں سے رخصت ہو گیا۔ ارد گرد کے لوگ بھی وہاں سے نود گیارہ ہو گئے۔

”ایسے لوگوں سے نمٹنا مجھے خوب آتا ہے۔“ لڑکے کے وہاں سے رخصت ہونے اور لوگوں کے وہاں سے نود گیارہ ہونے کے بعد اس لڑکی نے ساجدہ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ساجدہ ابھی تک حیرت کے سمندر میں غوطہ زن تھی۔ اسے احساس ہوا کہ اسے بھی کچھ نہ کچھ ضرور کہنا چاہیے۔

”آپ۔ آپ نے خواہ مخواہ میری وجہ سے تکلیف کی۔“ اس نے اٹک اٹک کر کہا۔

”مارے نہیں تکلیف کیسی۔ وہ تو اندر چلا گیا اور نہ میں نے اسے اور بھی سنائی تھیں۔ ویسے۔۔۔“ وہ تیز بولتے بولتے اچانک رک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”یہ تکلیف اگر آپ خود کرتیں تو زیادہ اچھا ہوتا۔“

”آپ کا مطلب ہے کہ میں۔۔۔ اس سے یہ سب کہتی ہوں۔“

”ہاں۔“ اس نے کندھے اچکائے۔ وہ اتنی خوب صورت نہیں تھی لیکن بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ شاید یہ اس کا اعتماد تھا جو اسے خوب صورت بنا رہا تھا۔

”مجھ میں اتنی ہمت کہاں؟“ وہ بے چارگی سے بولی اور پھر میں کس کس کی زبان روکوں گی۔ لوگ یہ سچ اکثر بولتے ہی رہتے ہیں۔ جب مجھے اللہ نے بنایا ہی ایسا ہے تو اب کیا ہو سکتا ہے۔“

”لوگوں کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ کسی کی انسلٹ کریں اور مذاق اڑائیں۔“ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ ”اور معاف کیجئے گا۔ اللہ نے آپ کو ایسا نہیں بنایا۔ آپ خود ایسی بن گئی ہیں۔ آپ احساس کمتری کا شکار ہیں۔“

”تو ایسی شکل پہ میں احساس کمتری کا شکار نہیں ہوں گی تو کیا احساس برتری کا شکار ہوں گی۔“ ساجدہ

نے تلخی سے کہا۔

”خیر چھوڑیں آپ اس موضوع پر پھر کبھی بات کر لیں گے۔ مجھے فائزہ کہتے ہیں۔ اور آپ کو؟“ اس کا انداز خاصا دوستانہ تھا۔ ساجدہ تھوڑی دیر تک اسے دیکھتی رہی پھر دھیرے سے بولی۔

”ساجدہ!“

یہ فائزہ سے اس کی پہلی ملاقات تھی۔ فائزہ تھوڑی ہی دیر میں اس سے بے تکلف ہو گئی اور آپ سے تم پر آگئی۔ ساجدہ کو وہ بہت اچھی لگی۔ سادہ اور پر خلوص۔

اس نے جاتے ہوئے ساجدہ سے اس کے گھر کا ایڈریس لیا اور کہا کہ وہ اس کے گھر آئے گی۔ لیکن ساجدہ کو یقین تھا کہ وہ اس کے گھر کبھی نہیں آئے گی۔ شاید شادی کی تقریب سے واپسی کے بعد اسے باوجود بھی نہ رہے کہ وہ بھی ساجدہ نام کی کسی لڑکی سے ملی بھی تھی۔ لیکن ساجدہ کے دل نے فائزہ سے ایک مرتبہ پھر ملنے کی تمنا ضرور کی تھی۔ اور اس بات کی بھی کہ کاش وہ بھی فائزہ جیسی بن سکتی!

لیکن پہلی بار ساجدہ کا اندازہ غلط ثابت ہوا تھا۔ شادی کے صرف دو دن بعد فائزہ ان کے گھر آدھمکی لگی۔ کل نیل بننے کی آواز پر دروازہ ساجدہ نے کھولا تھا اور فائزہ کو سامنے پا کر وہ تھوڑی دیر کے لیے ہنسنے لگی۔

”ساجدہ!“ فائزہ نے اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ ہلایا۔ ”کیا بت بن گئی ہو۔ اندر آنے کو نہیں کہو گی؟“

”نہیں نہیں۔ اندر۔ اندر آؤنا۔“ وہ مرتعش آواز میں بولی اور اس کو اندر آنے کے لیے راستہ دے دیا۔

”وہ دراصل مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔“ فائزہ کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے اس نے وضاحت کی۔

”کس بات کا یقین؟ میرا تمہارے گھر آنے کا یقین؟“ فائزہ نے پوچھا۔

”ہاں۔“ اس نے سر جھکا کر کہا۔

”کیوں ہیں تمہارے گھر نہیں آسکتی کیا؟ تمہارے گھر آنے سے پہلے لپٹا لپٹا رہتا ہے؟“ وہ مسکرائی تو اس کے سفید دانت جھلک کر نکلے۔

”نہیں نہیں۔ ایسی تو کوئی بات نہیں۔“ وہ گھبرا کر وضاحت کرنے لگی۔ ”اس دن آپ نے میرے گھر کا ایڈریس لیا تو میں سمجھی کہ آپ ایسے ہی لے رہی ہیں۔ گھر نہیں آئیں گی۔“

”کم آن۔ ساجدہ ڈارلنگ! میں ایسے ہی کوئی کام نہیں کرتی۔“ اس نے دوستانہ انداز میں اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ”اور یہ تم مجھے آپ آپ کتنا چھوڑو اتنی بڑی نہیں ہوں میں تم سے۔“

ساجدہ نے جواب میں مسکرائے کی کوشش کی۔ سچ تو یہ تھا کہ اس کے ہاتھ پاؤں پھول رہے تھے۔ وہ ایک دلو اور کم اعتماد لڑکی تھی۔ بچپن سے لے کر آج تک کوئی لڑکی اس کی دوست تو کیا شناسا بھی نہیں بن سکی تھی اور کبھی اس کے گھر صرف اسی سے ملنے تو کوئی بھی لڑکی نہیں آئی تھی۔ اس کے ہاتھ پاؤں پھولنے تو لازمی تھے۔

”آئی! میرا مطلب ہے تمہاری ای کمال ہیں؟“ فائزہ نے پوچھا۔

”اماں؟ وہ اندر گھرے میں بیٹھی ہیں۔“ ساجدہ نے اس کمرے کی طرف اشارہ کیا جہاں اماں بیٹھی ہوئی تھیں۔

”اچھا چاؤ، پہلے انہیں ہی سلام کرتی ہوں۔“ فائزہ اس کمرے کی طرف مڑی تو ساجدہ جلدی سے کچن میں آکر اس کے لیے شربت بنانے لگی جلدی جلدی الٹا سیدھا شربت بنا کر وہ اس کمرے میں آئی تو فائزہ اماں کے ساتھ بیٹھی اوپر اوپر کی باتیں کر رہی تھی اماں کے چہرے پر حیرانی صاف نظر آرہی تھی۔ ساجدہ سے ملنے کے لیے پہلی بار کوئی لڑکی آئی تھی۔

”اف ساجدہ! تم نے شربت میں اتنی چینی ڈال دی۔“ فائزہ نے شربت کا ایک گھونٹ لے کر منہ بنایا۔ ”وہ دراصل جلدی میں بنایا ہے، نا تو اس لیے

شاید۔“ ساجدہ حسب عادت گھبرا گئی۔

”اس کے کام ایسے ہی ہوتے ہیں۔ بھال ہے جو کبھی کوئی کام دیکھ بھال کر کیا ہو۔“ اماں بولے بغیر نہیں رہ سکیں۔

”اس اوکے آئی! میرے ساتھ بھی اکثر ایسا ہو جاتا ہے، میں بھی زیادہ تر کام الٹے سیدھے ہی کرتی ہوں۔“ فائزہ نے بات سنبھالی۔

فائزہ کو شرمندگی ہونے لگی تھی۔

”سوری ساجدہ! میں نے تو ایسے ہی کہہ دیا تھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ تمہاری امی ایسے ری ایکٹ کریں گی۔“ وہ دوسرے کمرے میں آکر بیٹھی تھیں۔ جب فائزہ نے کچھ شرمندہ سے انداز میں کہا۔

”کوئی بات نہیں۔“ وہ ہنسکی سی مسکراہٹ سے بولی۔

”آپ کا اس میں کوئی قصور نہیں۔ اماں تو بس ایسے ہی۔“

”پھر وہی آپ؟“ فائزہ نے اس کی بات کاٹی۔ ”ارے بابا! میں تمہاری دوست ہوں۔ جب میں تمہیں۔ تم کہتی ہوں تو تم بھی تم کہا کرو۔“

”یہ تو آپ کی مہربانی ہے کہ آپ مجھے اپنا دوست سمجھتی ہیں۔“

”بھئی۔ اس میں مہربانی کی کیا بات ہے۔“ ساجدہ خاموشی سے ہنسی رہی۔

”اچھا چھوڑو ان باتوں کو۔ یہ بتاؤ کیا کرتی رہتی ہو سارا دن؟“ فائزہ نے اس کے موڈ کو محسوس کرتے ہوئے ٹانگ تبدیل کر دیا۔

”بس گھر کے کام کرتی ہوں۔ صفائی ستھرائی کرنا، کھانا پکانا، کپڑے دھونا وغیرہ۔“

”اچھا بس۔ سارا دن یہی کرتی رہتی ہو۔“ وہ دونوں بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ جب تھوڑی دیر بعد مونیہ کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔ اس نے ایک نظر ان دونوں کو دیکھا۔ فائزہ کو دیکھ کر وہ کچھ حیرت زدہ سی ہو گئی۔ پھر کندھے اچکا کر بولی۔ ”ہیلو۔“ ایک ہیلو فائزہ کی طرف پھینک کر وہ ساجدہ کی طرف متوجہ

ہوئی۔

”ساجدہ! اماں کہہ رہی ہیں جلدی سے کھانا بنالو۔ سب لوگوں کو بہت بھوک لگی ہوئی ہے۔“

ساجدہ نے شرمندگی سے فائزہ کو دیکھا۔ وہ حیرت سے مونیہ کو دیکھ رہی تھی۔

”سونیا! ساجدہ نے آہستگی سے کہا۔ ”تم جاؤ، میں ابھی کھانا بنا لیتی ہوں۔“

”اچھا ٹھیک ہے۔ لیکن ذرا جلدی کرو۔ پہلے ہی اتنی دیر ہو گئی ہے۔ تمہاری تو باتیں ہی ختم ہونے میں نہیں آ رہی ہیں۔“

مہمان کا لحاظ کیے بغیر وہ بولتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔

”تمہاری بہن تم سے بہت مختلف ہے۔“ مونیہ کے جانے کے بعد فائزہ نے کہا۔

”ہاں۔ وہ بہت نوب صورت ہے اور میں بہت بد صورت۔“

”نہیں ساجدہ! میرا مطلب یہ نہیں تھا تمہارے مقابلے میں وہ اخلاق، تمیز، تہذیب سے کوسوں دور ہے۔ انسان کی قدر و قیمت اس کے اخلاق و کردار سے ہوتی ہے۔“

”آپ پڑھاتی ہیں نا۔ اس لیے ایسی باتیں کر رہی ہیں۔“ فائزہ نے اسے بتایا تھا کہ وہ کسی اسکول میں پڑھاتی ہے۔ ”ورنہ حقیقت اس سے بہت مختلف ہے۔ لوگ صرف شکل و صورت کو دیکھتے ہیں۔ کردار اور اخلاق کو کوئی نہیں دیکھتا۔“ اس کی آواز میں تلخی آگئی۔ ”اور میں دوسروں کی شکایت کیا کروں۔ میرے اپنے گھر والے بھی ایسا ہی کرتے ہیں۔“

ساجدہ کو واقعی دکھ ہوا تھا آج سونیا اور اماں کے روئے سے۔ صرف آج اگر وہ خود کھانا بنائیں یا بازار سے منگوائیں تو کیا فرق پڑ جاتا۔

”جو لوگ تمہاری طرح اپنے حقوق سے دست بردار ہو کر بیٹھ جائیں اور تمام خرابیوں کا ذمہ دار قسمت کو سمجھنے لگیں، ان کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔“

ساجدہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔ ”کیا مطلب؟“ ”مطلب یہ ساجدہ ڈیر کہ اپنا حق دنیا سے لیتا پڑتا ہے۔ کوئی پلیٹ میں سجا کر پیش نہیں کرتا۔“ ”مجھے ایسا کہاں کرنا آتا ہے۔“ وہ آزدگی سے بولی۔

”اچھا چلو، فی الحال تم اٹھو اور کھانا بناؤ۔ ایسا نہ ہو کہ تمہاری ملکہ حسن بہن مونیہ دوبارہ انٹری دے دے۔“ فائزہ نے شفقت سے کہی۔

ساجدہ نے شرمندگی سے اسے دیکھا۔ ”اور۔۔۔ آئی۔۔۔“ وہ اس سے بوجھلچاہتی تھی کہ اس تمام عرصے وہ کیا کرے گی۔

”میں؟ میں تمہارے ساتھ چلوں گی اور ہم لوگ مل کر کھانا بنائیں گے۔“

”نہیں فائزہ جی۔ میں پہلے ہی آپ سے شرمندہ ہوں۔ مجھے مزید شرمندہ مت کریں۔“

”کوئی بات نہیں، تھوڑی سی شرمندگی اور سہ لو۔“ وہ ہنس کر بولی۔ پھر وہ اس کے روکنے کے باوجود فائزہ اس کے ساتھ کچن میں آکر کھانا بنانے میں اس کی مدد کرنے لگی اور پھر ان دونوں نے مل کر بہت اچھا کھانا بنایا۔

کھانے میں آلو گوشت تھا اور ساتھ میں سلاد اور چاول۔

فائزہ نے ساجدہ کے منع کرنے کے باوجود اس کے ساتھ دمتر خواں پر کھانا لگانے میں بھی اس کی مدد کی اور جب وہ کھانا سرد کر رہی تھی تو اس نے سونیا اور اماں کے چہرے پر واضح شرمندگی محسوس کی۔

اماں نے کچھ شرمندہ سے انداز میں کہا۔ ”بیٹا! تمہیں کیا ضرورت تھی یہ سب کرنے کی۔“

”کوئی بات نہیں آئی!“ ساجدہ کاموں میں لگ گئی تھی تو میں وہاں اکیلی بیٹھ کر کیا کھیاں مارتی اور دیے بھی نہ فائزہ نے کن اکھیوں سے مونیہ کی طرف دیکھا۔

”گھر کا کام کرنے سے کون سا انسان کی شان میں کمی آ جاتی ہے۔“

فائزہ نے بظاہر ٹھنڈے میٹھے انداز میں کہا تھا۔ لیکن جس پر اس نے طنز کیا تھا وہ اچھی طرح سمجھ گئی

تھی۔ تب ہی سونیا کی پیشانی پر بل پڑ گئے تھے۔
فائزہ کے سامنے تو وہ کچھ نہیں بولی۔ لیکن اس کے
جانے کے بعد اس نے اہل اور ساجدہ کے سامنے اس
کی جی بھر کر باتیں کیں اور اپنے دل کی بھڑاس نکالی
گئی۔

”ارے اس لڑکی کی فکر تو مجھے کھائے جا رہی ہے۔
نہ جانے کیا ہو گا اس کا۔ ابھی تو ہم اس کے سر پر ہیں۔
کل کو ہم نہ ہوں گے تو کس کے سارے زندگی
گزارے گی۔“

ثریا تپا آج چھٹی کے دن ان کے گھر آئی ہوئی
تھیں اور اہل ہمیشہ کی طرح ان کے ساتھ بیٹھ کر باتیں
کر رہی تھیں۔ موضوع گفتگو ساجدہ تھی۔
ساجدہ نے دوپہر کا کھانا تیار کرنا تھا۔ وہ کچن میں آکر
سالن پکانے لگی۔ وہ کوئی نئی باتیں نہیں کر رہی تھیں
کہ جن کو سن کر وہ اپنا جلا ہوا دل مزید جلا کر اپنا وقت
ضائع کرتی۔ ابھی تھوڑی دیر بعد ان ہی لوگوں نے شور
کرنا تھا کہ اتنی بھوک لگی ہوئی ہے اور کھانا ابھی تک
تیار نہیں ہوا۔ کیونکہ کھانا تیار کرنا تو صرف اسی کی ذمہ
داری تھی۔

”بڑی خوشبو میں آ رہی ہیں بھئی۔ کیا پک رہا ہے
آج؟“

وہ فریج سے آنا نکال کر اس کے پیڑے بن رہی تھی۔
جب نوی اندر داخل ہوا پھر اس کے جواب کا انتظار
کیے بغیر اس نے دیکھی کا ڈھکن ہٹا کر پکا ہوا خود ملاحظہ
کرنا چاہا۔ لیکن ڈھکن سے نکلتی بھاپ نے اس کا ہاتھ
جلا دیا اور اس نے ”سی“ کر کے ڈھکن چھوڑ دیا جو
زوردار آواز کے ساتھ عازم فرش ہو گیا۔

ساجدہ بننے لگی۔ ”بے وقوف! کیا ضرورت تھی
تمہیں گرم گرم ڈھکن کو ہاتھ لگانے کی۔ اب جل گیا نا
ہاتھ تمہارا۔“

”چلیں آپ اس بہانے نہیں تو سہی۔ قسم سے
مدت ہو گئی ہے آپ کو اس طرح کھلکھلا کر ہنسنے

ہوئے دیکھے۔“ وہ اپنا جلا ہوا ہاتھ تنک کے نیچے لے کر
گھڑا ہو گیا۔

”نوی!“ وہ ڈھکن اٹھا کر دوبارہ سے دیکھی پر دینے
لگی۔ ”تمہیں۔ تم مجھے آج فائزہ کے گھر لے جاؤ گے؟“
”فائزہ؟“ نوی نے پر خیال نظروں سے اسے
دیکھا۔ ”آج ساجدہ آپ کی نئی دوست۔“

”ہاں وہی بتایا تو تھا میں نے تمہیں اس کے بارے
میں۔“

”چلیں ٹھیک ہے کھانا کھانے کے بعد چلیں گے
ہم ان کے گھر۔“

”نوی! تم بہت اچھے ہو سب سے اچھے۔“ ساجدہ
نے تشکر سے اسے دیکھا۔

”وہ تو خیر میں ہوں۔“ اس نے کار اگڑائے۔ ”بس
کچھ لوگ ہیں جو اس بات کو نہیں مانتے۔ اچھا میں
ابھی لی وی پر بیچ دیکھنے جا رہا ہوں۔ جب کھانا پک
جائے تو مجھے بلا لیجئے گا۔“

ساجدہ نے اثبات میں سر ہلایا اور جلدی جلدی کھانا
بنانے لگی۔ پھر سب کے کھانا کھالینے کے بعد اس نے
اہل سے جانے کی اجازت مانگی۔

”واہ بھئی! اب تو ساجدہ کی بھی دوستیں بننے لگی
ہیں۔ خدا خیر ہی کرے۔“ سونیا کا انداز تمسخرانہ تھا۔

”کیوں جب ہر فضول لڑکی تمہاری دوست بن سکتی
ہے تو ایک معقول لڑکی ساجدہ آیا کی دوست کیوں نہیں
بن سکتی۔“ نوی نے رخ انداز میں کہا۔

”میری سمجھ میں نہیں آیا تم ہر بات میں میری
مخالفت کرنے کے لیے کیوں پہنچ جاتے ہو۔“ سونیا نے
بد مزگی سے کہا۔

”تم بات ہی ایسی کرتی ہو۔“

”یہی کیا بات کر دی ہے میں نے۔ تمہوڑا سا مذاق
ہی تو کیا تھا میں نے۔“

”مذاق کرنے کے لیے تمہیں ساجدہ آپا ہی ملی ہیں
اور کسی کے ساتھ مذاق کرو تو تمہیں پتا چلے۔“

”تم سونیا کے ساتھ خواہ مخواہ مت الجھا کرو۔“
ساجدہ نے راستے میں نوی سے کہا۔

”جب وہ آپ کے ساتھ بد تمیزی سے پیش آتی
ہے تو مجھے بہت غصہ آتا ہے۔“

”جانے ہو کب وہ اب اسے شکایت کرے گی۔“

”تو کون سا پہلی بار کرے گی اس کی تو عادت ہی ایسی
ہے۔ اور۔۔۔ اب وہ بھی ہمیشہ اسی کی ہی سائیڈ لیتے ہیں۔“

”ہاں۔۔۔ اب کو سونیا سے بہت پیار ہے۔“ ساجدہ کے
انداز میں تشکیلی سی اتر آئی تھی۔

نعمان اسے ایڈریس کے مطابق فائزہ کے گھر چھوڑ
کر یہ کہہ کر اپنے کسی دوست کے پاس چلا گیا کہ وہ
ڈیڑھ دو گھنٹے بعد اسے لینے کے لیے آئے گا۔

”کیا بات ہے بھئی۔ آج تو بڑے بڑے لوگ
ہمارے گھر آئے ہیں۔“ فائزہ نے اسے دیکھتے ہی شوخی
سے فخر اچھالا۔

”کیسی ہو؟“ اس سے گرم جوشی سے گلے ملنے
ہوئے فائزہ نے پوچھا۔

”میں ٹھیک ہوں۔ آپ۔۔۔ میرا مطلب ہے تم
کیسی ہو؟“ فائزہ کے گھورنے پر جلدی سے اس نے
آپ کو تم میں بدلا۔

وہ اسے لے کر اندر آگئی۔ وہ پانچ مرلے کا چھوٹا سا
گھر تھا۔ لیکن بہت خوب صورتی سے سجا ہوا تھا۔

پر آمدے میں پھولوں سے سج گئے رکھے ہوئے تھے۔
کمروں میں دیواروں پر خوب صورت پینٹنگز بھی
ہوئی تھیں۔ ہر ایک چیز سے اس گھر کے کینوں کی
نفاست اور ذوق حسن کا اندازہ ہو رہا تھا۔

”تمہارا گھر بہت خوب صورت ہے۔“ ساجدہ نے
کمرے کی تزئین و آرائش کا بغور جائزہ لیا۔

”آخر گھر کا کس ہے۔“ فائزہ نے فخریہ کار
اگڑائے۔

”ہوں واقعی۔ یہ بات تو سچ ہے۔“ ساجدہ نے زور
شور سے سر ہلایا۔

”گھر میں اور کون کون ہوتا ہے۔“ ساجدہ نے
پوچھا۔

”تب ہی کمرے میں ایک گریس فل سی خاتون
داخل ہوئیں۔“

”ارے فائزہ! تم۔۔۔ باہر گٹ کھلا چھوڑ کر اندر آکر
بیٹھ گئی ہو۔ بڑی لاپرواہی ہوئی جا رہی ہو۔“ بات کرتے

”بس میں اور میری امی۔“

”اور تمہارے ابو! تمہارے بہن! بھائی! وہ
سب۔۔۔“

”میرے ابو کی بہت پہلے میرے بچپن میں ہی ڈنٹھ
ہو گئی تھی۔ بس بھائی کوئی تھا ہی نہیں۔ میرے ابو کی
ڈنٹھ کے بعد امی نے دوسری شادی نہیں کی۔ بس میں
اور امی اکیلے رہتے ہیں۔“

”اوہ۔۔۔ یہ تو بہت افسوس ناک بات ہے۔“ ساجدہ
افسردہ ہو گئی۔

”ہاں ہے تو۔ لیکن یہ زندگی ہے۔ اس میں بہت
کچھ سہتا اور برواشت کرنا پڑتا ہے۔ اپنی محرومیوں اور
دکھوں کو بھلا کر زندگی کی دوڑ میں شامل ہونا ہی پڑتا
ہے۔ ورنہ انسان وقت اور زندگی کی دوڑ میں بہت پیچھے
رہ جاتا ہے۔“

”تمہیں اور تمہاری امی کو اکیلے رہتے ہوئے ڈر
نہیں لگتا؟“

”نہیں۔ بالکل بھی نہیں۔ جب اوپر والا ہماری
حفاظت کے لیے موجود ہے تو ہمیں ڈرنے کی کیا
ضرورت ہے۔“

”لیکن پھر بھی۔ میرا مطلب ہے کس۔“ ساجدہ
بات ادھوری چھوڑ کر فائزہ کو دیکھنے لگی جو اس کی طرف
دیکھ کر سننا شروع ہو گئی تھی۔

”اویار! تمہیں کیسے یقین دلاؤں کہ مجھے یا میری امی
کو بالکل بھی ڈر نہیں لگتا بلکہ سچ بتاؤں۔“ وہ اپنی
ہنسی روک کر اپنی آنکھوں میں آئے ہوئے آنسوؤں کو
پونچھنے لگی۔ ”الٹا لوگ مجھ سے ڈرتے ہیں۔ پتا ہے
جب میں باہر جاؤں تو مجھے دیکھ کر لڑکے پیچھے ہٹ
جاتے ہیں اور آپس میں کہتے ہیں۔ اوئے ہٹ جاؤ
فائزہ آ رہی ہے۔ میں بلیک ہیٹ ہو لڈر ہوں۔ جو ڈو
کرائے کی باہر۔“

تب ہی کمرے میں ایک گریس فل سی خاتون
داخل ہوئیں۔

”ارے فائزہ! تم۔۔۔ باہر گٹ کھلا چھوڑ کر اندر آکر
بیٹھ گئی ہو۔ بڑی لاپرواہی ہوئی جا رہی ہو۔“ بات کرتے

”بس میں اور میری امی۔“

”اور تمہارے ابو! تمہارے بہن! بھائی! وہ
سب۔۔۔“

”میرے ابو کی بہت پہلے میرے بچپن میں ہی ڈنٹھ
ہو گئی تھی۔ بس بھائی کوئی تھا ہی نہیں۔ میرے ابو کی
ڈنٹھ کے بعد امی نے دوسری شادی نہیں کی۔ بس میں
اور امی اکیلے رہتے ہیں۔“

”اوہ۔۔۔ یہ تو بہت افسوس ناک بات ہے۔“ ساجدہ
افسردہ ہو گئی۔

”ہاں ہے تو۔ لیکن یہ زندگی ہے۔ اس میں بہت
کچھ سہتا اور برواشت کرنا پڑتا ہے۔ اپنی محرومیوں اور
دکھوں کو بھلا کر زندگی کی دوڑ میں شامل ہونا ہی پڑتا
ہے۔ ورنہ انسان وقت اور زندگی کی دوڑ میں بہت پیچھے
رہ جاتا ہے۔“

”تمہیں اور تمہاری امی کو اکیلے رہتے ہوئے ڈر
نہیں لگتا؟“

”نہیں۔ بالکل بھی نہیں۔ جب اوپر والا ہماری
حفاظت کے لیے موجود ہے تو ہمیں ڈرنے کی کیا
ضرورت ہے۔“

کرتے ان کی نظر ساجدہ پر پڑی۔ انہوں نے استفہامیہ نظروں سے فائزہ کی طرف دیکھا۔

”ہی! یہ ساجدہ ہے، میری دوست۔ میں نے آپ کو بتایا تھا اس کے بارے میں اور ساجدہ! یہ میری امی ہیں۔“

”السلام علیکم! ساجدہ نے اٹھ کر انہیں سلام کیا۔
”وعلیکم السلام! جیتی رہو۔ خوش رہو بیٹا۔“ انہوں نے پیار سے اس کی پیشانی چومی۔ ساجدہ نے حیرت سے دیکھا۔ اس کی پیشانی تو بھی اس کی اہل نے نہیں چومی تھی۔ تو پھر۔

”تم لوگ باتیں کرو۔ میں تم لوگوں کے لیے چائے بنا کر لاتی ہوں۔“ رسی حال احوال پوچھنے کے بعد فائزہ کی امی نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”اور امی! چائے کے ساتھ بسکٹ، سمو سے اور چکن روٹز بھی ہوں۔“ فائزہ نے ہانک لگائی۔

”ارے بابا! سب کچھ لاؤں گی۔ کیا مجھے نہیں پتا؟ آخر تو ساجدہ ہمارے گھر پہلی بار آئی ہے۔“ وہ مسکراتے ہوئے وہاں سے چلی گئیں۔

”تمہاری امی بہت اچھی ہیں فائزہ! آج تم بہت خوش قسمت ہو۔“ ساجدہ نے رشک سے کہا۔

”ہاں سو تو میں ہوں۔“ فائزہ کھل کر مسکرائی۔
”تم سناؤ، تمہارے گھر والے کیسے ہیں اور وہ تمہاری مغرور بہن سونیا، ویسے بالی دا دے اس دن میرے جانے کے بعد اس نے میرے بارے میں کیا کیا بھروسہ فرمایا تھا؟“

”وہ ایسے ہی فضول باتیں کرتی ہے۔ دراصل ابا کی بہت لاڈلی ہے وہ۔ اس لیے شاید۔“ ساجدہ نے بات بنانے کی کوشش کی۔

”خیر اب ایسا بھی کیا لاڈ پیار کہ انسان دو سروں کو اپنے سامنے بالکل ہی حقیر سمجھنے لگے۔ تمہاری جگہ اگر میں ہوتی تو اب تک وہ سیدھی ہو چکی ہوتی۔“

”ہاں سو تو میں جان چکی ہوں۔“ ساجدہ مسکرائی۔
”ویسے ساجدہ! تم نے ابھی تک اپنی کوالی فکشن کے بارے میں نہیں بتایا؟“ فائزہ کے سوال پر ساجدہ

نے اچھے ہوئے انداز میں اس کی طرف دیکھا۔
”میرا مطلب ہے تعلیم، تمہاری تعلیم کتنی ہے؟“ فائزہ نے وضاحت کی۔

”میں نے نویں کلاس میں پڑھائی چھوڑ دی تھی۔“
”مگر کیوں ساجدہ! جانتی ہو تم نے کتنا غلط کیا؟“

ساجدہ سر جھکا کر بیٹھی رہی پھر آہستہ سے بولی۔
”میں نے تو اور بھی بہت کچھ غلط کیا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ میں نے اس دنیا میں آکر بھی بہت بڑی غلطی کی ہے۔“

”فضول باتیں مت کرو ساجدہ! خیر تم یہ بتاؤ تمہارے پڑھائی کیوں چھوڑ دی تھی؟ کیا تمہیں شوق نہیں تھا پڑھنے کا؟“

”مجھے بہت شوق تھا پڑھنے کا۔ مین یہاں بھی میری بد صورتی آڑے تھی۔ وہاں اسکول میں بھی کسی لڑکی نے مجھ سے دوستی نہیں کی۔ ٹیچرز کا رویہ بھی ایسا ہی تھا۔ انھوں نے مجھے تیسرے پاس کی، لیکن نویں کلاس میں جو ٹیچر آئیں ان کا رویہ تو میرے ساتھ بہت اہانت آمیز تھا اور میرے اسکول چھوڑنے کا اصل سبب بھی شاید وہی تھیں۔“

”وہ کیسے؟“

”میں شاید بد صورت لوگ پسند نہیں تھے اور میں تو شاید انہیں بالکل بھی اچھی نہیں لگتی تھی۔ مجھے ایسا لگتا تھا جیسے وہ اپنی کلاس میں بھی مجھے بمشکل برداشت کر رہی ہیں۔ ان کے اسی رویے کی وجہ سے میں پڑھائی میں بالکل صفر ہو کر رہ گئی تھی۔ گھر سے جو سبق یاد کر کے جاتی تھی وہ ان کے سامنے بالکل ہی بھول جاتا تھا۔“ ساجدہ گزرے ہوئے دنوں کو یاد کر کے پھر سے اداس ہو گئی۔

فائزہ نے غصے سے مٹھیاں بھیجنیں۔ ”ان ہی ٹیچرز نے اس شعبے کا تقدس پامال کر کے رکھ دیا ہے۔ لیکن تمہارے گھر والوں نے تمہیں اس موقع پر سپورٹ نہیں کیا؟“

”سپورٹ۔“ وہ تخی سے ہنسی۔ ”بلکہ وہ تو میرے اسکول چھوڑنے پر خوش ہوئے۔ اب اس بات پر کہ اب

انہیں میری پڑھائی پر کچھ خرچ نہیں کرنا پڑے گا اور اہل اس بات پر کہ اب میں گھر کے کاموں میں ان کا ہاتھ بٹاؤں گی۔“

”ہوں۔ میں اندازہ کر سکتی ہوں۔“ اس نے سر ہلایا۔ ”بہر حال میرا تمہیں مشورہ یہی ہے کہ تم اپنی پڑھائی دوبارہ سے شروع کرو۔ صرف یہی ایک چیز ہے جس سے تم اس دنیا میں اپنے آپ کو منوا سکتی ہو۔“
”یہ اب کیسے ممکن ہے؟“ ساجدہ نے اچنبھے سے اسے دیکھا۔ ”اتنے سال ہو چکے ہیں مجھے پڑھائی چھوڑے ہوئے اور اب میں اس عمر میں پڑھتے ہوئے اچھی لگوں گی۔“

”پڑھنے کی کوئی عمر نہیں ہوتی۔ انسان اپنی ساری زندگی کچھ نہ کچھ پڑھتا اور کچھ نہ کچھ سیکھتا رہتا ہے۔ تمہیں پتا ہے امریکا میں ایک ستر سالہ خاتون نے کالج میں داخلہ لیا ہے پڑھنے کے لیے کیونکہ جوانی میں وہ کسی وجہ سے اپنی اسٹڈیز مکمل نہیں کر سکی تھی۔“
”ستر سال کی عمر میں؟“ ساجدہ نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں ستر سال کی عمر میں جب وہ ستر سال کی عمر میں اپنی اسٹڈیز دوبارہ سے شروع کر سکتی ہے تو تم بایس تیس سال کی عمر میں کیوں نہیں۔ گھر والوں کا رویہ تو تم دیکھ ہی رہی ہو۔ کیا اسی طرح ساری زندگی دو سروں کی جھڑکیوں کھاتی اور دو سروں کے کام کرتی رہو گی۔“
”لیکن پڑھنے سے مجھے کیا فائدہ ہو گا؟ کیا پڑھنے سے میری بد صورتی، خوب صورتی میں بدل جائے گی؟“
میرے گھر والوں کا رویہ مجھ سے بدل جائے گا یا دنیا والے میری بد صورتی کا مذاق اڑانا بند کر دیں گے؟“ ساجدہ نے بحث کی۔

”پڑھنے سے تمہیں اتنا فائدہ ہو گا کہ تم سوچ بھی نہیں سکتیں۔ پڑھنے سے تمہیں اپنے حقوق کا شعور پیدا ہو گا۔ تمہیں خود پر اعتماد پیدا ہو گا۔ منہی سوچوں سے چھٹکارا ملے گا اور سب سے بڑھ کر زندگی گزارنے کا تہہ صمد مل جائے گا۔“

”وہ سب تو ٹھیک ہے فائزہ! لیکن۔“ ساجدہ کہتے

کتے رک گئی۔
”کیا لیکن؟“

”یہ سب کچھ اتنا آسان نہیں ہے۔ گھر والے نہیں مانیں گے اور پھر اتنے عرصے کے بعد دوبارہ سے پڑھائی شروع کرنا یہ بھی بہت مشکل ہے۔“
”کوئی مشکل نہیں ہے اگر انسان کسی کام کرنے کا سچا عزم کر لے اور پوری لگن اور پورے حوصلے سے کر لے تو راوی کی مشکلیں اور رکاوٹیں خود بخود دور ہو جاتی ہیں۔ امادیوی کو جانتی ہو؟“

فائزہ نے کتے کتے رک کر اس کی طرف دیکھا پھر ساجدہ کے نفی میں سر ہلانے پر بولی۔ ”امادیوی برصغیر کی ایک بہت ہی معروف گلوکارہ اور اداکارہ تھیں۔ لیکن جانتی ہو وہ بالکل بھی خوب صورت نہیں تھیں۔ وہ بہت بد صورت تھیں۔“

ساجدہ نے انتہائی حیرت سے اسے دیکھا۔ ”کیا واقعی؟“

”ہاں لیکن اسے اپنی بد صورتی پر کسی قسم کی شرمندگی اور احساس کمتری نہیں تھا۔ لوگ اس کا مذاق اڑاتے تھے لیکن وہ ان کی باتوں کو میریس نہیں لیتی تھی اس کے ہاں باپ مر گئے تھے اور وہ اپنے بچا کے ہاں رہتی تھی جو انتہائی غریب شخص تھا۔ اسے فلموں میں گانا گانے اور اداکاری کرنے کا بہت شوق تھا۔ اور اپنے اس شوق کو پورا کرنے کے لیے اس نے راہ میں آنے والی ہر مشکل کا بہت اور بہادر سے مقابلہ کیا اور بالآخر وہ اپنے مقصد کو پانے میں کامیاب ہو گئی۔ اور ٹرن ٹن کے نام سے مشہور ہوئی۔“

”وہ یہ تو واقعی بہت حیرت انگیز ہے۔“ ساجدہ نے حیرت سے کہا۔

”صرف امادیوی ہی نہیں دنیا کی تاریخ ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ مائیکل جیکسن کا نام تو تم بھی جانتی ہو گی۔ وہ امریکا کا ایک مشہور پاپ سٹار تھا لیکن وہ بھی بہت غریب اور سیاہ فام تھا۔ اسی طرح مشہور کامیڈین چارلی چپلن بھی بہت غریب خاندان سے تعلق رکھتا تھا لیکن اس کے باوجود اس نے اتنی شہرت

اور دولت حاصل کی صرف اور صرف اپنے عزم و حوصلے کی بدولت۔۔۔

بتاؤ ساجدہ! کیا ہمتی ہو؟“ قانزہ نے اسے سوچ میں ڈوبے ہوئے دیکھ کر پوچھا۔

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو قانزہ! میں اپنی پڑھائی دوبارہ شروع کروں گی اور اس دنیا کو اس میں بسنے والے لوگوں کو یہ بتا دوں گی کہ میں بھی کسی سے کم نہیں ہوں۔“ ساجدہ نے ایک عزم سے کہا۔

”یہ ہوئی ثابت۔“ قانزہ نے خوشی سے نعروں لگایا۔

”اب لگی ہو تا میری سیلی۔“

”ہی! اس نے بانگ لگائی۔“ یہ چائے بن رہی ہے پیائے۔“

”ابھی لار رہی ہوں بیٹا!“ اتنی کی آواز آئی۔ قانزہ مسکرا کر ساجدہ کو دیکھنے لگی اور پھر وہ دونوں ساجدہ کی پڑھائی دوبارہ شروع کرنے کے بارے میں ضروری باتیں دسکس کرنے لگیں۔

گھر والوں نے اس کی پڑھائی دوبارہ شروع کرنے کی بات بہت حیرت سے سنی تھی۔ سب نے اپنے اپنے انداز میں اس بات پر تبصرو کیا تھا۔ سب لوگوں کے تبصرے حوصلہ شکن تھے سوائے نعمان کے، صرف وہی تھا جس نے اس کی بہت ہمدردی کی تھی اور اس کی حوصلہ افزائی کی تھی۔ قانزہ چاہتی تھی کہ وہ ریگور تعلیم حاصل کرے تاکہ اس کے اندر اعتماد پیدا ہو۔ اس مقصد کے لیے پہلے اس نے اپنے اسکول میں بات کی تھی انہوں نے حسب توقع صاف انکار کر دیا تھا کہ وہ اتنی ایجنڈ لڑکی کو داخلہ نہیں دے سکتے۔ پھر اس نے ایک نام سے گورنمنٹ اسکول میں بات کی تھی۔ اس کی ہیڈ مسٹریس اس کی امی کی جاننے والی تھیں اس لیے انہوں نے کچھ تذبذب کے بعد داخلہ دینے پر آمادگی ظاہر کر دی تھی۔

یہ ساری باتیں قانزہ نے نعمان کے میل فون پر فون کر کے بتائی تھیں۔

ساجدہ! اسکول جانے کا سن کر پریشان ہو گئی تھی۔

”قانزہ! کیا ضروری ہے کہ میں اسکول جاؤں۔ میں گھر پر رہ کر بھی پڑھ سکتی ہوں۔“

”ہاں۔ مگر میں چاہتی ہوں کہ تم ریگور تعلیم حاصل کرو۔ کچھ دیر کے لیے تو تم اس گھنے ہوئے ماحول سے نکل کر کھلی فضا میں سانس لے سکو گی۔ پھر گھر میں تمہیں پڑھنے کو ن دے گا۔ گھر کا سارا کام تو تم ہی کرتی ہو اور کوئی ہاتھ بھی نہیں لگاتا۔“

”لیکن قانزہ! کتنا عجیب لگے گا کہ اتنی ایجنڈ لڑکی اسکول جایا کرے گی۔ اور پھر لوگ کیا کہیں گے؟“

”کوئی عجیب نہیں لگتا۔ اس اسکول میں گئی ہوں میں۔ یہ سرکاری اسکول ہے۔ اس میں بڑی بڑی ایجنڈ کی لڑکیاں بھی پڑھ رہی ہیں اور ہوتا ہے وظیفہ بھی ملتا ہے۔“

اسکول سے آنے کے بعد تم میرے پاس ٹیوشن پڑھنے کے لیے آجانا۔ میں کور کر دوں گی۔“

”لیکن قانزہ! گھر والے میرے اسکول جانے اور پھر وہاں سے واپسی پر تمہارے گھر ٹیوشن پڑھنے پر بالکل راضی نہیں ہوں گے۔“

”یہ تمہارے گھر والوں کا نہیں، تمہاری زندگی کا معاملہ ہے تمہیں اس بات پر اسٹینڈ لینا ہی پڑے گا ورنہ ساری زندگی اسی طرح دوسروں کی جھڑکیاں اور طعنے سہتی رہو گی۔“ قانزہ نے کہہ کر فون بند کر دیا تھا۔

ساجدہ خالی اسکرین کو دیکھتی رہ گئی۔

”آپ کی دوست بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں بیٹا! نعمان جو اس کی باتیں غور سے سن رہا تھا۔ فون بند ہونے کے بعد بولا۔“ آپ کو اسٹینڈ لینا ہی ہو گا۔ اور میں اس معاملے میں آپ کا پورا ساتھ دوں گا۔“

ساجدہ نے تشکر سے اسے دیکھا۔ ”تم میرے بہت اچھے بھائی ہو۔“

گھر والوں نے حسب توقع وہی رد عمل ظاہر کیا تھا۔ جیسا اس نے سوچا تھا۔

”داغ ٹھیک ہے تمہارا۔ اب اس عمر میں تم اسکول جاؤ گی۔ لوگ کیا کہیں گے۔“ اماں نے غصے سے کہا

تھا۔

”لوگ ہمیشہ ہی کچھ نہ کچھ کہتے رہتے ہیں اماں! مجھے ان کی کوئی پروا نہیں ہے۔“ ساجدہ نے سکون سے کہا۔ ”آپ اپنی بات کریں۔“

”مگر گھر والے ساتھ ہوں تو کسی کی جرات نہیں ہوتی بات کرنے کی اور پھر ساجدہ آیا کوئی غلط کام تو نہیں کر رہی ہیں۔ پڑھائی دوبارہ شروع کر رہی ہیں۔“ اب کی بار نعمان نے کہا تھا۔

”چھاتو تم اس کے وکیل بن کر آئے ہو۔“ اماں نے کچھ طنز انداز میں کہا۔

”حالانکہ جتنا تو آپ کو چاہیے تھا۔ آپ ان کی ماں ہیں۔ ہم سب بھی تو جانتے ہیں پڑھنے سونیا بھی تو جانتی ہے کالج۔“

”میرا نام بیچ میں لینے کی ضرورت نہیں ہے۔“ سونیا جو ان لوگوں کی باتیں خاموشی سے سن رہی تھی۔ نعمان کی بات کاٹتے ہوئے بولی ”میں کالج جاتی ہوں اسکول نہیں۔ اور میں نے ساجدہ کی طرح بیچ میں پڑھائی نہیں چھوڑ دی تھی۔“

”مجھے پتا ہے یہ پتی کس نے پڑھائی ہے۔ جب سے یہ اس گھنی قانزہ کے گھر سے آئی ہے تب ہی سے اس قسم کی باتیں کر رہی ہے۔“ سونیا نے گل افشانی کی۔

”دیکھو سونیا! تم مجھے جو کچھ کہہ لیتی ہو میں برداشت کر لیتی ہوں لیکن قانزہ کے خلاف میں ایک لفظ بھی برداشت نہیں کروں گی۔ سمجھیں تم!“

ساجدہ کے سخت اور دو ٹوک انداز پر جہاں سونیا ہکا بکا رہ گئی وہیں اماں بھی حیرانی سے اس کا منہ دیکھتی رہ گئیں۔

”اور اماں! آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میری پڑھائی پر آپ کا کوئی خرچ نہیں ہو گا۔ بلکہ وہ لوگ وظیفہ بھی دیں گے۔ اور گھر کے کام بھی جہاں تک مجھ سے ہو سکا کروں گی۔ آپ اب اسے بات کر لیں۔ خرچا نہ ہونے کا سن کر وہ شاید راضی ہو جائیں۔“

”بڑی زبان چلائی آگئی ہے تمہیں۔ کبھی ماں پر باتیں کر رہی ہو کبھی باپ پر طنز۔ وہ دن اس لڑکی سے کیا

ملیں۔ تمہیں تو تمیز غلط ادب سب کچھ بھول گیا ہے۔“

”اماں! پلیز آپ میری باتوں کا غلط مطلب مت لیں۔“ ساجدہ کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ میں نے آپ سے کبھی کسی بات کے لیے ضد نہیں کی۔ کبھی کوئی خواہش نہیں کی۔ کیا آپ میری اتنی سی بات نہیں مان سکتیں؟“

بیٹی کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر ان کا دل پیچ گیا۔ انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ اور بولیں ”اچھا تم روؤ مت میں تمہارے ابا سے بات کروں گی۔“

”یا ہو۔“ نعمان نے زور سے نعروں لگایا۔ ساجدہ مسکراتے لگی اور سونیا ”ہونہ“ کہہ کر وہاں سے چلی گئی۔

اور پھر بتا نہیں اماں نے ابا سے کیا بات کی اور کس طرح کی لیکن بہر حال اسے اسکول جانے کی اجازت ضرور مل گئی۔

قانزہ نے نہ صرف اس کا ایڈمیشن کروا دیا تھا بلکہ اس کے لیے کتابیں اور یونیفارم بھی اسی نے لا کر دیے تھے۔ اور آج اس کا اسکول میں پہلا دن تھا۔

اسکول۔ جس سے اس کی بہت سی تیاریاں جڑی ہوئی تھیں اور جسے چھوڑے ہوئے اسے چھ سات میل سے زیادہ عرصہ ہو گیا تھا۔ وہ بہت گھبراہٹ کا شکار تھی۔ آج چونکہ پہلا دن تھا اس لیے قانزہ اسے لے کر جاری تھی اور ساجدہ کو ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ دوبارہ سے وہی چھوٹی سی بچی بن گئی ہو جو اسکول جاتے ہوئے بے حد گھبرائی تھی۔ کیونکہ اس اسکول میں اس کے ساتھ امتیازی سلوک ہوتا تھا۔

”کچھ آتا جاتا نہیں ہے اسے۔ ایسی مبالغہ کند ذہن اور بد صورت لڑکی میں نے پہلی بار دیکھی ہے اور ڈھیٹ اتنی ہے کہ روز مار کھاتی ہے لیکن مجال ہے جو اتنی مار کا کبھی اس پر کوئی اثر ہوا ہو۔“ اس کی کلاس پیچر مس روینہ کہہ رہی تھیں اس نے بے اختیار اپنے

بازوؤں اور کندھوں کی جانب دیکھا جن پر مس کی مار کھا کھا کر نشانات بڑھ چکے تھے لیکن مس پھر بھی کہہ رہی تھیں کہ اس پر مار کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔

”آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔“ مس راشدہ نے ان کی تائید کی۔ ”آپ اس کے پیرئٹس سے بات کیوں نہیں کرتیں؟“

”آپ کی بیٹی بہت کمزور ہے انتہائی تھلائی ہے کچھ آتا جاتا نہیں ہے اسے۔“ اگلے منظر میں مس روہینہ اہل سے کہہ رہی تھیں جو ان کی فرمائش پر اسکول آئی تھیں۔

”اچھا مگر گھر میں تو یہ سارا وقت پڑھتی رہتی ہے۔“ اہل نے حیرت سے ساجدہ کی طرف دیکھا۔ اہل ٹھیک کہہ رہی تھیں لیکن مس کے سامنے نہ جانے کیوں سبق اٹکنے اور بھولنے لگ جاتا تھا۔

”خاک پڑھتی ہے۔“ انہوں نے وائٹ میسے ”بہر حال میرا آپ کو مشورہ یہ ہے کہ آپ اسے گھر بٹھا کر گھر کا کام کاج سکھائیں۔ یہ پڑھنا وڑھنا اس کے بس کا روگ نہیں ہے۔“

اور اہل کو ان کا مشورہ اتنا بھایا کہ انہوں نے گھر جاتے ہی اسے حکم دیا ”بس بہت بڑھ لیا تمہارے تمہارا پڑھنے والا داغ ہی نہیں ہے اب گھر بیٹھو اور گھر کے کام کاج سیکھو۔“

یوں اس کی پڑھائی کا خاتمہ ہو گیا۔ ”کیا سوچ رہی ہو؟“ قارئہ نے اسے سوچ میں گم دیکھ کر پوچھا۔

”میں سوچ رہی ہوں کہ پتا نہیں میں اسکول میں ایڈجسٹ کر بھی سکوں گی یا نہیں۔“ ساجدہ نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

”کیوں۔ کیا مسئلہ ہے تمہیں ایڈجسٹ کرنے میں؟“

”ایک نہیں، کئی مسئلے ہیں۔ اتنے عرصے بعد دوبارہ پڑھائی شروع کرنا“ اپنے سے چھوٹی لڑکیوں کے ساتھ پڑھنا اور سب سے بڑھ کر میری بد صورتی۔“

”پہلی بات تو یہ کہ ماحول انسان خود بناتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ اگر انسان میں کوئی ایک خامی ہو تو اس خامی کو دبایا جاسکتا ہے اپنی دوسری خوبیوں کو اجاگر کر کے۔“

”وہ کیسے؟“ ساجدہ نے حیرت سے پوچھا۔ ”جو لوگ تمہاری بد صورتی کا مذاق اڑاتے ہیں ان کے ساتھ نمٹنے کے دو طریقے ہیں۔ پہلا تو یہ کہ جو لوگ ایسا کریں تم ان کے ساتھ سختی سے پیش آؤ اور اینٹ کا جواب پتھر سے دو۔“

اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ تم ان کی بد تمیزی کے باوجود ان سے پیار محبت سے پیش آؤ۔ یہاں تک کہ وہ تمہارے حسن سلوک سے متاثر ہو کر تمہارے گرویدہ ہو جائیں اور ان کے نزدیک تمہاری بد صورتی یا خوب صورتی کی کوئی اہمیت نہ رہے اب یہ تم پر ہے کہ تم ان میں سے کون سا طریقہ اپنائی ہو۔

”تم کیا سمجھتی ہو کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟“ ”میرا مشورہ یہی ہے کہ تمہارے لیے بلکہ دنیا کے کسی بھی شخص کے لیے دوسرا طریقہ ہی مناسب ہے۔ محبت سے پتھر کو بھی رام کیا جاسکتا ہے۔ اگر تم اپنی کلاس فیلوز اسکول فیلوز اور دوسرے لوگوں سے محبت سے پیش آؤ گی تو وہ بھی تمہارے گرویدہ ہو جائیں گے۔ اگر تم ان سے سختی سے پیش آؤ گی ان کی باتوں پر اور رری ایکٹ کرو گی تو تمہاری یہ خامی اور اجاگر ہوگی۔ تمہاری زندگی میں تلخیاں مزید بڑھیں گی۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ محل اور بردباری سے کام لینا۔ تم میری بات سمجھ رہی ہو نا؟“

قارئہ نے ساجدہ کی طرف تصدیق طلب نظروں سے دیکھا۔ ساجدہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

”ہاں۔ میں سمجھ رہی ہوں تمہاری بات۔“

”مگر میری ایک بات یاد رکھنا۔ سب لوگ ایک جیسے نہیں ہوتے۔ کچھ لوگ پیار محبت کی زبان نہیں سمجھتے۔ ایسے کم طرفوں پر اپنا احسان کبھی ضائع نہیں کرنا۔ ازات کیئر؟“

ساجدہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ اسکول کا گیٹ اُکھا

تھا وہ دونوں گیٹ کر اس کرنے لگیں۔ ساجدہ نے اپنا دایاں پاؤں اندر رکھا اور بسم اللہ کہہ کر اندر چلی گئی۔ اسے پڑھنا تھا اور بہت آگے جانا تھا آخر اس دنیا میں اس کے آنے کا بھی کوئی نہ کوئی مقصد تھا۔

اچھی دوست اللہ کی کتنی بڑی نعمت ہے۔ یہ اسے اب پتا چلا تھا۔ تعلیم کی انسان کی زندگی میں کتنی اہمیت ہے اس کا صحیح معنوں میں اندازہ اسے اب ہوا تھا۔

شروع شروع میں اسے اسکول میں ایڈجسٹ کرنے میں بہت دشواری پیش آئی تھی۔ اسکول میں پڑھنے والی لڑکیوں کا انداز اس کے ساتھ متضاد تھا۔ پتھر سے عجب نظروں سے دیکھتی تھیں۔ گھر والوں کے ساتھ ساتھ محلے والوں نے بھی اس کے دوبارہ اسکول ”بھوائن“ کرنے کی خبر کو بڑی مشکل سے ہنسم کیا تھا۔ لیکن قارئہ کا بتایا ہوا دوسرا طریقہ بہت فائدہ مند ثابت ہوا تھا۔

اس کا حسن سلوک محبت، بردباری اور مستقل مزاجی آخر رنگ لائی تھی اور صرف چار پانچ ماہ میں ہی سب کچھ ٹھیک ہو گیا تھا۔ اب اسکول میں لڑکیاں اسے ساجدہ کے بجائے ساجدہ باجی کہتی تھیں۔

پتھر زاب اسے عجیب نہیں بلکہ مشتاقانہ نظروں سے دیکھتی تھیں کیونکہ وہ این کی سب سے زیادہ تابعدار اور مودب اسٹوڈنٹ تھی۔

اور جہاں تک گھر والوں کی بات تھی انہوں نے بھی جیسے تیسے سمجھوتا کر ہی لیا تھا۔ سب سے زیادہ تکلیف اس کے اسکول جانے سے سونیا کو ہوئی تھی کیونکہ پہلے گھر کا کام کالی طور پر ساجدہ ہی کرتی تھی۔ اب اسکول جانے اور پھر وہاں سے قارئہ کے گھر ٹیوشن پڑھنے جانے کی وجہ سے سونیا کو بھی گھر کے کاموں میں ٹھوڑا بہت حصہ لینا پڑتا تھا۔ جس کی وجہ سے اس کا ساجدہ کے ساتھ رویہ اور بھی ابانت آمیز ہو گیا تھا اکثر وہ گھر والوں کے سامنے اس بات کا رونا روئی رہتی تھی کہ ساجدہ کے اس عمر میں اسکول جانے کی وجہ سے اسے

اپنی دوستوں اور محلے والوں کے سامنے کتنی شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

”اُم! آپ ساجدہ کو سمجھاتی کیوں نہیں ہیں، کیوں اسکول جا کر ہمارا اور اپنا مذاق بنوا رہی ہے۔ لوگ ہنستے ہیں، باتیں کرتے ہیں اس پر۔ آپ کو ہوتا ہے وہ جو میری دوست رابعہ ہے۔ وہ کہہ رہی تھی کہ اس عمر میں ساجدہ کو شادی کر کے خود اپنے بچے سنبھالنے چاہیے تھے لیکن وہ تو خود بھی بن گئی ہے۔“

”نقیں تو خود ایسا نہیں چاہتی تھی لیکن کوئی رشتہ بھی آئے تب تک پڑھائی کر لیتی رہے۔“ اہل نے کندھے اچکائے۔

”پڑھائی تو وہ گھر میں بھی کر سکتی ہے۔ اسکول جانا ضروری تو نہیں۔ آپ اسے اسکول جانے سے منع نہیں کر سکتیں؟“ سونیا نے تب کر کہا۔ وہ اور اہل محسن میں بیٹھی باتیں کر رہی تھیں جبکہ ساجدہ اندر کمرے میں ہوم ورک کرتے ہوئے این کی باتیں سن رہی تھی۔

”کیسے منع کروں۔ وہ بھی میری بیٹی ہے۔ البتہ اگر اس دور این اس کا کوئی اچھا رشتہ آگیا تو پھر میں اس کی شادی کروں گی۔ پھر اس کی کوئی بات نہیں سنوں گی۔“

”اچھا رشتہ اور ساجدہ کا؟“ سونیا نے استہزائیہ انداز اختیار کیا۔ ”یہاں معجزہ کم از کم اکیسویں صدی میں تو ہوتا ہوا مجھے دکھائی نہیں دیتا اگلی صدی میں ہو جائے تو میں کچھ کہہ نہیں سکتی۔“ وہ اٹھ کر وہاں سے جانے لگی۔

”سونیا! تو جا کر برتن تو دھو دے پھر ساجدہ اٹھ کر رات کا کھانا بنا دے گی۔“ اہل نے اسے آواز دی۔

”جب آپ کی پڑھا کو بیٹی پڑھنے سے فارغ ہو کر رات کا کھانا بنائے گی تو اسے کیسے گارتن بھی دھو لے کیونکہ میرا صبح ٹیسٹ ہے، مجھے اس کی تیاری کرنا ہے۔“ وہ پاؤں پختے ہوئے وہاں سے چلی گئی۔

”بہت بد تمیز ہو گئی ہے۔ کسی کام کو ہاتھ نہیں لگاتی۔ سب اس کے باپ کے لاڈ پیار کا نتیجہ ہے۔“

نکمی کہیں کی۔

اب اس غصے سے بڑبڑا کر رہ گئیں اور ساجدہ ٹھنڈی سانس لے کر دوبارہ سے ہوم ورک کرنے میں مصروف ہو گئی۔ منہ جانے سونیا اس سے اتنی خاریوں کھاتی تھی۔



وہ پڑھائی میں دل و جان سے مصروف تھی اور جاگتی آنکھوں سے سینے بننے لگی تھی۔ کچھ کروکھانے کے آگے جانے کے

معاشرے میں ایک انلا اور باوقار مقام پانے کے

اور اس کے لیے اسے بہت محنت کرنا تھی۔

وہ اب اتنا مصروف رہتی تھی کہ اسے صحیح معنوں میں سرکھانے کی فرصت بھی نہیں ملتی تھی۔ گھر کے کام زیادہ تر اب بھی وہی کرتی تھی۔ لیکن اس مصروفیت سے اسے تسکین نہیں ہوتی تھی۔

سب ٹھیک چل رہا تھا کہ ایک دن ثریا اپنے آکر پر سکون پانی میں پتھر پھینک کر ہانچل مچادی۔

اس روز چھٹی کا دن تھا۔ وہ جلدی جلدی دھیر کا کھانا بنانے میں مصروف تھی۔ تاکہ کھانے سے فارغ ہو کر وہ اپنے ٹیسٹ کی تیاری کر سکے۔ وہ سالن بھون کر پانی ڈال کر کسی کام سے برآمدے میں آئی تو ثریا آپا پر جوش طریقے سے اس کو تار رہی تھیں۔

”ماں! آپ ساجدہ کے رشتے کے لیے پریشان تھیں نا۔ تو بس اب آپ کی پریشانی ختم ہوئی۔ ساجدہ کے لیے رشتہ مل گیا ہے۔“

”اے۔ کیا واقعی؟“ ماں نے خوش ہو کر پوچھا۔

”جی ماں بالکل۔“ ثریا آپا نے سر ہلا کر تصدیق کی۔ ”وہ جو میری نند فہمیدہ ہے نا۔ اس کے جیتھ محبوب حسین کو تو جانتی ہیں آپ۔“

”محبوب حسین۔“ ماں سوچ میں پڑ گئیں۔

”چھا۔ وہ جس کی بیوی پچھلے سال فوت ہو گئی ہے اور اس کے تین بچے بھی ہیں۔“

”جی ماں! وہی۔ انہوں نے میری نند فہمیدہ کے ذریعے کھلوا لیا ہے۔“

”تمہارا مطلب۔۔۔؟“ ماں نے بے بسی سے پوچھا۔

”جی ماں! ساجدہ سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ کل میری نند فہمیدہ میرے پاس آئی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی کہ میں آپ سے پوچھ لوں اگر ہم لوگ راضی ہوں تو وہ باقاعدہ پیغام لے کر آئیں۔“

ساجدہ حیرت اور تاسف سے ثریا آپا کو دیکھتی رہ گئی۔ وہ محبوب حسین سے واقف تھی۔ وہ پینتالیس پچاس سال کی عمر کا ایک کرخت صورت شخص تھا۔ اس کی آنکھوں سے ہی سفاکی اور کینگی ٹپکتی تھی۔ ابھی پچھلے سال ہی اس کی بیوی کا انتقال ہوا تھا۔ اس نے سنا تھا کہ وہ اپنی بیوی پر بے دریغ تشدد کرتا تھا۔ بلکہ کچھ لوگ تو یہ بھی کہتے تھے کہ اس بیوی کے مرنے کی وجہ بھی وہ تشدد تھا جو اس نے مرنے سے کچھ روز پہلے اس بے چاری پر کیا تھا۔ اس نے ماں کی طرف دیکھا۔ پتا نہیں وہ کیا کہتی ہیں۔

”تمہاری نند کو شرم نہیں آئی یہ سب کہتے ہوئے۔“ اس نے ماں کو کہتے ہوئے سنا۔ ”اس منحوس کے لیے کیا میری بیٹی ہی رہ گئی تھی۔ مجھے تو تمہاری عقل۔ حیرانی ہو رہی ہے۔ یہ رشتہ لے کر آئی ہو تم اپنی بہن کے لیے؟“

”کیوں! کیا ہوا ہے میری عقل کو۔“ ثریا آپا رہا ان گئیں۔ ”خود ہی تو کہتی تھیں کہ ساجدہ کا رشتہ نہیں مل رہا۔ ساجدہ کا رشتہ ڈھونڈ کر لاؤ۔ اب میں ایک رشتے کا بتا رہی ہوں تو آپ ایسی باتیں کر رہی ہیں۔“

”ٹھیک ہے اس کا رشتہ نہیں مل رہا اور میں اس وجہ سے پریشان بھی ہوں۔ لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ میں اپنے ہاتھوں سے اپنی بیٹی کو اندھے کنویں میں دھکا دے دوں۔“ ماں اس وقت بات کرتے ہوئے کتنی باری لگ رہی تھیں۔

”ماں! آپ جذباتی ہو کر سوچ رہی ہیں۔ ذرا ٹھنڈے دل سے میری بات پر غور کریں۔ محبوب

حسین اتنا برا آدمی نہیں ہے۔ جتنا اسے لوگوں نے مشہور کر دیا ہے۔ اچھا خاصا پیسہ ہے اس کے پاس۔ ساجدہ اگر اس کے ساتھ پیار محبت سے رہے گی تو وہ بھی ساجدہ سے پیار محبت سے ہی پیش آئے گا۔ اور جہاں تک اس کے بچوں کی بات ہے تو وہ سب بڑے بڑے ہیں۔ ساجدہ کو تنگ نہیں کریں گے اور پھر یتیم بچوں کو پالنے کا تو ویسے ہی بڑا ثواب ملتا ہے۔“ ساجدہ خاصی حیرانی سے ثریا آپا کو محبوب حسین کی وکالت کرتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

”جن لوگوں کی فطرت ہی خراب ہو وہ کبھی نہیں سدھرتے چاہے کوئی کتنا ہی ان کے ساتھ اچھا رہے۔“

”اچھا آپ اب اسے تو ایک مرتبہ بات کر لیں۔ اتنی جلد بازی سے کام مت لیں۔ کچھ دن غور کر لیں پھر جواب دے دیجئے گا۔“ بات کرتے کرتے ان کی نظر ساجدہ پر پڑی تو وہ کہتے کہتے رک کر اس کی طرف دیکھنے لگیں۔

”تم یہاں کھڑی کھڑی کیا کر رہی ہو۔ جاؤ جا کر کھانا بناؤ۔ ابھی بچے بھوک بھوک کا شور مچائیں گے۔“ ساجدہ نے ناگواری سے انہیں دیکھا اور پاؤں پٹختے ہوئے کچن میں آئی۔

”ہونہ۔ بڑی آئیں رشتہ کرانے والی۔ دیکھتی ہوں کیسے کرواتی ہیں۔“ وہ ناگواری سے سوچ رہی تھی۔



”چھا تو تمہاری ثریا آپا تمہارے لیے رشتہ لے کر آئی ہیں اور وہ بھی ایک اجڑا اور وحشی انسان کا جو تین بچوں کا باپ ہے۔ خوب!“

فائزہ نے طنز انداز میں ساجدہ سے مخاطب ہو کر کہا۔ وہ دونوں اس وقت مارکیٹ میں آئی ہوئی تھیں۔ کیونکہ فائزہ نے کچھ شاپنگ کرنی تھی اس لیے وہ ساجدہ کے منع کرنے کے باوجود اسے اپنے ساتھ لے کر آئی تھی۔

”لیکن ماں نے صاف انکار کر دیا ہے۔ ماں نے ان سے کہہ دیا ہے کہ وہ اپنی بیٹی کی شادی ایسے فضول اور گھٹیا شخص سے نہیں کریں گی۔“ ساجدہ نے خوش ہو کر بتایا۔

”یہ تو اچھی بات ہے۔ لیکن اگر انہوں نے اپنا ارادہ بدل لیا تو پھر۔ پھر کیا کرو گی؟“ فائزہ نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں۔ ایسا نہیں ہو گا۔ کبھی بھی نہیں۔“ ساجدہ نے جھرجھری کر۔ ”ماں ایسا کبھی نہیں کریں گی۔“

”اللہ کرے ایسا ہی ہو۔ اچھا چلو اب سامنے والی بیکری سے کچھ کھانے کو لیتے ہیں میں تو چلتے چلتے تھک گئی ہوں اور بھوک سے مرنے کے قریب ہوں۔“ فائزہ نے سامنے والی بیکری کی طرف اشارہ کیا۔ وہ دونوں بیکری شاہ میں گھس گئیں۔ فائزہ نے اس کے اور اپنے لیے ایک ایک پزا اور ایک ایک سینڈویچ لیا۔ پھر وہیں مارکیٹ میں ہی کھانا شروع کر دیا۔

”اے تم تو سب کے سامنے ہی کھانا شروع ہو گئی ہو۔ لوگ کیا کہیں گے۔“ ساجدہ نے اسے ٹوکا۔

”کیا کہیں گے؟ زیادہ سے زیادہ یہی تاکہ لڑکی کو بہت بھوک لگی ہوئی ہے۔ تو تم بھی کھاؤ۔“

فائزہ نے کہا پھر اس کی ہونٹوں جیسی شکل دیکھ کر ہنسنے لگی۔

”اے دیکھو تیار! ہم جیسے لوگ یونہی عام سی بیکری سے لے کر راستوں میں کھاتے ہیں۔ اب ہم ان جیسے بڑے ہوٹلوں میں جانا تو انورڈ نہیں کر سکتے نا“ فائزہ نے سامنے بنے شہر کے مشہور اور مینکے ترین ہوٹل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

تب ہی ان کی نظروں کے سامنے ایک سیاہ مرسیڈیز آکر رکی۔ اس کی دونوں سائیڈوں کے دروازے کھلے اور ساتھ ہی ساجدہ کی آنکھیں بھی کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ کار کی ڈرائیونگ سیٹ سے ایک انتہائی اسمارٹ اور ماڈرن لڑکا برآمد ہوا جبکہ دوسری طرف سے نندہ اور میرون امتزاج کا سوٹ پہنے اور آنکھوں پر گانگز

ابا حیرانی سے انہیں دیکھ رہے تھے۔ ”یہ تم سے سونیا نے کہا ہے؟“

”صرف یہی نہیں اور بھی بہت کچھ کہا ہے۔“
 ابا کی بات ادھوری رہ گئی کیونکہ سونیا صاحبہ کوئی زیادہ دور نہیں تھیں۔ دروازے سے ہی چسکی ان کی باتیں سن رہی تھیں اور اب بے قرار ہو کر آخر کار کمرے میں ہی انٹری دے دی تھی۔

”آخر میں نے ایسا کیا کہہ دیا ہے کہ آپ ابا کو بڑھا چڑھا کر بتا رہی ہیں۔“ سونیا نے ناک چڑھا کر کہا۔
 ”تم یہاں کس لیے آئی ہو؟ تم سے کس نے کہا ہے کہ ہماری باتوں میں دخل دو۔“ ابا نے ناکواری سے اسے دیکھا۔

”آپ میرے رشتے کے بارے میں تو ابا سے بتا رہے خیال کر رہی ہیں۔ ساجدہ کے رشتے کے بارے میں نہیں کریں گی۔“ سونیا نے مکاری سے بات بدلنے کی کوشش کی۔

”ساجدہ کا رشتہ کیا مطلب؟“ ابا نے الجھ کر اسے دیکھا۔

”کیوں ابا! آپ نے ابا کو نہیں بتایا کہ ثریا ابا ساجدہ کے لیے اپنی نند فمیدہ کے جیسے کا رشتہ لے کر آئی تھیں۔“

ابا نے دانت کچکچا کر اسے دیکھا۔ وہ یہ بات ابا کو نہیں بتانا چاہتی تھیں۔ انہوں نے ثریا کو بھی یہ بات بتانے سے منع کیا تھا کیونکہ انہیں خدشہ تھا کہ کہیں ابا اس رشتے پر سنجیدگی سے غور نہ کرنے لگ جائیں۔

”یہ کیا چکر ہے آخر؟ صبح جب میں اس گھر سے گیا تھا اس وقت تک تو ایسی کوئی بات نہیں تھی؟“ ابا نے ابا سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”اب ایسی کیا بات ہو گئی ہے کہ تم دونوں آپس میں ہی الجھ رہی ہو۔ کبھی سونیا کے رشتے پر تو کبھی ساجدہ کے رشتے پر؟“

”مجھ سے کیا پوچھتے ہیں۔ اسی سے پوچھیں جو آپ کو سب باتوں کی خبر دے رہی ہے۔ اسے اتنی شرم نہیں ہے کہ لڑکیاں ایسے معاملات میں نہیں بولتیں۔“

”تم کچھ بتا رہی تھیں سونیا کے بارے میں؟“ ابا نے ابا سے مخاطب ہو کر کہا۔

”پوچھیں اپنی لاڈلی سے۔ آخر وہ کون زیشان ہے جس کی محبت کا یہ دم بھر رہی ہے اور جس کے ساتھ یہ ہوٹلوں میں گھومتی پھر رہی ہے۔ پوچھیں اس سے۔“ ابا نے غصے سے کہا۔

”سونیا! اب کی بار ابا کا لہجہ واقعی سخت تھا۔“ یہ کیا سن رہا ہوں میں؟ اگر میں نے تمہیں باہر آنے جانے اور اپنی دوستوں کے گھر جانے کی آزادی دے رکھی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم اس آزادی کا ناجائز فائدہ اٹھاؤ۔“

”ابا! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ سونیا کا انداز اب دھیمہ ہو گیا تھا۔ ”میں نے ناجائز فائدہ نہیں اٹھایا ہے۔ لیکن کسی سے محبت کرنا اور اس سے شادی کی خواہش کرنا کوئی جرم تو نہیں ہے۔“

”تو بات یہاں تک پہنچ گئی ہے۔“ ابا کو اس کی بات سے واقعی شاک پہنچا تھا۔ اس کے اس انداز پر جہاں چوکھٹ سے لگی، ان کی باتیں سختی ساجدہ حیران رہ گئی تھیں وہیں ابا بھی بے یقینی سے اسے دیکھ رہے تھے۔

”ناصر میں کیا برائی ہے؟ ہینڈ سم ہے اتنا بڑھا لکھا ہے؟ اچھی جاب ہے اور پھر سب سے بڑھ کر وہ دیکھا بھلا ہے۔“

”جتنی خوبیاں آپ نے ناصر میں گنائی ہیں اس سے کہیں زیادہ خوبیاں زیشان میں ہیں اور جتنی دولت زیشان کے پاس ہے۔“ اس کا انداز گھبراہٹ ہو گیا۔ ”اتنی تو ناصر بھی خواب میں بھی نہیں سوچ سکتا۔ اس کی تو گاڑی کے پیٹرول کا خرچ بھی ناصر کی کل تنخواہ سے زیادہ ہے۔“

سو باتوں کی ایک بات یہ ہے کہ میں صرف زیشان سے ہی شادی کروں گی۔“

”ٹھیک ہے۔“ ابا کا انداز شکست خوردہ تھا۔ ”تو پھر اس سے کہو کہ وہ ہمارے گھر رشتہ لے آئے۔“
 ”سچ ابا! وہ خوش ہو کر بولی۔“ مجھے پہلے ہی پتا تھا کہ آپ میری کوئی بات بھی نہیں ٹل سکتے۔“

”اچھا ٹھیک ہے تم اب جاؤ۔“ ابا نے اسے باہر جانے کا اشارہ کیا۔

کمرے میں ایک لمحہ کے لیے خاموشی چھائی رہی پھر اچانک ابا نے پوچھا۔ ”یہ ساجدہ کے رشتے کا کیا چکر ہے؟ اور اگر اس کا کوئی رشتہ آیا ہے تو تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟“

ابا کی اس بات پر باہر کھڑی ساجدہ کا دل بڑی تیزی سے دھڑکا تھا۔ عین اسی لمحے سونیا نے فاتحانہ اور کچھ جتاتی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا تھا۔



ساجدہ پریشان تھی۔ ابا نے ابا سے رشتے کے بارے میں سننے کے بعد ثریا ابا کو بلا بھیجا تھا تاکہ وہ اس سلسلے میں انہیں تفصیلات سے آگاہ کر سکیں۔ وہ سارا دن اسکول میں بھی یہی سوچ کر پریشان ہو رہی تھی کہ اب نہ جانے کیا ہو۔ کہیں ابا مان ہی نہ جائیں۔ وہ اسکول سے واپس گھر گئی تو ثریا آیا آئی ہوئی تھیں۔ غالباً ان کی ابا سے بات ہو گئی تھی کیونکہ وہ اسی سلسلے میں ابا سے ڈسکس کر رہی تھیں۔

”ارے ابا! آپ اتنی پریشان کیوں ہیں؟ آپ کو تو خوش ہونا چاہیے کہ ساجدہ کا کہیں رشتہ ہونے کا امکان پیدا ہو گیا ہے۔“ ثریا ابا کو سوزی سے ابا سے کہہ رہی تھیں۔

”ارے خاک دھول ایسے رشتے پر۔ ایسا شخص جس کے تین ہوتے بچے ہیں۔ اور جو اتنا ظالم اور سفاک ہے۔ میں کیسے اس سے اپنی بیٹی کی شادی کروں۔“

ساجدہ یونیفارم اتار کر کھانا گرم کرتے ہوئے تشویش سے ابا اور ثریا ابا کی باتیں سن رہی تھی۔

”تو ابا! مجبوری ہے۔ کتنے عرصے سے آپ ساجدہ کے رشتے کے لیے کوششیں کر رہی ہیں لیکن آپ خود بتائیں کہ کہیں کوئی بات بنی؟ اور محبوب حسین اتنا برا نہیں ہے ابا! وہ کہتے ہیں تاکہ بد اچھا بد نام برا۔ تو بس وہ بد نام ہو گیا ہے اور جہاں تک اس کا اپنی بیوی

کو بارنے پینے والی بات ہے تو اس کی بیوی بھی کم نہیں تھی۔ فمیدہ بتا رہی تھی کہ بہت زبان چلاتی تھی اپنے میاں سے جب پتا ہو کہ بندہ آگے سے تھوڑا غصے والا ہے تو انسان کو احتیاط کرنی چاہیے اتنی زبان نہیں چلاتی چاہیے۔“

”اچھا۔ بس کرو اب اس کی تعریفیں۔“ ابا نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔ ”تمہیں یہاں اتنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ میں نے تمہیں منع کیا تھا۔“

”ابا نے بلایا تھا۔ میں کیسے انکار کرتی۔ اور آپ اتنی پریشان نہ ہوں۔ ابھی ابا نے صرف رشتہ لانے کو ہی تو کہا ہے کون سا رشتہ قبول کر لیا ہے ایک دفعہ آپ ان لوگوں سے ملیں۔ بات وغیرہ کر لیں پھر جو جواب آپ دیں آپ کی مرضی۔“

”جس کئی جانا نہیں اس کے کوس گننے کا کیا فائدہ۔ تم بس ان لوگوں کو منع کر دینا۔“ ابا کے قطعیت پر ساجدہ نے ایک طویل اطمینان بھر اسانس لیا۔
 ”لیکن ابا! ابا ناراض ہوں گے۔ انہوں نے مجھے خود بلا کر کہا ہے۔“ ثریا ابا نے منہ بنا کر کہا۔

”تم ان کی ناراضی کو چھوڑو۔ میں ان سے خود بات کر لوں گی۔ ویسے ہی آج کل ان کا دماغ سونیا کے مسئلے میں الجھا ہوا ہے۔“

”کیوں؟ کیا ہوا ہے سونیا کو؟“ ثریا ابا نے چونک کر پوچھا۔ ابا نے اسے سونیا کے ”مسئلے“ کے بارے میں آگاہ کرنے لگیں۔

”وہ اچھا تو یہ بات ہے۔“ انہوں نے حیران ہو کر کہا۔ ”ویسے ابا! اگر رشتہ اچھا ہے تو آپ لوگ ضد میں نہ آئیں۔ اس کی شادی ہو جس کو جس جہاں وہ چاہتی ہے ورنہ آپ کو تو پتا ہے وہ ضد کی کتنی بچی ہے۔“

”وہ جانے اور اس کا باپ جانے۔“ ابا نے سر جھٹکا۔ ”میری تو وہ ویسے بھی کوئی بات نہیں سنتی۔“
 وہ دونوں اب سونیا کے مسئلے کے بارے میں ڈسکس کرنے لگی تھیں۔ اس نے اپنا بیگ اٹھایا اور باہر آئی۔



پاک سوسائٹی ڈاٹ کام آپکو تمام ڈائجسٹ

ڈائریکٹ ڈاؤنلوڈنگ لنک کے ساتھ

ڈاؤنلوڈ کرنے کی سہولت دیتا ہے

آج ہی وزٹ کریں

www.paksociety.com

سب برے لگنے شروع ہو گئے ہیں۔“
”ابا! آپ میری بات کو غلط رنگ مت دیں۔“ سونیا نے جلدی سے وضاحت کی۔ ”لیکن آپ یہ بتائیں کہ آپ کو اس سے ہوٹل میں ملنے سے کیا مسئلہ ہے۔ جو بات یہاں ہوگی وہ وہاں بھی تو ہو سکتی ہے۔“

”بالکل ہو سکتی ہے۔ لیکن رشتہ طے کرنے کے کچھ اصول ہیں۔ رشتے گھروں میں بڑے بزرگ آپس میں مل بیٹھ کر بات کر کے طے کرتے ہیں اسے کہو کہ اگر اس کے والدین نہیں ہیں تو کسی اور رشتہ دار کو رشتہ لینے کے لیے لے کر آئے۔ میں اس سے ملوں گا۔ بات کروں گا۔ پھر اس کے بارے میں کوئی چھان بین کرواؤں گا معلومات کرواؤں گا۔ جب مجھے پوری طرح اطمینان ہو جائے گا تب ہی میں ہاں کروں گا۔ ایسے ہی تو یہ سب نہیں ہو سکتا۔“

”ابا! آخر اس سب کی ضرورت ہی کیا ہے۔“ سونیا نے منہ بنا کر کہا۔ ”ڈیٹا بہت اچھا ہے۔ میں اسے اچھی طرح جانتی ہوں۔“

”تم چپ کرو۔“ ابا نے اسے ٹوک دیا۔ ”تم ابھی بچی ہو۔ تمہیں ان باتوں کا نہیں پتا۔ آج کی دنیا میں لوگ اپنے منہ پر کئی کئی نقاب چڑھائے پھرتے ہیں۔ باہر سے کچھ ہوتے ہیں اندر سے کچھ۔“

سونیا کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ وہ ان باتوں سے کوئی زیادہ متفق نہیں ہے۔ پھر وہ بادل خواستہ بولی۔ ”ابا! آپ بعد میں یہ سب کچھ کر بیچے گا آپ فی الحال اس سے کل ہوٹل میں تو مل لیں اس نے کل کے لیے ٹیکسٹ ریڈ کر دالی ہے۔“

”کیا وہ ہمارے گھر نہیں آ سکتا؟“ ابا نے ناراضی سے پوچھا۔

”آ سکتا ہے۔ کیوں نہیں آ سکتا۔ لیکن فی الحال تو آپ اس سے کل ہوٹل میں مل لیں۔ پلیز ابا! میری خاطر۔“ اب کی بار اس نے لجاجت سے کہا تھا اور ابا اس کے لہجے کے سامنے بے بس ہو کر رہ گئے۔

”تمہارا مطلب ہے تمہارے ابا ڈیٹا سے ملنے

”ابا! وہ آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔“ تقریباً ڈیڑھ بجتے کے بعد سونیا نے ابا سے جھجکتے ہوئے کہا تھا۔

”وہ کون؟“ ابا نے پوچھا۔

”ڈیٹا سڈیشن آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں انہوں نے آپ کو کے ایف سی میں بلایا ہے۔“ سونیا نے ایک مشہور ہوٹل کا نام لیا۔

”لیکن میں نے تم سے کہا تھا کہ اسے کہو کہ اپنے ماں باپ کو لے کر رشتہ لینے کے لیے آئے۔ کیا تم نے اسے نہیں بتایا؟“

”وہ اسی سلسلے میں تو آپ سے ملنا چاہتے ہیں اس کے پیرٹس نہیں ہیں۔ ان کا انتقال ہو چکا ہے۔“ سونیا ڈیٹا کے لیے کبھی ”اس“ تو کبھی ”من“ کا صیغہ استعمال کر رہی تھی۔

”اگر ماں باپ نہیں ہیں تو کوئی دوست بھی نہیں ہے کوئی رشتہ دار بھی نہیں ہے؟“ ابا نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ”اور وہ مجھ سے ہوٹل میں کیوں ملنا چاہتا ہے؟“

”وہ آپ سے رشتہ کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہے۔“

”داغ ٹھیک ہے تمہارا؟“ ابا نے غصے سے اس کی بات کاٹ دی۔ ”کیا رشتوں کی باتیں ہوٹلوں میں طے کی جاتی ہیں۔ ہمارے گھر آنے میں اسے کوئی مسئلہ ہے؟“

”کوئی مسئلہ نہیں ہے لیکن آپ خود سوچیں ہمارا گھر کتنا معمولی اور چھوٹا سا ہے اور ہمارے محلے کا ماحول بھی کیسا فضول اور عامیانہ سا ہے۔ جب یہاں کی کچی کچی گلیوں سے اتنی بڑی مرشدیز گزرتی ہوئی ہمارے گھر کے سامنے رکے گی تو یہاں کے چھوٹے لوگ کتنی باتیں بنائیں گے۔ آپ کو معلوم ہے نا؟“

ابا نے افسوس سے اسے دیکھا۔ ”تمہیں جمعہ جمعہ آٹھ دن بھی نہیں ہوئے ڈیٹا سے ملے ہوئے اور تمہیں یہ گھر یہ محلہ اور اس محلے میں بسنے والے لوگ

خود ہوٹل گئے ہیں اور وہ بھی رشتے کی بات کرنے؟“
فائزہ نے حیرت سے ساجدہ کی طرف دیکھا۔ ساجدہ
نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ اس وقت یوشن پڑھنے فائزہ
کے گھر آئی ہوئی تھی۔

”واؤ! اس کا مطلب ہے تمہارے ابا بڑے روشن
خیال ہیں۔ ہے نا؟“

”وہ روشن خیال نہیں ہیں۔“ ساجدہ نے نفی میں
سر ہلایا۔ ”بات صرف اتنی ہی ہے کہ وہ سونیا کی بات
نہیں ٹل سکتے۔ سونیا نے انہیں مجبور کیا ہے کہ وہ
زیشان نامی اس لڑکے سے ہوٹل میں جا کر ملیں۔“

”اور تم؟“ فائزہ نے پر خیال نظروں سے اس کی
طرف دیکھا۔ ”تم اگر کسی چیز کے لیے ان سے ضد کرو
تو کیا وہ تمہاری بات بھی مان لیں گے؟“



وہ گھر پہنچی تو ماحول خاصا سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔ گھر کے
سارے افراد برآمدے میں بیٹھے کسی اہم مسئلے پر گفتگو
کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ ثریا آیا بھی اپنے دونوں
بچوں سمیت وہاں موجود تھیں۔ ماحول کچھ کشیدہ سا نظر
آ رہا تھا۔ وہ گیٹ سے اندر داخل ہوئی تو سب کی نظریں
اس کی طرف اٹھ گئیں۔ وہ سب کو اپنی طرف دیکھتا ہوا
کچھ گڑبڑا سی گئی۔

”السلام و علیکم!“ اس نے منمناتی ہوئی آواز میں
سب کو سلام کیا۔ اس کے سلام کا جواب صرف ابا
نے دیا ”باقی سب خاموش رہے۔“
”کہاں سے آرہی ہو تم؟“ ابا نے سخت انداز میں
پوچھا۔

ساجدہ نے گہرا کر ابا کی طرف دیکھا وہ اچھی طرح
جانتے تھے کہ وہ اس وقت فائزہ کے گھر سے یوشن پڑھ
کر واپس آتی ہے تو پھر وہ کیوں پوچھ رہے تھے۔
”کیا بھری ہو گئی ہو؟ سنا نہیں تم نے کہ کہاں سے
آ رہی ہو تم؟“ اب کی بار ابا پھاڑ کھانے والے انداز میں
بولے۔

”ابا۔۔۔ میں فائزہ کے گھر سے واپس آرہی

ہوں۔۔۔ ابا۔۔۔ کوسہتا ہے۔“ اس نے انک انک
کر کہتے ہوئے مدد طلب نظروں سے ابا کی طرف
دیکھا۔

”تو کیا روز روز تمہارا اپنی سہیلی کے گھر جانا ضروری
ہے۔ ٹائم دیکھا ہے تم نے؟ جو ان لڑکیاں اتنی دیر گھر
سے باہر رہتے ہوئے اچھی لگتی ہیں؟“

ساجدہ کی ٹانگیں کانپنے لگیں۔ نجائے ابا اس سے
بات کرتے ہوئے اتنے سرد اور سفاک کیوں ہو جاتے
تھے۔

”بس بھی کریں سراب کے ابا!“ ابا اس کی مدد کو
آئیں۔ انہوں نے ساجدہ کی نم ہوتی آنکھیں دیکھ لی
تھیں۔ ”مغصہ کس کا ہے اور نکال کس غریب پر رہے
ہیں۔“ انہوں نے ساجدہ کو اندر جانے کا اشارہ کیا۔ وہ
کانپتی ٹانگوں کے ساتھ برآمدے سے ملحقہ کمرے میں
آگئی۔

”ہاں۔ پڑھ لکھ کر تو یہ پروفیسر بن جائے گی۔ ملک و
قوم کا نام روشن کرے گی۔“ ابا کی طنزیہ آواز اسے
کمرے میں بھی سنائی دی۔

”ابا! آپ چھوڑیں اس بات کو۔“ سراب نے ان
سے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ وہ بات زیادہ اہم ہے جو ہم
اس سے پہلے کر رہے تھے۔“

”کیا کہوں میں؟“ ابا کی آواز اب دھیمی ہو گئی تھی۔
”مجھے اس لڑکے سے مل کر سخت مایوسی ہوئی ہے۔ وہ تو
مجھ سے ایسے بات کر رہا تھا جیسے مجھ پر کوئی احسان کر رہا
ہو۔“

”آپ کو وہاں پر جانا ہی نہیں چاہیے تھا۔“ سراب
کے چہرے پر تڑاؤ نظر آ رہا تھا۔ ”کیا ہمیں یہ زیب دیتا
ہے کہ ہم لوگ ہوٹلوں میں جا کر رشتوں وغیرہ کی باتیں
کریں اور مجھے تو حیرت اس بات پر ہے آپ لوگوں نے
بالا ہی بالا اس بات کا فیصلہ کر لیا اور مجھے اس بات کی خبر
ہی نہیں ہونے دی۔ اور اگر آج بھی ابا مجھے نہ
بتاتیں تو مجھے تو اس بات کا پتا ہی نہ چلتا۔“ سراب کے
انداز میں شکوہ نظر آ رہا تھا۔

ساجدہ اس کی بات سن کر دروازے کی جھری سے

جھانک کر دیکھنے لگی۔ سونیا بھی وہیں موجود تھی۔ اس
کے چہرے پر کبیدگی نظر آرہی تھی۔
”میں تو خود اس بات کے حق میں نہیں تھی لیکن تم
تو جانتے ہو تمہارے ابا اور سونیا جب کسی بات کا فیصلہ
کر لیں تو پھر ان کو روکنا کتنا مشکل ہو جاتا ہے۔“ اب
کی بار ابا نے کچھ غصے سے کہا تھا۔

”اور سونیا! مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی۔“ اب کی
بار سراب نے سونیا سے مخاطب ہو کر ناگواری سے
کہا۔ ”مگر میں نے یا فوئی نے کبھی تم سے روایتی
بھائیوں جیسا سلوک نہیں کیا کبھی تم پر سختی یا روک
ٹوک نہیں کی تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم اس قسم کی
گھٹیا حرکتیں کرتی پھرو۔“

”ایسا کیا کر دیا ہے میں نے کہ آپ اسے گھٹیا
حرکتوں میں شمار کرنے لگے ہیں۔“ سونیا بجائے کسی
شرمندگی کا اظہار کرنے کے دبدبہ جواب دینے پر اتر
آئی۔

”تو اور کیا کرنا چاہتی ہو تم؟“ وہ تلخی سے بولا۔ ”کیا
کوئی کسر رہ گئی ہے۔“

”سراب! اب کو اس بند کرو اپنی۔“ اب کی بار ابا غصے
سے چلا اٹھے۔ ”یہ کس قسم کی باتیں کر رہے ہو تم۔ کیا
تم بھول گئے ہو کہ تم اس وقت کسی اور سے نہیں اپنی
بہن سے بات کر رہے ہو۔“

”بہن کو بھی چاہیے کہ وہ اپنے بڑے بھائی سے تمیز
سے بات کرے۔“ وہ آنت پیس کر بولا۔

”دیکھو سونیا!“ اب کی بار ابا سونیا سے مخاطب
ہوئے۔ ”میں صرف تمہاری خوشی کی خاطر اس لڑکے
سے ملنے چلا گیا تھا لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ وہ ایک
انتہائی مغرور اور بد تمیز لڑکا ہے۔ اسے تو بیٹوں سے بات
کرنے کے آداب تک معلوم نہیں ہیں۔ وہ مجھ سے
یوں بات کر رہا تھا جیسے میں تمہارا باپ نہیں کوئی تھرڈ
کلاس پولیس آفیسر ہوں۔ جس کے سوالات کے
جواب دینا اس کے لیے انتہائی ناگواری کا باعث ہوں
اور جسے وہ اپنی امارت کے بل بوتے پر چپ کر دینا چاہتا
ہو۔“

”ہو سکتا ہے کہ آپ کو سمجھنے میں غلطی ہوئی ہو۔“
سونیا نے بے نیازی سے کہا۔ ”اب زیشان اس بارے
میں کیا کہتا ہے یہ بھی تو معلوم کرنا پڑے گا۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ سراب اس کی بات سن
کر بھڑک اٹھا۔ ”تمہیں ابا کی بات کا اعتبار نہیں ہے۔
تمہارے خیال میں ابا جھوٹے ہیں۔“

”میں نے ایسا کچھ بھی نہیں کہا۔“ وہ منہ بنا کر
بولی۔ ”میں تو صرف یہ کہہ رہی ہوں کہ ہو سکتا ہے کہ
ابا کو جو محسوس ہوا ہے اصل میں ایسا نہ ہو۔ ہو سکتا
ہے اس دن وہ کچھ تھکا ہوا ہو یا کسی بات پر اس کا موڈ
آف ہو۔ شاید اسی لیے وہ کچھ ایسا باری ایکٹ کر گیا ہو۔
پھر ایک ملاقات سے کسی شخص کے اچھے یا برے
ہونے کے بارے میں اندازہ کرنا بہت مشکل ہے۔ کسی
شخص کو مکمل جاننے کے لیے کم از کم تین چار ملاقاتیں
تو ہونی چاہئیں۔“

”یعنی ایک باری بے عزتی پر تیری تشفی نہیں ہوئی۔
تو چاہتی ہے کہ تیرا باپ تین چار بار بے عزت
ہو۔“ ابا نے اسے غصے سے لتاڑا۔

”سونیا! میں کوئی بچہ نہیں ہوں جسے تم ادھر ادھر کی
باتیں کر کے بھلا رہی ہو۔“ اب کی بار ابا کالجہ تیز تھا۔
”مگر دنیا دیکھی ہے میں نے اور اسے دیکھتے ہی میں
سمجھ گیا ہوں کہ وہ شخص قابل اعتبار نہیں ہے۔
تمہاری خاطر اگر میں اپنی بے عزتی نظر انداز کر بھی
دوں تو اور بھی بہت سی باتیں ہیں انہیں میں کیسے
نظر انداز کروں۔ اس لڑکے کا نہ تو کوئی رشتہ دار ہے
اور نہ کوئی ایسا خاص دوست ہے جو اس کی تصدیق
کر سکے اور نہ ہی وہ خود بتانے کو تیار ہے۔ اس شہر میں
وہ بالکل نیا ہے پہلے کس شہر میں تھا۔ وہ کیا کرتا تھا اس
بارے میں نہ تو وہ خود بتانے کو تیار ہے اور نہ ہمیں
معلوم ہے۔ ایسے مشکوک شخص کو میں اپنی بیٹی کا ہاتھ
کیسے تھما سکتا ہوں۔“

”ابا! یہ سب آپ کے وہاں ہے۔ بے بنیاد اندیشے
ہیں۔ آپ جانب دار ہو کر سوچ رہے ہیں کیونکہ زیشان
کے مقابل آپ کے بھائی کا بیٹا ہے۔ اسی خواہش کو

پورا کرنے کے لیے آپ جواز تلاش کر رہے ہیں۔
 وائیس ڈھونڈ رہے ہیں۔ میں صرف ڈیشن سے شادی
 کروں گی صرف ڈیشن سے۔“
 محبت واقعی اندھی ہوتی ہے، یہ اندازہ سونیا کو دیکھ کر
 بخوبی ہو رہا تھا۔ وہ اپنے داغ کو طاق میں رکھ صرف
 اپنے دل سے سوچ رہی تھی۔
 ”نکو اس بند کرو اپنی۔“ سراب غصے سے چلا کر
 بولا۔

”تم اتنی بے حیا ہو گئی ہو کہ باپ اور بھائیوں کے
 سامنے جو منہ میں آ رہا ہے بولے چلی جا رہی ہو۔ ایک
 بات یاد رکھو تمہاری شادی وہیں ہوگی جہاں ہم لوگ
 چاہیں گے۔ سمجھیں تم!“ وہ قطعیت سے کہتا وہاں
 سے اٹھ کر چلا گیا۔

سونیا نے فریادی نظروں سے ابا کی طرف دیکھا۔
 ”دیکھا ابا! آپ نے سراب بھائی مجھ سے کس انداز
 میں بات کر رہے تھے۔“

”تو اور کیسے کرتا۔ تمہارے اس کارنامے پر تمہیں
 شاباش دیتا۔“ اب کی بار ابا نے اسے لتاڑا۔

”سونیا! کچھ ہوش کے ناخن لو۔ ہم تمہارے اپنے
 ہیں۔ ہم تمہارے بارے میں برا کیسے سوچ سکتے
 ہیں۔“ ثریا آپا نے رسائیت سے کہا۔ سونیا نے جواب
 میں کچھ نہیں کہا اور راسمانہ بنا کر بیٹھ گئی۔

”ارے یاد آیا۔ ثریا! ابا نے اچانک چونک کر ثریا
 آپا کی طرف دیکھا۔ ”تم نے محبوب حسین کے گھر
 والوں کو رشتہ لانے کو کہا تھا؟ کوئی آیا نہیں پھر ان کے
 گھر والوں میں سے۔“

”فہم دراصل۔ ابا۔“ ثریا آپا نے گہرا کر اباں
 کی طرف دیکھا۔ انہوں نے اباں کے کہنے پر۔

اپنی منہ فمیدہ کو انکار کر دیا تھا۔ لیکن اب ان کی
 سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ ابا کو یہ بات کیسے بتائیں۔

”ثریا نے ان سے کہہ دیا تھا لیکن اب ان لوگوں کا
 خود ہی ارادہ تبدیل ہو گیا ہے۔“ اباں نے اتنے اطمینان

سے جھوٹ بولا کہ وہاں بیٹھی ثریا آپا اور اندر حزی
 ساجدہ بھی حیران رہ گئی۔ سونیا نے بھی چونک کر ان کی

طرف دیکھا تھا۔
 ”کیا مطلب؟“ ابا نے حیرانی سے کہا۔
 ”مطلب یہ کہ وہ لوگ اب یہاں رشتہ نہیں کرنا
 چاہتے۔ وہ لوگ کہیں اور پر تلاش کر رہے ہیں انہوں
 نے ہم سے معذرت کر لی ہے۔“ اباں نے سکون سے
 ایک اور جھوٹ بولا اور ان کے اس جھوٹ پر ساجدہ کا
 دل چاہا کہ وہ انہیں کم از کم سونے کا ایک میڈل ضرور
 پہنا دے۔

”عجیب لوگ ہیں۔ اگر ایسا ہی کرنا تھا تو پہلے بات
 کرنے کی کیا ضرورت تھی۔“ ابا نے کچھ ترشی سے
 کہا۔

”چلیں جو ہوا اچھا ہی ہوا۔ اب آپ خود نہ ان سے
 کوئی اس سلسلے میں بات کرنے لگ جائے گا۔ اچھا
 نہیں لگے گا۔“ اباں نے فصاحت کی۔

”ارے داغ خراب ہو گیا ہے میرا کہ میں ایسے
 فضول لوگوں سے کوئی بات کروں گا۔ میری طرف سے
 بھاڑ میں جائیں۔“ ابا غصے میں لگ رہے تھے۔

”ارے اباں! آپ نے تو مکمل کر دیا۔“ ابا کے
 جانے کے بعد ثریا آپا نے خوش ہو کر اباں سے کہا۔

”کیسے بات کو سنبھالا۔ ورنہ میں تو ڈر رہی تھی کہ
 میں ابا کو منع کرنے والی بات بتاؤں گی تو ابا کہیں ناراض
 ہی نہ ہو جائیں۔“

”اباں! آپ بہت اچھی ہیں۔ بہت اچھی۔“
 ساجدہ نے شکر گزاری سے ان کی طرف دیکھا۔

”بات تو میں نے بنا دی ہے۔ لیکن اب کو شش کرنا
 کہ یہ بات تمہارے ابا کو نہ پہنچے۔“ انہوں نے کہہ
 کر خاموش بیٹھی سونیا کی طرف دیکھا۔

”سونیا! یہ بات تمہارے ابا کو پتا نہیں چلتی
 چاہیے۔ سن رہی ہوتا یہ بات۔“ انہوں نے قدرے

تخت کچے میں سونیا سے کہا۔ سونیا نے بے زاری سے
 اثبات میں سر ہلا دیا۔



گھر میں کشیدگی کی فضا تھی۔ سونیا اپنی ضد پر اڑی

ہوئی تھی۔ وہ کسی کی بات سننے کے لیے تیار نہیں تھی۔
 ساجدہ نے بھی ایک دوبار موقع پا کر اسے سمجھانے کی
 کوشش کی تھی۔ سلسلے فائزہ کی یہ بات بھی بتائی تھی کہ
 اس نے ڈیشن کو کسی اور لڑکی کے ساتھ گھومتے پھرتے
 دیکھا ہے لیکن وہ اس کی یہ بات سن کر اور بھڑک اٹھی
 تھی، اس کا خیال تھا کہ ساجدہ اور فائزہ دونوں حسد میں
 اس قسم کی باتیں کر رہی ہیں کیونکہ ان دونوں سے یہ
 بات ہنسن ہی نہیں ہو رہی کہ اس کی شادی اتنے ہینڈم
 اور دولت مند لڑکے سے ہو رہی ہے۔ اس نے سچ
 لہجے میں ساجدہ سے کہا کہ وہ اپنے کام سے کام رکھے اور
 اپنی فکر کرے اس کی فکر کرنا چھوڑ دے۔

اور صرف دونوں بعد اسے اپنی فکر کرنا پڑ گئی جب ابا
 نے دکان سے گھر آنے کے بعد غصے سے اباں کو ان کا وہ
 ذہانت بھرا جھوٹ بتایا جو انہوں نے بڑی صفائی سے
 گھڑا تھا۔

”شرم نہیں آئی تم لوگوں کو جھوٹ بولتے ہوئے
 رشتے سے منع تم لوگوں نے خود کیا اور نام لگا دیا ان
 لوگوں کا۔ بڑی چالاکیاں کرنا آگئی ہیں تم لوگوں کو۔“ ابا
 خاموشی میں لگ رہے تھے۔

”آپ۔۔۔ کو کس نے بتایا؟“ اباں نے گہرا کر
 پوچھا۔ ان کی بات سن کر سامنے برآمدے میں بیٹھی
 سبزی بٹاتی ساجدہ بھی گہرا گئی تھی۔

”محبوب حسین خود آیا تھا میری دکان پر۔ شکوہ کر رہا
 تھا کہ ہم نے بغیر کوئی بات کہے سنے رشتہ سے صاف
 انکار کر دیا ہے۔ جب میں نے اس سے کہا کہ رشتہ لے
 کر آنے کا کہہ کر وہ لوگ خود ہی پیچھے ہٹے ہیں تو وہ تو
 حیران رہ گیا اور اس نے مجھے قسم کھا کر یقین دلایا کہ
 انکار انہوں نے نہیں بلکہ ہم لوگوں نے کیا ہے۔ کیا
 بتاؤں کتنی شرمندگی ہوئی ہے مجھے۔ کیا سوچتا ہو گا وہ
 ہمارے بارے میں۔“

”جو سوچتا ہے سوچتا رہے۔ اس کے سوچنے نہ
 سوچنے سے ہمیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ اباں اب
 سنبھل گئی تھیں۔

”یعنی تمہیں اپنے جھوٹ پر ذرا بھی شرمندگی

نہیں ہے؟“ اباں نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔
 ”اس وقت مجھے جو مناسب لگا، میں نے کہہ دیا اور
 ویسے بھی اب جو ہوتا تھا وہ چکا۔ اب تو آپ کو بھی پتا
 چل چکا ہو گا کہ مجھے یہ رشتہ ذرا بھی پسند نہیں ہے۔ اگر
 وہ لوگ رشتہ لے کر آ بھی جاتے تو بھی ہم نے انکار ہی
 کرنا تھا۔“

”کیوں انکار کر دیتے؟ تمہاری اطلاع کے لیے
 عرض ہے کہ میں یہ رشتہ قبول کرنے کا فیصلہ کر چکا
 ہوں۔ میں نے محبوب حسین کو تقریباً ہاں کہہ دی ہے
 اور اس سے کہہ دیا ہے کہ وہ دونوں میں کسی طور پر بھی
 رشتہ لینے کے لیے اپنے گھر والوں کو بھیج دے۔“ ابا
 نے بہت اطمینان سے کہا۔

ساجدہ کے ہاتھ سے چھری گر گئی۔ وہ وہیں مارے
 صدمے کے حق و دق رہ گئی تھی۔ اباں بھی حیرت اور
 شاک کے عالم میں ابا کو دیکھتی رہ گئی تھیں۔

”آپ نے مجھ سے پوچھے بغیر اتنا بڑا فیصلہ خود ہی
 کر لیا۔ میرا خیال نہیں آیا آپ کو؟“

”جب تم مجھ سے پوچھے بغیر ان لوگوں کو ہاں کہہ
 سکتی ہو تو میں انہیں ہاں کیوں نہیں کہہ سکتا۔ اور مجھے
 تو تم پر حیرت ہو رہی ہے، تمہیں تو ساجدہ کے رشتے کی
 بہت جلدی تھی، ہر آنے جانے والے کو اس کے رشتے
 کا کتنی تمہیں اب جب ایک رشتہ خود چل کر گھر آ رہا
 ہے تو تم اسے ٹھکراتا چاہتی ہو۔ کیا ہو گیا ہے تمہاری
 عقل کو؟“

”اور میری یہ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ آپ کی عقل کو
 کیا ہو گیا ہے۔ کیا آپ کو نظر نہیں آ رہا کہ وہ ساجدہ سے
 کتنا بڑا ہے۔ تین بچے ہیں اس کے اس کا کردار اس
 کا مزاج، آپ کو کچھ نظر نہیں آ رہا؟“ اباں تاسف سے
 انہیں دیکھ رہی تھیں۔

”سب کچھ نظر آ رہا ہے مجھے اور بہت سوچ سمجھ کر
 فیصلہ کیا ہے میں نے اور میرا تمہیں مشورہ یہی ہے کہ
 تم بھی حقیقت پسند بن کر سوچو، جذباتی ہو کر نہیں اور
 حقیقت یہی ہے کہ جو خالی ساجدہ میں ہے اس کی وجہ
 سے اس کے ایسے ہی رشتے آئیں گے تم خود بتاؤ تم

کتنے عرصے سے اس کے لیے رشتہ تلاش کر رہی ہو۔
بتاؤ کوئی رشتہ ملا؟" ابا واقعی بہت حقیقت پسند ہیں یہ
اندازہ ساجدہ کو اب بہت اچھی طرح ہو رہا تھا۔
"یہ ٹھیک ہے کہ میں ساجدہ کے رشتے کے لیے
پریشان تھی اور اب بھی ہوں لیکن اس کا مطلب یہ تو
نہیں کہ اپنی پریشانی دور کرنے کے لیے ہم اپنی بیٹی کو
ایک ایسے شخص کے پلے باندھ دیں جس کا کردار
مفلوک اور مزاج اتنا کڑوا ہے۔ یاد نہیں کیسے اپنی بیوی
کو مارتا پینتا تھا۔ کیسے اس کا جینا حرام کر رکھا تھا۔ اگر
ہم اس کی زیادہ عمر اور تین بچوں کو نظر انداز کر بھی دیں
تب بھی اس بات کو کیسے نظر انداز کر سکتے ہیں۔"
"تم نے خود اسے ایسا کرتے ہوئے دیکھا ہے؟"
"نہیں۔ لوگوں سے سنا ہے۔ اس کے ساتھ رہنے
والے ہمسائے اور۔"

"یعنی تم صرف سنی سنائی پر اعتبار کر کے اپنے گھر
آنے والے اس واحد رشتے کو بھی ٹھکرادینا چاہتی ہو۔
ارے سنی سنائی پر نہ جاؤ۔ لوگوں کو تو عادت ہوتی ہے
بات کا جتنکڑ بنانے کی اور پھر اس کے کردار کی اچھائی اس
سے بڑھ کر اور کیا ہوگی کہ اس نے جینے لینے سے صاف
انکار کر دیا ہے اس نے مجھے صاف کہہ دیا کہ چاچا جی
میں آپ سے جینے کے سلسلے میں ایک پائی بھی نہیں
لوں گا۔ خود سوچو اس سے اچھا رشتہ اور وہ بھی ساجدہ
کے لیے ہمیں کوئی اور ملے گا۔" ابا کا انداز بالکل قطعی
تھا اور ساجدہ کو لگ رہا تھا اس کا دل ڈوبتا جا رہا ہو۔
ایک ایسا شخص جس کی صورت دیکھتے ہی اس سے
نفرت کرنے کو دل چاہتا ہو اس کے ساتھ وہ پوری
زندگی کیسے بتائے گی۔
"آپ کچھ بھی کہیں مجھے یہ رشتہ منظور نہیں
ہے۔" ابا نے غصے سے کہا۔

"میں تم سے پوچھ نہیں رہا۔ تمہیں بتا رہا ہوں۔"
ابا غصے سے کھڑے ہو گئے۔ "تم مانو یا نہ مانو میں اس کا
رشتہ وہاں ملے کر چکا ہوں۔ اور اس گھر میں وہی ہوگا جو
میں چاہوں گا۔ سمجھیں تم؟" ابا کہہ کر رے نہیں اور
وہاں سے اٹھ کر چلے گئے۔ ابا نے بے بسی سے

ساجدہ کی طرف دیکھا۔ وہ رو رہی تھی۔ ان کا دل چاہا
بھی رونا شروع ہو جائیں۔

"تمہارا مطلب ہے کہ تمہارے ابا نے تمہارا رشتہ
ایسے شخص کے ساتھ ملے کر دیا ہے جس کے تین بچے
ہیں جو رندا ہے۔ شرابی ہے، بد مزاج ہے، خود سر ہے
اور نہ جانے کیا کچھ ہے۔ ہے نا۔"
فائزہ تنگی سے بولی۔ وہ اس وقت فائزہ کے گھر آئی
ہوئی تھی اور وہ دونوں فائزہ کے کمرے میں بیٹھی ہوئی
تھیں۔

"مجھے تو حیرت اس بات پر ہو رہی ہے، ایک باپ
اپنی اولاد کے بارے میں اتنا دہرا معیار بھی رکھ سکتا
ہے۔ ایک بیٹی کے بارے میں اتنا اچھا اور دوسری کے
بارے میں اتنا برا۔" وہ حیرت اور دکھ سے مغموم بیٹھی
ساجدہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"اور تم۔" مجھے تو تم پر طیش آ رہا ہے۔ تم چپ
کر کے ان کی باتیں سنتی رہیں۔ تمہیں تو انکار کر دینا
چاہیے تھا۔ صاف انکار۔" اب وہ غصے سے کہہ رہی
تھی۔

"کیسے کرتی میں انکار۔" وہ رنجیدگی سے بولی۔ "وہ
اباں سے بات کر رہے تھے جب انہوں نے اباں کی کسی
بات کو قابل توجہ نہیں سمجھا تو میری بات کو کیسے
سمجھتے۔ ان کے پاس بہت سی دلیلیں تھیں، بہت سی
وجوہات تھیں اس رشتے کو قبول کرنے کی اور سب سے
بڑی دلیل سب سے بڑی وجہ تو انہوں نے یہی بتائی کہ
میں بد صورت ہوں۔ مجھ جیسی بد صورت لڑکی کے
لیے یہی رشتہ مل گیا ہے تو خیمت ہے اور کون آئے گا
مجھے بیاہنے اور ٹھیک ہی تو کہہ رہے تھے وہ۔" اس کی
آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ "میں بد صورت ہوں
اور یہی میری اوقات ہے۔"

"بہت افسوس ہو رہا ہے۔ مجھے تم پر ساجدہ! بہت
افسوس۔" وہ ناسف سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے
بولی۔ "میں سمجھ رہی تھی کہ شاید اب تمہارے انداز

فکر میں تبدیلی واقع ہو گئی ہوگی اور تم میں اعتماد پیدا
ہو گیا ہوگا۔ لیکن۔ تم۔ تم تو وہی ساجدہ ہو۔ وہی خود
ترسی کا شکار، احساس کمتری کے خول میں جتنا رہنے والی
لڑکی دوسرے کے ہاتھوں میں اپنے مستقبل کا فیصلہ
سونپ کر اپنی ساری خرابیوں اور ناکامیوں کا ذمہ دار
نقدیر کو سمجھنے والی لڑکی، تم نے مجھے بہت مایوس کیا ہے
ساجدہ! بہت مایوس۔"

"تو کیا کروں۔ کیا کروں میں؟" وہ روتے ہوئے
بولی۔ "میں تمہاری طرح خوبصورت اور پر اعتماد نہیں
ہوں۔ میں ایک بد صورت اور بزدل لڑکی ہوں۔ مجھ
میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ میں اپنے باپ کے سامنے
کھڑی ہو جاؤں۔"

"بہادر بنو ساجدہ! اگر اس وقت بزدلی دکھاؤ گی تو
آئندہ پیش آنے والی مشکلات اور مصائب کا ذمہ دار
تمہیں قسمت کو ٹھہرانے کا کوئی حق نہیں ہوگا۔"

"شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ لیکن۔ میرے
لیے یہ سب کرنا بہت مشکل ہے۔" وہ انک کر بولی۔
"کیوں مشکل ہے۔ سونیا کی مثال تمہارے
سامنے ہے۔ اس نے بھی تو انکار کر دیا ہے حالانکہ اس
کے ساتھ ایسا کچھ بھی نہیں ہو رہا جو تمہارے ساتھ
ہو رہا ہے۔ ساجدہ! تمہیں انکار کرنا ہوگا ورنہ تمہارے
سارے خواب اور حورے وہ جائیں گے۔ وہ خواب
جنہوں نے تمہیں جینے کا نیا حوصلہ دیا ہے اور جن کو
پانے کے لیے تم اتنی محنت کر رہی ہو۔"

"میں تم سے کچھ کہہ رہی ہوں ساجدہ! اسے سوچ
میں ڈوبا ہوا دیکھ کر وہ اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ
لہراتے ہوئے بولی۔

"تم بالکل ٹھیک کہہ رہی فائزہ! وہ کچھ دیر بعد بولی تو
اس کا لہجہ نئے حوصلے اور عزم سے جگمگا رہا تھا۔ "میں
ضرور انکار کروں گی۔ آخر یہ زندگی بھر کی بات ہے، وہی
مذاق تو نہیں پھر سونیا نے بھی تو انکار کر دیا ہے۔ میں
کیوں انکار نہیں کر سکتی۔"

"یہ ہوئی نا بات۔" فائزہ خوش ہو کر بولی۔ "اب لگی
ہو نا میری اصلی والی سیلی۔"

"وہ لوگ آرہے ہیں کل۔" ابا نے کھانا کھاتے
ہوئے اباں کو بتایا۔ وہ دوپہر کا کھانا کھانے کے لیے گھر
آئے ہوئے تھے۔ ساجدہ بظاہر اپنی کتاب کھول کر
پڑھنے میں مصروف تھی لیکن اس کے کلن اباں اور ابا
کی باتوں میں لگے ہوئے تھے اس نے آج اسکول سے
چھٹی کی تھی کیونکہ وہ آج ابا کو اپنے انکار کے متعلق
بتانا چاہتی تھی اور اس کے لیے دوپہر کا وقت اس کے
خیال میں سب سے مناسب تھا کیونکہ اس وقت گھر
میں سوائے اباں اور ابا کے اور کوئی نہیں ہوتا تھا۔ فائزہ
نے اس سے کہا تھا کہ وہ زیادہ ٹائم ضائع کیے بغیر اپنے ابا
کو انکار کر دے کیونکہ ابھی صرف زبانی کلامی بات ہوئی
تھی اگر باقاعدہ رشتہ ملے ہو جاتا تو پھر اس بارے میں
بات کرنا بہت مشکل ہو جاتا۔

"محبوب حسین کے گھر والے باقاعدہ رشتہ لے کر
آ رہے ہیں۔" انہوں نے نوالہ منہ میں رکھتے ہوئے
کہا۔

"حالانکہ میں نے آپ کو منع کیا تھا۔" اباں نے
شکوہ کیا۔ "لیکن شاید آپ کے نزدیک میری بات کی
کوئی اہمیت ہی نہیں ہے۔"

"تم ایک بے وقوف عورت ہو۔" ابا نے ترشی سے
کہا۔ "اگر عقل سے سوچو گی تو محسوس ہوگا کہ یہ فیصلہ
کتنا درست ہے۔ اپنی بیٹی کی شکل و صورت کو وہ کھو
اور پھر دیکھو کہ یہ رشتہ مناسب ہے یا نہیں۔"

"اگر عقل کے ساتھ سوچنے سے اس قسم کے فیصلے
کیے جاتے ہیں تو پھر یہ عقل آپ کو ہی مبارک ہو
میرے سوچنے کے لیے میرا دل ہی کافی ہے۔" اباں
نے کٹنی سے کہا۔

"تم اور تمہارا دل دونوں ہی فصول ہیں۔" وہ چنگیر کو
سمیٹ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ "مجھ سے اب اس سلسلے
میں کوئی بحث نہ کرنا۔ وہ لوگ کل آرہے ہیں۔ سراب
سے کہہ کر جو منگوانا ہو منگوا لیتا۔"

ساجدہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اسے جو کچھ کہنا تھا ابھی کہنا

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام آپکو تمام ڈائجسٹ

ڈائریکٹ ڈاؤنلوڈنگ لنک کے ساتھ

ڈاؤنلوڈ کرنے کی سہولت دیتا ہے

آج ہی وزٹ کریں

www.paksociety.com

انکار کیا اب دوسری انکار کر رہی ہے غضب خدا کا کیا دوسرے گھروں میں بھی بیٹیاں اپنے باپ کے سامنے اس طرح کھڑے ہو کر بے حیائی سے انکار کر دیتی ہیں جیسے ہمارے گھر میں ہو رہا ہے۔

”ساجدو! میں نے حیرانی سے اسے دیکھا۔ ”تمہیں اپنے باپ سے ایسے نہیں کہنا چاہیے تھا۔“ ”کیوں میں! اس نے تم آنکھوں سے اُم کی طرف دیکھا کیا اثر انکار نہیں کر سکتی؟ میرے سینے میں دل نہیں ہے یا اپنے جذبات کو بیان کرنے کے لیے میرے منہ میں زبان نہیں ہے۔ میں بد صورت ہوں۔“ اس نے اب کی بار ابا کی طرف دیکھا۔ ”لیکن شاید آپ بھول گئے ہیں کہ بد صورت ہونے کے باوجود میرے سینے میں آپ کی طرح کا ایک زندہ دھڑکتا ہوا دل موجود ہے۔“

”دیکھا۔ دیکھا تم نے۔“ ابا نے وائٹ پیس کر کہا۔ ”کیسے زبان چلا رہی ہے میرے سامنے۔“ پھر وہ غصے سے اسے دیکھتے ہوئے بولے۔ ”بہت پر نکل آئے ہیں تمہارے۔ کیا اپنے باپ سے ایسے بات کی جاتی ہے۔ یہی کچھ سکھایا ہے تمہیں تمہارے اسکول والوں نے؟“

”ابا! میں نے آپ سے کوئی بد تمیزی نہیں کی۔ میں تو صرف اپنی رائے کا اظہار کر رہی تھی۔“ اس کی آواز کانپ رہی تھی اور اپنی رائے کا اظہار کرنا میرا حق ہے۔“

”نکو اس بند کرو۔“ ان کا ایک زوردار تھپڑ اس کے چہرے پر پڑا۔ ابا حق دتی انہیں دیکھتی رہ گئیں۔ ساجدہ نے پھٹی پھٹی نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔ آنسو بہت تیزی سے چلوں کی باڑھ توڑ کر نکلے تھے۔

”یہی ہے تمہارا حق۔“ وہ غصے سے دھاڑتے اس ”روشن خیال“ ابا سے بہت مختلف لگ رہے تھے جنہوں نے سونیا کی تمام باتیں بہت سکون سے سنی تھیں اور اس کی خاطر ہول میں ایک لڑکے سے ملنے گئے تھے۔

تھا بعد میں کہنا شاید اس کے کوئی کام نہ آتا۔ ابا وہاں سے جانے کے لیے مڑے۔ اس نے ابا کو انکار ”ابا!“ ابا نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں استغلاب اتر آیا۔ ”تم نے مجھے بلایا ہے؟“ ”جی ابا!“ اس نے سر ہلایا۔ ”مجھے مجھے آپ سے ایک بات کرنی ہے۔“ وہ تھوڑا نکلتے ہوئے بولی۔ ”مجھ سے؟“ ابا حیرت زدہ ہو کر بولے۔

”جی آپ سے۔“ آپ بیٹھیں نا۔“ اس نے سامنے بڑی چارپائی کی طرف اشارہ کیا۔ ابا تھوڑی دیر اسے ایسے دیکھتے رہے جیسے سمجھنے کی کوشش کر رہے ہوں پھر چارپائی پر بیٹھ گئے۔ ایسا شاید پہلی بار ہوا تھا کہ ساجدہ نے ان سے کوئی بات کرنے کے لیے انہیں اس طرح روکا تھا ورنہ وہ تو سونیا کی باتوں کو سننے اور اس کی فرمائشوں کو پورا کرنے کے عادی تھے۔

”ہاں کو۔“ ابا نے اس کی طرف دیکھا۔ ”ابا! وہ میں۔“ میرا مطلب ہے کہ۔“ ”یہ کیا وہ میں میں لگا رکھی ہے تم نے جلدی کو؟“ مجھے دکھن پر جانے میں دیر ہو رہی ہے۔“ ابا نے ترشی سے اس کی بات کاٹ دی۔

”ابا! میں آپ سے یہ کہنا چاہتی ہوں۔ کہ میں محبوب حسین سے شادی نہیں کر سکتی۔“ اس نے آخر دل کڑا کر کے کہہ ہی دیا۔

”کیا؟“ ابا اس طرح اچھلے جیسے چارپائی کے اسپرنگ نکل آئے ہوں۔ ”یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟“ ”جی ابا! میں بالکل ٹھیک کہہ رہی ہوں۔“ اب اس کا لہجہ مضبوط تھا۔ ”مجھے وہ شخص بالکل بھی اچھا نہیں لگتا۔ وہ اتنے کمزور کا حامل نہیں ہے اور ویسے بھی مجھے ابھی بہت بڑھنا ہے۔“

سر جھکا کر دھیرے دھیرے کہتے ہوئے اس نے نظریں اٹھا کر ابا کی طرف دیکھا اور گھبرا گئی۔ ابا بے حد غصے میں لگ رہے تھے۔ پھر وہ چلائے گئے۔ ”یہ کی ہے تم نے اپنی بیٹیوں کی تربیت۔“ انہوں نے حیران کھڑی ابا کو مخاطب کیا۔ ”پہلے ایک نے

”باب کے سامنے زمین چلاؤ۔ میری عزت کا میری زبان کا کوئی خیال ہے تم لوگوں کو؟ میں کہتا ہوں کیا خرابی ہے محبوب حسین میں۔ لولا ہے، لنگڑا ہے، لاج ہے کما نا نہیں ہے، کیا خرابی ہے اس میں؟“ کیا تمہارے لیے کوئی شہزادہ اتر کے آئے گا آسمان سے تاؤ جواب دو۔“

وہ غضب ناک انداز میں اس سے پوچھ رہے تھے لیکن ساجدہ ان کی باتوں کا کوئی جواب نہیں دے رہی تھی کیونکہ وہ رو رہی تھی۔ ہر شخص اس سے یہی پوچھتا تھا۔ ہر کوئی اس سے یہی کہتا تھا۔ وہ تو کسی شہزادے کی طلب گار نہیں تھی پھر اس سے یہ کیوں پوچھا جاتا تھا۔ ”جو رشتہ تمہیں مل گیا ہے نا اسے ہی غنیمت سمجھو یہ رشتہ بھی بڑی مشکلوں سے ملا ہے بہت پڑ بیلنے کے بعد۔ اسے بھی ٹھکرا دینا چاہتی ہو تم؟ کیا ساری زندگی ہمارے سر پر سوار رہو گی تم؟“

”بہت شکریہ ابا!“ وہ روتے ہوئے بڑی مشکل سے بولی ”بہت شکریہ آپ کا کہ آپ نے مجھے میری اوقات یاد دلادی۔ یہی تو ہے میری اوقات یہ میری سٹی ہے کہ میں اس کو بھول گئی تھی۔ میں بھول گئی تھی کہ میں آپ کی بد صورت بنی ہوں۔ میرے لیے آپ کا معیار کچھ اور ہے دوسروں کے لیے اور۔ آپ فکر مت کریں، میری شادی وہیں ہوگی جہاں آپ چاہتے ہیں۔ آئندہ آپ سے کچھ نہیں کہوں گی۔ ہمیشہ اپنی اوقات یاد رکھوں گی۔ ہمیشہ۔“

وہ روتے ہوئے وہاں سے ایسے بھاگی جیسے اس کی قسمت اس سے دور بھاگ رہی تھی۔



وہ مرجانا چاہتی تھی۔ لیکن مرجانا بھی کہاں آسان تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس دنیا میں تکلیف دہ زندگی گزارنے کے بعد جب وہ قبر میں جائے تو وہاں بھی اس کے لیے تکلیفوں اور اذیتوں بھری ایک اور زندگی منتظر ہو۔ لہذا وہ زندہ رہی اور اپنی آنکھوں سے اپنے خوابوں کو اجڑتے اور اپنی زندگی کو تباہ ہوتے دیکھتی رہی۔

اگلے روز وہی کچھ ہوا جو کچھ ابا چاہتے تھے۔ اس کا رشتہ محبوب حسین سے ملے ہو گیا۔ شادی دو تین مہینے کے بعد ہونا قرار پائی۔ ساجدہ کا رشتہ ملے کرنے کے دو تین دن بعد انہوں نے سونیا کا رشتہ بھی ناصر کے ساتھ ملے کرنے کا اعلان کر دیا۔ سونیا نے اس سلسلے میں احتجاج کرنے کی کوشش کی لیکن ابا نے اس کے احتجاج کو ”نرئی“ سے مسترد کر دیا انہوں نے سونیا سے کہا کہ وہ یہ سب کچھ اس کی بھلائی کے لیے کر رہے ہیں کیونکہ اپنے تجربے کی بنا پر وہ پرکھ چکے ہیں کہ ذیشان اس کے ساتھ مخلص نہیں ہے وہ اس کے لیے اچھا جیون سا بھی ثابت نہیں ہو گا جبکہ ناصر اس کے لیے ہر لحاظ سے اچھا اور بہترین جیون سا بھی ثابت ہو گا۔

دو تین روز کے بعد سعادت چچا اور ناصر کے دوسرے گھر والے بھی باقاعدہ رسم کر گئے۔ سونیا نے بظاہر خاموشی اختیار کر لی تھی اور سب نے گویا سکون کا سانس لیا تھا۔ اس کے خاموش ہونے کا مطلب بظاہر یہی تھا کہ وہ اس رشتے پر راضی ہو گئی ہے۔ انہوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ ساجدہ اور سونیا کی شادی اکٹھے ہی کر دیں گے۔ ساجدہ کو تو انہوں نے کچھ دینا نہیں تھا کہ انہیں اس کے لیے انتظام کرنے کو کچھ وقت چاہیے ہوتا اور وہ کئی سونیا، ان کی عزیز از جان بیٹی تو اس کے لیے پہلے ہی سے وہ بہت کچھ پس انداز کر چکے تھے اور باقی جو رہ گیا تھا وہ اسے دو ڈھائی ماہ میں آسانی سے جمع کر سکتے تھے۔

ساجدہ نے اسکول جانا چھوڑ دیا تھا۔ اسے پتا تھا کہ اب اس کا اسکول جانا زیادہ عرصے برداشت بھی نہیں کیا جائے گا اب وہ فائزہ سے بھی بہت کم ملتی تھی وہ بھی فائزہ اسے خود فون وغیرہ کر کے اس کی خیریت معلوم کر لیتی تھی۔

کیا فائدہ تھا اس سے بات کرنے کا۔ اس سے ملنے کا۔ اس سے ملنے کے بعد ہی تو وہ اپنی اوقات اور حیثیت بھولی تھی اور اس نے مستقبل کے بارے میں نہ جانے کیا کچھ سوچنا شروع کر دیا تھا لیکن۔ اچھا تھا۔ اچھا تھا کہ اب اسے اپنی اوقات دوبارہ سے یاد آئی

تھی۔ اس کا کام صرف دوسروں کی بات پر سر جھکانا اور ان کے احکام کو بلا چوں چرانا تھا۔ اس کی بد صورتی اس کا بہت بڑا جرم تھی اور اس کی سزا تو اسے بھگتنا ہی تھی۔



وہ گرمیوں کی ایک عام سی صبح تھی وہ اپنی چارپائی پر سر سے پیر تک چادر لپیٹے سوئی ہوئی تھی۔ اماں اسے اٹھنے کے لیے دو تین آوازیں دے چکی تھیں۔ گرمیاں ہونے کی وجہ سے وہ لوگ صحن میں چارپائیاں بچھا کر سوتے تھے۔ اماں کے اٹھانے کے باوجود وہ کسل مندی سے آنکھیں بند کیے پڑی رہی۔ اس کا دل اب کسی چیز میں نہیں لگتا تھا۔ نہ سونے میں نہ جاگنے میں نہ کھانے میں نہ بیٹنے میں اسے لگتا تھا جیسے زندگی سے اس کی ساری دلچسپی ختم ہو گئی ہو، اب شاید وہ زندگی کو نہیں گزار رہی تھی بلکہ زندگی اسے گزار رہی تھی۔

سورج کب کا طلوع ہو کر اب اس کے سر پر کھڑا اسے جا رہا تھا لیکن وہ اماں کے بار بار اٹھانے کے باوجود اپنی جگہ ڈھٹ بن کر پڑی رہی۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ سارے لوگ اسے اٹھاتے رہ جائیں لیکن وہ سوئی کی سوئی رہے۔

”اگر ایسا ہو جائے تو کتنا اچھا ہو۔“ اس نے حسرت سے سوچا۔ تب ہی اسے اماں کی گھبراہٹی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”ارے یہ صبح ہی صبح سونیا کہاں چلی گئی ہے۔ سب جگہ دیکھ چکی ہوں میں۔ کہیں نہیں ہے وہ۔ آخر کہاں چلی گئی ہے وہ؟“

”سراب کے ابا!“ اب وہ ابا کو آوازیں دے رہی تھیں۔

ابا نے جھنجھلاتے ہوئے پوچھا ”کیا بات ہے میوں اتنا چلا رہی ہو؟“

”ابھی تو میں چلا رہی ہوں تھوڑی دیر بعد آپ بھی چلانے لگیں گے۔ آپ کی لازمی بیٹی سونیا گھر پر نہیں ہے نہ جانے اتنی صبح کہاں چلی گئی ہے وہ۔“ اماں

کے انداز میں خوف، گھبراہٹ غصہ سب ہی کچھ نمایاں تھا۔

”ہاں، وہ مجھے بھی نظر نہیں آرہی کہاں گئی ہے وہ؟“ اماں نے بغیر سوچے سمجھے پوچھا پھر وہ کچھ پریشان نظر آنے لگے۔ ”کیا مطلب ہے تمہارا؟ اتنی صبح کہاں چلی گئی ہے وہ۔“

اتنی آوازیں سننے کے بعد اب اس کا سونا بنتا نہیں تھا۔ وہ بھی گھبراہٹ میں بستر چھوڑ کر نیچے اتر آئی۔ اماں اور ابا دونوں برآمدے میں مضطرب و پریشان کھڑے سونیا کے بارے میں سوچ رہے تھے۔

”تم نے بڑوس والوں کے گھر سے پوچھا ہے؟“ ہو سکتا اور صبح چلی گئی ہو۔“ اماں نے مضطرب سے انداز میں پوچھا۔

”ہاں گھر میں سب جگہ دیکھنے کے بعد ساتھ والوں کے گھر سے بھی پوچھا ہے میں نے۔“ اماں کا دل ہول رہا تھا اور یہ ہولا ہٹ اس وقت مزید بڑھ گئی جب نعمان نے آکر بتایا۔

”اماں! آپ کے تمام زیورات کے ڈبے خالی پڑے ہوئے ہیں اور الماری کالا ک بھی کھلا ہوا ہے۔“

”کیا؟“ اماں نے بدحواسی سے پوچھا۔ پھر اماں اور ابا بھاگ بھاگ کمرے میں پہنچے الماری کا کھلا ہوا لاک اور زیورات کے خالی ڈبے ان کا منہ چڑا رہے تھے۔

گھر کے تمام افراد آن واحد میں وہاں جمع ہو چکے تھے۔ سونیا بھی غائب اور زیورات بھی غائب تھیں۔ اس بات کا جو بھی مطلب تھا وہ سب بخوبی سمجھ رہے تھے۔

اماں دیوانوں کی طرح لکڑی سے بنی اس الماری کی تلاشی لے رہی تھیں۔ ان کے تمام زیورات کے علاوہ سونیا کے جینز کے لیے بنائے گئے کپڑوں کے جوڑوں میں سے بھی بیشتر غائب تھے۔

”دیکھ لیا، دیکھ لیا آپ نے۔“ وہ چیخ کر ابا سے بولیں ”دیکھ لیا آپ نے اپنی بیٹی کا کارنامہ، بھاگ گئی ہے وہ اپنے یار کے ساتھ۔“

”نہ نہیں نہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا سونیا ایسا نہیں کر سکتی۔ وہ ایسا نہیں کر سکتی۔ تمہیں ضرور

کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ ابا کی بدحواسی ان کے چہرے سے واضح تھی شاید وہ سمجھ کر بھی سمجھنا نہیں چاہتے تھے۔

”غلط فہمی؟“ ابا نے دکھ اور غصے سے ان کی طرف دیکھا۔ ”یہ غلط فہمی ہے۔ میرے تمام زیور غائب ہیں اس کے جینز کے تقریباً سارے کپڑے غائب ہیں وہ خود یہاں نہیں ہے۔ یہ غلط فہمی ہے بتائیں مجھے۔“ وہ اب رو رہی تھیں۔

ابا نے ہوتے چہرے کے ساتھ کبھی روتی ہوئی اباں کو دیکھ رہے تھے کبھی چوٹ کھلی ہوئی الماری کو اور کبھی گھر کے بڑے گیٹ کو انہیں شاید سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کریں تب ہی نعمان ایک کانڈ ہاتھ میں لیے ابا کی طرف بڑھا۔

”ابا! یہ سونیا کا خط ہے۔ یہ ڈرنک نیبل پر پڑا ہوا تھا۔“

ابا نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے وہ کانڈ لیا۔ اس پر لکھی ہوئی تحریر کو وہ ہزاروں میں بھی پہچان سکتے تھے وہ ان کی عزیز از جان بیٹی سونیا کی تحریر تھی۔ خط پر لکھا ہوا تھا۔

ابا! میں زیشان کے ساتھ یہاں سے بہت دور جا رہی ہوں۔ مجھے ڈھونڈنے کی کوشش مت کیجئے گا مجھے افسوس ہے کہ مجھے یہ انتہائی قدم اٹھانا پڑا لیکن اس کے ذمہ دار آپ لوگ ہیں اگر آپ سب میری بات مان لیتے تو مجھے یہ سب نہ کرنا پڑتا۔

میں اباں کے زیورات بھی لے کر جا رہی ہوں ویسے بھی یہ سارے زیورات میرے پاس ہی آئے تھے پہلے یا بعد میں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کیونکہ ساجدہ کو تو ویسے بھی آپ نے کچھ نہیں دینا تھا۔

خدا حافظ

آپ کی بیٹی سونیا

ابا کا چہرہ بالکل زرد پڑ گیا تھا۔ خط ان کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے جا کر انہیں ایسا لگ رہا تھا جیسے زمین و آسمان زور زور سے گھومنا شروع ہو گئے ہوں اور تیز

آندھ می سے گھر کا تمام چیزیں بکھرتی جا رہی ہوں۔ انہوں نے سارے کے لیے سامنے والی دیوار کو پکڑنے کی کوشش کی۔

”سونیا! تیرا ککھ نہ رہے۔ تو نے ہماری عزت خاک میں ملا دی۔“ اباں اب روتے ہوئے بین کر رہی تھیں۔ ”ارے کچھ تو خیال کر لیا ہوتا ہمارا۔“

”ابا! پلیز آہستہ بولیں۔ پورے مکمل دالوں کو سانس کی کیا۔“ مسراب نے ناگواری سے اباں کو ٹوکا۔

”میرے آہستہ بولنے سے کیا ہوگا۔ کیا یہ بات چھپ جائے گی۔ ایسی باتیں چھپا کرتی ہیں۔“ اباں بدستور رو رہی تھیں۔ بلی سب لوگ خاموش تھے کسی بات کی طرح۔

”ابا! یہ سب آپ کی دی ہوئی ڈھیل کا نتیجہ ہے۔ آپ نے اسے بہت سرجھا رکھا تھا۔“ مسراب نے اب کی بار ابا سے مخاطب ہو کر کہا۔

”صرف سرجھا رکھا تھا؟“ اباں نے مداخلت کی۔ ”ارے انہوں نے تو اسے لاڈ پار میں بالکل بگاڑ کر رکھ دیا تھا۔ تیرا کہا میں نے کہ لڑکی ذات سے اتنا مت سرجھاؤ مگر انہوں نے مجھ سے جو میری کوئی بات سنی ہو۔ اب بتائیں کیا جواب دیں گے ہم سعادت بھائی کو پورے خاندان والے تمہو تمہو کریں گے ہم پر کتنی بدنامی دو گی ہماری۔“

ابا ان سب باتوں کے جواب میں بالکل خاموش تھے۔ ساجدہ ان کی حالت کو تشویش سے دیکھ رہی تھی۔ انہیں بھی کچھ بولنا چاہیے تھا لیکن ایسا لگتا تھا جیسے انہیں سکتہ ہو گیا ہو وہ جہاں تھے وہیں رک گئے تھے۔ پھر اچانک وہ کھڑے کھڑے نیچے گر گئے۔

سب لوگ بہت تیزی سے ان کے پاس آئے تھے۔

ابا بہت سخت بیمار پڑے تھے ان کا اعصابی نظام شاید ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گیا تھا۔ کچھ دن انہیں ہسپتال میں بھی رہنا پڑا تاہم ایک ڈیڑھ ہفتے کے بعد وہ گھر

آگئے۔ یہ بات معمولی نہیں تھی کہ چھپالی جاتی۔ دودن میں ہی یہ بات پورے محلے میں پھیل گئی تھی۔ خاندان والے باتیں بنا رہے تھے اور محلے والوں نے سوال کر کر کے ان کا جینا دو بھر کر دیا تھا ان کے گھر کے کسی بھی فرد کا باہر جانا عذاب ہو گیا تھا۔ کچھ لوگ بہم ردی جاتے اور کچھ براہ راست طعن و تشنیع پر اتر آتے۔

انہوں نے اس واقعہ کی رپورٹ پولیس میں درج نہیں کی تھی البتہ سہرا اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر سونیا کو ڈھونڈنے کی کوشش ضرور کر رہا تھا لیکن ابھی تک اس کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔

اس صورت حال سے گھر کے تمام افراد پریشان تھے لیکن ابا کی حالت تو بہت قابل رحم ہو گئی تھی۔ وہ سارا دن بید پر خاموش پڑے چھت کو گھورتے رہتے۔ گھر سے باہر نکلنا انہوں نے تقریباً چھوڑ دیا تھا۔ وہ کان ان کی غیر موجودگی میں نعمان سنبھل رہا تھا۔

ساجدہ ان کے دکھ کا اندازہ کر سکتی تھی۔ جب خواب بکھر جائیں ۴ منٹیں دم توڑ دیں اور انسان کو کسی اپنے کے ہاتھوں تکلیف اور دکھ ملے تو دل خون کے آنسو رو رہا ہے۔ وہ یہ عذاب کتنے ہی عرصے سے جھیل رہی تھی۔ اپنوں کے درمیان اور اپنوں کے ساتھ رہتے ہوئے بھی اسے ایسا لگتا تھا کہ جیسے وہ اجنبیوں کے ساتھ رہتی ہو جنہیں اس کے احساسات اور جذبات سے کوئی دلچسپی نہ ہو۔

ابا جتنے عرصہ بیمار رہے تھے ساجدہ نے بی جان سے ان کی خدمت کی تھی۔ اباں تو خود صدمے کی حالت میں تھیں اور پھر وہ ابا کو کسی حد تک اس واقعے کا ذمہ دار بھی خیال کرتی تھیں لہذا وہ ان سے دور دور رہی رہتی تھیں اور وہیں بیٹھا تو وہ صرف باتیں بکھارنے کی ماہر تھیں سو آج کل بھی وہ یہ کام بہت خوش اسلوبی سے سرانجام دے رہی تھیں۔ اپنی باتوں سے وہ اباں اور ابا دونوں سے ہی خوب بہم ردی کا اظہار کرتی تھیں اور سونیا کو برا بھلا کہنے کا سیشن بھی ساتھ ساتھ ہی چلتا تھا۔

ساجدہ جب بھی ابا کی تیمارداری کے لیے ان کے

پاس جاتی تھی اسے ان کی آنکھوں میں دکھ کے ساتھ ساتھ شرمندگی بھی نظر آتی تھی۔ وہ جب تک ان کے پاس رہتی تو نظریں جھکائے رہتے۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ اس سے نظریں ملاسنے سے گریز کر رہے ہوں۔

”ابا! یہ دودھ پی لیں۔“ سونیا کو گئے ہوئے کافی دن بلکہ ہفتے ہو گئے تھے لیکن ابا ویسے ہی گھر میں پڑے ہوئے تھے۔ ان کی بیماری کافی حد تک ٹھیک ہو گئی تھی لیکن وہ اس جھٹکے سے شاید ابھی پوری طرح سنبھلے نہیں تھے۔

ابا اپنی آنکھوں پر بازو رکھ کر سوئے ہوئے تھے۔ اس کی آواز سن کر انہوں نے آنکھوں سے بازو ہٹا کر اسے دیکھا۔

”ابا! ان کا کوئی رد عمل ظاہر نہ ہونے پر اس نے آہستگی سے انہیں دوبارہ پکارا۔“ دودھ پی لیں۔“ ”رکھ دو ادھر۔“ انہوں نے سائیڈ پر پڑی ہوئی تپائی کی طرف اشارہ کیا۔ ”بی لوں گا تھوڑی دیر بعد۔“

”نہیں ابا! ابھی پی لیں۔ کل بھی آپ نے ایسے ہی کیا تھا اور پھر بعد میں نہیں پیا تھا ایسے ہی پڑا رہ گیا تھا۔“ وہ گلاس ہاتھ میں لیے وہیں کھڑی رہی۔

”کیا کروں گا دودھ پی کر میں۔ اگر تھوڑا سا زہر ہے تو وہ لاؤ۔“ ان کے انداز میں وہی یاسیت تھی جو پچھلے کئی دنوں سے ان کے لیے کاجزون کر رہی تھی۔

”ابا! پلیز ایسی باتیں نہ کریں۔ ہم سب کو آپ کی ضرورت ہے۔“ وہ گلو کیر لیمے میں بولی۔

ابا تھوڑی دیر اسے دیکھتے رہے پھر اچانک اٹھ کر اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر رونے لگے۔

”مجھے معاف کرو۔ مجھے معاف کرو بیٹی۔ میں نے میں نے تمہارے ساتھ بہت زیادتی کی ہے۔“ ساجدہ بوکھلا گئی۔ ”یہ۔ یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟“

”وہی جو مجھے کہنا چاہیے۔“

”لیکن ابا! مجھے یہ سب کچھ بالکل بھی اچھا نہیں لگ رہا ہے۔“ اس نے گلاس سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر ان کے ہاتھ تھام لیے۔ ”آخر ایسا کیوں کر رہے ہیں

آپ؟“ ”جو شخص کسی کے ساتھ زیادتی کرے۔ اس کے حقوق پامال کرے“ اس کا دل دکھائے کیا اسے اس شخص سے معافی نہیں مانگنی چاہیے۔“ ”ابا کا انداز دل گرفتہ سا تھا۔ جیسے وہ اپنے گناہوں کا اعتراف کر رہے ہوں۔“

”میرے دل پر“ میرے ضمیر پر بہت بوجھ ہے اس کا“ میں اس بوجھ کو اتار دیتا چاہتا ہوں میں نے تمہیں ہمیشہ نظر انداز کیا لیکن جس بنی کو میں دل و جان سے پیار کرتا رہا اس نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا۔“

ابا کا لہجہ گلو گیر ہو گیا۔ ”میرے منہ پر کالک مل وی۔ مجھے کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا۔ اگر مجھے پتا ہو ماکہ وہ بڑے ہو کر یہ گل کھلائے گی تو میں پیدا ہوتے ہی اس کا گلا گھونٹ دیتا۔ مجھے یہ دن تو نہ دیکھنا پڑتا جو اولاد اپنے والدین کے ساتھ ایسا سلوک کرتی ہے اس کے ساتھ بھی اچھا نہیں ہوگا۔ تم دیکھ لیتا۔“ ایسا کہتے ہوئے ان کا لہجہ ایک بارگی کانٹا تھا۔

”نہیں ابا! ایسا مت کہیں۔“ اس نے بے اختیار ابا کو ٹوکا۔ ”کچھ بھی ہو آخر وہ ہے تو ہماری اپنی۔ خون کا رشتہ ہے اس کے ساتھ ہمارا۔“ ”کوئی رشتہ نہیں ہے۔ اس سے ہمارا۔“ وہ غصہ سے بولا۔

ساجدہ جواب میں چپ رہی۔ وہ جانتی تھی کہ ابا یہ سب کچھ وقت غصے کے زیر اثر کہہ رہے ہیں۔ سونیا نے ابا کو جو شک پہنچایا تھا اس کا اثر دھیرے دھیرے ہی کم ہو سکتا تھا۔

”تم اسکول نہیں جاتیں اب؟“ کچھ لمحے خاموش رہنے کے بعد انہوں نے پوچھا۔

”جی ابا! میں نے اسکول جانا چھوڑ دیا ہے۔“ اس نے کوشش کی کہ اس کا لہجہ بے تاثر رہے۔

”لیکن کیوں؟ میرا مطلب ہے کہ۔“ تمہیں تو بہت شوق تھا پڑھنے کا۔ اور تم نے ہماری مخالفت کے باوجود

اسکول میں داخلہ لیا تھا۔“ ”ابا پتا نہیں واقعی انجان تھے یا پھر جان بوجھ کر انجان بن رہے تھے۔ اس نے کچھ حیرانی سے ابا کی طرف دیکھا پھر آہستہ سے بولی۔ ”ابا! اسکول تو مجھے ویسے بھی چھوڑنا تھا۔ آج نہیں تو۔ دوڑھاٹی ماہ بعد۔“ اس کی شادی محبوب حسین سے دوڑھاٹی مہینہ بعد ہی ہونا قرار پائی تھی۔

”تمہ محبوب حسین سے اپنا رشتہ طے ہونے کی وجہ سے ایسا کہہ رہی ہو؟“

ساجدہ جواب میں چپ رہی۔ ”تم اس رشتے سے خوش نہیں ہو۔“ ”ابا نے کچھ توقف کے بعد پوچھا۔

”نہیں ابا! ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔“ اس نے تردید کی۔

”لیکن تم نے انکار کر دیا تھا۔“ ”دع۔ تو۔ وہ تو میں نے ویسے ہی۔“ ”وہ گڑبڑا گئی۔“

”تم نے بالکل ٹھیک انکار کیا تھا۔ وہ شخص واقعی اس قابل نہیں ہے کہ اس کے ساتھ تمہاری شادی ہو۔“

”جی“ ساجدہ نے چونک کر انہیں دیکھا۔

”ہاں۔“ ان کی آنکھوں میں ندامت کے سائے لہرانے لگے۔

”میں محبوب حسین سے تمہارا رشتہ توڑ دوں گا۔ میں اسے انکار کر دوں گا۔“

ساجدہ نے بے یقینی سے انہیں دیکھا۔ ”لیکن آپ نے انہیں زبان دی ہے۔“

”میری زبان اور میرے قول کی اہمیت اب باقی رہ ہی کہیں گئی ہے۔“ ”ابا نے افسردگی سے کہا۔

”لیکن ابا! میں نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے آپ کو کوئی شرمندگی ہو۔ آپ میری وجہ سے انکار مت کریں۔ مجھے اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔“

”برخلاف دل کے اس کا لہجہ بہت مضبوط تھا۔

ابا نے بہت پیار سے اس کی طرف دیکھا۔ ”میں جانتا ہوں میری بیٹی نے کبھی مجھے شرمندہ نہیں کروایا اور مجھے یہ یقین ہے کہ وہ آئندہ بھی کبھی مجھے شرمندہ

نہیں کروائے گی لیکن بحیثیت باپ مجھ پہ بھی کچھ ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں جن سے میں غفلت کرتا رہا اور غفلت میں ہی یہ فیصلہ کر بیٹھا۔ میرے لیے میری بیٹی کی خوشیاں اس کے جذبات اور اس کے خواب زیادہ اہم ہیں۔“

”ابا! آپ۔“ خوشی کی شدت سے اس کی آواز کانپنے لگی۔ ابا کی زبان سے ادا ہونے والے یہ الفاظ کتنے پیارے خوب صورت اور مسحور کن لگ رہے تھے۔ ”آپ بہت اچھے ہیں۔“ اس نے پیار سے ابا کے ہاتھ تھام لیے۔

”تو کیا میں سمجھوں کہ میری بیٹی نے مجھے معاف کر دیا ہے؟“ ابا مسکراتے ہوئے کتنے پیارے لگ رہے تھے۔

”اب اگر آپ نے یہ معافی دانی کے الفاظ مجھ سے بولے تو میں آپ کی بیٹی نہیں بنوں گی۔ سبھی آپ۔“ اس نے مصنوعی حقارت سے کہا اور ہنسنے لگی ابا بھی اس کی ہنسی میں اس کے ساتھ شریک ہو گئے۔ کچھ ہی فاصلے پر کھڑی ادا نے یہ منظر بڑی حیرت سے دیکھا تھا۔



”فائزہ! میں بہت خوش ہوں۔ اتنی خوش ہوں اتنی خوش ہوں کہ تمہیں بتا بھی نہیں سکتی۔“ وہ اتنی خوش تھی کہ اگر نہ بھی بتاتی تو بھی فائزہ کو پتا چل جاتا۔ خوشی اس کے انگ انگ سے پھوٹ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے اس کی باتوں سے اس کے لہجے سے اس کے ایک ایک انداز سے۔

”ہاں۔“ وہ تو مجھے پتا چل ہی رہا ہے۔ محترمہ خوشی کے مارے ہنسنے کو تیار ہیں۔

”تم یہ بتاؤ۔ تم اسکول کب سے جوائن کر رہی ہو؟“

فائزہ کے اینول پیپرز ہونے میں صرف ایک ڈیڑھ ماہ ہی رہ گیا ہے۔ پہلے ہی تمہاری اتنی طویل چھٹیوں سے تمہاری پڑھاٹی کا بہت لوس ہوا ہے۔“

”ہاں ان شاء اللہ بس آج کل میں جوائن کر لوں

گی۔“ ”تو چلو پھر تمہارے ری جوائن کرنے کی خوشی میں مٹھائی ہو جائے۔“ فائزہ نے جانے کہاں سے ایک مٹھائی کا ڈبہ برآمد کیا اور اس کے سامنے رکھ دیا۔

”میرے ری جوائن کرنے کی خوشی میں؟“ ساجدہ نے مشکوک نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ”جج جج بتاؤ یہ مٹھائی کس سلسلے میں ہے؟“

فائزہ نے شرمانے کی ایکٹنگ کی۔ ”یہ بات میں نہیں بتا سکتی۔ تم اسی سے جا کر پوچھو۔ کیونکہ میں۔“ اس نے دوپٹے کا کونہ منہ میں ڈال لیا۔ ”میں ایک مشرقی لڑکی ہوں۔“

”تمہارا مطلب ہے کہ۔“ ساجدہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ”تمہارا رشتہ طے ہو گیا ہے؟“

”میرے ساتھ رہ کر کافی عقل مند ہو گئی ہو۔“ فائزہ نے اس کے شانے پر تھپکی دی۔

”فائزہ کی بچی! تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟“ وہ خوشگوار حیرت سے بولی۔

”کیسے بتاتی۔ تم اور تمہارے گھر والے تو سونیا بی بی کے گھر سے بھاگ جانے کے سوگ میں ڈوبے ہوئے تھے۔“

”چھا خیر۔ جلدی سے بتاؤ وہ کون ہے کیا کرتا ہے؟“

”کہاں رہتا ہے؟“

اور فائزہ مسکراتے ہوئے اسے اپنا رشتہ پکا ہو جانے کی تفصیلات سے آگاہ کرنے لگی۔



ابا نے باضابطہ طور پر محبوب حسین اور اس کے گھر والوں کو رشتہ توڑنے کا غندیہ دے دیا تھا جس پر محبوب حسین اور اس کے گھر والوں نے خاصا برا مانا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ گھٹیا اور بیچ لوگ ہی اپنی زبان دے کر پھر اس سے مکر جاتے ہیں۔

ثریا تپا اور سراب نے بھی اس پر خاصا اعتراض کیا تھا۔ سراب کا کہنا تھا کہ سونیا کے اس لڑکے کے ساتھ گھر سے فرار ہونے پر پہلے ہی خاندان اور محلے والے

ہم پر باتیں بنا رہے ہیں اب ملے کیا ہوا رشتہ توڑ دینے سے ان لوگوں کو مزید باتیں بنانے کا موقع مل جائے گا۔ لیکن اب ان سب اعتراضات کو مسترد کر دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ غلط فیصلے کا احساس کسی بھی موقع پر ہو جائے تو اپنے فیصلے کو بدل لینا چاہیے اسے اٹایا عزت کا مسئلہ نہیں بنانا چاہیے۔

سونیا کا ذکر کرنا اور اس کے بارے میں بات کرنا وہ پسند نہیں کرتے تھے لیکن ساجدہ نے انہیں کئی بار چھپ چھپ کر کمرے میں آنسو بہاتے ہوئے دیکھا تھا۔ اماں اگرچہ کسی سے کچھ نہیں کہتی تھیں لیکن ان کی افسردگی بھی صاف نظر آتی تھی۔ سونیا واقعی بہت بد نصیب تھی جو اتنی محبتوں کو اپنے پاؤں تلے روند کر چلی گئی تھی۔

ساجدہ کے ناٹھ میں ٹائم تھوڑا ہونے کی وجہ سے زیادہ اچھے مارکس نہیں آئے تھے لیکن میٹرک میں اس نے جی جان سے محنت کی تھی۔

اور جب رزلٹ آیا تو اس کی محنت رنگ لائی تھی۔ اس نے A گریڈ میں میٹرک پاس کیا تھا اور کلاس میں اس کی تیسری پوزیشن آئی تھی۔

ان ہی دنوں فائزہ کی شادی کا ہنگامہ جاگا۔ اس نے فائزہ کی شادی میں بھرپور شرکت کی۔ شادی کی تقریب میں شرکت کے دوران کچھ لوگوں نے پھر اس کی بد صورتی کا مذاق اڑانے کی کوشش کی تھی لیکن ساجدہ نے بہت اچھے طریقے سے انہیں ہنڈل کیا۔ اسے اب اپنی بد صورتی پر کسی قسم کی شرمندگی نہیں تھی۔ جو چیز اپنے بس میں نہ ہو اس پر غور کرنا یا پھر شرمندہ ہونا بے فائدہ نہیں رہتا۔

فائزہ کا شوہر فراز امریکہ میں کسی اچھے عہدے پر جاب کرتا تھا۔ کچھ روز پاکستان میں رہنے کے بعد فائزہ اپنے ہنرمند کے ساتھ امریکہ جا رہی تھی۔ ساجدہ انہیں ایئر پورٹ پر ہی آف کرنے آئی تھی۔ وہ بہت اداس تھی۔ یہ خیال ہی اسے پریشان کر دیتا تھا کہ اسے اب فائزہ کے بغیر رہنا ہو گا۔

”یہ کیسا سوکھی امی جیسی منہ بنایا ہوا ہے تم نے۔“

ایسا لگ رہا ہے جیسے میں ملک چھوڑ کر نہیں جا رہی۔ دنیا چھوڑ کر جا رہی ہوں۔“ فائزہ نے منہ بنایا۔ اس نے سبز اور نی پینک کمرے کے کبھی نیشن کا سوٹ پہنا ہوا تھا۔ ہلکے ہلکے میک اپ کے ساتھ وہ بہت پیاری لگ رہی تھی۔

”اللہ نہ کرے۔“ ساجدہ نے بے اختیار کہا اور مگور کر اسے دیکھا۔ ”یہ تم کیسی فضول باتیں کر رہی ہو۔“ ”اچھا یہ سب چھوڑ دینے تم نے جتنے اچھے مارکس میٹرک میں لیے ہیں تم پر ایک ٹریٹ ڈیو ہے۔ یہ تو میں شادی کی مصروفیات کی وجہ سے تم سے ٹریٹ نہیں لے سکی۔ جیسے ہی میں دوبارہ پاکستان آئی سب سے پہلے تم سے ایک زبردست سی ٹریٹ لوں گی۔“ فائزہ نے ہر جوش لہجے میں کہا۔

”میرے میٹرک میں اچھے مارکس تمہاری وجہ سے آئے ہیں۔ اگر تم بڑھائی میں میری مدد نہ کرتیں تو میں کبھی بھی اچھے مارکس نہ لے سکتی۔ تم نے میری جتنی مدد کی ہے میں اس کا بدلہ نہیں دے سکتی۔“

”کم آن۔ دوستوں میں اس قسم کی باتیں اچھی نہیں لگتیں۔ میں نے اپنے حصے کا دیا جلایا ہے اس دنیا میں ہر شخص کو اپنے حصے کا دینا ضرور جانا چاہیے کیونکہ ایک دیے سے پھر دوسرے دیے جلیں گے اور یوں روشنی بڑھتی جائے گی۔“

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ اس دنیا میں بہت اندھیرا ہے ہمیں اس اندھیرے کو ختم کرنے کے لیے اپنے اپنے حصے کا دینا ضرور جانا چاہیے۔“ ساجدہ نے پرمعمر لہجے میں کہا۔

”ہائے گرلز!“ فراز بھائی جو سی آف کرنے آنے والے اپنے دوسرے دوستوں اور رشتہ داروں کے درمیان کھڑے ہوئے تھے۔ ان کے پاس آئے۔

”یہ دیا جانے کی کیا باتیں ہو رہی ہیں؟“ ”ہے ہماری ایک پرسل بات۔ آپ کو کیوں بتائیں۔“ فائزہ نے شوخی سے کہا۔

”فراز بھائی!“ ساجدہ نے مسکراتے ہوئے ان کی طرف دیکھا۔ ”آپ نے میری دوست کا بہت خیال

رکھنا ہے۔ میری دوست لاکھوں میں ایک ہے۔“ ”آپ کی پہلی بات پر میں ضرور عمل کروں گا۔ لیکن آپ کی دوسری بات سے مجھے اختلاف ہے۔“ ان کی سنجیدگی سے کئی گنی بات پر فائزہ نے ٹیکسی اور ساجدہ نے حیرت بھری نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔

”وہ کیوں؟“ ساجدہ نے پوچھا۔ ”آپ سے کس نے کہا ہے کہ آپ کی دوست لاکھوں میں ایک ہے آپ کی دوست تو۔“ انہوں نے رک کر فائزہ کی طرف دیکھا۔ ”آپ کی دوست تو کروڑوں میں ایک ہے۔“

ساجدہ کھلکھلائی۔ ”بہت اچھا!“ ”تھوڑی دیر بعد جہاز کی روانگی کا اعلان ہونے لگا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے گلے لگ گئیں۔

”اپنا حوصلہ بلند رکھنا۔ ابھی تم نے پہلی میٹرک پر قدم رکھا ہے لیکن تمہیں بہت آگے جانا ہے۔“ فائزہ نے سرگوشی کی۔

”تم بھی اپنا خیال رکھنا۔ مجھے فون ضرور کرتی رہنا۔“ ساجدہ نے غم آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔

کچھ دیر بعد جہاز فضا میں بلند ہو گیا۔ ساجدہ اسے بہت دیر تک اور بہت دور تک جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔



لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری صبح کی ٹھنڈی میٹھی اور مست خرام ہو امیں بچے ایک آواز ہو کر گاتے ہوئے کتنے خوبصورت لگ رہے تھے! وہ جب بھی ان بولوں کو سنتی تھی بے خود ہو جاتی تھی۔

کتنے بارے الفاظ تھے یہ اور کتنی خوبصورت دعا تھی یہ اگر انسان شمع کی مانند ہو جائے تو کتنا اچھا ہو۔ شمع جو خود تو جلتی رہتی ہے لیکن دوسروں کو روشنی

دیتی ہے۔ خود کو فنا کر کے دوسروں کو زندگی دیتا۔ دور دنیا کا میرے دم سے اندھیرا ہو جائے ہر جگہ میرے چمکنے سے اجالا ہو جائے کاش ہر شخص کی سوچنے لگے اور یہی کرنے لگے تو کتنا اچھا ہو۔ اس نے سر سے اڑتے آپٹل کو سر پر اچھی طرح جماتے ہوئے سوچا۔

ہو میرے دم سے یونہی میرے وطن کی زینت جس طرح پھول سے ہوتی ہے چمن کی زینت بچے پورے سر میں گار ہے تھے۔ ان کے چہرے پر جوش اور آنکھوں سے جذبہ عیاں تھا۔

جو کام دل سے اور جذبے سے کیا جائے اسی میں نکھار پیدا ہوتا ہے۔ اس نے یہ بات بار بار بچوں کو سمجھائی تھی۔

ہو میرا کلام غریبوں کی حمایت کرنا درد مندوں سے ضعیفوں سے محبت کرنا بچے بہت محبت سے اسے دیکھ رہے تھے۔ وہ ان کی آئیڈیل تھی۔ وہ ہر معاملے میں ان کی رہنمائی کرتی تھی۔ وہ انہیں امن کا، محبت کا، دوستی کا، خودداری کا درس دیتی تھی وہ انہیں غریبوں کی مدد کرنے پر اکساتی تھی۔

میرے اللہ برائی سے بچانا مجھ کو نیک جو راہ ہو اسی راہ پر چلانا مجھ کو ”آمین۔“ اس نے زیر لب آمین کہا اور ساتھ ہی تمام ٹیچرز اور بچوں نے بھی آہستگی سے آمین کہا تمام ٹیچرز بالکل خاموش اور مودب کھڑی تھیں۔

تمام اسٹوڈنٹس اور ٹیچرز ایک نظم و ضبط سے اپنی اپنی کلاسز کی طرف بڑھنے لگیں۔ تھوڑی ہی دیر میں اسکول کا صحن خالی ہو گیا۔ وہ تھوڑی دیر وہیں رک کر اسکول کی عمارت اور اس کے سرسبز لان میں کھلے خوبصورت اور خوش رنگ پھولوں کو دیکھتی رہی۔ وہ جب بھی اپنے اسکول کو دیکھتی تھی اسے ایک طمانیت اور سرشاری کا احساس ہوتا تھا۔ تھوڑی دیر وہیں رک کر وہ اپنے آفس میں آگئی اور وہیں پر کچھ فائلز دیکھ چیک کرنے لگی۔

”اے! مجھے بھی اس اسکول میں داخل کرو اور اسے ایک پرشوقی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی اس نے اپنے آفس کی کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ ایک چودہ سال کی لڑکی ایک درمیانی عمر کے ساتھ گیلری میں کھڑی تھیں۔“

”باغ خراب ہو گیا ہے تیرا۔ تیری عمر وہ گئی ہے اب اسکول میں پڑھنے کی۔ اور تجھے داخل کرے گا کون اس اسکول میں۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کے درمیان اتنی بڑی لڑکی پڑھتی ہوئی اچھی لگے گی بھلا۔“ اس کی ماں کی آواز غصے سے لبریز تھی۔

”اے! آپ بات تو کریں۔ ہو سکتا ہے ماں جائیں۔“ اس کی آواز میں آس تھی۔ ”میرا باغ خراب نہ کر۔ اور تجھے داخل کرایا تو تھا میں نے اسکول میں خود ہی تیرا پڑھنے میں دل نہیں لگتا تھا۔ ہر وقت تو تیری استائیاں تیری شکایتیں لگاتی تھیں۔“

”اے! وہ تو خود ہی صحیح طریقے سے نہیں پڑھاتی تھیں۔ بار بار بھی بہت تھیں۔“ ان دونوں کی بحث طویل پکڑتی جا رہی تھی۔ وہ اپنے آفس سے نکل کر ان کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ دونوں ہی باتیں کرتے کرتے چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگیں۔

اس نے غور سے اس لڑکی کی طرف دیکھا۔ گہری سانولی رنگت اور موٹے بھدے نقوش کی حامل لڑکی اسے اپنی طرف ایسے دیکھتے یا کر کچھ گڑبڑا سی گئی۔ اس کی ماں کی آنکھوں میں شناسائی کا رنگ ابھرا۔

”ارے میڈم جی! آپ؟ آپ تو اس اسکول کی بڑی میڈم ہونا؟“ اس عورت نے مرغوبیت سے پوچھا۔ ”ہاں۔“ اس نے سر ہلایا۔ ”ابھی آپ دونوں کسی بات پر بحث کر رہی تھیں غالباً۔“

”نہیں جی۔ بحث تو نہیں ہوئی۔“ وہ عورت گڑبڑا گئی۔ ”در اصل میری بیٹی ناویہ اس اسکول میں پڑھتی ہے اس کی ٹیچر نے بلایا ہے مجھے۔ کہہ رہی تھی کہ کوئی ضروری بات کرنی ہے اس نے مجھ سے اس

کی پڑھائی کے سلسلے میں۔ بس اسی لیے آئی ہوں۔“ اس نے بات کو دوسری طرف موڑا۔

”اور یہ؟ یہ بھی آپ کی بیٹی ہے؟“ اس نے اس کم رو اور شرمیلی لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

”ہاں جی۔ یہ ناویہ سے بڑی ہے۔ ساجدہ نام ہے اس کا۔ سلام کر بڑی۔ میڈم کو۔“ اس نے ساجدہ نامی اس لڑکی کو شوق سے دیکھا۔

”سلام علیکم! لڑکی نے نظریں جھکا کر کہا۔ ”ساجدہ۔“ وہ لمحہ بھر کو ساکت ہو گئی۔ ”آخر یہ تمام ساجدہ امیں ایک جیسی کیوں ہوتی ہیں۔“ اس نے بے اختیار سوچا۔

”وعلیکم السلام! لمحہ بھر کے توقف کے بعد اس نے کہا۔ ”تم۔“ اس اسکول میں پڑھنا چاہتی ہو؟“ اس نے اس لڑکی سے پوچھا۔

لڑکی نے کچھ متذبذب سے انداز میں اپنی ماں کی طرف دیکھا پھر آہستہ سے اثبات میں سر ہلادیا۔

”جب یہ اسکول میں پڑھنا چاہتی ہے تو آپ اسے روک کیوں رہی تھیں؟“ اس نے اب کی بار ساجدہ کی ماں سے پوچھا۔

”ظاہر ہے جی اب یہ اس عمر میں کچی پکی میں پڑھتی اچھی لگے گی اور پھر اسے اسکول میں داخل کرے گا کون؟“ عورت نے بنیادی نکتہ اٹھایا۔

”میں۔ میں کروں گی اسے اس اسکول میں داخل۔“

”آپ؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔ ”ہاں میں۔ کیونکہ میں اس اسکول کی پرنسپل ہوں۔ آپ یہ بتائیں آپ کو تو کوئی اعتراض نہیں ہے؟“ اس نے کہتے ہوئے اس لڑکی کی طرف دیکھا۔

اس کی مایوس نگاہوں میں دیے جل اٹھے تھے۔ وہ ممنون نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ ”وہ سب تو ٹھیک ہے لیکن۔ دیکھیں یہ میرے ساتھ گھر کا کام کرواتی ہے اگر یہ اسکول میں پڑھنے لگے گی تو میرے ساتھ گھر کا کام کون کروائے گا۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ میں تو بہت پریشان ہوں

کی۔“

”تو کیا گھر کا کام کروانے کے لیے آپ اسے گھر میں بیٹھائے رکھیں گی۔ پڑھنے نہیں دیں گی۔ اور پھر یہ بھی کتنی نا انصافی ہے کہ آپ ایک بیٹی کو تو پڑھا رہی ہیں اور دوسری کو صرف گھر کے کاموں کے لیے مخصوص کر رکھا ہے۔ کیا آپ کو اپنی اس بیٹی سے پیار نہیں ہے؟“

”نہیں جی۔ ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔ مجھے اپنی دونوں بیٹیوں سے پیار ہے۔ بس بات صرف اتنی سی ہے کہ اس کا باغ پڑھائی میں بہت چلتا ہے اور اس کا اتنا نہیں چلتا۔ پہلے بھی اسے اسکول میں داخل کرایا تھا مگر یہ صحیح پڑھتی نہیں تھی۔ استائیاں بہت شکایتیں کرتی تھیں اس کی۔“

”ہو سکتا ہے اس اسکول کا ماحول اسے موافق نہ آیا ہو اس وجہ سے اس کی مطابقت نہ ہو سکی ہو بہر حال یہ سب ضمنی باتیں ہیں۔ آپ کی بیٹی پڑھنا چاہتی ہے۔ اسے پڑھنے کا شوق ہے تو آپ کا اسے یوں روکنا بننا نہیں ہے۔ آپ کو تو اس کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔ آپ آئیے میرے ساتھ میں ابھی اس کا اسکول میں ایڈمیشن کروا دیتی ہوں۔“

لڑکی نے ملتی جلتی نظروں سے اپنی ماں کی طرف دیکھا اور بولی۔ ”اے! ماں جاؤ نا۔“

”چلیں ٹھیک ہے۔“ اس عورت نے گہرا سانس لیا۔ ”پھر آپ دیکھ لیں کہ اسے کس کلاس میں داخل کرنا ہے۔ پہلے اسکول سے تو اس نے تیسری کلاس میں چھوڑا تھا۔“

”وہ میں دیکھ لوں گی۔“ اس نے سرشاری سے کہا۔ ”اس بات کی آپ فکر نہ کریں۔ اور فیس کے بارے میں بھی۔ یہاں دیے بھی غریب اسٹوڈنٹس سے ہاف فیس لی جاتی ہے۔“

وہ انہیں لے کر کلاس تھری میں آگئی اور مس نمو سے اس کا نام رجسٹر میں داخل کرنے کے لیے کہا مس نمو اس کی عمر اور اس کی قابلیت کے بارے میں معترض تھیں لیکن اس نے ان اعتراضات کو مسترد کر دیا۔

”مس نمو! اتنی اور قابلیت یقیناً! اہمیت رکھتی ہیں لیکن جہاں بات جوش جذبے اور لگن کی ہو وہاں ان کی حیثیت ضمنی ہو جاتی ہے۔ آپ نے اس لڑکی کا جذبہ اور لگن دیکھی ہے؟ کیا وہ قابل تحسین نہیں ہے؟ میری ایک بات ہمیشہ یاد رکھیں دنیا میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے ذہانت اور قابلیت سے کہیں زیادہ جذبہ اور لگن کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لڑکی کو پڑھنے کا بہت شوق ہے۔ یہ اپنی قابلیت بڑھانے کے لیے سخت محنت کرے گی۔ کیوں۔ کرو گی نا محنت؟“ آخری فقرہ اس نے اپنی ہم نام سے مخاطب ہو کر کہا۔

”جی میڈم! اس نے زور و شور سے سر ہلایا۔ ”میں بہت محنت کروں گی۔“

”وہ سب تو ٹھیک ہے لیکن۔“ مس نمو اب بھی ہچکچاہٹ کا شکار تھیں۔

”مس نمو! میری طرف دیکھیں۔“ اس نے اپنی طرف اشارہ کیا۔ ”میں نے بھی بہت لیٹ پڑھنا شروع کیا تھا۔ آپ کو پتا ہے تیس چوبیس سال کی عمر میں تو میں نے میٹرک کا امتحان دیا تھا۔ کیا آپ کو مجھ میں کوئی کمی نظر آتی ہے؟“

”نہیں میڈم! آپ تو بہت قابل ہیں۔ پو آر ریلی آٹا کس لیڈی۔“ مس نمو کے انداز میں چالپوسی نہیں تھی صرف عقیدت اور محبت تھی۔

”تو پھر فیصلہ ہو گیا کہ ساجدہ اسی کلاس میں بیٹھے گی؟“

”جی میڈم! وہ مسکرائی۔ ”فیصلہ ہو گیا۔“ وہ طمانیت کے احساس سے سرشار اپنے آفس میں واپس آگئی ایک اور ساجدہ کو اس نے تباہ ہونے سے بچالیا تھا۔ لیکن ابھی بہت سی ساجدہ امیں باقی تھیں۔ اس ملک میں بہت اندھیرا تھا۔ لیکن اس اندھیرے کو ختم کرنے کے اس نے اپنے جیسے کا دیا جلانا تھا۔ اس نے اجالا پھیلانا تھا۔ اس کی نظر کھڑکی سے باہر گیٹ کے اوپر لگے ہوئے بورڈ پر چلی گئی جس پر لکھا ہوا تھا۔

اجالا پبلک اسکول

آج بہت سناٹا دن تھا۔ آج اس نے ایک اور اہم سنگ میل عبور کر لیا تھا۔ آج اس نے ایک اور شہر میں اپنے اسکول کی برانچ کھول لی تھی۔ اس کا خواب تھا کہ پورے ملک میں اس کے اسکول کی برانچیں ہوں۔ مظفر گڑھ میں اس کا اسکول کامیاب جا رہا تھا۔ ابھی پچھلے سال اس کے اسکول کے چار پانچ بچوں نے مختلف کلاسز میں بورڈ میں پوزیشنز جیتی تھیں۔ مظفر گڑھ کے بعد اب اس کا ارادہ تھا کہ وہ ملتان میں بھی اپنے اسکول کی برانچ کھولے اس سلسلے میں وہ کچھ عرصے سے کوشش کر رہی تھی۔ ملتان میں ایک پارٹی سے زمین خریدنے کے سلسلے میں اس کی بات تقریباً "فائل ہو گئی تھی لیکن فی الحال اس نے ایک تعمیر شدہ کو بھی کرائے پر لے کر اس پر اسکول کا تمام سیٹ اپ مکمل کر لیا تھا۔ آج اسی سلسلے میں وہ ملتان آئی تھی۔

وہ پارٹی سے بات کر کے نکلی تھی کہ فائزہ کی کال موصول ہوئی۔

"ہیلو۔" اس نے کال ریسیو کرتے ہوئے کہا۔
"ہیلو پرنسپل صاحبہ! کیا حال چال ہیں؟" دوسری طرف سے فائزہ کی چمکتی ہوئی آواز سنائی دی۔
"جی مس امریکہ! میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ سائیں، آج آپ کو تھوڑا ورلڈ کی ایک پسماندہ جگہ سے تعلق رکھنے والی ایک پسماندہ سی لڑکی کیسے یاد آگئی؟" ساجدہ نے شوخی سے کہا۔

"خیر۔ مجھے تو یہ یاد ہر دو تین روز بعد آتی جاتی ہے۔ لیکن آپ جناب تو اتنی مصروف ہو گئی ہیں کہ آپ کو میری یادداشتوں بلکہ مہینوں نہیں آتی۔" فائزہ نے شکوہ کیا۔

"یاد تو انہیں کیا جاتا ہے جو بھول گئے ہوں۔ تم تو ہر لمحہ میرے دل کے قریب میرے ساتھ رہتی ہو۔"

ساجدہ نے پورے خلوص دل سے کہا۔

"چھاب زیادہ ڈانٹا لگنا بولنے کی ضرورت نہیں

ہے۔" فائزہ ہنسی۔ "یہ بتاؤ اسکول کیسا جا رہا ہے تمہارا؟ سنا ہے بڑی دھومیں ہیں اس کی۔"

"ہاں۔ اللہ کا بہت بڑا احسان ہے اور اللہ کے بعد یہ سب تمہاری وجہ سے ہے۔ تم اگر مجھے پڑھنے پر راغب نہ کرتیں تو شاید آج میں اس مقام پر نہ ہوتی۔"

فائزہ کے امریکہ جانے کے بعد اس نے آگے پڑھنے کے لیے کالج میں داخلہ لیا تھا اور وہاں سے فرسٹ کلاس "فرسٹ ڈیگری" میں بی اے کرنے کے بعد ہی اس نے اپنا اسکول کھولنے کا ارادہ کیا تھا۔ اس کام میں اب اسے بہت سپورٹ کیا تھا بلکہ تقریباً سارا سرمایہ بھی انہوں نے ہی فراہم کیا تھا۔ چھوٹے پیمانے پر شروع ہونے والا یہ اسکول اب ہائی لیول تک پہنچ گیا تھا اور اب اسے اتنی آمدنی ہو رہی تھی کہ وہ دوسرے شہروں میں اس کی برانچیں کھول رہی تھیں۔

"بہت پرانی بات ہے یہ اور تمہیں ابھی تک یاد ہے؟ یہ بتاؤ شادی واوی کے بارے میں کیا ارادہ ہے تمہارا؟ سارے بہن بھائیوں کی شادیاں تو ہو گئی ہیں تم کب کر رہی ہو؟" فائزہ نے بات بدل دی۔

"میری شادی بھی ہو چکی ہے میرے کام سے۔ اور آج کل کے دور میں ایک ہی شادی کوئی انورڈ کر لے وہی کافی ہے۔"

"فضول باتیں مت کرو" شادی بھی زندگی کا حصہ ہے۔ میں ایک مہینہ بعد پاکستان آ رہی ہوں تمہارا رشتہ لے کر۔ تم خود کو تیار کر لو۔"

"کیسا رشتہ؟ تمہارا بیٹا تو ابھی چھوٹا ہے اور بھائی کوئی ہے ہی نہیں۔"

"اللہ نے مجھے بھائی دے دیا ہے۔ فرائز کے بھائی میرے بھی بھائی بن گئے ہیں۔ بہت اچھے انسان ہیں۔ بچپن میں والد کے انتقال کے بعد بہن بھائیوں کی تعلیم اور شادی کے مسائل حل کرنے میں خود کو بھول گئے۔ اب میں نے یاد دلایا ہے کہ زندگی پر ان کا بھی حق ہے تم بھی اس بارے میں سوچو۔"

"میں یہ سب بعد میں سوچوں گی فی الحال خوش خبری

یہ ہے کہ تم پاکستان آ رہی ہو۔"

ٹھوڑی دیر اور فائزہ سے بات کرنے کے بعد اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔

"بی بی جی! اللہ کے نام پر کچھ دیتی جاؤ۔" وہ گاڑی میں بیٹھ رہی تھی۔ میلے چیکٹ کپڑے پہنے ہل بکھرائے ایک بھکارن نے اس کا راستہ روکا۔

ساجدہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ نہ جانے کیوں اس کی آواز اسے بہت مانوس سی لگی تھی۔

اسی لمحے اس بھکارن نے بھی اسے غور سے دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ پھر نہ جانے کیوں وہ بھکارن کئی کترا کر دوسری طرف جانے لگی اس کی چال میں لڑکھاہٹ آگئی تھی مگر ساجدہ نے بھاگ کر اس کو پکڑ لیا کیونکہ وہ اسے پہچان چکی تھی۔

"کیا بات ہے بی بی! میرا بازو کیوں پکڑا ہے تو نے؟" اس بھکارن نے منہ دوسری طرف کیے ہوئے شک لہجے میں پوچھا۔

"کیونکہ میں تمہیں پہچان چکی ہوں۔ اور بہتر ہے کہ تم بھی یہ ایکٹنگ چھوڑ دو۔" اس نے تنگ کر کہا۔
"دیکھو بی بی! ہم بھکاری لوگ ہیں۔ ہمارا تمہارا کیا واسطہ۔" اس نے اپنا بازو چھڑوا لیا اور دوسری طرف جانے لگی۔

"سونیا!" ساجدہ نے تڑپ کر اسے پکارا۔ "راستے تو تم نے بہت پہلے ہم سے جدا کر لیے تھے مگر یہ دور راستہ تو نہیں تھا جس پر تم کسی اور کی انگلی تمام کر چکی تھیں۔ تم تو اپنے خوابوں کی تعبیر پانے گئی تھیں۔ کیا یہی ہے تمہارے خوابوں کی تعبیر؟"

اس کی بات سن کر وہ جاتے جاتے رک گئی۔ ساجدہ اس کے قریب چلی گئی۔ اس کا چہرہ دوسری طرف تھا۔ ساجدہ نے گھوم کر دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے وہ رو رہی تھی وہ سونیا ہی تھی مگر سونیا نہیں لگ رہی تھی! انہی خوبصورتی اور رعنائی سے چاند کو بھی شراوینے والی سونیا اس وقت اپنے تمام رنگ و روپ کو کھوئے ایک بد حال اور بد مست فقیرنی کے روپ میں کھڑی تھی!

بیوٹی بکس کا تیار کردہ

سوہنی ہیرائل

SOHNI HAIR OIL

- کرتے ہوئے ہاتھوں کو دھوئے
- دے بال کاٹا ہے۔
- ہاتھوں کو صابن اور پھلدار پانی سے دھوئے
- مردوں، عورتوں اور بچوں کے لئے
- یکساں مفید
- ہر موسم میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔



قیمت = 100 روپے

سوہنی ہیرائل 127 بیوٹی بکس کا مرکب ہے اور اس کی تیاری کے مراحل بہت مشکل ہیں لہذا یہ قوی مقدار میں تیار ہوتا ہے۔ یہ بازار میں کسی دوسرے شہر میں دستیاب نہیں، کراچی میں دستی خرید جاسکتا ہے، ہیک ہول کی قیمت صرف = 100 روپے ہے، دوسرے شہروں کے لئے بھی آڈر بھیج کر دینا پڑا اس سے منظر الیں اور جزی سے منگوانے والے نئی آڈر اس حساب سے بھیجائیں۔

2 بوتلوں کے لئے = 250 روپے
3 بوتلوں کے لئے = 350 روپے

نوٹ: اس میں ڈاک خرچ اور پیکنگ چارجز شامل ہیں۔

منہ آذر بھٹنے کے لئے ہمارا پتہ

بیوٹی بکس، 53۔ اورنگزیب مارکیٹ، یکینڈ فورہ ایم اے جناح روڈ، کراچی
دستنی خریدنے والے حضرات سوہنی بھٹرا آل ان جیکو
سے حاصل کریں

بیوٹی بکس، 53۔ اورنگزیب مارکیٹ، یکینڈ فورہ ایم اے جناح روڈ، کراچی
مکتبہ عمران ڈائریکٹ، 37۔ اردو بازار، کراچی۔

فون نمبر 32735021

بدلتا ہے رنگ آسمان کیسے کیسے
”سوئیلا! آخر یہ سب کیا ہے؟ پلیز مجھے جلدی بتاؤ
میرا دم گھٹ رہا ہے۔“ ساجدہ کی آنکھوں کی نمی اس
کے کنبے میں گھل گئی تھی۔

”کیا بتاؤں میں؟“ وہ بولی تو اس کے لہجے میں
صدیوں کا کرب تھا۔ ”میرے جیسی تاریک اور
اندھیری راہوں کا سفر کرنے والی لڑکیوں کا انجام بالآخر
ایسا ہی ہوتا ہے جیسا تمہیں نظر آ رہا ہے۔“
”مگر تم تو زیشان کے ساتھ گئی تھیں نا جو بقول
تمہارے بہت امیر کبیر فیملی سے تعلق رکھتا تھا۔ پھر تم
اس حل میں کیوں ہو؟“

”وہ ایک فراڈ شخص تھا۔ دھوکا دیا ہے اس نے
مجھے۔“ وہ نفرت سے بولی۔
”کیسا دھوکا؟ پلیز مجھے کھل کر بتاؤ۔“

”کیا کرو گی جان کر۔“ وہ اچانک تھکی تھکی نظر آنے
لگی۔ ”یہ پوری دنیا ہی دھوکے باز ہے۔ اور تمہیں
دلچسپی لینے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ تمہارے ساتھ
کون سا اچھا کیا تھا میں نے۔ تمہیں تو۔ تمہیں تو
خوش ہونا چاہیے مجھے اس حل میں دیکھ کر۔“

”تم پھر دل دکھانے والی بات کر رہی ہو سوئیلا!“ اس
کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ”میں نے تمہارا کب برا
چاہا ہے؟“

”تم نے میرا برا نہیں چاہا لیکن میں نے خود تو اپنا
برا چاہا تھا نا۔ دل دکھانے والوں کا یہی انجام ہوتا ہے اور
میں نے ہر قدم پر تمہارا دل دکھایا، ہر بات پر تمہاری
تذلیل کی اور اپنے ہاتھوں سے۔“ اس نے برستی
آنکھوں سے اپنے گھر ورے اور میلے ہاتھوں کی طرف
دیکھا۔ ”اپنے ہاتھوں سے خدا کی طرف سے دی ہوئی
خوبصورتی کو اپنے لیے عذاب بنالیا۔ جانتی ہو۔ زیشان
کون تھا۔؟“ وہ ایک لمحے کے لیے رکی اور اس کی
طرف دیکھا۔

”زیشان ایک بروہ فروش تھا۔“
”تمہ تمہارا مطلب ہے۔“ ساجدہ ہکا بکا رہ گئی۔
”ہاں۔ وہ لوگ۔ لڑکیوں کو ان کے گھروں سے

بھگا کر ان سے دھندہ کرواتے ہیں اس مقصد کے لیے
انہوں نے زیشان جیسے کئی جوان اور خوبصورت لڑکے
رکھے ہوئے تھے جو مختلف قصبوں اور شہروں میں
معصوم لڑکیوں کو بھلا پھسلا کر ان کے گھروں سے بھگا
کر لے جاتے تھے اور لاہور میں واقع اپنے اس
ٹھکانے پر لے جاتے تھے جہاں۔ ان سے دھندہ کرایا
جاتا تھا۔ مجھ سے بھی زیشان نے شادی نہیں کی تھی
وہ غلط انسان مجھے اچھے اور سہانے مستقبل کے
خواب دکھاتے ہوئے وہیں لے گیا تھا۔“
ساجدہ کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے
سونیا کی طرف دیکھنے لگی۔ ”یہ۔ یہ تم کیا کہہ رہی
ہو؟“

”میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔“ اس نے دانتوں
سے اپنے نچلے ہونٹ کو اتارے زور سے کانٹا کہ اس کے
ہونٹ سے خون رسنے لگا۔ ”مجھ جیسے لوگ جو نہ
عزت کی قدر کرتے ہیں اور نہ محبت کی ان کے پاس نہ
عزت رہتی ہے اور نہ محبت۔ میں بہت عرصہ وہیں
رہی۔ وہاں پر مجھ جیسی اور بھی بہت سی لڑکیاں تھیں
مجبور بے بس اور ان لوگوں کا کھانا ماننے پر مجبور۔ ان
لوگوں کی پہنچ بہت دور تک تھی۔ وہاں اس بنگلے پر
بڑے بڑے لوگ آتے تھے بڑے بڑے سرکاری
افسر، یورو کریٹ، نواب، رئیس۔ وہاں رہتے ہوئے
ایسا لگتا تھا جیسے میں ہمیشہ وہیں رہوں گی۔ لیکن پھر اس
گروہ میں رقم تقسیم کرنے کے معاملے پر تو تکار ہونے
لگی اور ان میں پھوٹ پڑ گئی جس کی وجہ سے ان کا ہم
لڑکیوں پر ہولند اور سیکورٹی کم ہونے لگی چنانچہ اسی کا
فائدہ اٹھاتے ہوئے میں اور وہ اور لڑکیاں وہاں سے
بھاگ نکلیں۔ وہاں سے چھپ چھپا کر ہم لاہور سے
ملتان آ گئیں۔ یہاں پر ہمارے راستے جدا ہو گئے۔ وہ
لڑکیاں اندرون سندھ کی رہنے والی تھیں وہ وہیں چلی
گئیں۔ میرے اندر اتنی ہمت نہیں تھی کہ میں اپنے
گھر واپس آ جاتی۔ اکیلی عورت کے لیے اس
معاشرے میں سروائیو کرنا بہت مشکل کام ہے اور تب
میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں اسی دربار پر رہوں گی ان

ملنگوں کے ساتھ جو یہاں رہتے ہیں۔ میں بھی ان
میں شامل ہو گئی ہوں جو یہ لڑتے ہیں۔ یہ لوگ اگر
بھیک مانگنے کا کہتے ہیں تو وہ بھی مانگ لیتی ہوں۔ یہ میری
سزا ہے اور اب ساری زندگی مجھے اسی سزا کو بھگتنا
ہے۔“

”وہ میرے خدا!“ ساجدہ نے افسوس کے عالم میں
اپنے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ ”کتنا سمجھایا تھا
ہم نے تمہیں۔ کتنا روکا تھا۔ مگر تمہاری سمجھ میں کچھ
نہیں آیا۔ کاش تم ایسا نہ کرتیں!“

”مجھ جیسے لوگ کسی کے سمجھانے سے نہیں سمجھتے
وہ صرف ٹھوکر کھا کر ہی سمجھتے ہیں۔ میں بھی ٹھوکر کھا
کر سب کچھ سمجھ چکی ہوں لیکن۔ اب شاید اس کا
کوئی فائدہ نہیں ہے۔“

”کیوں فائدہ نہیں ہے۔ سوئیلا! زندگی ابھی ختم نہیں
ہوئی ہے اور مجھے تمہاری سبقتوں پر حیرت ہو رہی ہے،
تم جب اس قحبہ خانہ سے فرار ہونے میں کامیاب
ہو گئی تھیں تو تمہیں سیدھا گھر آنا چاہیے تھا۔“

”کس منہ سے گھر آتی؟ سارے رشتے تو میں ختم
کر آئی تھی اپنے خاندان کی عزت کو خود اپنے پاؤں
تले روند کر اب کس برتے پر میں واپس آتی
میں۔ نے۔ تو۔ اپنے استے چاہنے والے باپ کا
خیال تک نہیں کیا۔“ اس کے ہونٹ کپکپائے۔
”اس منحوس شخص کی جھوٹی محبت نے میری آنکھوں
پر ایسی بٹی باندھ دی کہ میں نے ان کی بے مول محبت کو
پاؤں تلے روند دیا۔ ساجدہ! ابا کیسے ہیں؟ اور اماں؟
سرا ب بھائی، نوی سب لوگ کیسے ہیں؟“ آخر میں اس
نے نہایت بے تابی سے پوچھا۔

”سب لوگ ٹھیک ہیں۔ لیکن۔ ابا۔“ وہ کچھ
کہتے کہتے رک گئی۔

”کیا ہوا ہے ابا کو؟“ سوئیلا نے بے تابی سے پوچھا۔
”ممن کی دھتھ ہو گئی ہے۔ تمہارے اس اقدام نے
انہیں جیتے جی تو بہت پہلے مار دیا تھا لیکن اس دنیا سے وہ
پچھلے سال گئے ہیں۔“

”کیا؟ ابا چلے گئے ہیں۔“ سوئیلا اپنے سر کو دیوار سے

ٹکرا کر رونے لگی۔ ”کیوں۔ ایسا کیوں ہوا میں تو ان
سے معافی مانگنا چاہتی تھی۔ میں تو سوچتی تھی
کس۔ کبھی۔ نہ۔ کبھی ان کے پاس جاؤں گی اور ان
کے پاؤں پر گر کر ان سے معافی مانگ لوں گی۔“

وہ چیخ چیخ کر رو رہی تھی۔ ارد گرد کے لوگ اسے
حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ ساجدہ نے بمشکل سمجھا بچھا
کر اسے جپ کروایا۔

”سوئیلا! جو ہونا تھا ہو چکا۔ اب گزرے وقت کو یاد
کر کے آنسو بہانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ یہ بتاؤ اب
آگے کے بارے میں کیا سوچا ہے تم نے؟“ ساجدہ نے
سنجیدگی سے کہا۔

”میرے سوچنے سے کیا ہو گا۔ تقدیر کے سامنے
سب سوچیں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔ یہ بات میں
اچھی طرح جان چکی ہوں۔“ وہ منموم لہجے میں بولی۔
”مگر زندگی ایسے نہیں گزرتی جیسے تم گزار رہی ہو تم
میرے ساتھ گھر چلو۔ اب ہم دونوں مل کر رہیں گی۔“
ساجدہ اسے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام آپکو تمام ڈائجسٹ

ڈائریکٹ ڈاؤنلوڈنگ لنک کے ساتھ

ڈاؤنلوڈ کرنے کی سہولت دیتا ہے

آج ہی وزٹ کریں

www.paksociety.com

سونیا نے ندامت سے اعتراف کیا۔
”بہت پرانی بات ہے یہ۔ اور پرانی باتوں کا بھول جانا
ہی ہمارے لیے بہتر ہے۔ تمہیں اپنی غلطیوں اور
کو تباہیوں کا احساس ہو گیا ہے یہی کافی ہے۔“
”ہاں۔ مگر اپنا سب کچھ گنوانے کے بعد۔“ اس نے
ٹھنڈی سانس لی۔

”جو شخص اپنا سب کچھ گنوا رہا ہے اس کے پاس
پانے کے لیے پوری دنیا ہوتی ہے۔ تمہیں بھی اپنے
ماضی کو بھلا کر اپنے مستقبل کے بارے میں سوچنا ہو گا
سونیا! ایک نئی زندگی کا آغاز کرنا ہو گا۔“

پھر وہ خوشی سے جھکتے ہوئے بولی۔ ”یہ نئی براچی تو
میرے لیے بہت مبارک ثابت ہوئی ہے۔ میں اس
کے لیے ملتان آئی اور یہاں میری ملاقات میری بہن
سے ہو گئی۔ آئی ایم سو بھی۔ پتا ہے فائزہ مجھ سے کہا
کہہ رہی تھی؟“ اس نے سونیا کی طرف دیکھا۔

”کیا؟“ سونیا نے پوچھا۔
”وہ مجھ سے پوچھ رہی تھی کہ میں اپنے اس نئے
اسکول کا انچارج کسے بناؤں گی۔ اس وقت میں نے
اس سے کہا تھا کہ مجھے معلوم نہیں ہے لیکن اب مجھے
پتا چل گیا ہے کہ میں کسے انچارج بناؤں گی۔“

”اپنی باری بہن سونیا کو۔“
”ساجدہ! سونیا حیرت سے اسے دیکھتی رہ گئی۔
”تم میرے اندھیرے اور تاریک وجود سے اپنے
”اجالا“ کو کس گونا گونا چاہتی ہو۔ اتنا آگے کا مت
سوچو۔“

”میں نے تو اس سے بھی بہت آگے کا سوچ لیا
ہے۔ آؤ چلیں۔“
اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور سونیا اس کے ہاتھ
میں اپنا ہاتھ دیتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ اس نے اپنی
بہن کو کتنا غلط سمجھا تھا۔ وہ اندھیرا نہیں اجالا تھی۔
اندھیری اور تاریک راہوں میں روشنی بکھیرنے والا
اجالا!

”نہیں ساجدہ!“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”بہت
مشکل ہے یہ۔ اگر گھر ہی جانا ہو تو میں بہت پہلے چلی
جاتی اور پھر مجھے وہاں کون قبول کرے گا۔ میں نے
خاندان کی عزت داؤ پر لگائی ہے۔ کوئی معاف نہیں
کرے گا مجھے۔“

”یہ سب تمہارے اپنے مفروضے ہیں۔ ہم سب
لوگ اب بھی تم سے بہت پار کرتے ہیں اور اگر کوئی
معاف نہ بھی کرے تو بھی تمہیں پریشان ہونے کی
ضرورت نہیں ہے تم کسی پر بوجھ نہیں بنو گی۔ تم
میرے ساتھ رہو گی۔ سراب بھائی اور نومی دونوں
ویسے بھی اپنے علیحدہ گھروں میں رہتے ہیں۔ میں اور
اماں اپنے الگ گھر میں رہتے ہیں۔“

”لیکن وہ دونوں کیوں علیحدہ رہتے ہیں؟“
”ان کی شادیاں ہو گئی ہیں۔ سراب بھائی تو خود ہی
ایسا چاہتے تھے شاید۔ لیکن نومی بے چارہ ایسا نہیں
چاہتا تھا اسے اس کی بیوی نے مجبور کیا ہے خیر جو ہوا سو
ہوا۔“ اس نے کندھے اچکا ئے۔

”اور تم نے۔ تم نے شادی نہیں کی؟“ سونیا نے
غور سے اسے دیکھا۔
”شادی!“ وہ مسکرائی۔ ”ہاں میں نے بھی کر لی ہے
شادی۔“

”اسی سے۔ میرا مطلب ہے۔ محبوب حسین
سے؟“
”نہیں۔ اپنے کاڑ سے۔ اپنے نصب العین
سے۔“ ساجدہ نے اسے مختصراً اپنے اسکول کے
بارے میں بتایا۔

”ساجدہ! تم بہت عظیم ہو۔ میں نے ہمیشہ تمہارے
ساتھ برا کیا۔ میں تمہاری راہوں میں کانٹے بچھاتی رہی
اور تم میری راہوں میں بچھائے ہوئے کانٹے اٹھا کر ان
کو پھولوں سے بھرنا چاہتی ہو۔ کیوں ساجدہ کیوں؟
جانتی ہو ابابا کو اماں کے جھوٹ کے بارے میں بھی میں
نے بتایا تھا کیونکہ میں چاہتی تھی کہ تمہاری شادی
محبوب حسین سے ہو جائے اور تم بھی خوش نہ رہو۔“



سکھ

دین محمد مٹی سے محبت کرنے والا جفاکش مرد ہے۔ دھرتی کو اپنے خون جگر سے سونا گلنے کے قابل بنانا اس کا پیشہ ہے۔ اس کی پوری زندگی محنت سے عبارت ہے جو وہ اپنے چھ مریخ زمین پر صرف کرتا ہے۔ شادی کو آٹھ سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ اپنے چھوٹے سے گھر میں وہ بیوی زہرا اور ماں کے ساتھ رہتا ہے۔ زہرا چھ مردہ بچوں کو پنہاں کر ایک مرتبہ پھر امید سے ہے۔ دین محمد کا رواداں اولاد کی خوش خبری پانے کے لیے مجسم دعا بن چکا ہے۔ اس کی دعا میں مستجاب ہوتی ہیں اور اس کے یہاں ایک خوب صورت نجی جنم ہوتی ہے۔ اسے وہ اپنی "جنت" کے نام سے مخاطب کرتا ہے۔

جلال الدین کے روز و شب نوکری کی چکی میں پتے گزر رہے ہیں۔ اس نوکری کے دوران اسے آرام کرنے کا موقع بھی کم ملتا ہے۔ آج کل مستقبل کا خواب اسے محمک رکھتا ہے۔ خدائی میں کسی کی محبت کا جگنو اس کی دنیا آباد رکھتا ہے۔ ہر دم "اس" کی یاد اسے بے چین رکھتی ہیں۔ دن بھر کا تھکا ہارا وہ آرام کرنے لینا ہے تو پولیس اسٹیشن سے اطلاع ملتی ہے کہ جنت بی بی ان کی حراست میں ہے جس کا دعوا ہے کہ اس نے اپنے شوہر کا قتل کیا ہے۔ جلال الدین اپنے وکیل دوست مسعود کے ساتھ بھاگ بھاگ پولیس اسٹیشن پہنچتا ہے اور ثبوت دکھاتا ہے کہ جنت بی بی فریاد کی مریض ہے، جس کی شادی ابھی ہوئی تک نہیں۔ جنت کی حالت جلال الدین کو اعصابی متکس کا شکار کرنے لگتی ہے۔ بے اس نے نوکروں کے سارے ٹیکہ گھر میں رکھ چھوڑا ہے۔

ثینہ 14 سال بعد اپنی بیٹی ماوی کے ساتھ آئرلینڈ سے پاکستان آئی ہیں تو انہیں توقیر صاحب کے بتائے گئے بنگلے کو "ٹھنے میں بہت وقت لگتا ہے۔ وہ فیض کے دوست توقیر صاحب کے توسط سے وانیال کی انیکسی میں ٹھرتی ہیں۔ ثروت، وانیال منسار اور مجبئی خاتون ہیں۔ ولی ولید اور انبیان کے بچے ہیں۔ ماوی کی پہلی ملاقات میں ازبیا سے دوستی ہو جاتی ہے۔

نبیہ العباس طبیعتاً سخت گیر اور غصہ ور نوجوان ہے جسے منف نازک کا غیر ضروری ہنسنا بھی ناگوار گزرتا ہے۔ وہ



پچھی زاد تنوی سے منسوب ہے۔ تنوی اس کی تند خو طبیعت سے سخت مالاں ہے۔ شبیہ تنوی کو کالج چھوڑنے آتا ہے تو سہیلہ ال عبیر اور عمرو تنوی کے سر ہو جاتی ہیں۔ یہ جان کر کہ شبیہ تنوی کا منگیتر ہے وہ اس کی قسمت پر رشک کرتی ہیں۔ تنوی داناں سے گزارش کرتی ہے کہ عروش کو اس بات کا علم نہ ہو۔

شبیہ انبیاں ثروت دانیال کی اولاد ہے جسے انیس دانیال حسن سے شادی سے پہلے چھوڑنا پڑا۔ بچپن کی محرومی نے اسے بد مزاج اور غصیلہ بنا دیا۔ وہ انبیا اور ولید سے بہت ترشی سے پیش آتا ہے۔ وہ ان سے تجلیت بہن بھائی جلی تعلقات محسوس نہیں کرتا۔ انبیا اس کی محرومی دل سے محسوس کرتی ہے۔ انبیا پر بری نظر ڈالنے پر وہ بے ڈی کے دوست سعدی کو پسند لاتا ہے۔ صرف بے ڈی اس کی کیفیات سمجھتا ہے۔

بنیارس نے پر بیگم دانیال شبیہ کی اچھی طرح دیکھ بھال کرتی ہیں تو شبیہ ان کے اخلاق سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتیں۔ انیس بیگم دانیال کو دیکھ کر لگتا ہے کہ وہ پہلے ان سے مل چکی ہیں۔

بچوں کی لڑائی میں جنت کو جوت لگتی ہے تو دین محمد اپنی بہن زیدہ کے بیٹے فاروق کا حلیہ بگاڑتا ہے۔ ساتھ ہی زیدہ بہن اور رفیق بھائی سے قطع تعلقی کر لیتا ہے۔ زہرہ اس کی جنت سے طوفانی محبت سے خوف زدہ ہے۔ دین محمد زہرہ کو باور کرواتا ہے کہ وہ جنت کو باور کر دوسرے گھر نہیں بھیجے گا۔ بلکہ اس کے شوہر کو گھر واپس لے گا۔

اتفاقاً ماوی کا نکر او شبیہ سے ہوتا ہے جس سے ماوی کا پیر زخمی ہو جاتا ہے۔ اپنی غلطی کے باوجود جھنجھلاہٹ میں شبیہ ماوی کو بری طرح سے ڈانٹتا ہے تو ماوی اس کی طبیعت صاف کر دیتی ہے۔ شبیہ سے وہ اس واقعے کا ذکر نہیں کرتی۔ شبیہ کا روز ایک سیڈنٹ ہوتا ہے تو بے ڈی عین موقع پر ان کی دست برد کرتا ہے۔ ماوی اور فیضان اس پر بے ڈی کے مشکور ہیں لیکن وہ اپنا پتا بے بغیر چلا جاتا ہے جس پر شبیہ کو بہت افسوس ہوتا ہے۔ اتفاقاً ان کی بے ڈی سے دوبارہ ملاقات آتی ہے۔ شبیہ اسے گھر بلائی ہیں۔ شبیہ ثروت کو بتاتی ہیں کہ ان کے شوہر زب کا بے دردی سے قتل ہوا تھا اور یہ بات ماوی کے علم میں نہیں ہے۔ یہ جان کر انیس رنج ہوتا ہے۔ شبیہ کو بے ڈی کا اپنی ماں اور شبیہ سے گفتگو کرنا پسند نہیں جس پر وہ بے ڈی کو تنبیہ بھی کرتا ہے۔

انبیا دل و دل میں فیضان کو چاہتی ہے۔ ثروت کے پہلے شوہر سے نسبت کے باعث دانیال صاحب شبیہ کی فیملی کو پسند نہیں کرتے۔ ماوی ان کی دلچسپی بھانپ لیتی ہے اور فیضان ماما سے رائے لینے کی کوشش کرتی ہے تو فیضان اسے جھڑک دیتے ہیں۔ بھائیوں پر بار نہ پڑے اس لیے شبیہ ماوی کو پاکستان میں مزید پڑھنے کی اجازت دے دیتی ہیں۔ عبیر عمرو اور تنوی کو عروش کی غیر اخلاقی اور جرائم پیشہ سرگرمیوں کے متعلق بتاتی ہے تو عمرو ناراض ہو جاتی ہے۔ عبیر کو اپنی جلد بازی پر افسوس ہوتا ہے وہ عروش کے متعلق ثبوت اکٹھا کرنا چاہتی ہے۔

زہرہ کی اچانک موت کو محض جنت کے کہنے پر دین محمد بہن زیدہ کے سر ڈالتا ہے تو سب برادری والے بھی حتی حق رہ جاتے ہیں۔ دین محمد کی ماں پر دوس کے کہنے پر جنت کو پھر صاحب کے پاس لے کر جاتی ہے تو جنت یہ بات بدھاڑ چھا کر دین محمد کو بتاتی ہے۔ وہ ماں کو بہن زیدہ کے یہاں ہمیشہ کے لیے بھیجنے کا فیصلہ سنا تا ہے تو ماں رو کر اسے اس فیصلے سے باز رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ بہت مشکل سے دین محمد راضی ہو پاتا ہے۔ دین محمد کے رویے سے جنت کے اندر پہنچنے والی منفی شخصیت قد آور ہو رہی ہے۔

دین محمد کی بہن زیدہ کا بیٹا فاروق گاؤں میں آتا ہے تو جنت اسے پسند کرنے لگتی ہے۔ وہ اسے اپنی طرف راغب کرنے کی کوشش کرتی ہے لیکن فاروق اتنا دھتکار دیتا ہے اور اس کے باپ سے ہنگ آمیز انداز میں شکایت کرتا ہے۔ دین محمد جنت کو اپنی سب سے چھوٹی بیٹی کو مارنے دیکھ لیتا ہے۔ اسے شدت سے احساس ہوتا ہے کہ اس نے جنت کی تربیت میں کوتاہی کی ہے۔

ثروت دانیال حسن کے ہر وقت کے شک سے تنگ آکر میکے چلی جاتی ہیں۔ انبیا اور ولید کو اپنے والدین کے درمیان کھنڈاؤ کا کچھ کچھ اندازہ ہے۔ دانیال حسن ثروت کو فون کر کے ٹیکس کی بات کرتے ہیں۔ ثروت کی طبیعت خراب ہو گئی اور انیس اسپتال میں داخل ہونا پڑا۔

شبیہ ماوی کے سامنے ماضی کے اوراق پلٹی ہیں۔ وہ اسے بتاتی ہیں کہ جلال اور شبیہ العباس ماوی کے رشتے دار ہیں اور یہ کہ ماوی کے باپ رجب کو جنت بی بی نے قتل کیا تھا۔ شبیہ ماوی پر زبردستی ہیں کہ وہ حویلی جا کر جنت بی بی سے انتقام لے۔

شبیہ نے بتایا۔ رجب کے مرنے کے بعد جنت بی بی نے ان کے سامنے رجب کی وصیت رکھ دی۔ جس میں انیسوں نے اپنی ساری جائیداد جنت بی بی کی سرپرستی میں دے دی تھی۔ وہ ساری جائیداد اٹھارہ برس کی عمر ہونے کے بعد رجب کی بیٹی یعنی ماوی کو منتقل ہونا تھی۔ یہ تو حقیقت تھی کہ وصیت جعلی تھی لیکن شبیہ کے اس وقت حالات ایسے نہ تھے کہ وہ جنت کو چیلنج کر سکتیں۔ وہ خاموشی سے حویلی چھوڑ کر اپنے بھائی فیاض کے ساتھ گئیں۔

بعد میں ایک دن جنت بی بی شبیہ سے ملنے آئی اور انیس مجبور کیا کہ وہ اس کے بڑے بیٹے سے شادی کر لیں۔ جو ذہنی معذور تھا۔ شبیہ نے انکار کر دیا۔ تب جنت نے بتایا کہ وہ رجب کی ساری جائیداد اپنے نام کر چکی ہے۔ ساتھ اس نے انکشاف کیا کہ رجب کو اس نے زہر دے کر مارا ہے۔

شبیہ نے کہا کہ ماوی آئرش نیشنل ہے۔ جنت اس کو ہاتھ بھی نہیں لگا سکتی۔ اب بیسی حرکت میں آجائے گی۔ شبیہ نے ماوی سے کہا کہ وہ اس کی شادی جلال سے طے کر چکی ہیں۔ اسے جلال سے نکاح کرنا ہو گا تاکہ حویلی جاسکے انیسوں نے کہا اپنا مقصد حاصل ہونے کے بعد ماوی جلال سے خلع لے لے تاکہ شہر سے شادی کر سکے۔ شہر کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔

ماوی نے انکار کیا تو شبیہ نے خواب آور گولیاں کھا کر خود کشی کی کوشش کی۔

ماوی بالآخر شبیہ کی بات مان کر حویلی چلی گئی۔ جنت بیگم گاؤں سے باہر گئی ہوئی تھی۔ مستقیم بھٹی اور دیگر لوگوں نے ماوی کا کھلے دل سے استقبال کیا۔ وہ سب رجب اور شبیہ کے ساتھ ہونے والی زیادتی کی تلافی کرنا چاہتے ہیں۔ وہ رجب کی جائیداد ماوی کے نام کرنا چاہتے ہیں۔ تاہم شبیہ العباس کو یہ منظور نہیں۔ وہ جنت بیگم کے آنے تک کوئی فیصلہ کرنے کے خلاف ہے۔ وہ ماوی کا دشمن ہو گیا اور اس نے اپنی تمام کزنز کو ماوی سے بات کرنے سے منع کر دیا۔ ماوی کو یہ پتا چلا تو اس نے مستقیم بھٹی سے اس کی شکایت کر دی۔ انیسوں نے ماوی کے سامنے شبیہ العباس کو ڈانٹا۔

فیضان ملک میں واپس آگئے۔ وہ سیدھے شبیہ کی انیکسی پہنچے۔ انبیا نے انیکسی کی چابیاں ان کے حوالے کر دیں۔ مگر شبیہ کے انیکسی چھوڑ کر چلے جانے کا نہیں بتایا۔

ماوی کو حویلی کے ایک حصے اور ملازمین کے رویے میں عجیب پر سرارت کا احساس ہوا تو اس نے تمام حالات جاننے کے لیے ایک خاص ملازمہ نسیم سے دوستی کر لی۔

وہ جنت بیگم کی حویلی میں واپسی کی شدت سے خطر تھی جب ہی ایک صبح اسے شبیہ کے ساتھ جنت بیگم نظر آئی۔

جنت بیگم کے ساتھ جلال بھی تھا۔ وہ ماوی کو حویلی میں دیکھ کر حیران رہ گیا تاہم اس نے اپنے تاثرات ظاہر نہ ہونے دیے۔ جنت بیگم نے ماوی کو یہاں دیکھ کر مستقیم بھٹی پر بے حد غصہ کیا۔ جنت بیگم نے تنائی میں ماوی سے حویلی آنے کا مقصد پوچھا تو اس نے صاف کہہ دیا کہ وہ اپنے باپ کے قاتل کا سراغ لگانے اور جائیداد میں سے اپنا حصہ لینے آئی ہے۔ جنت بیگم نے اسے دھمکی دی کہ وہ اسے حرم کی شادی کے بعد حویلی سے باہر نکال دے گی۔

فیضان ماوی کی پراسرار کشیدگی سے پریشان ہیں۔ شبیہ ان سے کہتی ہیں کہ ماوی پاکستان میں ہی ہے لیکن انبیا انیس بتاتی ہے کہ شبیہ نے اسے بتایا ہے وہ آئرلینڈ واپس چلی گئی۔

رات کے وقت جلال ماوی سے ملنے اس کے کمرے میں گیا تو شبیہ نے اسے وہاں سے نکلے ہوئے دیکھ لیا۔

ماویٰ دیکھ رہی تھی شبیہ کا رویہ اس کے ساتھ بدلتا جا رہا تھا وہ نہ صرف اس سے بات چیت کرنے لگا تھا بلکہ اس سے بات کرنے کے بنائے ڈھونڈنے لگا تھا۔ ممکن ہے یہ اس کی غلط فہمی ہو لیکن ہرگز رتے دن کے ساتھ اس کا یقین بڑھتا ہو رہا تھا کہ وال میں کچھ کالا ضرور ہے۔ شبیہ کے التفات بے جا نہیں تھے لیکن اس کے پاس ایسا کوئی راستہ بھی نہیں تھا جس کے ذریعہ اپنے شک کی نفی کر سکے یا اسے یقین میں بدل سکے۔ لہذا اسے خاموشی سے وقت کے بدلے ہوئے دھارے کو سمجھنا تھا۔

دوسری جانب وہ خود بڑی مستعدی سے ثبوت تلاش کرنے میں لگی ہوئی تھی۔ شادی کی وجہ سے حویلی میں کام بھی بہت بڑھ گیا تھا۔ تب ہی اسے تسنیم سے بھی بات کرنے کا موقع نہیں مل رہا تھا کیونکہ دیگر ملازمین کی طرح وہ بھی بے حد مصروف تھی۔ ناچار ماویٰ کو حالات کے سازگار ہونے کا بھی انتظار کرنا تھا۔

اس روز وہ لان میں مچی بسبوجہ اور ادھر ادھر چکر لگا رہی تھی کہ وقت گزرنے کا کچھ تو سبب بنے۔

”موسم انجوائے کیا جا رہا ہے۔“
ماویٰ نے گردن موڑ کے دیکھا شبیہ العباس کرسی کی پشت پر ہتھیلیاں جمائے بغور اسے دیکھ رہا تھا۔

”یہی سمجھ لیں۔“

گو کہ شبیہ کی موجودگی اسے ناگوار گزری تھی لیکن یہ جتنا کہ وہ ایک نئی مصیبت مول لینا نہیں چاہتی تھی۔
”کیا میں کچھ دیر یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟“ شبیہ نے چند لمحوں کے توقف کے بعد پوچھا تھا۔
”آپ کی حویلی آپ کا لان اور آپ کی سی میز کرسی۔ یہاں بیٹھنے کے لیے آپ کو میری اجازت کی کیا ضرورت ہے۔“

ماویٰ نے کندھے اچکا کر لاپرواہی سے کہا۔ شبیہ کے چہرے پر مسکراہٹ چھب دکھلا کر غائب ہو گئی۔
”یہی بات اس رات یقیناً جلال سے کہی ہوگی۔“

شبیہ نے کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے کہا تھا۔ ماویٰ جو ابھی تک اس کے رویہ کے اتار چڑھاؤ کو سمجھنے میں لگی تھی تڑپ کر پلٹی۔

”کیا مطلب۔ میں سمجھی نہیں۔“ اس نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔
”اس میں نا سمجھی کی کیا بات ہے۔ سادہ سا سوال ہی تو پوچھا ہے۔“ شبیہ نے مسکرا کر کہا لیکن حقیقتاً اس نے ماویٰ کے اعتماد کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ لیکن وہ بھی ماویٰ کی اپنے نام کی طرح متفرد اور بلا کی پراعتماد۔
”کیا یہ بہتر نہیں ہو گا کہ تم مجھ سے سیدھے لفظوں میں بات کرو۔“

”وہ تو تم بہت ہو میں کیسے مان لوں کہ تمہیں میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔“
”ٹھیک ہے۔ پھر تم یہاں بیٹھ کر موسم انجوائے کرو میں ہی چلی جاتی ہوں۔“ ماویٰ نے پلٹتے ہوئے کہا تھا۔
”ضرور جاؤ۔ لیکن جانے سے پہلے میرے چند سوالوں کا جواب دینا ہی ہو گا۔“ شبیہ نے دو ٹوک لہجے میں کہا تھا۔

”میں تمہارے ابا کی ملازمہ نہیں ہوں کہ ہر سوال کا جواب دینے کی پابند رہوں۔“ ماویٰ نے ترخ کر کہا۔
”کسی خوش فہمی میں مت رہو۔ ہم ملازم بھی اپنی پسند کے رکھتے ہیں۔“ شبیہ نے ناگوار سے کہا تھا۔
”پھر مجھ پر اتنا احسان کس خوشی میں جناب شبیہ العباس بھٹی صاحب؟“ اس کا انداز بھی کچھ کم طنزیہ نہیں تھا۔
شبیہ نے گہری سانس بھری اور گہری ہی نظروں سے اسے دیکھا۔ ”تم حویلی کس مقصد سے آئی ہو۔ مجھے اس سے فی الحال کوئی غرض نہیں ہے۔ میں صرف اتنا جاننا چاہتا ہوں کہ تم میرے بھائی کے ساتھ کیا کم کھیل رہی

ہو؟“

ماویٰ کو ایسے سوال کی توقع ہرگز نہیں تھی۔ وہ ایک بل کے لیے گزرتا تھا۔
”کس قدر احمقانہ سوال ہے۔ میں تمہارے بھائی کے ساتھ کوئی کم کھیلوں گی میں اتنی دور سے اس لیے تو نہیں آئی کہ تمہارے بھائی کے ساتھ گیمز کھیلوں۔“ اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔
”ڈونٹ ٹرائی ٹوئی اس مارش ماویٰ! (ہو شیار بننے کی کوشش مت کرو۔)“ شبیہ نے چڑکے اور کسی قدر طنزیہ انداز میں کہا۔ ”تم اچھی طرح جانتی ہو میرے کہنے کا کیا مطلب ہے۔“

”نہیں شبیہ! میں نہیں جانتی تمہارے کہنے کا کیا مطلب ہے۔“
”ٹھیک ہے اگر تم چاہتی ہو میں صاف لفظوں میں بات کروں تو ایسا ہی سہی۔ مجھے صرف اتنا بتاؤ اس رات جلال کو تم نے اپنے کمرے میں کیوں بلایا تھا۔ آخر ایسا کون سا جھانسا دیا تھا تم نے جلال کو کہ وہ تمہارے کمرے میں آنے پر مجبور ہوا۔“

ماویٰ چند لمحوں کچھ بول نہیں سکی۔ تو گویا اس کا خدشہ درست ثابت ہو ہی گیا کہ کوئی جلال کو اس کے کمرے سے نکلے ہوئے نہ دیکھ لے۔

”اس معاملے سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے شبیہ! اس لیے بہتر ہو گا کہ تم اس معاملے سے دور رہی رہو۔“
”جس معاملے میں میرا بھائی انوالو ہے اس معاملے سے میرا تعلق ہے۔“ شبیہ نے تیز لہجے میں کہا۔

”تو کیا بہتر نہیں ہو گا کہ تم ساری انکوائری اپنے بھائی سے ہی کرو۔“ ماویٰ نے اس سے بھی تیز لہجے میں کہا تھا۔
شبیہ بے ساختہ مٹھیاں سمجھ کر رہ گیا۔ اصل دقت تو یہی تھی کہ جلال منہ سے کچھ اگلنے کو تیار نہیں تھا اور ایسا پہلی بار ہو رہا تھا اور نہ شبیہ کو اس دو ٹوکے کی لڑکی سے بات کرنے کی زحمت گوارا کرتا ہی نہ پڑتی۔

”میرا بھائی بہت معصوم انسان ہے ماویٰ! اگر تم نے اس کی معصومیت سے کوئی فائدہ اٹھانے کی کوشش کی

تو یاد رکھنا میں بہت برا شکر کروں گا تمہارا۔“ شبیہ نے دانت کچکا کر کہا۔
”تم پھر مجھے دھمکا رہے ہو حالانکہ اچھی طرح جانتے ہو کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ کروں گی تو میں وہی جو میرا

دل چاہے گا۔“
ماویٰ نے بے نیازی سے کہا اور ایک طرف سے نکل کر آگے جانے لگی لیکن شبیہ نے اس کا راستہ روکا تھا۔

”ایسا سوچنا بھی مت۔“
”میرے راستے سے ہٹو شبیہ! ماویٰ نے سرد مری سے کہا تھا۔
”مجھے اپنے سوال کا جواب چاہیے۔“

”بے بھائی سے مانگو۔“
”وہ کیا کرنے آیا تھا تمہارے کمرے میں۔ یا میں یہ سمجھوں کہ تم ہر کسی کو اپنے کمرے میں آنے کی اجازت

دے دیتی ہو؟“
”شٹ اپ۔“ ماویٰ بری طرح چٹخنی تھی اس کے دہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ شبیہ اس طرح کی بات بھی کر سکتا ہے۔

”تم تو میری توقعات سے بھی چھوٹی ذہنیت کے مالک نکلے شبیہ العباس! افسوس تو مجھے تنوی کی قسمت پہ ہو رہا

ہے۔“
اب کی بار شبیہ کے کھوں پر لگی سر پر بھی تھی۔
”تمہیں تنوی کی قسمت پر افسوس کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”کیوں بھی؟“ ماویٰ نے اطمینان سے کہا۔ ”جو رشتہ تمہارا جلال سے ہے وہی میرا تنوی سے ہے پھر میں تنوی کے لیے ریشاں کیوں نہیں ہو سکتی۔“

”کیونکہ تمہیں ایسا کوئی حق نہیں ہے۔“ شبیہ نے سلگ کر کہا۔
”حق کی بات نہ کرو شبیہ العباس! اس جو ملی کے ہر راز سے واقف ہو، جانتے ہی ہو گے تمہاری وادی اور تم لوگ میرے کون کون سے حقوق غصب کیے بیٹھے ہو۔“ ماویٰ نے طنز سے کہا تھا۔
”خیر میں تم سے زیادہ بات کر کے اپنا موڈ خراب کرنا نہیں کرنا چاہتی۔ میری جوتی سے جو سمجھتا ہے، سمجھتے رہو۔“

ماویٰ نے ناک چڑھا کر نخوت سے کہا۔ تیزی سے پٹی اور بڑے بڑے قدم اٹھاتی وہاں سے چلی گئی۔

شبیہ کی رگوں میں خون کے ساتھ جیسے شرارے دوڑنے لگے تھے۔
اس کا غصہ سے برا حال تھا اور جلال کا برا وقت چل رہا تھا کہ اسی وقت دونوں کی مڈ بھڑ ہو گئی۔
”تم۔“ شبیہ نے پل بھر سوچا۔ ”چھا ہوا۔ تم بیس مل گئے۔ کچھ ضروری بات کرنا ہے۔ ذرا اسٹڈی میں آنا۔“

”بہت سنجیدہ لگ رہے ہو۔ خیریت تو ہے نا؟“
”تم آؤ۔“ ”اس کے تاثرات ذرا بھی نہ بدلے تھے۔ جلال کے لیے اتنی مبہم بات سے کوئی بھی اندازہ لگانا از حد مشکل تھا لیکن اتنا تو وہ سمجھ ہی گیا تھا کہ معاملہ کچھ گڑبڑ ہے۔ دل ہی دل میں اندازے لگاتا وہ اسٹڈی میں آیا۔ شبیہ ایک کرسی پر بیٹھا بے حد سنجیدگی سے اس کا منظر تھا۔
”جی جناب! ارشاد ہو۔“ جلال نے اپنا لب و لہجہ سادہ ہی رکھا تھا یعنی اپنے انداز سے کسی قسم کا تجسس ظاہر نہ ہونے دیا۔

شبیہ نے ابروا دکھا کر پہلے گہری نظروں سے اسے دیکھا پھر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

”نقش جو پوچھوں گا اس کا ٹھک ٹھیک جواب دینا۔ ٹال مٹول نہیں چاہیے مجھے۔“

”ہو اکیا ہے بار!“ جلال نے الجھ کر پوچھا۔

”ماویٰ تمہاری کیسی دوست ہے؟“ انی مین از شی یور گرل فرینڈ؟“

جلال سٹٹا گیا اور یہ سٹٹا ہٹ اس کے چہرے پر بھی صاف دکھائی دی تھی۔

”یہ کیسا سوال ہے؟ تم جانتے ہو۔“

”میں نے کہا تھا جلال! کوئی ٹال مٹول نہیں۔“ شبیہ نے تیز لہجے میں ٹوکا۔

”ماویٰ میری اچھی دوست ہے شبیہ! گرل فرینڈ تمہیں ہے۔“ جلال کو فوری طور اور کچھ نہیں سوچا تو یہی کہہ دیا۔

”تو اپنی اچھی دوست کے کمرے میں تم آدمی رات کو کیا کرنے گئے تھے؟“ شبیہ نے دائیں ٹانگ بائیں پر رکھتے ہوئے کہا تھا۔

جلال کا داغ ٹھک سے اڑ گیا۔

”وہ میں۔ میں وہ دراصل۔“

”وہ میں۔ میں وہ دراصل۔ کیا؟“

”شبیہ! ایسی کوئی بات نہیں ہے جو تم سمجھ رہے ہو۔“

”پھر کیسی بات ہے تم سمجھاؤ۔“ شبیہ نے سابقہ انداز میں کہا۔

”ویسے اگر ٹامپاس کے لیے گئے تھے تو بھی مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔“ شبیہ نے یکدم ہینتر ابدلتے ہوئے کہا تھا۔

”کیا مطلب؟“ جلال نے قدرے ناگواری سے اسے دیکھا۔

”مطلب یہ کہ لڑکی تو اچھی ہے۔ یعنی پکینگ تو اچھی لگتی ہے۔“

”شبیہ! کیا فضول بکواس کر رہے ہو۔“

”اس میں فضول تو کچھ بھی نہیں ہے۔ تم تو اس طرح بھڑکے ہو جیسے میں نے اس کے کمرے میں جانے کی اجازت مانگ لی ہو۔“

جلال بے ساختہ مٹھیاں بھیج کر رہ گیا۔ اس کی غیرت پہ آنا زیادہ پڑا تھا۔ خون رگوں میں اگلنے لگا۔

”ایک شریف لڑکی کے بارے میں تمہیں ایسی بات کرتے ہوئے سوچنا چاہیے۔“ اس نے بمشکل ضبط کرتے ہوئے کہا تھا۔

”وجہ؟“ شبیہ نے کندھے اچکا کر پوچھا۔

”وہ شریف لڑکی ہے شبیہ! ہر کسی کے بارے میں تم اسی طرح منہ پھاڑ کر کچھ بھی کہہ دیتے ہو، کم سے کم کبھی تو سوچا کرو۔“

”میں ہمیشہ سوچ سمجھ کر ہی بولتا ہوں۔“ شبیہ نے گہری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”سوچ میں یہ رہا ہوں کہ تم اس لڑکی کے بارے میں اتنے ایموشنل کیوں ہو رہے ہو؟ اتنی جذباتیت کا مظاہرہ یا تو انسان بہن کے معاملے میں کرتا ہے یا گرل فرینڈ کے معاملے میں۔“

”شبیہ! پلیز یار! کیا ہم کسی اور ایٹھوپہ بات نہیں کر سکتے؟“

”نہیں۔ کیونکہ مجھے اسی ایٹھوپہ بات کرنا ہے۔“

”لیکن کیوں؟“

”سیدھی سی بات ہے، میں نے تمہیں تو مئی رات کے وقت اس کے کمرے سے نکلنے ہوئے دیکھا ہے۔ جو لڑکا لڑکیوں سے کوسوں دور بھاگتا ہو اس کا ایسی حرکت کرنا غیر معمولی لگتا ہے نا۔ محبت و جنت کا معاملہ ہے تو بھی پتا دو ورنہ اس لڑکی کی شرافت پہ تو میں یوں بھی مشکوک ہوں، کمرے میں بلانے کے پیسے لیے ہیں تب بھی بتاؤ تمہوڑا بہت میں بھی۔“

”شٹ اپ شبیہ! تمہیں کوئی حق نہیں ہے کہ میری بیوی کے بارے میں اس طرح کی گھٹیا باتیں کرو۔“

جلال نے یکدم خود پر ضبط کھوتے ہوئے کہا تھا۔ شبیہ کو کہ اس سے کسی بھی قسم کے انکشاف کی توقع کر رہا تھا لیکن اس انکشاف پر ہکا بکا ہو کر اس کی شکل دیکھنے لگا تھا۔



فیضان عجب الجھن کا شکار تھی۔ حالات کچھ کہہ رہے تھے، شبیہ نے پاپا کا بیان کچھ اور تھا جبکہ انہی کی باتیں کسی اور ہی حقیقت کو آشکار کر رہی تھیں بلکہ حقیقت بھی کیا آشکار کرنا تھی بس یوں تھا کہ الجھن بڑھتی جا رہی تھی۔

فیضان بھول گئے کہ پاکستان کس کام سے آئے تھے، انہیں صرف ماویٰ کی تلاش تھی جس کے بارے میں سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ اسے زمین نکل گئی یا آسمان کھا گیا۔

دوسری جانب شبیہ نے پاپا کا رویہ بھی حیران کن تھا۔ وہ ماویٰ کے لیے پریشانی کا اظہار کر رہی تھیں لیکن یہ پریشانی اس حد تک نہیں تھی جس کی توقع کسی گمشدہ بیٹی کی ماں سے کی جاسکتی ہے۔ گویا سراغ کم تھے سوال اور الجھنیں

تمام تر پریشانیوں کے باوجود کاروباری معاملات میں دلچسپی لینا ان کی مجبوری تھی۔ صبح کے نکلے شام چھ بجے واپس آئے تھے۔ خدا معلوم انہیں کو ان کی آمدورفت کے اوقات کار کی خبر کیسے ہو جاتی تھی جب تک وہ فریش ہو کر باہر آئے انہیں ملازمہ کے ہاتھ کافی اور امنیکس بجھوا چکی تھی۔ فیضان کی بھوک جاگ اٹھی دل نہ ہونے کے باوجود انہوں نے رغبت سے کھایا پھر جب تنہا بیٹھ کر اوٹ پناہنگ خیال ستانے لگے تو کافی کام لے کر باہر نکل آئے۔

شام کے آسمان پر پرندوں کی قطاریں گزر رہی تھیں۔ پودوں سے نکراتی ہوئی ہوا میں نامانوس لیکن بھلی سی خوشبو کا احساس رہا تھا۔

فیضان نے دیکھا انہیں مگن سی اپنے لان میں پانی بے رہی تھی۔ فیضان بے ساختہ یک ٹک اسے دیکھنے لگے۔ ہلکے زرد رنگ کے لباس میں وہ تو خیز کلی سی محسوس ہوتی تھی۔ اپنے کندھوں تک آتے بالوں کو ڈھیلے سے جوڑے میں باندھ رکھا تھا۔ ہوا سے کچھ ٹپیں بار بار چہرے کے اطراف میں بکھر جاتیں تو وہ انہیں بیزاری سے کانوں کے پیچھے اڑس لیتی۔

فیضان اسے بے خودی سے دیکھتے رہے وہ خود ان کے رستے میں آئی تھی۔ کوئی سطحی سی ذہنیت رکھنے والے مرد ہوتے تو فائدہ اٹھانے میں ذرا سادقت بھی ضائع نہ کرتے۔ لیکن خوش قسمتی سے وہ ایسے ہرگز نہ تھے۔ زندگی نے جب بھی موقع دیا، کئی کئی کراکینچ نکلے تھے۔ اب بھی یہی کیا۔ اس سے قبل کہ دل کسی ضد پہ آمادہ ہوتا، انہوں نے نظریں ہی پھیر لیں مبادا کسی ضدی بچے کی طرح جھلنے دل کو ٹالنے کا حوصلہ ہی نہ رہے۔

واپس پلٹنے کا ارادہ کر رہی رہے تھے کہ انہیں ایک نظر ان پر پڑ گئی۔ نظریں ملتے ہی وہ خفیف سا مسکرائی اور پانی کا پائپ احتیاط سے گیارہی میں رکھ کر ان کی طرف آئی۔

”ماویٰ کا کچھ پتا چلا؟“ اس نے قریب آتے ہوئے پوچھا۔ فیضان نے مایوسی سے نفی میں سر ہلادیا۔

”اوہ“ انہیں بھی مایوس ہوئی پھر بولی۔ ”میں نے آپ سے کہا تھا، ٹینہ آئی سے پوچھیں۔“

”پوچھا ہے لیکن ان کے پاس بھی کوئی جواب نہیں ہے۔ وہ خود پریشان ہیں۔“ دل میں بہت سے خدشات ہونے کے باوجود انہیں بہن کی پوزیشن تو کھینچ کر رہی تھی سو کہہ دیا۔

”عجیب بات ہے۔“ انہیں نے کہا۔ ”ٹینہ آئی نے تو مجھ سے خود کہا تھا کہ ماویٰ ڈھلن جا چکی ہے۔“ پھر کچھ سوچ کر بولی۔ ”اگر آپ کو برا نہ لگے تو ایک بات کہوں؟“

”ضرور۔ لیکن ایسی کیا بات ہے جس کے لیے بطور خاص اجازت لینا پڑے۔“

”در اصل میں خود ماویٰ کے لیے بہت فکر مند ہوں اسی لیے مجھے یہ خیال آیا کہ معاملہ کچھ اور ہے۔“ انہیں نے کہا۔

”آپ خود سوچیں، ایک ہی وقت میں ٹینہ آئی مجھے کچھ بتاتی ہیں اور آپ کو کچھ اور۔ کیا یہ حیران کن بات نہیں ہے۔ مجھے تو ایسا لگ رہا ہے جیسے وہ جان بوجھ کر کوئی بات چھپا رہی ہیں۔“

فیضان چند منٹ متفکر سے خاموش رہے۔ یہ بھی حیران کن بات تھی کہ یہی خیال بیک وقت ان کے اور انہیں کے دماغ میں آ رہا تھا۔

”لیکن سوال تو یہ بھی ہے کہ ٹینہ آئی کیوں چھپائیں گی۔ آخر ایسی کیا بات ہو گئی ہے جسے چھپانا پڑے۔“

”اب اس بارے میں تو کچھ نہیں کہہ سکتی، آپ کی بہن ہیں وہ۔ اور آپ انہیں بہر حال مجھ سے زیادہ بہتر جانتے ہیں۔ میرے دل میں وہم سا آ رہا تھا تو میں نے اظہار کر دیا۔ باقی میں کیا کہہ سکتی ہوں۔“ انہیں نے دامن

بجاتے ہوئے کہا تھا۔ وہ دونوں بے دھیانی میں ساتھ ساتھ چلنے لگے تھے، ہوا پہلے کی نسبت تیز ہو گئی تھی اور انہیں کے بال تیزی سے بکھیر رہی تھی۔

”آپ فکر مند نہ ہوں۔ ماویٰ جہاں بھی ہوگی خیریت سے ہوگی۔ لیکن میرا خیال ہے، آپ کو اس سلسلے میں پولیس سے بھی مدد لینا چاہیے۔“ انہیں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا تھا۔

”ہاں۔ میں بھی یہی سوچ رہا ہوں کہ ماویٰ کی گمشدگی کی ایف آئی آر درج کروانا چاہیے۔“

دونوں کچھ دیر خاموش رہے پھر انہیں نے کہا۔

”آپ نے نہیں کیا کھانا چاہیں گے۔ مجھے بتادیں میں بنا کر شازیہ کے ہاتھ بھجوا دوں گی۔“

”میرے لیے کسی تکلف کی ضرورت نہیں ہے جو سب کے لیے بنے گا، میں وہی کھاؤں گا۔“

”اور اگر آج سب کے لیے کھانا نہ بنا تو۔۔۔“

فیضان ہنس دیے۔

”تب بھی کوئی فکر کی بات نہیں میں باہر سے جا کر کھاؤں گا۔“

”خیر، اب اتنے بے مروت تو نہیں ہیں ہم کہ چار دن آپ کی مہمان داری بھی نہ کریں۔“ انہیں نے شرارت سے ہنس کر کہا تھا۔ فیضان بے ساختہ گردن موڑ کر اسے دیکھنے لگے، اتنی دلکش ہنسی تھی جو انہیں کسی اور کی یاد دلاتی تھی۔ انہیں اپنے ہوا سے چہرے پر بکھرتے بالوں کو کانوں کے پیچھے اڑس رہی تھی۔ فیضان کا دل چاہا اس کی کانوں کے پیچھے بال لے جاتی انگلیاں تمام کر اسے روک دیں اور اسے بتائیں وہ اس طرح بکھرے بالوں کے ساتھ کتنی دلکش لگتی ہے۔ لیکن آج تک انہوں نے دل کی کسمانی تھی جواب اس کی فرمائشوں پہ کان دھرتے۔

”کیا ہوا؟“ انہیں نے ان کی نظروں کے ارتکاز پر خفیف سا ہوتے ہوئے پوچھا۔ فیضان نے دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ آہستگی سے نفی میں سر ہلادیا۔

”بتانا نہیں چاہتے تو ادب بات ہے ورنہ میں جانتی ہوں، کچھ تو ہے جو آپ چھپا رہے ہیں۔“

فیضان بے ساختہ ہنس دیے۔

”تمہاری ہنسی نے کسی اور کی یاد دلا دی تھی۔“

انہیں کے دل میں چمن سے کچھ ٹوٹ گیا۔ پھٹکی مسکراہٹ لبوں پر پھیل گئی۔

”ایک بات تو بتائیں۔ کیا بہت خوبصورت تھی وہ؟“ اس نے جھجک بالائے طاق رکھتے ہوئے پوچھا۔ جب دیر تک کوئی جواب موصول نہ ہوا تو گردن موڑ کر جواب طلب نظروں سے انہیں دیکھنے لگی۔

”ہاں نہیں۔ اتنی پرانی بات ہے کہ اب تو مجھے ٹھیک سے یاد بھی نہیں۔“

”یہ تو خیر آپ مجھے ٹال رہے ہیں۔ ورنہ انسان اپنی پہلی محبت کبھی نہیں بھولتا۔“

”تو کیا میں امید رکھوں کہ تم جی مجھے ہمیشہ یاد رکھو گی؟“ فیضان کے لبوں سے بے ساختہ پھسل گیا اگلے ہی لمحے

و کہہ کر ہچکتا ہے۔ انہیں کے چہرے پر سایہ سالہا گیا تھا۔

”آہم سوری انہیں! میرے کہنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ۔“ فیضان نے فوراً وضاحتی لہجے میں کہنا چاہا۔

”آپ کے کہنے کا جو بھی مطلب تھا، میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ سچ سچ میں آپ کو کبھی نہیں بھولوں گی۔ اور

میں یہ بھی چاہتی ہوں کہ آپ بھی مجھے یاد رکھیں۔ کیا آپ مجھے یاد رکھیں گے؟“ اس نے بہت آس سے پوچھا تھا۔

”مجھے کچھ کام ہے انہیں! میں چلتا ہوں۔“ فیضان نے اس کا سوال نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ انداز ایسا تھا جیسے

بہت جلدی میں ہوں اور اس کی بات سنی ہی نہ ہو۔

”کم سے کم اس بار تو میرے سوال کا جواب دیتے جائیں۔“ انبیاء نے بغیر پلٹے التجا کی تھی۔
”تم جانتی ہو انبیاء! تمہاری اور میری عمروں میں کتنا فرق ہے؟“ فیضان نے تیزی سے پوچھا۔
”پندرہ سال‘ چار مہینے‘ تین دن۔“ انبیاء نے سرعت سے کہا۔

”نہیں۔ اٹھارہ سال‘ چار مہینے‘ تین دن۔“ فیضان کے لہجے میں جھلپٹ تھی۔ ”وانیال بھائی سے کچھ ہی سال چھوٹا ہوں گا۔“

”اور آپ کو خود سے اتنی چھوٹی عمر کی لڑکی میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔“ انبیاء نے تیزی سے ان کا جملہ اچک لیا تھا۔ ”یہی کہا تھا نا آپ نے ماوی سے؟ کتنی عجیب بات ہے نا۔ میں نے اپنی اور آپ کی عمروں کا حساب اس لیے رکھا کیونکہ میں آپ سے محبت کرتی ہوں لیکن جب آپ کو مجھ سے کوئی دلچسپی ہی نہیں ہے تو آپ اتنا حساب کتاب کس لیے رکھے ہوئے ہیں؟“

فیضان بجا طور پر لا جواب ہوئے تھے۔ تو انہوں نے خود بھی نہیں سوچا تھا۔
”خیر ان ہو رہے ہیں تاکہ آپ کو یہ خیال کیوں نہیں آیا۔ میں بتاؤں؟۔ کیونکہ آپ کے دل میں بھی کہیں نہ کہیں میرا خیال موجود ہے جسے آپ جھٹکتے رہتے ہیں اور خود سے بھی اعتراف کرنا نہیں چاہتے۔“
اتنا حقیقت پسندانہ تجزیہ تھا کہ فیضان اس بار بھی کچھ نہ بول سکے۔ دونوں کے درمیان خاموشی کا طویل وقفہ حائل ہوا تھا۔

”کچھ تو کہیں۔ اور کچھ نہیں تو میری غلط فہمی ہی دور کر دیں۔“ اس طویل ہوتی خاموشی کو انبیاء نے ہی توڑا تھا۔
”یہ واقعی کشش ہے انبیاء! اور کچھ نہیں۔“ فیضان نے کہا۔

”وانیال بھائی بتا رہے تھے انہوں نے تمہارے لیے کوئی لڑکا دیکھا ہے۔ بہت تعریف کر رہے تھے اس کی۔ میں دعا کروں گا تمہارا لالہ نف ہارنر تمہیں بہت خوش رکھے۔ جب میں تمہارے سامنے نہیں ہوں گا تو تمہیں یاد بھی نہیں رہوں گا۔ تم بہت آرام سے مجھے بھول جاؤ گی۔“ فیضان دو سری سمت میں دیکھتے ہوئے غصہ غصہ کے بول رہے تھے۔

”کیا آپ زریں کو بھول چکے ہیں؟ اتنے سال گزرنے کے بعد کیا آپ انہیں یاد نہیں کرتے؟ کیا آپ کی ان سے محبت واقعی کشش تھی؟“ انبیاء نے تیز لہجے میں ان کی بات قطع کی۔

”آپ کہہ رہے ہیں میں آرام سے آپ کو بھول جاؤں گی اور۔ اور۔ اور پھر ساری زندگی ایک کم عمر لڑکے کے چہرے میں آپ کا چہرہ تلاش کرتی رہوں گی ٹھیک ویسے ہی جیسے آپ میرے چہرے میں زریں کا چہرہ تلاش کرتے ہیں۔“ انبیاء بولتے ہوئے جیسے ہانپنے لگی تھی۔ اس کی آنکھوں میں نمی بھی دکھائی دیتی تھی۔
فیضان اس کے رد عمل پر ہکا بکا رہ گئے تھے۔

”انبیاء! میرا وہ مطلب نہیں تھا۔“ انہوں نے کہا چاہا۔
”آپ کا کبھی بھی وہ مطلب نہیں ہوتا جو اتفاق سے آپ کہنا چاہتے ہیں۔“ انبیاء کے لہجے میں گرا طعن تھا۔

”لیکن آپ کو کوئی حق نہیں ہے کہ میری فیملنگز کو واقعی کشش قرار دیں۔ آپ کو صرف اپنے بارے میں فیصلہ کرنے کا اختیار ہے‘ میرے بارے میں نہیں۔ ماوی ٹھیک کہتی تھی‘ آپ سے محبت کرنا پھر سے سر بھوڑنے کے برابر ہے۔“ اس نے کہا اور آنکھوں میں آنسو لیے تیز قدموں سے اپنے پورشن کی طرف چلی گئی۔ فیضان اپنے لفظوں پر شرمندہ تھے کہ بہر حال اسے دکھ دینا تو ان کا مقصد نہیں تھا وہ اسے روکنا چاہتے تھے لیکن ہر بار کی طرح انہوں نے دیر کر دی تھی۔ بہت نہیں اپنی زندگی کے ہر اہم معاملے میں وہ اسی طرح دیر کیوں کر دیتے تھے۔

”شٹ اپ شبیہ! تمہیں کوئی حق نہیں ہے کہ میری بیوی کے بارے میں اس طرح کی گھٹیا باتیں کرو۔“ جلال نے ٹیک دم خود پر ضبط کھوتے ہوئے کہا تھا۔ شبیہ کو کہ اس سے کسی بھی قسم کے انکشاف کی توقع کر رہا تھا لیکن اس انکشاف پر ہکا بکا ہو کر اس کی شکل دیکھنے لگا۔

”یہ کیا مذاق ہے جلال! چند منٹ کے بعد جب بے یقینی کا جھکاؤ ابلکا ہوا تو شبیہ نے کہا۔
”مذاق نہیں ہے۔ میں سو فیصد سنجیدہ ہوں۔“ جلال نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ جذباتیت میں حقیقت تو اگل گیا تھا لیکن پچھتا بھی رہا تھا کہ اتنی جلدی اس راز میں کسی کو شریک نہیں کرنا چاہیے تھا۔

”میں نے انگلی نہ جانے سے پہلے ماوی سے نکاح کر لیا تھا۔ سوچا تھا مناسب وقت آنے پر سب کو بتا دوں گا۔“
”لیکن یہ سب ہوا کیسے؟۔ تم تو کہتے تھے وہ تمہاری صرف اچھی دوست ہے۔“

”ہاں کہتا تھا۔“ جلال نے آہستگی سے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”لیکن یہ دوستی کب محبت میں بدل گئی مجھے خود بھی پتا نہیں چلا۔“

”اس محبت کے مرض میں صرف تم جلا ہوئے ہو یا وہ لڑکی بھی ایسا کوئی دعوہ کرتی ہے؟“
”ظاہر ہے۔ ہم دونوں ہی ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں تب ہی تو بات نکاح تک پہنچی ورنہ یک طرفہ محبت میں معاملات اتنا نہیں بڑھتے۔“

”محبت۔“ شبیہ نے زہر خند کیا۔ ”یہ لفظ مجھے اس دور کی یاد دلاتا ہے جب ہمارے بزرگوں کے بزرگ بھی ہماری عمروں کے ہوں گے۔ کتنی زمانہ ایسے کسی جذبے کا کوئی وجود نہیں ہے۔“

”تم نے اس جذبے کی خوبصورتی کو کبھی محسوس نہیں کیا تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ کسی دوسرے کی فیملنگز کو بے کار سمجھو۔ میں ماوی سے اور وہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔ میرے لیے اتنا جاننا کافی ہے۔“
”یعنی میرا شک صحیح نکلا۔ اس لڑکی نے حویلی میں آنے کے لیے تمہیں مہو بنایا ہے۔“ شبیہ نے نخوت سے کہا۔

”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اس بے چاری کو تو پتا بھی نہیں تھا کہ ہمارے درمیان اتنی قریبی رشتہ داری نکل آئے گی۔“

”ایسی بے ٹکی باتوں پہ شاید اسے یقین آ سکتا ہے جس کی آنکھوں پر نام نہاد محبت کی پٹی بندھی ہو۔ مجھے تو بہر حال اس لڑکی کی کسی بات کا بھروسہ نہیں ہے۔“ شبیہ نے سر جھٹکتے ہوئے کہا تھا۔

”تنی بدگمانی اچھی نہیں ہوتی شبیہ!“
”اور اتنی خوش گمانی بھی اچھی نہیں ہوتی۔“ شبیہ نے دہرہ دہرہ کہا۔ ”تمہیں اس سے محتاط رہنا چاہیے۔“

”اس کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ مجھے ماوی پر پورا بھروسہ ہے۔“ اس کے لہجے میں یقین بولتا تھا۔
”تو تو بالکل ہے جلال!“

”نہیں بالکل نہیں ہوں۔ تمہیں کبھی محبت نہیں ہوئی نا اس لیے تم نہیں سمجھ سکتے۔ جس سے محبت ہونا شبیہ! اس کی ہر بات پر یقین کر لینے کو دل چاہتا ہے۔“

”ظاہر ہے۔ عقل جو ساتھ نہیں رہتی۔“ شبیہ نے چڑکے کہا۔ جلال بے وجہ ہنس دیا۔ شبیہ کی جان اور جل کر خاک ہوئی۔

”بہر حال میں تو مشورہ ہی دے سکتا ہوں اس لڑکی سے محتاط رہو۔ مجھے اس لڑکی کے ارادے ٹھیک نہیں لگتے۔“

”میں نے سوچا تھا ابھی اس بارے میں کسی کو نہیں بتاؤں گا لیکن اب تمہیں پتا چل ہی گیا ہے تو اس بات کو

اپنے تک ہی رکھنا۔ میں نہیں چاہتا کہ حالات سازگار ہونے سے پہلے کسی کو بھی میرے اور ماویٰ کے متعلق پتا چلے۔ جلال نے تعاون چاہنے والے انداز میں کہا، اس کے بعد شبیہ نے کہا جواب دیا۔ یہ تو پتا نہیں لیکن یہ ضرور ہوا تھا کہ نیم وادروازے کے باہر کھڑی تنوی کی آنکھوں میں اس نئی اطلاع سے چمک سی دوڑ گئی تھی۔ وہ فی الفور یہ خبر حرم اور نمل کو دینے بھاگی تھی۔



”کیا! حرم اور نمل کے منہ سے بے ساختہ نکلا تھا۔ نمل کی آنکھیں تو باقاعدہ حیرت اور بے یقینی سے پھیلی ہوئی تھیں۔ تنوی نے کانوں پہ ہاتھ رکھ لیا۔

”ادھر! آہستہ تو بولیں۔ میرے کان پھاڑیں گی کیا؟“ اس نے ناگواری سے کہا۔

”تم نے بات ہی ایسی بتائی ہے کہ ہم اپنا راری ایکشن چھپا ہی نہیں پارے۔“ نمل نے تعجب کے زیر اثر کہا۔

”تمہیں ضرور غلط فہمی ہوئی ہوگی تنوی!“ حرم نے کہا۔ ”میرا دل تو سچی بات ہے یہ بات ہی نہیں مان رہا کہ جلال اور ماویٰ کا نکاح ہو سکتا ہے۔“ وہ مستقل نفی میں سر ہلا رہی تھی۔

”تو کیا میں جھوٹ بول رہی ہوں؟“ تنوی نے آنکھیں پھیلا کر صدے کی کیفیت میں پوچھا۔ ”بھئی۔ میں اپنے کانوں سے شبیہ اور جلال بھائی کی باتیں سن کر آ رہی ہوں اب کانوں سنی تو غلط نہیں ہو سکتی نا۔“

”درست۔ لیکن اس بات کی تصدیق کون کرے گا۔“ نمل نے کہا۔ ”میرا مطلب ہے شبیہ بھائی سے پوچھنے کی ہمت کوئی نہیں کر سکتا اور جلال بھائی نے اگر خود شبیہ بھائی کو تاکید کی ہے کہ ان کے اور ماویٰ کے رشتے کی سچائی سے کسی کو آگاہ نہ کیا جائے تو بھول ہی جاؤ کہ وہ اپنے منہ سے کچھ اگلیں گے۔“ نمل نے ہاتھ جھاڑتے ہوئے کہا۔

”کہتی تو تم ٹھیک ہو۔“ حرم پر سوچ انداز میں بولی۔

”ایک آئیڈیا آیا ہے۔“ معاتنوی نے کہا تو وہ دونوں سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگیں۔

”ہم جا کر ماویٰ سے ہی پوچھ لیتے ہیں کہ کیا واقعی اس نے جلال بھائی سے نکاح کیا ہوا ہے۔“ اس نے پر جوش نظروں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”وہ ہمیں کیوں بتائے گی؟“ نمل مایوسی سے بولی۔ ”میں سمجھی ہوتا نہیں کیا آئیڈیا دینے لگی ہو۔“

”پھر بھی ہمیں ایک بار کوشش تو کرنا چاہیے۔“ تنوی بھند تھی۔ ”کیا پتا وہ ہمیں بتائی دے۔ آخر اس میں کوئی مضائقہ بھی تو نہیں ہے۔“

”نمل ٹھیک کہہ رہی ہے تنوی! ماویٰ ہمیں کچھ نہیں بتائے گی۔“ حرم نے کہا۔ ”اگر جلال شبیہ کو منع کر سکتا ہے کہ کسی کو کچھ نہ بتایا جائے تو یقیناً اس نے ماویٰ کو بھی منع کر رکھا ہو گا۔“

اور اگر انہوں نے واقعی نکاح کر رکھا ہے تو آپس میں کچھ نہ کچھ تو طے کر ہی رکھا ہو گا نا۔“

”یعنی ابھی بھی تم لوگوں کو شک ہے کہ میں جھوٹ بول رہی ہوں؟“ تنوی جل کر بولی۔

”تم پر کون احمق شک کر رہا ہے پانگل! ہم تو صرف یہ کہہ رہے ہیں کہ حقیقت حال کا پتا کس طرح لگایا جائے۔“ حرم نے کہا۔

”تمہیں یاد ہے حرم تپا! ہم سب سوچ رہے تھے کہ اچانک ماویٰ کو حویلی آنے کا خیال کیسے آیا۔“ نمل نے چند منٹ بعد کہا۔

”ہو سکتا ہے وہ اپنے نکاح کو منوانے ہی حویلی آئی ہو یعنی جلال بھائی اور ماویٰ کی پلاننگ ہو یہ ساری۔“

حرم نے گھور کر اسے دیکھا۔ ”تم ہر معاملے میں فلمی باتیں ڈھونڈ لیا کرو۔“

”اس میں فلمی باتیں ڈھونڈنے کی کیا بات ہے۔ تم خود بتاؤ کیا تمہیں خود ایسا نہیں لگ رہا۔ دو لوگ ایک دوسرے سے محبت کرنے لگتے ہیں اچانک انہیں پتا چلتا ہے کہ بزرگ ان کا رشتہ ہونے نہیں دیں گے۔ تب وہ۔“

”بس کرو نمل!“ حرم نے چڑ کر اس کے آگے ہاتھ ہی جوڑ دیے تھے۔

”پھر کیا کریں حرم تپا!“ تنوی نے بے قراری سے پوچھا۔ اسے سب سے زیادہ جلدی تھی کہ اصل بات جان لے۔ ماویٰ اسے اچھی لگتی تھی جبکہ جلال اسے سکی بہنوں کی طرح چاہتا تھا گو کہ حویلی کے باقی لڑکے بھی اس کے لیے بھائیوں کی طرح ہی تھے لیکن جو انیسیت اپنی اچھی فطرت کی وجہ سے وہ جلال سے محسوس کرتی تھی وہ بات کسی اور میں نہ تھی۔

”میرا خیال ہے خاموشی سے ملی کے تھیلے سے باہر آنے کا انتظار کرنا چاہیے۔ مناسب وقت آنے پر جلال اور ماویٰ خود ہی ہر بات دس کلوز کروں گے تو ہمیں بھی پتا چل جائے گا۔ ایسا نہ ہو ہماری جلد بازی ان لوگوں کے لیے کوئی مسئلہ نہ کرے۔“ حرم ہمیشہ دور اندیشی سے سوچتی تھی۔

”یہ کیا بات ہوئی حرم تپا!“ تنوی نے بسور کے کہا۔ ”کیا پتا کب تھیلہ پھٹتا ہے اور ملی باہر آتی ہے اور خدا ہی جانے تھیلہ پھٹتا بھی ہے یا نہیں۔ اتنا لبا انتظار کون کرے اور آپ کیسی بہن ہیں حرم تپا! آپ کے بھائی نے چپکے سے شادی کر لی اور آپ کو کوئی دلچسپی ہی نہیں ہے۔“ اس کا انداز شرم دلانے والا تھا۔ حرم زور سے ہنس دی یوں بھی مایوں کے زرو سنہری جوڑے میں ہنسی بات بے بات اس کے لبوں پر بکھر رہی تھی۔

”دلچسپی کیوں نہیں ہے بالکل ہے لیکن میں تمہاری طرح زندگی کے معاملات کو محض جذباتیت سے نمٹانے پر یقین نہیں رکھتی۔ بات صرف اتنی سی ہے۔“

”شاید آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔“ تنوی نے بظاہر کہا اور دل میں سوچا۔ ”جذباتیت سے تو یوں ہی سہی لیکن واقعی اتنا لبا انتظار کون کرے۔ میں جلال بھائی سے نہ پوچھ سکی تو ماویٰ سے تو ضرور پوچھ لوں گی۔“ اس نے مصمم ارادہ کر لیا تھا۔



”تسنیم!“ ماویٰ نے اسے رانداری سے گزرتے تو دیکھ کر بے ساختہ پکارا۔ وہ بڑے بڑے تھال اٹھائے تیز قدموں سے کہیں بھاگی جا رہی تھی۔ ماویٰ کی آواز یہ وہ ٹھنک کر رک گئی اور سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

”بڑی جلدی میں لگتی ہو۔ کہیں جانے کی جلدی ہے کیا؟“ ماویٰ نے دوستانہ انداز میں پوچھا۔

”ہم تو ملازم ہیں بی بی! کسی نہ کسی کام کی جلدی ہی رہتی ہے۔“ تسنیم کا انداز سادہ سا تھا۔

”تمہیں اپنا وعدہ یاد ہے نا؟“

”کون سا وعدہ؟“ خدا جانے وہ انجان تھی یا بن رہی تھی۔

”میری مدد کرنے کا وعدہ۔ حویلی کے رازوں سے پردہ اٹھانے کا وعدہ۔“

”بی بی! آپ ناحق مجھ غریب کے پیچھے بڑی ہیں۔“ تسنیم نے بے چارگی سے کہا۔

”یہ تو۔“ ماویٰ نے سر پہ ہاتھ مارا۔ ”میں تو میں تمہارے پیچھے بڑی نہیں ہوں۔ کبھی پڑ گئی تو جانے تمہارا کیا حشر ہو گا۔ اب نخرے کرنا بند کرو اور سیدھی طرح بتاؤ۔ میری مدد کب کرو گی۔“ عجب حوصلے جتا تا انداز تھا۔

”بی بی! حویلی میں کسی کو بھنک بھی پڑ گئی ناں کہ میں نے آپ کو کچھ بتایا ہے تو آپ کو تو کوئی کچھ نہیں کہے گا۔“

میری جان مصیبت میں آجائے گی۔“ تسنیم رو دکھی ہو کر بولی تھی۔
 ”میں تمہیں ایک بات صاف بتا دوں تسنیم! میرے بارے میں کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہونا۔ کیونکہ اگر تم نے مجھے کچھ نہ بتایا تو مجھ سے زیادہ تمہاری جان کوئی مصیبت میں نہیں ڈال سکتا۔“
 بڑے ہی دوستانہ انداز میں دھمکایا گیا تھا۔ تسنیم جو انہماک سے اس کی بات سن رہی تھی، ہونٹ سی بن کر اس کی شکل دیکھنے لگی۔

ماویٰ ہنس دی۔ ”دیکھو میں تمہاری دشمن نہیں ہوں۔ اور میں یہ بھی جانتی ہوں۔ اس حویلی میں تم وہ واحد شخصیت ہو جو میری مدد کر سکتی ہے۔ اس بات کا اندازہ بھی میں نے تمہاری اس روز کی گفتگو سے لگایا جس میں تم اپنے اور میرے بابا کے اچھے تعلقات کا ذکر کر رہی تھیں۔ ایک بات تم ذہن نشین کر لو جتنی مجھے اپنی خیریت عزیز ہے اتنی ہی تمہاری بھی ہے اس لیے یہ تو بھول ہی جاؤ کہ میں تم پر کوئی رنج آنے دوں گی۔ میں اس حویلی میں اپنے بابا کے قاتل کے خلاف ثبوت لینے آئی ہوں اور اگر مجھے خالی ہاتھ واپس جانا پڑا تو یاد رکھنا، قیامت کے روز قاتل کے ساتھ ساتھ تمہیں بھی اللہ کے سامنے جواب دہ ہونا پڑے گا۔ کیونکہ خاموش رہ کر تم اس قاتل کا ساتھ ہی دے رہی ہو۔“

”بی بی! آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔ میں اتنا کچھ تو نہیں جانتی کہ آپ کی مکمل طور پر مدد کر سکوں۔“ تسنیم بے چارگی سے بولی۔

”تھوڑا جانتی ہو یا زیادہ لیکن تم پر ذمہ داری تو ہے کہ مجھے ان حقائق سے آگاہ کرو۔“ ماویٰ نے کہا۔ ”اب فیصلہ کرنا تمہارا کام ہے کہ تم خاموش رہ کر قاتل کا ساتھ دینا چاہتی ہو یا۔“ ماویٰ نے جتنی نظروں سے اسے دیکھا اور جملہ احوال چھوڑ کر واپس مڑ گئی۔

”ماویٰ بی بی!“ معاً تسنیم نے اسے پکار لیا۔ ماویٰ چند قدم ہی آگے گئی تھی کہ اس کی آواز سن کر پلٹی۔
 تسنیم تذبذب سے انگلیاں مروڑ رہی تھی۔ چند قدموں کا فاصلہ عبور کر کے ماویٰ کے قریب آئی اور رازداری سے بولی۔

”کل حرم بی بی کی رسم مندی ہے۔ رسم کے وقت سب لوگ مصروف ہوں گے۔ آپ موقع دیکھ کر حویلی کے پچھلے حصے میں آجائے گا۔ مجھے جو کچھ پتا ہے وہ آپ کو بتا دوں گی۔ لیکن ایک بات ہے بی بی! مجھ سے زیادہ مدد کی امید نہ رکھیے گا۔ ہو سکتا ہے مجھ سے معلومات لے کر بھی آپ کو کوئی فائدہ نہ ہو۔ میں آپ کا انتظار کروں گی۔“ اس نے جھپکتے ہوئے لیکن بے تعلقتہ کہا اور ادھر ادھر دیکھتی جلدی سے آگے بڑھ گئی۔

ماویٰ چند لمحے بے یقینی سے کھڑی رہی پھر ہنس دی۔ تسنیم اس کی توقع سے جلدی مان گئی تھی لیکن اب اگلا مرحلہ طے کرنا بھی ایک وقت طلب مرحلہ تھا۔



”فیاض بھائی! آپ ٹہنہ آپا سے صاف صاف بات کریں۔ میں یہ بات مان ہی نہیں سکتا کہ انہیں ماویٰ کے بارے میں کوئی خبر ہی نہ ہو۔“ فیضان نے فون پر فیاض بھائی سے کہا تھا۔
 ”تم کس طرح کی باتیں کر رہے ہو فیضان!“ فیاض نے حیران ہو کر کہا۔ ”ٹہنہ بھلا ہم سے کیوں چھپائے گی کہ ماویٰ کہاں ہے وہ تو خود اس کے لیے اتنی پریشان ہے۔“

”آپ کی بات اپنی جگہ درست سہی لیکن معاملہ کچھ گڑبڑ ضرور ہے بھائی!“
 فیضان نے انہیں وہ ساری تفصیلات کہہ سنائیں جو انہیں بتائی تھیں۔

”تم عجیب بات بتا رہے ہو فیضان!“ فیاض بھائی نے متعجب ہو کر کہا۔ ”مجھے تو ٹہنہ کے کسی انداز سے ایسا نہیں لگا کہ وہ غلط بیانی کر رہی ہے اور سوچنے کی بات تو یہ بھی ہے کہ وہ ایسا کرے گی بھی کیوں؟۔ تمہیں ضرور غلط فہمی ہوئی ہے فیضان!“

”یہی تو زیادہ پریشانی کی بات ہے بھائی! کہ آپا ایسا کر کیوں رہی ہیں۔ اور آپا اس بات کو بھی دماغ سے نکال دیں کہ مجھے غلط فہمی ہوئی ہے۔ اس سارے معاملے میں ایسا کچھ ضرور ہے جو آپا ہم سے چھپا رہی ہیں۔“ فیضان کی آواز پریشانی میں ڈوبی ہوئی تھی۔

”میری مائیں۔ آپ ٹہنہ آپا کو اعتماد میں لے کر سچائی جاننے کی کوشش کریں۔“
 ”او میرے بھائی! سچائی جاننے کے لیے بھی کسی بنیاد کی ضرورت ہوتی ہے جبکہ تمہیں محض شک ہے۔“ فیاض نے کہا تھا۔ ”اور ذرا یہ بھی تو سوچو کہ اگر ٹہنہ واقعی لاعلم ہوئی تو اس کے دل پر کیا گزرے گی کہ اس کے بھائی جس بنیاد پر اس پر شک کر رہے تھے۔“

بات مقول تھی۔ فیضان سوچ میں پڑ گئے۔ پھر تھک ہار کر بولے۔
 ”ٹھیک ہے فیاض بھائی! آپ نہ پوچھیں ٹہنہ آپا سے۔ میں خود ہی کسی طرح ماویٰ کا پتا چلانے کی کوشش کرتا ہوں۔“ ان کا لہجہ کسی قدر مایوسی لیے ہوئے تھا۔



”داوی جان! کیا سوچ رہی ہیں؟“ ماویٰ نے بڑی بے تکلفی اور چاہ سے پوچھا تھا۔ وہ دونوں بڑی سی ڈانٹنگ نیبل کے آمنے سامنے والی کرسیوں پر بیٹھی تھیں۔ باقی کرسیاں خالی تھیں۔ اسی لیے دونوں کو ایک دوسرے کے نیچے ادھرنے کا خوب موقع ملنے والا تھا۔

”میں سوچ رہی ہوں۔ جب میں حویلی سے دھکے دے کر تمہیں نکالوں گی تو تمہارے چہرے پر تاثرات کیسے ہوں گے؟“ جنت بیگم نے اس کے سوال پر کوئی بھی رد عمل ظاہر کیے بغیر جواب دیا تھا۔ ماویٰ اس بات پر ہنسی۔ یوں جیسے کسی بچے کی بات پر ہنسا جاتا ہے۔

”ماوی گاؤ! اتنا غرور ہے آپ میں۔ لیکن جب یہ غرور ٹوٹے گا تو آپ کے تاثرات کیا ہوں گے۔“
 ”کچھ لوگوں پہ غرور جتنا ہے اور میں ان ہی لوگوں میں سے ایک ہوں۔“ جنت بیگم نے تیکسی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”بابا!۔“ ماوی بد تمیزی سے ہنسی۔ جنت بیگم نے ناگواری سے اسے دیکھا۔
 ”تمہیں تھوڑی تمیز سیکھنی چاہیے۔“
 ”آپ کے پاس آگئی ہوں نا۔ سکھاؤ مجھے۔“

”میں نے تمہیں نہیں لے رکھا کہ لوگوں کی گہڑی ہوئی اولادیں سدھارتی پھوں۔“ جنت بیگم نے نخوت سے ناک چڑھا کر کہا۔

”داوی جان!۔“ ماوی نے جتنے لاڈ سے پکارا جنت بیگم نے اتنی ہی بری طرح اسے ٹوک دیا تھا۔
 ”میں تم سے کتنی بار کہہ چکی ہوں مجھے داوی مت کہا کرو۔ تمہاری داوی تمہارے باپ کے بچپن میں ہی مر گئی تھی۔“

”ظاہر ہے سب ہی تو میرے دادا نے آپ سے شادی کی تھی۔ اس حساب سے آپ میری داوی ہی بنتی ہیں۔“
 ماوی کا انداز اصرار بھرا تھا۔

”جب تک یہ کھا نہ نہیں کھلے گا تمہاری حرکتیں بھی ٹھیک نہیں ہوں گی۔“ انبیاء نے غصے سے آگے بڑھ کر لپٹا بند کر دیا تھا۔

”میں نے کام سے کام رکھنا سیکھواؤ!“ ولید نے سرد مہری سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

”یہ بھی میرا کام ہے۔“ انبیاء نے سابقہ انداز میں کہا۔

”میں اس کو ٹھیک نہیں کرتا انو! میں نے تمہیں اس روز بھی بتایا تھا کہ وہ سگریٹ میرے دوستوں کے تھے۔“ ولید نے غصے کے باوجود قدرے دوستانہ انداز میں کہا تھا۔

”چھا۔“ انبیاء نے طنزیہ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ پھر لپٹ کر گئی اور اس کی الماری کے سب سے نچلے حصے میں سے کچھ میگزینز نکال لائی اور انہیں ولید کے سامنے میز پر بچھو دیا۔

”سگریٹ تمہارے دوستوں کے تھے تو ان پورن میگزینز کے بارے میں کیا کہو گے؟“

ولید کے چہرے کا رنگ بدلتا ہوا تھا۔ اسے اس طرح گھبرائے جانے کی توقع ہرگز نہیں تھی۔

”اور وہ تمام نیوڈوب سامنس جنہیں تم سارا دن پردھانی کے بہانے سرچ کرتے رہتے ہو؟ اور وہ تمام گھٹیا اسٹیف جسے تم نے اپنے کمرے کے کونوں کھدروں میں چھپا رکھا ہے۔ ان سب چیزوں کے بارے میں کیا کہو گے ولید!“

انبیاء کا غصے سے برا حال تھا جبکہ ولید کی شکل دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ لیکن اسے چند منٹ ہی لگے تھے اپنی حالت پر قابو پانے میں۔ اگلے ہی پل اس نے میگزینز اٹھا کر میز کے سب سے نچلے خانے میں ڈال دیے تھے۔

”تمہاری ہمت کیسے ہوئی کہ میرے کمرے کی تلاشی لو؟“ ولید نے کرسی سے کھڑے ہو کر سینے پر ہاتھ باندھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے پوچھا۔ انبیاء اس سے ڈھٹائی کی توقع کر رہی تھی مگر اتنی بھی نہیں۔

”پہلے میرے سوالوں کا جواب دو۔ ورنہ میں تمہاری حرکتوں کی ساری خبر ڈیڈی کو دے دوں گی۔“

”کیا یہ بستر نہیں ہو گا کہ میری جاسوسی کرنے کے بجائے تم پہلے اپنی حرکتوں پر دھیان دے لو۔“ ولید نے اطمینان سے اس کے پیروں تلے سے زمین کھینچنا شروع کی تھی۔

”مطلب کیا ہے تمہارا؟“ انبیاء الجھی۔

”مطلب یہ کہ آج کل گھر میں جو کچھ ہو رہا ہے ممکن ہے وہ ڈیڈی کو نظر نہ آ رہا ہو، لیکن مجھے سب کچھ نظر بھی آ رہا ہے اور سمجھ بھی۔ لیکن میں نے تم سے کچھ کہا؟ اس لیے۔“ کہ میں سمجھ رہا تھا یہ تمہارا پرسل معاملہ ہے۔ مجھے اس میں انٹرفیر کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ لیکن اب جبکہ تم بہت اچھی بن بنے ہوئے میرے ہر معاملے میں ٹانگ پھنسا رہی ہو تو میرا بھی فرض بنتا ہے کہ میں بھی بہت اچھے بھائی کا رول پلے کرتے ہوئے تمہاری حرکتوں کی خبر ڈیڈی کو دے دوں۔“

”کیا بکواس کر رہے ہو ولید!“ انبیاء نے خائف ہوتے ہوئے کہا۔ گو کہ اس کے دل میں چور نہیں تھا، لیکن ولید کے بات کرنے کا انداز اسے ہراساں کر رہا تھا۔

”بکواس ابھی میں نے کی نہیں ہے، لیکن تم اگر اسی طرح میری جاسوسی کرتی رہیں تو تمہارے اور فیضان بھائی کے بارے میں جو کچھ ڈیڈی کو بتاؤں گا وہ ضرور بکواس کے زمرے میں آجائے گا۔“ ولید نے غرا کر کہا۔ اب کی بار چہرے کا رنگ بدلتے کی باری انبیاء کی تھی۔

”ولید! فضول مت بولو۔“

”چھا اپنی باری آئی تو میری باتیں فضول ہو گئیں۔“ ولید نے استہزائیہ کہا۔

”اگر تم نے ڈیڈی سے کوئی بھی فضول بات کہی تو ولید! تو میں تمہارا بہت برا حشر کروں گی۔“ انبیاء نے کہا۔

”نہیں۔ میں تمہاری سوتیلی دادی بنتی ہوں۔“ جنت بیگم نے زور دے کر کہا تھا۔

”تو ٹھیک ہے میں آپ کو سوتیلی دادی جان کہہ کر بلا لیا کروں گی۔ کیا خیال ہے آپ کا؟“ بڑا دوستانہ انداز تھا جنت بیگم کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔

”تم انتہائی ڈھیٹ لڑکی ہو۔“ اس نے دانت کچکا کر کہا۔

”تھمنکس فار د کامپلی منٹ سوتیلی دادی جان!“ وہ ابھی بھی باز نہیں آ رہی تھی۔ ”آپ کو اسی بات سے اندازہ لگایا چاہیے کہ آپ کا برا وقت شروع ہونے والا ہے۔ ثبوت لیے بغیر میں اس حویلی سے نہیں جاؤں گی اور آپ کو سزا دلوانے بغیر اس ملک سے۔“ انداز میں کوئی لچک نہ تھی۔ سید حاسپاٹ سا انداز تھا۔ لچک بھر کے لیے جنت بیگم کا دل لرز اٹھنے ہی پل اس نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پایا تھا اور کرسی سے کھڑے ہوتے ہوئے استہزائیہ ہنسی ہنس دی تھی۔

”اپنی سی کو ششیں کر دیکھو جب اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤ تب بات کرنا۔“ اس نے ایک جتنا ہی نظر دادی سے ڈالی اور ڈانٹنگ ہال سے نکل گئی۔ دادی نے اسے جاتے دیکھا پھر سر جھٹک کے پلیٹ میں باقی بچا سینڈویچ ختم کرنے لگی۔



”ولید! مجھے تم سے بات کرنی ہے۔“ انبیاء نے ولید کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

ولید اپنے لپٹا بند کر کے مصروف تھا اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا پھر اسی مصروفیت بھرے انداز میں بولا۔

”میں مصروف ہوں انو!“

”ذرا در کو بات سن لو گے تو کون سی قیامت آجائے گی۔“ انبیاء نے چڑ کر کہا۔

”یار انو! ولید نے بیزار سے کہا۔“

”آئی سویر۔ پندرہ منٹ سے زیادہ نہیں۔“

ولید نے ناچار لپٹا بند کر دیا اور کرسی کا رخ ذرا سا اس کی طرف موڑتے ہوئے بولا۔

”جلدی سے شروع ہو جاؤ۔ زیادہ وقت نہیں ہے میرے پاس۔“

”تم کیا کرتے پھر رہے ہو ولید!“

”مطلب؟“ وہ حیران ہوا۔

”مطلب یہ کہ تم کن ایکٹوئیز میں مصروف ہو۔ اپنی حالت دیکھی ہے کتنے کمزور ہو گئے ہو۔ آنکھوں کے گرد باقاعدہ حلقے بڑھ گئے ہیں۔“ انبیاء بڑے پریشان انداز میں کہہ رہی تھی۔

”وہ ایسی کوئی بات نہیں ہے یار! بس ایگزامز کی وجہ سے خود پر دھیان دینے کا ٹائم ہی نہیں مل رہا ہے۔ ورنہ اور تو کوئی بات نہیں ہے۔“ ولید نے اسے ٹالتے ہوئے کہا تھا۔

انبیاء چند منٹ خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔ سمجھ نہیں پا رہی تھی مزید کچھ کہے یا نہیں گو کہ آج تیرہ کر کے آئی تھی کہ دو نوک بات کرے گی۔

”ولید!“ بالآخر اس نے خاموشی کو توڑا۔ ”اور اس کو ٹھیک کے بارے میں کیا کہو گے؟“

”تم آج پھر وہی کھاؤ کھول کر بیٹھ جاؤ۔“ ولید نے سرد مہری سے کہہ کر رخ دوبارہ موڑ لیا تھا اور لپٹا بند بھی دوبارہ آن کر لیا تھا۔ مطلب صاف تھا کہ وہ اب مزید کوئی بات کرنا نہیں چاہتا اور انبیاء کو چاہیے اپنی شکل لے کر وہاں سے دفع ہو جائے۔ انبیاء کو تاؤ آ گیا۔

”منقول بات؟ کون سی بات؟ میں تو حقیقت ہی بتاؤں گا۔“

”نہی طرف سے افسانہ گھر کے حقیقت بناؤ گے؟“

”نہی طرف سے کیوں بنانے لگا۔ یہ تو سامنے کی حقیقت ہے۔ موقع ملنے ہی تم انگلی میں چلی جاتی ہو۔ کھانے بنانا کر بھجوائے جارہے ہیں۔ لان میں داک کی جارہی ہے۔ کچھ نہ کچھ تو بات ہے نا۔“ وہ خوب آنکھیں میٹکا میٹکا کر بول رہا تھا۔ لیکن انبیاء کے منہ میں تو جیسے زبان ہی نہ رہی تھی۔ اس کا تو وہ حال تھا کہ کان تو بدن میں لہو نہیں۔

”اب میری ایک بات کان کھول کر سن لو مس حسن! اگر اگلی بار تم نے میرے کمرے کی تلاشی لینے کی کوشش کی یا میری جاسوسی کرتے ہوئے پائی گئیں تو یاد رکھنا میں تمہارے اور فیضان بھائی کے بارے میں ایک کی چار لگا کر می اور ڈیڈی کو بتانے میں ذرا بھی نہیں سوچوں گا۔“ اس نے واضح الفاظ میں دھمکی دی تھی۔

”اب اپنی شکل کم کرو میں مصروف ہوں۔“

”اور ہاں۔“ انبیاء جس وقت کمرے سے باہر نکل رہی تھی اس نے ولید کو کتے بنا۔

”میں جو کہتا ہوں اسے بھولتا نہیں ہوں۔ یہ بات ضرور یاد رکھنا۔“ انبیاء خاموشی سے باہر نکل گئی تھی۔



فیضان بیڈ پر سیدھے لیٹے ہوئے تھے سر کے نیچے دونوں ہاتھوں کا تکیہ تھا اور آنکھیں چھت سے لگی ہوئی تھیں جبکہ کانوں میں انبیاء کی آواز گونج رہی تھی۔

”آپ کے کہنے کا جو بھی مطلب تھا۔ میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ سچ میں آپ کو کبھی نہیں بھولوں گی۔ اور میں یہ بھی چاہتی ہوں کہ آپ بھی مجھے یاد رکھیں۔ کیا آپ مجھے یاد رکھیں گے؟“

”کتنی عجیب بات ہے نا۔ میں نے اپنی اور آپ کی عمروں کا حساب اس لیے رکھا کہ کیونکہ میں آپ سے محبت کرتی ہوں، لیکن جب آپ کو مجھ سے کوئی دلچسپی ہی نہیں ہے تو آپ اتنا حساب کتاب کس لیے رکھے ہوئے ہیں؟“

”کیونکہ آپ کے دل میں بھی کہیں نہ کہیں میرا خیال موجود ہے، جسے آپ جھٹکتے رہتے ہیں اور خود سے بھی اعتراف کرنا نہیں چاہتے۔“

”کیا آپ زریں کو بھول چکے ہیں؟ اتنے سال گزرنے کے بعد کیا آپ انہیں یاد نہیں کرتے؟ کیا آپ کی ان سے محبت وقتی کشش تھی؟“

فیضان اٹھی اور کھڑکی میں جا کر کھڑے ہو گئیں۔ رات کا آسمان ستاروں سے جھلجھلا رہا تھا اور ہوا شائیں شائیں کر کے لان میں درختوں کو چھوئی تھی۔

”آپ کہہ رہے ہیں میں آرام سے آپ کو بھول جاؤں گی۔ اور۔ اور۔ اور پھر ساری زندگی ایک کم عمر لڑکے کے چہرے میں آپ کا چہرہ تلاش کرتی رہوں گی ٹھیک ویسے ہی جیسے آپ میرے چہرے میں زریں کا چہرہ تلاش کرتے ہیں۔“ اس نے جیسے فیضان کے سامنے آئینہ لا کر رکھ دیا تھا۔

”آپ کو کوئی حق نہیں ہے کہ میری لہلہکنڈ کو وقتی کشش قرار دیں۔ آپ کو صرف اپنے بارے میں فیصلہ کرنے کا اختیار ہے، میرے بارے میں نہیں۔ ماوی ٹھیک کہتی تھی، آپ سے محبت کرنا پھر سے سر بھوڑنے کے برابر ہے۔“

کتنی بے چارگی تھی اس کے لہجے میں۔ فیضان کو از سرنو شرمندگی نے آن گھیرا۔ انہوں نے بیزارگی سے کھڑکی بند کر دی۔ ایک جھٹکے سے ہوا کی تیز آواز کا رابطہ ٹوٹ گیا تھا۔

فیضان نے محض وقت گزاری کے لیے لب ٹاپ تن کر لیا۔ ان کے ان باکس میں انبیاء کی کچھ ای میلز پڑی تھیں۔ ساوا اور معصوم بے ضرر سی باتوں سے بھری ہوئی۔ وہ ایک ایک کر کے تمام ای میلز دیکھتے چلے گئے۔ معاذین میں ایک کو نڈا سا لپکا تھا۔ انہوں نے فی الفور اپنی آنکھوں کو سائن آؤٹ کر کے ٹیمپ آپ کا میلنگ ایڈریس لگانا شروع کیا۔ کسی وقت میں ٹیمپ آپ کا دوا ہوا پاس دروازہ کام آیا تھا اور کوکہ وہ جانتے تھے کہ وہ بہت سی غیر اخلاقی حرکت کے مرتکب ہونے جارہے ہیں۔ لیکن یہ وہ واحد راستہ تھا جس کے ذریعے ماوی کا ہاتھ لگایا جاسکتا تھا۔

تھوڑی سی محنت کے بعد بالآخر وہ اصل پاس ورڈ لگانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ توقع کے عین مطابق ان باکس ماوی کی ای میلز سے بھرا ہوا تھا۔ وہ ایک ایک کر کے تمام میلز چیک کرنے لگے۔ پہلی چار پانچ میلز میں کوئی قابل ذکر بات نہ تھی بلکہ چھٹی میل میں انہیں سراغ مل ہی گیا۔

”آپ کی ڈیمائڈ کے مطابق میں حویلی پہنچ چکی ہوں، لیکن سمجھ یہ نہیں پاری کہ میں یہاں آئی کس لیے ہوں۔ اگر بابا جان کے قاتل کے خلاف ثبوت ہی تلاش کرنا تھا تو ہم پولیس کی مدد بھی تو لے سکتے تھے۔ اس کے لیے مجھے حویلی پہنچنے کی کیا ضرورت تھی۔“

فیضان کے دماغ پر جیسے پھرے برسنے لگے تھے۔ اگلی ای میل میں لکھا تھا۔

”بالآخر آج میری ملاقات جنت بیگم سے ہوئی گئی۔ آپ نے ٹھیک کہا تھا می لہو بہت خوب صورت خاتون ہیں اور اگر زریں آئی اپنی ماں جیسی تھیں تو فیضان ماما نے بلاوجہ دل نہیں ہارا ہو گا۔ بلاشبہ ان میں ضرور ایسا کچھ ہو گا کہ دل ہار دیا جائے۔“

اب تو کسی شک و شبہ کی گنجائش ہی نہ تھی، ساری صورت حال سمجھ میں آتے ہی فیضان سر پکڑ کر بیٹھ گئے تھے۔

”آپ سے اور آپ کی بیٹی سے مجھے عقل مندی کی توقع تو کبھی بھی نہیں رہی۔ لیکن اس بار تو آپ دونوں نے حد ہی کر دی۔“

فیضان نے موبائل فون کان سے لگا رکھا تھا اور بے حد غصے میں تھے۔

”کیسی باتیں کر رہے ہو فیضان! ٹیمپ آپ نے قدرے تعجب سے پوچھا۔

”پہلے آپ مجھے بتائیں، ماوی کہاں ہے؟“ فیضان نے ان کے گرد گھیرائنگ کرنا شروع کیا۔

”جیسے چاہو نا تو کیا پہلے ہی نہ بتا دیتی۔“ ٹیمپ عاجز آکر بولیں۔

”تو پھر آپ کے لیے ایک خبر ہے۔ ماوی حویلی جا چکی ہے تاکہ وہاں سے رجب بھائی کے قاتل کا سراغ لا سکے۔“ فیضان نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

”لگ۔ کیا کہہ رہے ہو فیضان!“ ٹیمپ خود پر قابو رکھنے کے باوجود ہلکا گئی تھیں۔

”وہی کہہ رہا ہوں جو آپ سن رہی ہیں۔“ فیضان نے تیز لہجے میں کہا۔ ”اور بہتر ہو گا کہ آپ میرے سامنے مزید انجان بننے کا ڈراما نہ کریں کیونکہ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ ماوی نے آپ کے کہنے پر حویلی جانے کی حماقت کی ہے۔“

”فیضان! میں۔۔۔“ ٹیمپ نے کہنا چاہا لیکن فیضان کچھ بھی سننے کے موڈ میں نہیں تھے اور ٹیمپ نے آج سے پہلے بھائی کو کبھی اتنے غصے میں نہیں دیکھا تھا۔ وہ اپنی کیفیت اس شخص کی سی محسوس کر رہی تھیں جس کی چوری پکڑی گئی ہو۔ ناچار انہیں اعتراف کرنا پڑا کہ ماوی ان ہی کے اصرار پر حویلی گئی ہے۔

”ٹیمپ آپ! میری سمجھ میں نہیں آ رہا، آپ کی عقل مندی کا اعتراف کن الفاظ میں کروں۔“ فیضان کا غصہ سے برا حال تھا۔ ”آپ کو ذرا سا بھی احساس ہے، آپ نے کتنی بڑی حماقت کا ثبوت دیا ہے۔ ماوی کو اسے ہاتھوں سے

معیشت کے منہ میں دھکیل دیا۔ ایک بار بھی آپ نے سوچا وہاں اسے کوئی نقصان پہنچا تو آپ کیا کریں گی؟
 ”تم اس طرح کی باتیں مت سوچو فیضان! ماویٰ کو کچھ نہیں ہوگا۔“ ثمنینہ نے کہا۔
 ”آپ اپنے خیالوں میں خوش رہیں۔ مجھے ایسی کسی خوش امید کی آس نہ دلائیں۔“ فیضان نے دو ٹوک کہا
 ”ماویٰ کا کانٹھکٹ نمبر دس مجھے۔ میں اسے مزید اس حویلی میں چھوڑنے کا رسک نہیں لے سکتا۔“

”میرے پاس اس کا نمبر نہیں ہے۔“ ثمنینہ نے کہا۔
 ”اب آپ پھر جھوٹ بول رہی ہیں۔“ فیضان کو تاؤ آگیا۔
 ”فیضان!۔“ ثمنینہ تپانے بیڑاری سے کہا۔ ”تم بتانا کھیل بگاڑ دو گے۔ میں نے کن دقتوں سے ماویٰ کو
 حویلی جانے پر راضی کیا ہے اپنے مقصد کے اتنا قریب پہنچ کر اگر وہ واپس آگئی تو سب کیے کرائے پر پانی پھر جائے
 گا۔“

”آپ کو اپنی پلاننگ خراب ہونے کا خدشہ ہے اس بات کی کوئی فکر نہیں کہ ماویٰ کو وہ لوگ کوئی نقصان پہنچا
 سکتے ہیں۔“

”ماویٰ ان لوگوں کا اپنا خون ہے وہ اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔“ ثمنینہ نے کمزوری آواز میں کہا۔
 ”جی ہاں۔ ماویٰ ان کا اپنا خون ہے۔ خون بھی وہ جو کب کا سفید ہو چکا۔“ فیضان نے ثمنینہ کا جملہ اچکتے ہوئے
 انہیں آڑے ہاتھوں لیا تھا۔

”ایک طرف آپ نے ماویٰ کو وہاں رجب بھائی کے قاتل کے خلاف ثبوت لینے بھیج دیا۔ دوسری طرف آپ
 کہہ رہی ہیں کہ ماویٰ ان کا اپنا خون ہے اس لیے محفوظ ہے اگر وہ حویلی رجب بھائی کے لیے محفوظ نہیں تھی تو
 ماویٰ کے لیے کس طرح محفوظ ہو سکتی ہے؟ اس بات پر یقیناً آپ نے غور کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی ہوگی۔
 اب مجھے ایک بھی منٹ ضائع کیے بغیر ماویٰ کا نمبر دے دیں ورنہ غصے میں میں نہ جانے کیا کر بیٹھوں گا۔“
 یہ دھمکی کارگر رہی۔ یوں بھی ثمنینہ فیضان کے لہجے سے سمجھ گئی تھیں کہ اب کوئی بھی ہمانہ بنا فضول ہوگا۔
 بددلی کے ساتھ انہوں نے نمبر دے دیا تھا۔



”تم معاملے کی نزاکت کو سمجھ ہی نہیں رہی ہو ماویٰ!“ ثمنینہ نے جھنجھلا کر کہا تھا۔
 ”ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ۔“ ماویٰ نے سابقہ انداز میں کہا تھا۔ وہ بڑی سی سنگھار میز کے سامنے کھڑی لب
 اسٹک لگا رہی تھی۔ آج حرم کی رسم مندی تھی۔ سب لڑکیاں بھابھیاں تنوی کے کمرے میں تیار ہونے کے لیے
 جمع تھیں اس نے کندھے کی مدد سے موبائل فون کان سے لگا رکھا تھا جبکہ لب لائنز برش کی مدد سے وہ بے حد
 نفاست سے لب اسٹک لگا رہی تھی۔ اس نے بائبل گرین کھر کے غرارے کے ساتھ لائٹ گولڈن شرٹ پہن رکھی
 تھی۔ بائبل گرین ہی بڑا سا دھندلے جس کے کناروں پر سنہری کام کیا ہوا تھا۔ آگے کی طرف دونوں کندھوں پر بڑے
 اسٹائلش انداز میں سیٹ کر رکھا تھا۔ سیٹ کیے ہوئے بال کندھوں پر آگے آ رہے تھے جن سے کانوں میں ڈالے
 ہوئے بڑے بڑے جھمکے جھانک رہے تھے۔ اس نے میک اپ بھی بہت نفاست سے کر رکھا تھا اور بلاشبہ خوب
 صورت بھی بہت لگ رہی تھی۔ لب اسٹک کو فاسٹ لیچ دے کر اس نے شیشے میں خود پر تفصیلی نظر ڈالی پھر اپنی
 تیاری سے مطمئن ہو کر خود کو اوکے کا سگنل دیا اور پہلی بار پوری سنجیدگی سے ثمنینہ کی طرف متوجہ ہوئی۔
 ”اب بتائیں۔ آپ مجھ سے چاہتی کیا ہیں؟“

”فیضان کی کال آئے تو تم اینڈ مت کرتا۔“
 ”اس سے کیا ہوگا؟“

”فیضان مایوس ہو کر دوبارہ رابطہ نہیں کرے گا۔“
 ”اور اگر وہ حویلی آگئے تو۔۔“
 ”ایسا نہیں ہوگا۔“

”فیضان ماما آج پیدا ہوئے ہیں یا آپ؟“
 ”اس۔ مطلب؟“

”مطلب یہ کہ فیضان ماما کے بارے میں آپ ایسا دعوات کریں جب آپ انہیں جانتی نہ ہوں۔“ ماویٰ نے
 کہا۔ ”آپ اچھی طرح جانتی ہیں۔ میں ان کا فون ریسیو کروں یا نہ کروں اگر انہیں میرے بارے میں علم ہو گیا ہے
 تو وہ مجھ تک پہنچنے کے ضرور۔“

”تو اب میں کیا کروں؟“ ثمنینہ نے پریشانی سے کہا۔

”میں نے پہلے بھی کہا تھا۔ آپ کو کیا کرنا ہے اور کیا نہیں یہ سوچنا آپ کا کام ہے۔“
 ”ماویٰ! تمہارے پاس بلو آئی لائنز ہے؟“ اچانک پیچھے سے آکر نمل نے پوچھا تھا۔ ماویٰ نے ذرا سا چوکتے
 ہوئے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا پھر ڈرنگ رومنگ روم سے آئی لائنز اٹھا کر اس کی طرف بڑھا دیا اور مزید آواز دہمی
 کر کے بولی۔

”آپ کو پہلے ہی فیضان ماما کو طریقے سے ہینڈل کرنا چاہیے تھا۔ اب جب کہ تیر کمان سے نکل چکا ہے تو میرا
 نہیں خیال کہ ہم فیضان ماما کو ان کے ارادے سے باز رکھنے کے لیے کچھ کر سکتے ہیں۔ وہ جو کر رہے ہیں انہیں
 کرنے دیں۔ ویسے بھی میرا خیال ہے۔ آج رات تک مجھے کچھ نہ کچھ معلومات مل ہی جائیں گی۔“
 ”واقعی؟“ ثمنینہ یکدم رجوش ہوئی تھیں۔

”جی بالکل۔ لیکن ابھی میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتی۔ لیکن جیسے ہی کچھ پتا چلا میں آپ کو بتاؤں گی
 ضرور۔ آپ بس دعا کریں فیضان ماما کے مجھ تک پہنچنے سے پہلے مجھے مطلوبہ معلومات مل جائیں۔“
 ”خدا کرے ایسا ہی ہو۔“ ثمنینہ نے صدق دل سے کہا۔ پھر کچھ خیال آنے پر پوچھنے لگیں۔ ”جلال کیسا ہے؟“

”ٹھیک ہے۔ معصوم آدمی۔“

”ماویٰ! تم فیضان کے سامنے بات سنبھال لو گی ناں؟“ ثمنینہ نے بڑی آس سے پوچھا تھا۔

ماویٰ نے بیڑاری سے گہری سانس بھری۔

”آپ کی ہر پلاننگ ادھوری کیوں ہوتی ہے می! مجھے حویلی بھجواتے ہوئے بھی آپ کی پلاننگ ادھمی تھی۔
 باقی معاملات سنبھالنے کے لیے آپ نے مجھے تنہا چھوڑ دیا اور اب فیضان ماما کے معاملے میں بھی آپ کی
 اسٹوڈنسی کی رہی۔ کل کو آپ کہیں گی کوئی مشکل آجائے تو بھی اسے تنہا سنبھال لو۔“
 ”ماویٰ! تم مجھے ہمیشہ غلط سمجھتی ہو۔ جبکہ میں۔۔“ ثمنینہ نے کہنا چاہا۔

”اور فار گاڈ سیک۔ اب وہی پچھلا چھٹو کھول کے مت بیٹھیں۔“ ماویٰ نے بیڑاری سے کہا۔ ”اور فیضان ماما
 جو کرتے ہیں انہیں کرنے دیں۔ دیکھا جائے گا جو ہوگا اور میں فون بند کر رہی ہوں۔ اب مزید بات نہیں کر سکتی۔“

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام آپکو تمام ڈائجسٹ

ڈائریکٹ ڈاؤنلوڈنگ لنک کے ساتھ

ڈاؤنلوڈ کرنے کی سہولت دیتا ہے

آج ہی وزٹ کریں

www.paksociety.com

دیے بھی فنکشن اشارت ہونے والا ہے نمل اور تحریرہ بھابھی کئی بار بلانے آچکی ہیں۔ ٹیک کیئر آف یور سلف۔ اللہ حافظ۔“

تیسرے مزید کچھ بات کرنا چاہتی تھیں لیکن ماویٰ نے فون بند کر دیا تھا۔

رسم کا اہتمام حویلی کے مرکزی لان میں کیا گیا تھا، ماویٰ جان بوجھ کر لڑکیوں سے ذرا پیچھے پیچھے رہی تاکہ کسی کی نظروں میں آئے بغیر تسنیم کے کمرے کے عین مطابق حویلی کے عقبی حصے میں جاسکے۔ لیکن اپنی احتیاط کے باوجود اس کی موجودگی کو بہت سے لوگوں نے نوٹ کر لیا تھا۔

گوکہ سب نے ہی اسے سراہا تھا لیکن تنویر نے بطور خاص اس کی بہت تعریف کی تھی۔ اگر اسے باقی سب کی پروا نہ ہوتی تو اب تک یقیناً ”ماویٰ اور جلال کو ساتھ ساتھ کھڑا کر کے بھی دیکھ چکی ہوتی کہ ان کی جوڑی کیسی نکلتی ہے۔ وہ تو مصروفیت زیادہ ہونے کی بنا پر باویٰ سے پوچھ نہ پاری تھی ورنہ شوق کا تو وہ عالم تھا کہ بس حد نہیں۔ جنت بیگم نے البتہ اس پر سرسری سی خشکیاں نظروں سے ڈالی تھیں۔

ماویٰ کی نظریں مستقل تسنیم کے تعاقب میں لگی ہوئی تھیں۔ تسنیم بھی آتے جاتے اس پر نظر رکھے ہوئے تھی۔ جس وقت حرم کے سسرال والے مندی لے کر آئے، مہمانوں کی آمد کی وجہ سے تسنیم کو وہاں سے نکلنے کا موقع مل گیا۔ اس نے کھسکنے سے پہلے ماویٰ کو اشارہ کر دیا تھا۔ ماویٰ نے کچھ دیر سب کی نظریں خود سے ہٹنے کا انتظار کیا پھر نظر بچا کر سب کے درمیان سے نکل آئی۔

حویلی کے مرکزی حصے کے برعکس عقبی حصہ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ عجیب سی وحشت محسوس ہوتی تھی۔ ماویٰ اپنی آنکھوں کو اس اندھیرے سے مانوس کرنے کی کوشش کرتی اپنے غرارے کو دونوں سے ہاتھوں سے مگر بڑے بے ڈھب طریقے ذرا سا اوپر اٹھائے احتیاط سے آگے بڑھ رہی تھی۔ یہ لباس عالیہ نے اس کے لیے بنوایا تھا

اور اسے یہ روایتی سالباں پسند بھی آیا تھا۔ ایسا لباس پہننے کا اس کا پہلا تجربہ تھا اور وہ اس تجربے سے لطف اندوز بھی ہو رہی تھی لیکن ان سب باتوں کے باوجود اسے چلنے پھرنے میں بھی اچھی خاصی وقت کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ اس سے قبل کہ وہ مایوس ہو کر واپس پلٹی تسنیم دا دروازے سے نکلتی زرد روشنی نے اسے متوجہ کر لیا۔ اندھیرے میں جگنو کے مترادف تھی یہ روشنی۔ وہ تیزی سے اس طرف بڑھی۔ دروازے پر انگلیوں کا ذرا سا دباؤ ڈالتے ہی دروازہ کھلتا چلا گیا تھا۔ ماویٰ نے اندر داخل ہو کر جلدی سے دروازہ بند کر دیا تھا۔

”شکر ہے تسنیم! تم نے لائٹ جلا دی ورنہ اتنے اندھیرے میں تو میں کسی دیوار کو ہی ٹکمارنے لگی تھی۔“ حسب عادت تیز تیز بولتی وہ جوں ہی پلٹی۔ تسنیم کی جگہ خود سے محض چند قدم کے فاصلے پر کھڑے ڈھانچہ نما وجود کو دیکھ کر بری طرح ڈر گئی اور اٹل قدموں بند دروازے سے جا لگی۔ وہ جو کوئی بھی تھا بے حد ضعیف اور بد قوت تھا اس کی بڑی بڑی آنکھیں کمزور جلد سے باہر ابلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ وہ ٹکٹکی باندھے ماویٰ کو دیکھ رہا تھا۔ اپنی تمام تر طراری کے باوجود ماویٰ کو اس سے بری طرح خوف محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے چاہا کہ چیخ کر تسنیم کو آواز دے لیکن قوت گویائی نے اس کا ساتھ دینا بند کر دیا تھا۔

(باقی آئندہ ماواں شاء اللہ)



صاحب سمجھتا نذیراں کی کبھی بھی اس سے نہ ہوتی تھی۔
پھاتیں نے جلدی سے دوڑ کر بجو کو اٹھایا۔
”بجواٹھ چھوڑا! نذیراں پتا نہیں کہاں چلی گئی۔“
بجو ہڑبڑا کر اٹھا۔ پہلے گھر میں دیکھا، پھر باہر بھاگا۔
کچی پگڈنڈی پر زنانہ مردانہ جوتوں اور موٹر سائیکل کے
نشانات واضح تھے۔
”چھوڑی بھاگ گئی۔“ آنا ”فانا“ خبر دور دور تک
پھیل گئی۔ پھاتیں کا بیٹا، بجو اور نذیراں کا منگیتا ہر جگہ پتا
کرتے پھرتے تھے۔ تھانے میں جا کر انگوٹھی رپورٹ
درج کروا آئے۔ صبح سے شام ہو گئی۔ نذیراں نہ ملی۔
”آخر وہ گئی کہاں؟ کس کے ساتھ؟ کچھ تو اتنا پتا
رکھتیں تھیں۔“
جیلہ کو غصہ آیا تو پھاتیں پر برس پڑی۔
”میں نے چند بار حمزہ کے پیچھے عزیز کے ساتھ اسے
بات کرتے دیکھا تھا، پھر اس کے باہر نکلنے پر پابندی لگا
دی۔ پھاتیں نے مری ہوئی آواز میں بتایا۔



اس نے بجو کے لیے مانگ لی تھی اور نذیراں کا رشتہ
جیلہ کے بیٹے شمن کو دے رکھا تھا۔

پھاتیں کا ایک ہی بیٹا تھا جو بیوی بچوں کے ساتھ
الگ گھر میں رہتا تھا۔ پھاتیں کو نذیراں اور شمن کی
شادی کا انتظار تھا۔ یہ بوجھ اتارنے کے بعد وہ بیٹے کے
گھر چلی جاتی۔

اس بار بجو نے وعدہ کیا تھا کہ جیسے ہی فصل آئے گی
وہ اپنی اور بن نذیراں کی شادی انٹھی کرے گا۔ ان
کے ماں باپ تو بچپن میں ہی فوت ہو گئے تھے۔ پھر
پھاتیں ہی نے ان کی پرورش کی۔ پھاتیں کے شوہر
رمضان نے بھی کبھی ان کو غیر نہ جانا۔ نہ ہی ان کی چار
ایکڑ زمین کو بخر بننے دیا۔

اپنی زمین کے ساتھ ان کی زمین کی فصل بھی آتی تو
گھر میں خوشحالی آ جاتی۔

مگر پھر نہ جانے کس کی نظر ان کو کھا گئی۔ اک دن
رمضان زمین پر گیا تو وہاں پانی کی باری پر حمزہ سے اس
کی لڑائی ہو گئی۔ حمزہ نے کھلاڑی سے وار کیا تو رمضان
کا سر پھٹ گیا۔

رمضان جانبر نہ ہو سکا اور پھاتیں بڑھ ہو گئی۔ حمزہ کو
سات سال جیل ہو گئی اور پھاتیں کا بیٹا اور بجو مل کر
زمین کاشت کرنے لگے۔

وقت گزر رہا تھا۔ پھاتیں کے بیٹے نے شادی کر لی۔
پھر علیحدہ گھر بنا کر رہنے لگا۔ اب پھاتیں کو رات دن بجو
اور نذیراں کی شادی کی فکر تھی۔ جیلہ کا بیٹا شمن قریبی
شوگر مل میں ملازم تھا۔ نذیراں سے تیرہ چودہ سال عمر
میں بڑا تھا۔ کاشن کے کپڑے پہن کر وہ خود کو لاث

”یہ نذیراں کہاں چلی گئی؟“
صبح جب نیند سے اٹھی۔ نیم کی مسواک سے فارغ
ہو کر وہ نذیراں کو اٹھانے واپس گھر پر آئی تو نذیراں کی
خالی چارپائی دیکھ کر اک لمحے کو خاموش رہ گئی۔ چھوٹا سا
گھر تھا، کیس چھپ تو نہیں سکتی تھی۔

اندر کمرے میں باورچی خانے میں حتیٰ کہ بھینسوں
کے باڑے میں بھی دیکھ آئی کہ کیس بھینس دوہنے تو
نہیں گئی۔

باتھ روم سے تو وہ خود نکلی تھی۔ گھر کے صحن میں
لگے ٹکے سے منہ دھو کر پھر نذیراں کو اٹھانے آئی تاکہ وہ
ناشتا بنائے۔

چائے کا پانی چڑھا کر نذیراں آنا گوندھتی۔ چائے بن
جاتی تو آگ سے جلنے کو ٹکے نکال کر چولہے کے باہر
چائے کی ہڈیاں پر رکھتی تاکہ چائے گرم رہے۔ پھر
خود چولہے پر تو اچھا کر روٹیاں ڈالتی جاتی۔

پھاتیں پیالے دھو کر لکڑی کی چوکی پر آ بیٹھتی۔ جو
بھی اٹھتا جاتا، اسے چائے کے پیالے بھر بھر کر دیتی
رہتی اور وہ گرم گرم پائے اتار کر ان کو دیتی۔ ناشتے
کے بعد وہ گھاس کا ٹکڑا باندھنے والا کپڑا اٹھاتی اور
بھینس کے لیے چارہ کاٹنے کے لیے چلی جاتی۔

بجو زمین پر چلا جاتا۔
نذیراں واپس آکر برتن باغیچتی جھاڑو دیتی، لسی بناتی
پھر وہ ہر کے کھانے کی تیاری کر لیتی۔

ان کی زندگی اسی ڈگر پہ رواں تھی۔ گھر کے وہ تین
افراد اپنی زندگی سے مطمئن تھے۔ خوش تھے۔ بھتیجا اور
بھتیجی میں پھاتیں کی جان تھی۔ اپنی بن جیلہ کی بیٹی

”کیا۔ کیا عزیز کے ساتھ۔۔۔؟ اسے شرم نہ آئی ان سے تو ہماری برادری بھی نہ تھی۔“ شمن نے مدد سے کہا۔
 ”اگر مجھے پتا چل جاتا تو اس کمینی کو وہیں مار دیتا۔“
 مجھ نے طیش سے کہا۔
 ”ارے! تب ہی تو نہیں بتایا۔“ پھاتیں روتے ہوئے بولی۔
 ”مگر کیا پتا تھا کہ وہ منہ پر کالک مل کر چلی جائے گی۔ ہمیں تو جیتے جی مار گئی کلموٹی۔“ پھاتیں منہ پر دو ہتھار کے بین کرتی رہی۔ ان کے دلوں میں آگ بجڑک اٹھی۔
 ”آدھی مارا۔ اب گھر سے چھوڑی اٹھا کر لے گئے۔“

رات دن دھڑ دھوپ میں کھتے۔ بھینسیں پیچیں قرضہ لیا۔ کوئی دوڑیرا چھوڑا نہ پولیس نہ عدالت۔
 پر نذیراں واپس نہ ملی۔ الٹا اخبار میں دھیان طلب نوٹس آیا۔
 جس میں نذیراں نے کہا کہ نہ کسی نے اس کے ساتھ زبردستی کی ہے نہ اسے اغوا کیا گیا ہے۔ اس نے اپنی رضو خوشی سے عزیز سے نکاح کیا ہے۔ اب اپنے گھر والوں سے اسے اور عزیز کو جان کا خطرہ ہے۔
 ڈی ایس پی صاحب سے گزارش ہے کہ ان کی حفاظت کی جائے اور اس کا یہ بیان ریکارڈ پر رکھا جائے۔
 نذیراں کے اس بیان کے بعد وہ بظاہر خاموش ہو کر بیٹھ گئے، مگر اندر ہی اندر کچھڑی پکتی رہی۔ نذیراں کو مارنے یا واپس حاصل کرنے کے منصوبے بنتے رہے۔
 چار ماہ بعد پتا چلا کہ نذیراں اسی علاقے میں آگئی ہے، جہاں عزیز کا گھر تھا۔ حمزہ بھی جیل کاٹ کر آیا تھا۔ وہ کھلے عام کہتا۔
 ”میں نے جان بوجھ کر رمضان کو قتل تھوڑی کیا تھا۔ جھگڑے میں لانا بھی کھڑی تو چلتی ہی ہے۔ اب وہ مر گیا تو میری خطا تھوڑی تھی، پھر بھی ہم نے معافیاں مانگیں، خون بہا دینے کو کہا، مگر وہ لوگ نہ مانے اور مجھے سزا گوارا کی ہی رہے۔ اب میرے بھتیجے نے میرا بدلہ لے لیا۔ ان دونوں نے نکاح کیا ہے۔ محبت کی ہے۔“

کوئی جرم تھوڑی کیا ہے۔ ایسی خبریں سن کر اور آگ لگا دیتیں۔ شمن، محرم اور مجھ۔ بندوقیں تان کر کھڑے ہو جاتے۔
 مگر پھاتیں اور جیلہ ان کے پاؤں پڑ جاتیں سنتیں کرتیں۔
 ”کیوں اپنی جوانیاں اس کمینی چھوڑی کے پیچھے بریلو کرتے ہو؟“
 ”اہں! تم لوگ ہمیں بزدل، بے غیرت بنا کر رکھنا چاہتی ہو۔“ محرم کو غصہ آتا۔
 ”بیٹا! کلام ایسے کرو کہ ہاری ہوئی بازی بھی جیت جاؤ۔ موقع کا انتظار کرو اس طرح خود کو بریلو کرنے سے کیا حاصل؟“

نذیراں کو پہلے تو سب نے سر آنگھوں پر بٹھایا، لیکن کچھ عرصہ گزرا تو وہ بے تبدیل ہونے لگے۔ گھر کے کام کا سارا بوجھ اس پر آگیا۔ کلام کی تو خیر تھی۔ عزیز کے لیے وہ جان بھی دینے کو تیار تھی، مگر جو ساس اور نندیں طعنوں کی مار مار تیں تو نذیراں کا سراپہ بنی کیے پر شرم سے جھک جاتا۔
 وہ بار بار کہتیں۔ ”فتح ہماری، جیت ہماری۔ پہلے ان کا قتل کیا، پھر لڑکی بھگالی۔ ارے! ایسے غیرت مند ہوتے تو چلو بھرائی میں ڈوب مرتے۔“
 ہر آئے گئے کے سامنے ذکر کیا جاتا۔ ٹھنڈے لگائے جاتے نذیراں کو اپنے کیے پر پشیمانی ہونے لگی تھی۔ مگر پھر اچانک اس کی طبیعت خراب ہو گئی۔ اسے الٹیاں آنے لگیں۔ ساس نے سارے میں خبر پھیلا دی۔
 ”اب ان کی لڑکی ہمارا وارث پیدا کرے گی۔“
 یہ خبر پھاتیں کو بھی پہنچی۔ وہ بے چین ہو گئی۔ محلے کی چند کشنیوں کے پلو میں بیٹھے باندھ کر ڈیوٹی لگا دی نذیراں جیسے ہی گھر سے باہر نکلے، مجھے اطلاع دینا۔
 نذیراں کا برا حال تھا۔ بخار، الٹیاں طبیعت سنبھلنے کا نام ہی نہ لیتی۔ سو ماہ گزر گئے۔ کھانا پینا بھی حرام۔

مارے ڈر کے وہ اسے ڈاکٹر کے پاس بھی لے جانے سے گریزاں تھے۔ کیا پتا راستے میں وہ آکر ان کو مار جائیں، مگر نذیراں کی بگڑتی حالت کو دیکھ کر عزیز سے رہا نہ گیا۔ شلواریں میں پستول اڑسا اور نذیراں کو موٹر سائیکل پر بٹھا کر شہر لے گیا۔ راستہ خیریت سے کٹا۔ ڈاکٹر صاحبہ نے ڈرپ چڑھائی۔ انجکشن لگایا اور دو ایسوں کا نسخہ تھما دیا۔
 وہ نذیراں کو لے کر ابھی گاؤں کے راستے پر آیا ہی تھا کہ سامنے سے آنے والی گاڑی نے ان کا راستہ روکا۔ کچی پگڈنڈی پہ دونوں طرف کھیت تھیں۔ وہ چاہنے کے باوجود موٹر سائیکل سائڈ سے نکل نہ پایا۔ شمن اور مجھ بندوقیں تانے گاڑی سے باہر نکلے اسے شلواریں میں اڑسا پستول کو نکالنے کا موقع مل ہی نہ سکا۔
 نذیراں موٹر سائیکل سے اتر کر ان کے سامنے کھڑی ہو گئی۔
 ”خدا کے لیے عزیز کو نہ مارو۔ میں چلتی ہوں تمہارے ساتھ۔“
 اس نے شمن کے ہاتھ سے بندوق چھیننے کی کوشش کی۔ مجھ نے اسے بانو سے پکڑا۔ دونوں کی توجہ نذیراں کی طرف تھی۔ اسی لمحے عزیز نے گنے کے کھیت میں چھلانگ لگا دی اور فوراً نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ انہوں نے نذیراں کو گھسیٹ کر گاڑی میں ڈالنا اور عزیز کو گالیاں دینے لگے، جو ان کے ہاتھوں سے بچ نکلا تھا۔
 نذیراں کو وہ دوسرے گاؤں میں دھڑرے کے گھر چھوڑ گئے۔ پھاتیں وہاں پہلے سے موجود تھیں۔
 اس نے جی بھر کے نذیراں کو لعن طعن کی، برا بھلا کہا۔ دھڑرے کی بہن نے اسے سمجھایا۔
 ”دیکھو! تمہارا برا بھلا کہنے سے لڑکی تمہاری نہیں ہو گی۔ عدالت میں تمہارے خلاف بیان دے دے گی تو کیا کرو گے؟ عقل سے کام لو۔“
 بات پھاتیں کی سمجھ میں آگئی۔ اب اس نے مظلومیت کا چولا پہن کر محبت کا جالود جگایا۔

محبت تو بڑے بڑے بیوں کو بے وقوف بنا دیتی ہے۔ وہ تو نذیراں تھی۔ پھاتیں کی گودوں پٹی۔ پھاتیں کی محبت اس سے ڈھکی چھپی بھی نہیں تھی۔
 یہ حقیقت تھی کہ پھاتیں نے اسے محبت سے پالا تھا۔ اس کو سگی ماں کے نہ ہونے کا احساس کبھی بھی نہیں ہوا۔
 کتنے ہی دن پھاتیں اسے سمجھاتی رہی۔ اپنی محبت کا رشتے کا احساس دلاتی رہتی۔
 ”دیکھ نذیراں! تو ہماری ہے۔ ہماری بہن۔ عدالت میں ہمارے حق میں بیان دے۔ ارے بیٹا! وہ عزیز والے ہمارے قاتل ہیں۔ وہ تیرے بچن نہیں بن سکتے۔“
 ”ٹھیک ہے! میں آپ لوگوں کے حق میں بیان دوں گی۔ ان کے ساتھ نہیں جاؤں گی، مگر نہ تو عزیز سے طلاق لوں گی نہ ہی شمن سے شادی کروں گی۔“
 نذیراں پھاتیں کی محبت بھری باتوں سے متاثر ہو کر رضامند ہو گئی۔
 ”ارے! وہ لوگ دشمن ہیں۔ ہمارے دشمن۔“
 پھاتیں دانت پیس کر کہتی۔
 ”طلاق تو پھر بھی نہیں لوں گی۔“ نذیراں اس بے پروائی سے سرنفی میں ہلا کر کہتی۔ پھاتیں سر پیٹ لیتی۔
 شمن فون پر پوچھتا۔
 ”ماسی! نذیراں ہالی کہ نہیں؟“
 وہ کوئی کوتاہی نہ دیتی، جہاں نذیراں نہ سن سکے۔
 ”کیا کروں شمن! چھوڑی مانتی ہی نہیں۔ تیرے ساتھ شادی کرنے پر تو قدم ہی نہیں جماتی۔ صاف انکاری بنی کھڑی ہے۔“
 ”ماسی! اس کا علاج جوتا ہے جوتا۔ لے آئے۔ دیکھتا ہوں کیسے نہیں مانتی۔“ شمن تھماتا۔
 بس کر شمن! تجھے بھی لاکھ کہا، سمجھایا کہ برائی عورتوں کو نہ تاز۔ اپنی تنگ کا دل جیت، مگر تو نے تو ایک نہ مانی۔“ پھاتیں نے جلع دل کے پھپھو لے پھوڑے۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام آپکو تمام ڈائجسٹ

ڈائریکٹ ڈاؤنلوڈنگ لنک کے ساتھ

ڈاؤنلوڈ کرنے کی سہولت دیتا ہے

آج ہی وزٹ کریں

www.paksociety.com

”ارے ماسی! مجھے کیا پتا تھا کہ وہ عزیز کے ساتھ اندر ہی اندر چکر چلا رہی ہے۔ سوچا یہ تو آگے پیچھے میری ہی میری ہے۔“

”ہاں! یہ تو ہے۔ ہمیں تو کانوں کان خبر تک نہ ہوئی۔ پتا تب چلا جب پانی سردوں سے اونچا ہو گیا۔“

پھانسل نے کچھ رنج سے کہا۔

”ارے ماسی! عزت کا جنازہ نکال دیا اس نے۔“

شمن کو ایک بار پھر غصہ آیا۔ ”کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا بد بخت نے۔“

”اچھا! چھوڑو جو ہوتا تھا ہو گیا۔ اپنا جی کیوں جلا رہا ہے۔ بس اب کوئی تدبیر سوچ جس سے نذیراں ہمیشہ کے لیے اسیں بھول جائے۔“

نذیراں اسے فون پر چپکے چپکے باتیں کرتے دیکھ کر کڑھتی۔

”پتا نہیں کیا سازشیں کرتی رہتی ہے جو چھپ کر فون پر باتیں کرتی ہے۔“

وہ بریداتی۔ برآمدے میں بیٹھی بی بی سے کہتی۔

”دیکھ لینا! آپ کے گھر سے لے جا کر یہ لوگ مجھے مار دیں گے۔“

”ہمیں نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ تم ہماری پناہ میں ہو تمہارے گھر والے تمہیں ہرگز نہیں مار سکتے۔ میرا بھائی تمہیں ایسے تھوڑی ان کے حوالے کرے گا۔ پہلے تمہاری برادری یا وڈیرے کو بطور ضامن ڈالے گا کہ لڑکی کا بابل بھی بیکا نہیں ہو گا۔ پھر بھی تم اپنی رضا مندی سے ہی جاؤ گی۔“ بی بی اسے سمجھاتی دلاسا دیتی۔

نذیراں کے دل کو کچھ ڈھارس ملتی۔

”چھاتم لوگوں کی تو ان سے دشمنی تھی۔ آتا جانا ہی نہیں تھا پھر عزیز سے کہاں ملیں؟“ بی بی نے حیرت سے پوچھا۔

نذیراں کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔ محبت کے رنگ اس کے سانولے چہرے پر بکھر گئے۔

”میں بھینس کے لیے چارہ کاٹنے جاتی تھی۔ وہیں عزیز بھی اپنی بھینسوں کا چارہ کاٹنے آ جاتا تھا۔“ نذیراں

نے ماضی کے تصور میں گم ہو کر بتایا۔

”تم چارہ کاٹنے کیوں جاتی تھیں؟ تمہارا بھائی کیوں نہیں؟“ بی بی نے حیران ہو کر پوچھا۔

”اسے اپنے دوستوں میں بیٹھ کر پتس لڑانے سے فرصت ملتی تو کام کرتا تھا۔ سارا کام ہم کرتے تھے۔“

نذیراں جل کے بولی۔

بی بی نے اثبات میں سر ہلایا۔ بات اس کی سمجھ میں آگئی تھی۔ یہ معاشرتی ایسہ ہے۔ لوگ فارغ بیٹھ کر فضول گفتگو کرتے اور ان کی عورتیں پچاریاں گھر کا کام بھی کرتی اور باہر زمینوں کا بھی۔

”تم لوگوں کی بول چال بند تھی۔ پھر کیسے عزیز نے اظہار کیا؟“

”صل میں ایک بار مجھے بخار تھا۔ اس دن بھی میرا بھائی نہیں گیا۔ ناچار مجھے ہی جانا پڑا۔ چلی تو کئی ٹکڑ سو رنج چڑھ آیا تھا۔ سو ہانتی ہوئی بڑی گھنی چھاؤں میں بیٹھ گئی۔ عزیز نے یہ دیکھا تو اپنی زمین سے چارہ کاٹ کر گٹھا میرے سامنے رکھ گیا۔ ہاتھ کے اشارے سے لے جانے کو کہا۔ میں نے غنیمت جانا اٹھا کر لے آئی۔ چند دن وہ اسی طرح کرتا رہا۔ پھر ماسی پھانسل کو کچھ شک پڑا۔ اس نے پوچھا تو میں صاف مکر گئی۔“

”اسے شک کیسے پڑا؟“ بی بی نے حیران ہو کر پوچھا۔

”اس نے ایک بار عزیز کو گھاس کا گٹھا ہمارے کھیت میں پھینکتے دیکھ لیا تھا۔“

”مگر تم لوگوں کو محبت کیسے ہوئی؟“ اس کی سوئی ابھی تک اسی بات پر اٹکی ہوئی تھی۔

”بس بی بی! محبت کا تو مجھے پتا نہیں، لیکن اس کی ہمدردی اور خیال نے دل جیت لیا۔ آج تک کسی نے اتنا خیال کب کیا تھا۔ ہاں! ایک بار عزیز نے مجھ سے کہا تھا۔“ نذیراں جس دن تم نہیں آئیں۔ میرا دن نہیں کھٹتا۔“ پھر نہ جانے کیا ہوا کہ میرا بھی دن اس کے بن نہیں کھٹتا تھا۔“

دن گزرتے گئے اور اسے وہ مہینے حویلی میں گزر

گئے۔ فیصلے کی کوئی صورت نہیں نکلتی تھی۔ بیچ میں سردار آگیا۔

بھائی نے شرط رکھ دی۔ ”مگر عزیز اپنی بہن کا رشتہ بدلے میں دشمن کے لیے دے تو ہم نذیراں عزیز کے حوالے کر سکتے ہیں۔“

”یہ کیا کہیے ہو سکتا ہے۔“ عزیز تو سن کر ہی بھڑک اٹھا۔ ”میں اپنی محبت کی خاطر اپنی بہن کو زندہ درگور کر دوں تاکہ وہ اسے سکا سکا کر مار دیں، نذیراں کی شادی کا بدلہ بھی لے لیں اور حمزہ نے چاچا کو قتل کیا تھا۔ اس کا حساب بھی پورا کر لیں۔“

”پھر تم دستبردار ہو جاؤ اپنی بیوی سے۔“ برادری کے سردار نے فیصلہ سنایا۔

”ٹھیک ہے! نذیراں میری بیوی ضرور ہے۔ لیکن میں اس کے لیے اپنی بہن کو قربان نہیں کر سکتا ویسے بھی معاملہ کورٹ میں ہے۔ نذیراں کو مجھ سے محبت ہے تو وہ کورٹ میں بیان دے دے اور اپنا گھر بسائے اگر اس کی خوشی ہے۔“

عزیز کے اس رویے کا جب نذیراں کو پتا چلا تو اسے بے حد دکھ ہوا۔ جی بھر کے روئی۔ اسے عزیز سے یہ توقع نہ تھی۔ اسے پورا پورا یقین تھا کہ عزیز اسے حاصل کرنے کے لیے بدلے میں بہن کا رشتہ دے گا۔ اس کے دل میں پہلی بار عزیز کے خلاف میل آیا۔ گھر میں سب عورتیں اسے سمجھاتیں۔

”دیکھ نذیراں! عزیز جھوٹا تھا و غایب۔ صرف تیرے بھائی کی عزت یلیا میٹ کرنا چاہتا تھا تب ہی تو صلح کی بات نہ کی۔ تجھے اس نے بہت سستا سمجھا تھا۔ اپنی بہن کو بہت اونچی شے سمجھتا ہے۔ کیوں ایسے بے وفا شخص کے پیچھے اپنی اور اپنے گھر والوں کی عزت برباد کر رہی ہے؟“

بات کچھ کچھ نذیراں کی سمجھ میں بھی آگئی۔ پہلی بار وہ دل سے راضی ہوئی۔ کمراعدالت میں نذیراں نے کہا۔

”میں واپس اپنے بھائی کے پاس جانا چاہتی ہوں اور مجھے عزیز سے طلاق چاہیے۔“

مگر اسی وقت عزیز کے وکیل کی دلیل نے کیس کا پانسہ پلٹ دیا۔ اس نے کہا کہ ”طلاق تب تک نہیں ہو سکتی جب تک نذیراں بچے کو جنم نہ دے دے۔“

بیچ نے ایک ماہ کے لیے پیشی ملتوی کرتے ہوئے نذیراں کی میڈیکل رپورٹ مانگی۔

گھر آکر نذیراں کی شامت آگئی۔

”ان چکروں میں تو میں یہ بات بھول ہی گئی تھی۔ بھوری! تو بھی چھپائے بیٹھی رہی۔“ بھائی بگڑی۔

”مامی! یہ بات چھپانے والی تھوڑی ہے، جو میں چھپاتی۔ تم لوگ ہی بیوقوف ہو جو سمجھ نہ سکتے۔“

”لو اب قاتلوں اور دشمنوں کا بچہ ہمارے گھر میں بیٹے گا۔ ایسا تو ہرگز نہیں ہو گا۔“ بھائی کے سر پہ لگی تلکوں پر ہنسی۔

نذیراں شیرینی کی طرح بھڑکی۔

”دیکھ مامی! میرے بچے کا نام بھی نہ لیتا۔“ وہ دھمکی آمیز انداز میں بولی۔ ”میرا بچہ ناجائز نہیں ہے۔ اسی کے سارے زندگی گزار لوں گی۔ ارے مامی! اسی کے آسرے رہ تو عزیز سے طلاق لے رہی ہوں کہ کم از کم اب میں اکیلی نہیں رہوں گی۔ ساتھ میں اپنا بچہ ہو گا۔“

بھائی نے نچنے پھلا کر نفی میں سر ہلاتی رہی۔ گھر میں کچھڑی پکڑنے لگی۔ دشمن، مجھ سب اپنی غیرت کے بلوں سے بلبلا کے نکل آئے۔

”اس خبیث کا بچہ ہمارے گھر میں پیدا ہو گا۔ ہم کھلا پلا کر اسے جوان کریں گے۔ دیکھ مامی! اس کا بندوبست کر دوں نہ بچے سمیت مار دوں گا اسے۔“ دشمن فہمے میں اڑے ہسپتال کو نکل کر طیش سے بولا۔

اور ایک صبح بھائی نے پکڑ کر اسے گاڑی میں بٹھایا اور ایک چھوٹے سے قصبے میں نرس کے حوالے کر دیا۔ وہ چیخی چلائی مگر اس کی ایک نہ سنی گئی۔ تین دن تک نرس اسے ڈرپ ڈرپ اور بالکل لگاؤ رکھتی رہی۔

درد کی لہر پورے جسم میں پھیلی چلی گئی۔ اک اک جوڑا کھڑکرائی جگہ سے ہٹ گیا۔ تب تڑپ تڑپ کر

اس نے جس بچے کو جنم دیا۔ وہ دنیا میں ایک سانس بھی نہ لے سکا۔ ساتواں مہینہ پورا ہونے کو تھا۔ وہ ننھا سا سپید وجود اس کی یادداشت میں گڑ گیا۔ ممتا تڑپ اٹھی وہ اسے ایک لمحے کو بھول نہ پاتی جب بھائی نے وہ ننھا وجود پرانے دوپٹے میں لپیٹ کر دشمن کے حوالے کیا تھا کہ جا کر دفن کر آئے۔

گھر آکر وہ ہرے درد سے تڑپتی رہی۔ اک جسمانی دو سرا قلبی۔

وہ ہر بات بھول گئی۔ بس اسے صرف اپنا بچہ یاد رہ گیا۔ وہ راتوں کو سونہ پاتی۔ ہیٹ کے اندر اس کے ہٹنے چلنے کا شٹھا سا احساس جما رہتا۔ اس کی ممتا تڑپ اٹھتی۔ تخلیق کا کرب اور لذت اور حوری وہ گئی۔ گود بھری مگر خالی رہ گئی۔

اس کے اندر دھواں بھرنے لگا۔ اس کی گود خالی تندور کی طرح دھکتی تھی جس میں وجود ایندھن بن کر جلتا۔ وہ جلتی کڑھتی رہتی۔ کسی کل چین نہ آتا۔

چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کی پوروں کا لمس اپنی آنکھوں پر محسوس کرتی۔ آنکھیں بند کرتی تو وہ ننھا وجود اس کے سامنے آ جاتا۔ اس کے گلابی لبوں کا میٹھا سا لمس اپنے سینے پر محسوس کرتی۔ اک گدگد سا احساس پورے وجود پر بیتکت۔ اس کی روح سرشار ہو جاتی۔ یہ سرشاری لگاتی ہوتی۔ آنکھیں کھولتی تو بد صورت حقیقت قریب آ جاتی۔ پینا ٹوٹ جاتا اور پورے وجود میں درد پھیل جاتا۔ وہ جو جنت پاؤں تلے تعمیر کرنے گئی۔ وہ گارا بن کر سیلاب میں بہہ گئی۔ اس کی اندھیری کھوکھ روشنی سے بھری تھی مگر پھر سے تاریک سار بن گئی۔

اسے۔ اسے تو اپنی تخلیق سے ہی محروم کر دیا گیا تھا۔ یہ غم کھائے جا رہا تھا۔ دکھ دلائے جا رہا تھا۔

عزیز نہ سہی عزیز کا بچہ تو ساتھ ہو گا۔ زندگی کا سفر کٹ ہی جائے گا اس بچے کے ساتھ ساتھ اپنے گھر والوں کی بات ملنی۔ عدالت میں دنیا کے سامنے ان کی بات رکھی مگر انہوں نے کیا کیا۔

حمزہ کے لیے ان کی غیرت نہ جاگی، جو پورے گاؤں

میں دندناتا پھرتا۔ میرے معصوم بچے نے ان کا کیا باگاڑا تھا جس کو دنیا میں اک سانس بھی نہ لینے دی۔ نذیراں اپنی اجڑی گود کو دیکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

اندر دشمن ہنس کر بھائی کو تیار ہاتھ۔

”اس پلید سے جان چھوٹ گئی ہماری ساسی! تم نے بہت اچھا کیا۔ کون پر اپنا گند پالتا۔ اچھا ہوا، ہیٹ سے ہی مر کر آیا۔“ نذیراں کے بدن میں درد کی لہر ویسے ہی ابھری جیسے مردہ بچے کو جنم دیتے وقت ابھری تھی۔

”اب پیر کو جو شنوائی ہوگی اس میں بچہ نہ ہونے کا میڈیکل سرٹیفکیٹ دکھاؤں گا۔ بس پھر نذیراں کو طلاق ہو جائے گی۔ سارے کس بل نکل دوں گا اس کے۔ جب آئے گی میری جوتی کی نوک کے نیچے۔“

نذیراں سے آگے کچھ نہ سنا گیا، مگر اس کے مردہ بچے کو گھٹیا الفاظ دنیا اس کی پروا نہ تھی۔ باہر ہو گیا۔

آج ہفتہ ہے۔ بیچ میں صرف اتوار تھا۔ نذیراں نے دو سو روپے اپنی پڑوسی لڑکی کو دیے کہ موبائل میں بیلنس ڈلوائے اور اسے موبائل پر بات کرنے دے لڑکی خوش ہو گئی کہ نذیراں وہ منٹ بہت کرے گی بلی کا بیلنس اس کو ملے گا۔

اس نے ہاتھ روم میں جا کر دو منٹ ہی بات کی۔ موبائل چھپا کر لڑکی کو دے دیا۔

اسی لڑکی نے رات کو نذیراں کو چپکے سے ایک پڑیالا کر دی۔ نذیراں نے اس پڑیالا میں سے پانچ سو کا نوٹ نکل کر لڑکی کو تھمایا اور کسی سے اس بات کا ذکر نہ کرنے کا وعدہ لے لیا۔ رات نشہ آور دودھ پی کر سب گہری نیند سوئے رہے۔ لمبی اور گہری نیند۔ اور نذیراں خود اپنی اجڑی گود کا انتقام لینے کو گھر کی چوکھٹ پار کر گئی۔

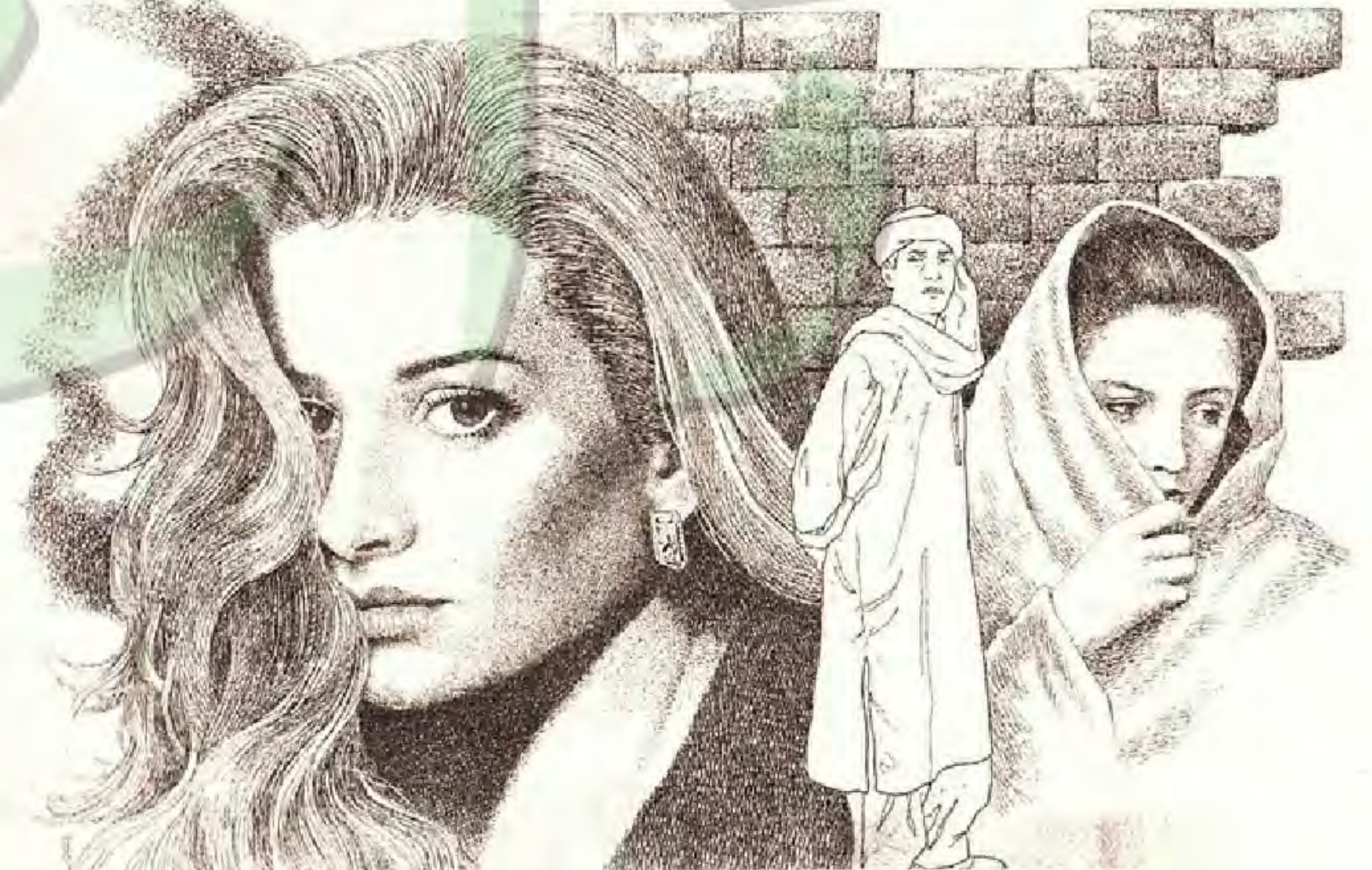
جہاں عزیز گاڑی لیے اس کا منتظر تھا۔



اکٹی سٹریٹ

سیف اللہ کاروبار کے سلسلے میں اکثر بیرون ملک جاتے رہتے تھے۔ وہ خیال کے دورے پر گئے تو واپسی پر میٹھا ان کے ساتھ تھی۔ وہ ان کے دوست کی بیٹی تھی۔ اس کے والدین کا ایک حادثے میں انتقال ہو گیا تو سیف اللہ اسے اپنے ساتھ لے آئے۔ سیف اللہ کی والدہ پر شکوہ خانم نے کھلے دل سے اس کا استقبال کیا مگر ان کی بیوی مرنے سے قبل نہ کیا۔ وہ ناراض ہو گئی اور دونوں بیٹیوں کو اپنی اور اپنی کو ساتھ لے کر سیکے چلی گئی۔ سیف اللہ نے اپنی بھیمتر کار کو چھوڑ کر مہرے پسند کی شادی کی تھی۔ وہ مہر کی جدائی میں راتوں کو جاگنے لگا۔ دو سال بعد اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کے انتقال پر مہر واپس آگئی مگر وہ میٹھا کو اس گھر سے نکال نہیں سکی کیونکہ وہ مکان پر شکوہ خانم کے نام تھا۔ اور وہ میٹھا کو اپنے ساتھ رکھنا چاہتی تھی۔ مرنے میٹھا کی تعلیم چھڑا دی۔ کیونکہ کاروبار مہر کے نام تھا۔ وہ میٹھا پر بیہ خرچ کرنا نہیں چاہتی تھی۔ پر شکوہ خانم میٹھا کو گھر ہی میں پڑھانے لگیں۔ اسیں میٹھا کے خوابوں سے ڈر لگتا تھا کیونکہ اس کے خواب پر اسرار ہوتے تھے اور اکثر سچے بھی ہوتے تھے۔

دوسری قسط



کودل بسلانے کے لیے سب ملے گا۔ اس علاقے کا سب سے مشہور میلہ۔ سالانہ میلہ۔

کئی سالوں سے رٹے رٹائے جملے دوہراتا آگے نکل گیا اور اپنے پیچھے چھوڑ گیا ان گنت دلوں میں بے شمار جوش و خروش۔

”اما! وہاں بہت سے فوڈ اسٹالز ہوں گے۔ چائے پانی پوری۔ سموے، جلیبی۔ میں سب کچھ کرائی کروں گی۔“

ایمی نے چٹکارہ بھرتے ہوئے کہا۔

”تمہیں تو کھانے کے علاوہ کچھ سوچنا ہی نہیں۔ میں تو وہاں خوب شاپنگ کروں گی۔ جیولری تو اتنی زیادہ لوں گی۔ میرے پاس رینگز کی کوئی شین دن بدن کم ہو رہی ہے اور ہاں اما۔ میں مندی بھی لگواؤں گی۔ اینڈین اسٹائل بھی لگے گا میں ہمیشہ کی طرح۔“

مہراں دونوں کا جوش و خروش دیکھ کے مسکرا دی۔

اس چھوٹے سے قصبے میں جہاں زندگی کی گہما گہما اور رونق نہیں نہ ہونے کے برابر تھیں اور جہاں ملنا ملانا بھی کم کم ہی تھا۔ عزیز و اقارب اور رشتے دار تو تھے نہیں۔ ایسے میں اس طرح کے میلے کی خبر سونے کے دھانوں۔ مہندہ برسنے کے برابر تھی۔

”تم لوگوں کا جودل چاہے کر لیتا۔ سال میں ایک ہی بار تو لگتا ہے یہ میلہ۔ میں بھی بنگلہ اسٹائل سے کچھ اچھی ساڑھیاں لے لوں گی۔“

یشا بیانو سے دھول جھاڑتے ہوئے یہیں کلن لگائے ہوئے تھی۔ پچھلے دو سال سے کسی نہ کسی وجہ سے وہ اس میلے میں شرکت کرنے سے محروم رہی تھی اب تو تین سال پہلے والا میلہ یادداشت سے گھوٹنے لگا تھا۔

”میں کون سا ڈریس پہنوں اما!“

”ابھی پچھلے مہینے تو تم نے اپنی دوست کی برتھ ڈے پارٹی کے لیے نئے کپڑے بنوائے تھے وہ پہن لیتا۔“

”مگر وہ مجھے ٹائٹ ہو گیا ہے۔“

یشا لکڑی کے سال خوردہ پھانک سے جھلکتی باہر جھانک رہی تھی اور چہرے پر وہی تہمتا ہٹ تھی جو بچپن سے ہی اس موقع پر اس کے گالوں سے جھلکنے لگتی تھی۔ جب بھی کسی اپنی سائیکل لیے اس بھورے پتھروں والی گلی سے گزرتا تھا اور اس کے ہر سال گزرنے کے یہی ایام ہوا کرتے تھے جب پوری گلی سفید پھولوں سے بھری ہوتی تھی اور ہر شاخ سیب اور خوبلی کے بوجھ سے جھکی ہوئی تھی۔

کئی کے چہرے پر چند جھروں کا اضافہ ہو گیا تھا مگر اس کی مسکراہٹ اب بھی اس کے ہر چہرے نقش سے پھولی پڑ رہی تھی۔ اس کا استخوانی وجود سائیکل دھکیلے آگے بڑھ رہا تھا۔ سائیکل کی رفتار جتنی ست تھی سائیکل کی گھنٹی اس سے کہیں زیادہ تواتر سے بج رہی تھی اور جب اس نے دیکھا کہ یشا ایمی اور زینہ کی طرح باقی کے گنتی کے گھروں سے بھی سر جھانکنے لگ گئے ہیں اور چند بچے قلائیں بھرتے اس کی سائیکل کے پیچھے پیچھے آ رہے ہیں تو اس نے گھنٹی بجانا اور سائیکل کے ہینڈل پر ہمارا ناچھوڑا اور اگلے ہی پل اس کے سامنے لگے لاڈو اسٹیکر سے خرخر اٹھنے لگی بھری۔

”سب نے اپنی سائیس تک دوکلی تھیں۔“

”سنو۔ سنو اس ہفتے آرہا ہے روشنیوں کا وہ سیلاب۔ خوشیوں کی وہ چکار۔ وہ میلہ جس کا کرتے ہیں آپ سارا سال انتظار۔“

”ہائے زینہ۔ میلہ۔“

ایمی مارے خوشی کے زینہ سے لپٹی تو اس کے وجود کے بوجھ سے زینہ جھک سی گئی اور کوفت سے برہماتے ہوئے اس کے پہلو میں کہنے لگی۔

”پرے ہٹو تم تو۔“

یشا مارے اشتیاق کے گیٹ سے چند قدم آگے بڑھی۔ اب اس کے ننگے ٹکڑے کاہی زہ اینٹوں کی پٹریوں پر تھے جو خود گھاس اور جھاڑ جھنکار سے اتنی بڑی تھیں۔ کاہی کی پھسل پر اپنی چکنی ایزویوں کو جما جمائے رکھتی وہ گلی کی طرف جارہی تھی۔

”آئیے آئیے! میلے کی رونق بڑھائیے یہاں آپ

ایمی کے منہ سورسنے زینہ نے ناک چڑھائی۔

”تو کم کھلایا کرو میں مولی!“

”مگر میں کیا پہنوں گی۔ میں نے پچھلے مہینے تو کیا پچھلے سال بھی کوئی نئے کپڑے نہیں بنوائے۔“

یشا کو ہاتھ اس کی بات کا جواب اسے کیا ملے گا اور کس انداز میں ملے گا مگر وہی جان بوجھ کے بلکہ بڑے شوق سے آتش نمود میں کودنے والی عادت۔ باز نہیں آتی تھی۔

”تم نے کرنے کیا ہوتے ہیں نئے کپڑے!“

وہ مہر کے گھوڑے کو ذرا خاطر میں نہ لائی۔

”تو کیا میں میلے میں پرانے کپڑے پہن کے جاؤں گی؟“

”چہرہ واقعی یہ تو ہے۔“ زینہ نے ہمدردی دکھائی۔

”پرانے کپڑے پہن کے اتنے بڑے فیصلوں میں جانا تو اپنی انسلٹ کروانے والی بات ہے۔“

”اور کیا؟“ یشا نے اس کی آنکھوں سے جھلکتا تمسخر نہ دیکھا اور صرف اس کی ہمدردی پر ہی لٹو ہو گئی۔

”وہاں اتنے لوگ ہوں گے۔ ایک سے ایک خوب صورت لباس میں۔ تمہیں اتنے گندے اور رف چلے میں دیکھ کر کتنا مذاق رہا میں گے۔“

”بالکل۔“ یشا نے مہر کی جانب دیکھ کے تائیدی انداز میں گردن کاٹی زور و شور سے ہلائی جو خود بھی زینہ کے پٹری بدلنے پر ذرا حیران پریشان اسے تک رہی تھی۔

”اس لیے بہتر ہے کہ۔ کہ تم وہاں جاؤ ہی نہیں۔“ بالآخر زینہ نے اپنے ہمدردی کے غبارے سے ہوا نکل بی دی اور کھلکھلا کے ہنس پڑی۔ ایمی کا وجود بھی تھل تھل کرنے لگا۔

”کیا؟“ یشا کا دل دھک سے رہ گیا زندگی میں پہلی بار تو اسے گرینی کے علاوہ بھی کسی اور کی حمایت ملی تھی اور وہ بھی بس اتنی ہی دیر کے لیے؟

”تمہارے پاس ٹائم کہاں ہے ان سب کے لیے۔ اپنا دھیان ان کاموں کی طرف رکھو جو تم سے کبھی پورے ہی نہیں ہوئے۔ مہر نے اس کی لگا میں

کیں۔“

”تم تو ہر وقت گھر سے موبج میلہ کرتی رہتی ہو تمہارے لیے تو جو ہیں گھنٹے عیش ہی عیش ہے۔ یہ دونوں آج کل کلج میں اور باقی کا تو حادون گھر پرہنے میں گزارتی ہیں۔ ان کو تو بیک چاہیے دل بسلانے کے لیے تفریح چاہیے۔ تمہیں فاسخ جیسے بیٹھے کیوں مستیاں سوچ رہی ہیں۔“

یشا منہ ہی منہ میں منمنانے رہ گئی۔ بھلا مہر اما کے سامنے وہ اور کتنا بول پاتی۔

”یا اللہ! کسے جاؤں میں ان کے ساتھ میلے میں پچھلی بار بھی نہیں گئی اور اس سے پچھلی بار بھی نہیں۔ کتنا عرصہ ہو گیا ہے جھولے لیے۔ بڑھیا کے بل کھائے۔ اف۔“

ایمی کے کپڑے استری کرتے ہوئے وہ مسلسل اسی فکر میں غلط تھی جب زینہ نے اس کے منہ پہ اپنا سوشمارا۔

”یہ بھی پریس کرو جلدی۔“

”ابھی ایمی کا کر رہی ہوں۔“

”وہ تو ایک گھنٹے سے کر رہی ہو۔ اما ٹھیک کتنی ہیں تم سے کوئی کام ٹھیک نہیں ہوتا۔“

”اور تم سے کوئی کام سرے سے ہوتا ہی نہیں۔ نہ ٹھیک نہ خراب۔“

یشا کا کڑوا جھجکاؤ زینہ کی کوری طرح تپا گیا۔

”کیا۔ بکواس کرتی ہو آگے سے میں ابھی جا کے اما کو بتاتی ہوں کہ ایک تو تم میرے ساتھ بد تمیزی کر رہی ہو اور اوپر سے جان بوجھ کے ایمی کے کپڑے پریس کرنے میں دیر بھی لگا رہی ہو۔“

”ہاں تو تم اپنی بہن کے کپڑوں کا ساڑز بھی تو دیکھو۔ تین کے برابر ہے ٹائم تو لگے گا۔“

زینہ کا دایاں ابرو کمان کی طرح اٹھا۔ اور وہ اونچی آواز میں چلائی کرے سے نکلی۔

”ایمی! دیکھو یہ یشا کی بچی تمہارے بارے میں کیا

کہہ رہی ہے کہ ایسی کا سائز تین لوگوں کے برابر ہے۔

یہاں سر جھٹک کے دوبارہ کپڑے استری کرنے لگی۔ مہر کی پھینٹی کھاتے کھاتے اب بھلا وہ ان چھوٹی موٹی مصیبتوں کو کہاں خاطر میں لاتی تھی مگر وہ اپنے ذہن سے یہ فکر نہ نکال سکی کہ میلے میں جانے کے لیے کون سی تدبیر اختیار کی جائے۔

”گریٹی سے کہوں۔ نہیں۔ وہ اور سب باتیں تو مان لیتی ہیں مگر اکیلے کہیں جانے نہیں دیتیں۔ کتنی ہیں جہاں جاتا ہے میرے ساتھ جاؤ۔ اب میلے میں کہاں لے جاؤں ان کو ساتھ۔ وہ تو دس منٹ میں تھک جائیں گی۔“

اسی الجھن میں اسے پتا ہی نہ چلا کہ کب تک وہ استری ایسی کی لیس پہ رکھے گھڑی رہی۔

”کیا کتا تم نے میرا سائز تین کے۔“

ایسی اندر گھسی تو زین کے بھرے ایندھن کی وجہ سے غصے سے پھنکار رہی تھی مگر جو اپنی نئی لیس کو استری تلے بادحوال چھوڑتے دیکھا تو پھس ہو کے رہ گئی۔

”یہاں کی پچی۔“

پھر ایسی اسے سمجھنے کے سر کے دربار میں لے گئی تھی جاضری کے لیے جہاں مہر اپنا عتاب اس پر نازل کر رہی تھی اور ایسی برگر کے بڑے بڑے نوالے لیتے ہوئے

یہاں کو ایسے گھور رہی تھی جیسے ہر نوالے کے ساتھ اسے چباری ہو جبکہ یہاں مہر کی ساری ڈانٹ پھنکار ایک کان سے سن کے دوسرے کان سے نکالتے ہوئے مسلسل کن اکھیوں سے ایسی کے نوالے گن رہی تھی۔

”کیا فائدہ میرے اتنے بک بک کرنے کا۔ اپنے ہی سر میں درد کر لیا ہے میں نے۔ اس ڈھیٹ پہ ذرا جو اثر ہو۔“

”چار۔ پانچ اور چھ نوالے میں یہ برگر پورے کا پورا ایسی کے پیٹ کے منگے میں۔ اب اگر مجھے کھانا پڑتا تو بھلا کتنے نوالے لینے پڑتے؟ میں نہیں بائیس۔“

وہ دل ہی دل میں حساب لگا رہی تھی۔

”جنگ کر کے رکھ دیا ہے اس لڑکی نے۔ روز ایک نیا تماشا۔“

”آپ کس لڑکی کی بات کر رہی ہیں ماما؟“

وہ معصومیت سے گویا ہوئی اور یہی معصومیت مہر کے لیے ہمیشہ زہر کا گھونٹ ثابت ہوتی تھی۔

”تمہارے علاوہ یہاں کون ہے جو دوسروں کو عاجز کر دینے میں اتنی مہارت رکھتا ہو۔“

”مگر میرا نام تو میٹھا ہے اور آپ کو پتا بھی ہے۔ پھر آپ ہمیشہ یہ لڑکی۔ یہ لڑکی کیوں کہتی ہیں۔“

”میرا بس چلے تو میں بھی بھی نہیں مخاطب نہ کروں۔“

”رنگی؟“ وہ بے تحاشا۔ بے حساب کھل اٹھی۔

”تو پھر آپ ایسا کرتی کیوں نہیں؟“

”شٹ آپ۔“ مہر چلائی۔

”ماما! اس نے میرا سب سے نیا سوٹ جلا دیا ہے۔“

اب میں میلے میں کیا پن کے جاؤں گی۔“

”اسی کو پن جانا میں۔ جہاں سے جلا ہے وہاں ایک Patch لگا لو۔ بالکل ایسا۔“

اس نے اپنی قمیص اٹھا کے اس پہ لگا پوند دکھایا۔

”ماما۔ اسے بتائیں میں جب میرا یہ اکلوتا سوٹ بھی برانا ہو کے پھٹ گیا تھا اور میں نے آپ سے یہی سوال کیا تھا کہ اب میں کیا پنوں تو آپ نے یہی بتایا تھا کہ خراب ہوئے کپڑوں پہ patches لگا کے کب تک استعمال کیا جاسکتا ہے اسے بھی بتائیں میں۔“

وہ معصومیت سے پڑ پڑ پلکیں جھپکتی یہ مشورے دیتی مگر کوڑہر لگ رہی تھی۔

”تم اپنا مقابلہ میری ایسی سے کر رہی ہو؟“

”میں کیسے کر سکتی ہوں ایسی سے مقابلہ۔ میں کوئی ریسلو ہوں؟“

”ماما! ایسی چلائی۔“ یہ مجھے ریسلو کہہ رہی ہے۔“

”رائگ۔ میں نے تمہیں ریسلو نہیں کہا۔“

صرف یہ کہا ہے کہ میں ریسلو نہیں ہوں۔“

”ناغ خراب کر کے رکھ دیا ہے اس نے۔ یا اللہ یہ

لڑکی گوئی کیوں نہیں ہو جاتی؟“

مہر نے دوبارہ اپنا سر پکڑ لیا۔

دروازے پہ آہٹ ہونے پہ پر شکوہ خانم نے کتاب سے نظر ہٹا کے سامنے دیکھا میٹھاڑے ہاتھ میں لیے کھڑی تھی۔

وہ مسکرائیں۔ ”لگتا ہے آٹھ بج گئے۔“

”جی بالکل پورے آٹھ۔“ وہ ڈرے ان کے سامنے رکھ کے ان کی گود میں نیپکن کھول کے رکھنے لگی۔

”تمہارے ہوتے ہوئے مجھے گھڑی دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ پورے سات بجے ناشتہ۔“

پورے نو بجے میڈیسنز پورے بار بجے جوس۔ دو بجے لچ چار بجے چائے ایک منٹ اور مہر سے اوپر نہیں ہوتا۔“

”لیکن پھر بھی مہر لگتی ہیں کہ میں کوئی بھی کام ٹائم نہیں کرتی۔“

”مہر بھی اپنی جگہ ٹھیک ہے۔“ انہوں نے غیر جانب داری سے تجزیہ کیا۔

”اس کا کوئی بھی کام تم کب وقت پہ کرتی ہو اور نہ ہی ٹھیک طریقے سے کرتی ہو۔“

”وہ تو اس لیے کہ وہ جنگ آ کے مجھ سے کام کروانا چھوڑ دیں۔ مگر نہیں اصل میں ڈھیٹ میں نہیں وہ ہیں۔“

”بری بات میٹھا! بیویں کو ایسے نہیں کہتے۔“

پر شکوہ خانم کو ہنسی تو بڑی آئی دل پر لگی تھی بات واقعی مہر کی ڈھٹائی میں دو رائے ہو ہی نہیں سکتی تھیں مگر میٹھا کو سرزنش کرنا بھی ان کی تربیت کا حصہ تھا۔ اس لیے اپنی مسکراہٹ کو چھپانے کے لیے

انہوں نے سر جھکا کے سوپ کا چمچ منہ میں ڈالا اور ڈانٹنے لگیں۔

”ویسے بڑی خاموشی ہے نیچے۔ میں کہاں سب؟“

”ڈنر کے لیے باہر گئے ہیں۔“

”آپ مجھے کس سے چھپانا چاہتی ہیں گریٹی؟“

”مگر کھانا تو پتا ہے۔“

”ہاں لیکن اس میں نمک زیادہ ہو گیا تھا میں۔“

”نمک؟“ انہوں نے لہجے سے دہرایا اور قیصر اور سبزی کا سالن اور دال دونوں کو باری باری چکھا۔

”نمک تو بالکل ٹھیک ہے۔“

”یہ تو میں نے آپ کے اور اپنے لیے پہلے سے نکال لیا تھا بعد میں میٹھے کھانے میں نمک ملا یا تھا۔“

”یہاں کتنی فضول حرکتیں کرنے لگی ہو۔“

”اور وہ جو کچھ کرتی ہیں اس کا کیا؟“ میٹھا نے منہ بسورا۔

”دیکھیں میں مجھے پھر سے میلے میں جانے سے منع کر دیا۔ خیر ان کے منع کرنے کی پروا کسے ہے۔ وہ تو پاور تو آپ کے پاس ہے۔“

”مگر میں بھی نہیں چاہتی کہ تم جاؤ۔“

”مگر کیوں گریٹی؟“ وہ دہانسی ہو گئی۔

”بس میں نے کہہ دیا کہ تم نہیں جاؤ گی تو تم نہیں جاؤ گی۔ یہ میرا آرڈر ہے۔ کیا تم اپنی گریٹی کی بات نہیں مانو گی۔“

”تو کیا گریٹی اپنی میٹھا کی بات نہیں مانیں گی۔“

”نہیں۔ کم از کم یہ تو نہیں۔“ ان کے لہجے میں قطعیت تھی۔

”آپ نے اس سے پہلے میری کون سی باتیں مان لی تھیں۔“

”چھپلے سال بھی نہیں جانے دیا۔ آخر کیوں؟“

”سب لوگ تو جاتے ہیں۔“

”سب میں اور تم میں بہت فرق ہے میٹھا۔“ ان کی سرسری آنکھوں میں خوف سا لہرایا۔

”کوئی فرق نہیں ہے۔ بس مجھے پتا ہے۔ آپ نہیں چاہتیں کہ میں آپ کے پاس سے ذرا بھی دور جاؤں۔“

”یہی سمجھ لو۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔ ایسے میلوں ٹھیلوں میں بھانت بھانت کے لوگ ہوتے ہیں۔ پتا نہیں کون کون کہاں کہاں سے آیا ہو۔ میرا بس چلے تو میں نہیں چھپا کے رکھ لوں۔“

”آپ مجھے کس سے چھپانا چاہتی ہیں گریٹی؟“

یٹھا کے سوال یہ ان کے چہرے پہ سگینی سی در آئی۔
 بڑے بڑے کھسکاتے انہوں نے سرد مہری سے کہا اور
 کتاب چہرے کے آگے کر لی۔
 ”اب تم جاؤ۔ مجھے کچھ پڑھنا ہے۔“

”کیا؟ تمہیں پکا یقین ہے سارا۔ کہ تم اسی کی
 بات کر رہی ہو؟“
 مہر ریسور کلن سے لگائے ماتھے پہ بے پناہ مل لیے
 بات کر رہی تھی۔
 پر شکوہ خانم وہیل چیر و حکلیتی ٹیل تک صرف
 اخبار لینے آئی تھیں مگر سارا کا نام سن کے ان کے ماتھے
 مہر کے ماتھے سے بھی دگنے بل جگہ بنا گئے۔ زہر لگتی
 تھی انہیں سارا مہر کی دوست اور پڑوس۔
 ”اکلی آ رہی ہے کیا؟“

مہر کے لہجے کی تشویش نے انہیں کھٹکنے پہ مجبور
 کیا۔
 ”مجھے کیا ضرورت ہے اس سے ملنے جانے کی نہ
 میں نے پہلے کبھی اسے لفٹ کرائی تھی نہ اب کراؤں
 گی اور تم جانتی ہو کہ مجھے اس کے نام سے بھی جڑ ہے تو
 بطور خاص مجھے فون کر کے یہ منحوس خبر دینے کی کیا
 ضرورت تھی۔“

مہر کے کھٹ سے ریسور رکھ دینے پہ پر شکوہ خانم
 نے دو بڑے طفرے ساتھ کہا۔
 ”یٹھا تو صبح سے اسٹور روم کی صفائی کر رہی ہے۔
 اس نے تو تمہیں تنگ بھی نہیں کیا آج۔ بلکہ شاید
 تمہارا اور اس کا آتنا سامنا بھی نہیں ہوا۔ پھر موڈ کس
 وجہ سے خراب ہے۔“

”میرا موڈ خراب کرنے کے لیے اور بہت سے
 لوگ ہیں۔ کچھ پہلے سے موجود تھے۔ کچھ اب آ رہے
 ہیں۔“

مہر نے لہجے میں نخوت بھر کے کہا۔
 ”کون آ رہا ہے؟“
 ”کارا۔“

”کارا۔“ پر شکوہ خانم پہلے چونکیں پھر خوشی سے
 بھر پور کپکپاتے لہجے میں پوچھنے لگیں۔
 ”کارا واپس آ رہی ہے ہمیشہ کے لیے؟“
 ”ہمیشہ کا تو پتا نہیں۔ مگر دس سال بعد آخر وہ
 واپس آ رہی ہے۔“

”تو تم اتنی پریشان کیوں ہو رہی ہو اس کے آنے
 سے۔“
 ”اور آپ اتنی خوش کیوں ہو رہی ہیں؟“ وہ جز بڑی
 ہوئی۔

”میں تو اس لیے خوش ہوں کہ وہ میری منہ بولی بیٹی
 ہے۔ بہت محبت ہے ہمارے درمیان جسے فاصلے بھی
 کم نہیں کر سکے اور میں دس سال بعد اس سے ملوں
 گی۔ مگر تم اب سیٹ کیوں ہو؟ کارا سے تمہاری دشمنی
 کی تو اب وجہ بھی باقی نہیں رہی۔“

”وجہ ختم ہوئی تھی۔ دشمنی نہیں اور ہاں آپ اس
 سے ہرگز نہیں ملیں گی۔“
 مہر کی تنبیہ انہیں مشتعل کر گئی۔

”مہر! میں کس سے ملتی ہوں کس سے نہیں یہ
 میرا ذاتی معاملہ ہے اور میں نے اپنے فیصلے کبھی کسی
 کے مشورے سے نہیں کیے۔“

”تو کم از کم اس گھر میں وہ آپ سے ملنے نہیں آئے
 گی۔ آپ کا دل بہت ادا ہو رہا ہے اپنی بھانجی سے
 ملنے کے لیے تو جا کے مل آئیں۔ مگر پہلے پتا ضرور کر
 لیجئے گا کہ آپ کی امیر کبیر بھانجی یا منہ بولی بیٹی آپ سے
 ملنا بھی پسند کرتی ہے یا نہیں شوہر کے مرنے کے بعد
 اس کی چھوڑی ہوئی دولت اور جائیداد میں ہر سال
 اضافے ہوتے رہے ہیں۔ ان دس سالوں میں تو وہ اور
 بھی تو بچ چیز بن گئی ہوگی۔ پتا نہیں آپ کو پہچانتی بھی
 ہے یا نہیں۔“

یٹھا نے بستر پہ اونڈھی لٹٹی پو کو دوپٹے اس سے
 گلے شکوے کر رہی تھی۔
 ”تم نے دیکھا پو۔ گریبی بھی مہرما سے ڈرتی ہیں“

کتنی بچی ہیں کہ انہیں زمانے سے ڈر لگتا ہے مجھے کسی
 سے نقصان نہ پہنچ جائے اس بات سے ڈر لگتا ہے
 لیکن سچ تو یہ ہے کہ انہیں مہرما سے ڈر لگتا ہے۔ ان کی
 مرضی کے خلاف وہ مجھے کہیں نہیں جانے دیتیں۔ مگر
 یٹھا کو مہرما سے اتنا ڈر نہیں لگتا۔ پتا ہے آج میں نے
 کیا کیا؟ ان کے کھانے میں اتنا نمک ملا دیا کہ وہ مہرما کی
 زبان سے بھی زیادہ کڑوا ہو گیا۔“

کھلکھلا کے ہنستے ہوئے وہ سیدھی ہوئی۔ اب پو
 کے بجائے ٹوٹی اس کی ہتھیلیوں میں دبی اس کے
 چہرے کے اوپر مسکرا رہی تھی۔

”اور ٹوٹی۔ تم نے زینبی کے بل دیکھے؟ بالکل
 ہنسل اینڈ گریٹل کی اسٹوری والی witch
 جلد گریبی جیسے ہو رہے تھے۔ پتا ہے کیوں؟ یٹھا نے اس
 کے شیمو میں ہیکنگ سوڈا جو ملا دیا تھا۔“

ہنسی سے لوٹ پوٹ ہوئی وہ اپنے کارنامے سن رہی
 تھی۔ اسے لگ رہا تھا اس کے ساتھ ساتھ سب ہنس
 رہے ہیں۔ پو۔ ٹوٹی، مکی ماؤس، ڈونلڈ ڈک، ٹام۔
 اور۔ اور۔ سنڈرلا کے اواس سے چہرے پہ بھی
 مسکراہٹ جھلک رہی ہو۔ وہ سنڈرلا کے سامنے جا
 کھڑی ہوئی۔

”دوست۔ تمہاری اور میری کتنی بہت سی باتیں
 ایک جیسی ہیں نا، میں بھی تمہاری طرح کیوٹ ہوں،
 تمہاری طرح مجھے دیکھ کے بھی سب کو پیار آ جاتا ہے۔
 سوائے مہرما کے۔ تمہاری طرح میری بھی ایک
 کھڑوس اسٹپ مام ہے۔ دو ذفری اسٹپ کسٹرز
 لیکن جانتی ہو، تمہارے پاس وہ نہیں ہے جو میرے
 پاس ہے۔ کیس کرو۔ نہیں پتا نا؟ اول۔ ہوں۔ میں
 گریبی کی بات نہیں کر رہی۔ اگر میرے پاس گریبی ہیں
 تو تمہارے پاس فیری مڈر ہیں۔ مگر میرے پاس وہ چیز ہے
 جو تمہارے پاس بھی ہو ہی نہیں سکتی۔ میرے پاس
 اپنی زندگی خود جینے کا حوصلہ ہے، امید ہے، خواب ہیں
 اور ہاں بہت بھی ہے۔“
 وہ مکمل کے مسکرائی۔

اس کے چہرے کے ہر ہر نقش میں تابندگی جاگ

اٹھی۔
 پھر ایک کوندا سا اس کے ذہن میں پلکا۔
 ”لو۔ لیس۔ حوصلہ۔ ہمت۔ ہاں۔ مجھے
 اپنے خواب پورے کرنے کے لیے کسی کام نہ دیکھنے کی
 ضرورت نہیں ہے۔ میں میلے میں جاؤں گی اور ضرور
 جاؤں گی اور زبردست ساڈرٹس بھی بناؤں گی۔ دیکھتی
 ہوں کون روکتا ہے مجھے۔“

اس نے پل بھر کے لیے اپنی آنکھیں میچیں۔ جگر
 جگر کرتے ہیرے جیسے کسی نے اوٹ میں چھپا دیے۔
 پھر اپنی سدا کی شریر مسکراہٹ کے ساتھ کمرے سے
 نکلی۔ اس کا رخ ایلی اور زینبی کے کمرے کی جانب تھا۔
 دونوں اس وقت کالج میں تھیں۔ بیڈ۔ وہ لباس پھیلا
 کے رکھا ہوا تھا جس کے بارے میں ابھی تک یہ طے
 نہیں ہوا تھا کہ میلے میں اسے ان دونوں میں سے کون
 پہن کے جانے والا ہے۔ دونوں کا دل ہی اس پہ آیا ہوا
 تھا۔ بڑی پیاری ستاروں والی لیس سے بھی میکسی
 تھی۔ جس کی آستینوں پہ بڑے بڑے تنگ تنگ تھے۔
 میٹھا نے پشت پہ چھپائی فینچی نکالی اور نہ صرف لیس
 کو جگہ جگہ سے گٹ گرا تا رہا، بلکہ آوے سے زیادہ
 تنگ بھی اس بے دردی سے نوپے کہ وہاں سے کپڑا ہی
 پھٹ گیا۔

”سوپ لٹنڈا ہو رہا ہے گریبی۔“
 یٹھا نے پر شکوہ خانم کے سامنے سلاور کھتے ہوئے
 انہیں مخاطب کیا جو مہر کے بگڑتے موڈ کو بھانت کر خود
 بھی بد مزگی سی محسوس کر رہی تھیں۔ زینبی ابھی کالج
 سے نہیں لوٹی تھی اور ایلی آتھی ہی کھانے پہ نوٹ پڑی
 تھی۔

”تو آپ کارا کو فون کرنے سے باز نہیں آئیں۔“
 آخر مہر نے اپنے اندر کالا داگل ہی دیا۔
 ”اب تم میری جاسوسی بھی کرنے لگی ہو؟“
 ”میں نے فون پہ ڈائل نمبرز میں دیکھا تھا۔“
 ”اسی کو جاسوسی کہتے ہیں مہر۔“ انہوں نے

ٹھنڈے لہجے میں کہا۔ ”اور تم نے خود کہا تھا کہ میں اس کے گھر جا کے اس سے ملنا چاہوں تو جاسکتی ہوں تو اس کے لیے مجھے اسے فون کر کے اپنے آنے کی اطلاع تو دینی تھی۔“

”آخر یہ کارا ہے کون؟“ امی نے دونوں نوالوں کے درمیان وقفے کے دوران پوچھنے کی زحمت کی۔

”میری منہ بولی بیٹی۔ مجھے آنٹی کستی ہے۔ اس لیے سمجھو۔ میری بھانجی ہے۔“

”واؤ۔ یعنی آپ ان کی آنٹی ہیں تو وہ ہماری آنٹی ہوئیں۔“

امی نے مہر کی شعلہ بار نگاہوں پر توجہ نہ دیتے ہوئے اشتیاق ظاہر کیا۔

”گرینی۔ مجھے ضرور ملوایئے گا ان سے۔“ میٹا نے بھی جھٹ فرمائش کی۔ ”میں نے کبھی کوئی آنٹی نہیں دیکھی۔“

”دیکھا تو تم نے اپنی ماں کو بھی کبھی نہیں ہے۔ تم اس سے ملنے کیوں نہیں چلی جاتیں۔“

مہر کے سلگتے لہجے پہ میٹا سمجھ سی گئی اور اپنی پلیٹ میں کھانا نکالتے اس کا ہاتھ رک گیا۔ پلوں پہ انکے آنسو لیے وہ کھانے کی ٹیبل سے اٹھ گئی اور امی نے دُش اپنی جانب سرکال۔

”مہر۔ تم کیوں اس بچی کا دل دکھاتی ہو؟“ پر شکوہ خام نے ملال سے اسے جاتے دیکھا جو صبح سے خالی پیٹ اتنے بڑے سارے گھر کی صفائی ستھرائی میں بہکن لگی۔

”اور جو میرا دل دکھ رہا ہے اس فتنے کے آنے سے۔ میں کیسے اس عورت کو برداشت کروں جو میرے شوہر کی منگیتر تھی۔“

”سبکی۔ بابا کی فیاضی۔“

”چپ کرو تم۔ کھانا کھاؤ اپنا۔“ مہر نے امی کے بار بار جذباتی ہو جانے پہ اسے گھر گا۔

”تم بچوں کے سامنے کیوں ایسی باتیں کر رہی ہو؟ سیف اللہ نے تمہاری خاطر کارا سے منگنی توڑی تھی۔ نفرت تو کارا کو تم سے ہونی چاہیے تھی۔“

”وہ تو شکر ادا کرے“ میں نے اسے سیف اللہ کی بیوی بن کے یہ گھٹی ہوئی زندگی نہیں گزارنے دی۔

ورنہ آج وہ میری جگہ بیٹھی اس کھنڈر میں آنے آنے کا حساب لگا رہی ہوتی اور سوکن کی اولاد کو بھی بھگت رہی ہوتی۔ وہ تو مزے میں رہی۔ سیف اللہ کے منگنی توڑتے ہی ایک امیر کبیر اس کے ہاتھ لگ گیا۔ جس کے مرنے کے بعد اس کی پیرس والی ساری برائیاں پر وہ راج کر رہی ہے۔ سنا ہے شاہانہ طرز زندگی تھی رہی ہے وہاں۔“

”وہ خدا لیا۔ تم اب تک بے کاری و دشمنی پالے بیٹھی ہو۔ اب ان باتوں کو دہرائے گا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ سیف اللہ اس دنیا میں نہیں رہا اور کارا ایک بیوہ عورت ہے۔ بل واریوہ سہی۔ مہر ہے تو یوہ۔ تنہا یہ باتیں کرنا اب زیب نہیں دیتا۔“

پر شکوہ خانم نے سمجھانا چاہا۔ ”مگر وہ مزید بھگتی۔“

”ہاں اور تب زیب دیتا تھا جب وہ جوان بیوہ تھی اور جب سیف اللہ اس دنیا میں تھا۔ کتنا ایڑی چوڑی کا زور لگایا تھا آپ نے کہ کارا کی دوسری شادی سیف اللہ سے ہو جائے۔“

”یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔ میں نے کبھی ایسا نہیں چاہا تھا۔ ہاں۔ میں نے اس کی جوان بیوگی اور بے شمار دولت و جائیداد دیکھ کے یہ ضرور مشورہ دیا تھا اسے کہ وہ کسی پر خلوص بندے کا ہاتھ تھام لے۔ اپنی جوانی بیوگی کی نذر نہ کرے۔ ورنہ دنیا اسے لوٹ لے گی۔ مگر وہ خود ہی دوسری شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔“

”آپ نے اپنی خواہش دوسرے طریقے سے پوری کر لی۔ مجھ پہ سوچن لائے کی خواہش۔ میں تو ہمیشہ سے آپ کو ناپسند تھی۔ صرف مجھے زچ کرنے کے لیے آپ نے سیف اللہ کو اکسایا دوسری شادی کے لیے۔“

پر شکوہ خانم کے پاس ہمیشہ کی طرح آج بھی ان الزامات کا کوئی جواب نہیں تھا۔

☆ ☆ ☆

میٹا آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ اپنے کمرے میں

آئی تھی۔ چند منٹ ہیڈ پر بیٹھ کے ٹانگیں ہلا ہلا کے مہر کو کونے کے بعد وہ جھکی۔ ہیڈ کے نیچے سے وہ نوکری کھسیٹ کے نکالی۔ جس میں کل سے لے کر اب تک کافی مال مسودہ جمع کر رکھا تھا۔

امی کی میکسی سے اتاری لیس۔

بڑے بڑے پھیلے ٹکے۔

کچھ مختلف رنگین ریشمی کپڑوں کی چھوٹی بڑی کتریں۔

زینی کے کچھ زیورات۔

مہر کے کمرے سے چرائی لپ اسٹک اور بندیا۔

اس کی آنکھوں میں پھر سے شرارت کے ستارے چمکنے لگے۔ وہ بندیا ماتھے پہ چپکا کے مختلف کترنوں کو جوڑ کے ایک ساتھ رکھتے ہوئے بولی۔

”دیکھ لینا۔ ایسا شان دار لباس بناؤں گی۔ اتنی اچھی اتنی پیاری لگوں گی کہ بس۔“

☆ ☆ ☆

امی بھرے پیٹ کے خمار سے ڈولتی۔ جھومتی کمرے میں داخل ہوئی اور ہیڈ پہ پھیلی میکسی کو دیکھ کے مسکرائی۔

”اے تو میں ہی پنوں کی چاہے کسی بھی طرح پھنسا نا پڑے۔“

اس نے بڑے شوق سے میکسی اٹھائی اور اپنے ساتھ لگانے ہی لگی تھی کہ اس کی آنکھیں پٹی کی پٹی رہ گئیں۔ عین اسی وقت زینی اندر داخل ہوئی۔ وہ صبح کی گھر سے نکلی اب لوٹ رہی تھی۔

”اوہ گاؤ۔ اتنا گھومے آج ہم۔ کس۔“

اور جب اس نے میکسی کا شر دیکھا تو پورا حلق پھاڑ کے چلائی۔

”امی کی بچی۔“ اس کی چیخ کی بازگشت سے امی بھی سکتے سے باہر آگئی اور خود بھی چیخنے لگی۔

”مسونی۔ یہ کیا کیا تم نے؟“

”میں نے یا تم نے؟“ امی بھی اس سے جھٹی۔

”میں ایسا کیوں کروں گی۔ مجھے تو یہ کل شام میلے

میں پہن کے جانا تھا۔“

”تم نے نہیں۔ میں نے پہننا تھا۔ اسی لیے تم نے اسے خراب کیا۔“ تاکہ میں نہ پہن سکوں۔ جمل نکڑی۔“

”شت اب امی۔ اصل میں تم نے ہی اسے خراب کیا ہے کیونکہ اسے پہن کے تم آنے کی پوری لگتیں۔ بلکہ تم اسے پہن ہی نہیں سکتی تھیں۔ یہ تمہارے بارہ من کے وجود پر پوری آہی نہیں سکتی تھی۔ اسی غصے میں تم نے اسے برباد کیا ہے۔ تاکہ تم نہیں تو کوئی اور بھی اسے نہ پہن سکے۔“

”ماما۔“ امی روتی پیر بختی باہر کو نکلی۔

☆ ☆ ☆

ہیڈ کے پائنٹی ویک کے بیٹھی میٹا گود میں کتریں رکھے انہیں سوئی دھاگے کی مدد سے جوڑ رہی تھی۔

لیپ کی ہلکی ہلکی روشنی میں اسے یہ کام کرنے میں دشواری پیش آرہی تھی۔ مگر وہ لائٹ بھی آن نہیں کرنا چاہتی تھی۔ سب ہی جانتے تھے، خیند کی کتنی ہلکی ہے۔ اتنی دیر تک جاگ نہیں سکتی۔ اس کے کمرے سے روشنی آتے دیکھ کے ضرور کسی نہ کسی نے نوہ لینے کے لیے اندر جھانک لینا تھا۔

”تمہیں پتا ہے پوپ۔ ایہ نیٹ میں نے ماما کے روم کے کرنل سے اتاری ہے۔ وہ سمجھیں گی چوہا کتر کے لے گیا اور اس کو میں ایسے رن کی طرح مہل لگاؤں گی اور یہ گرینی کی ساڑھی کا بارڈر۔ وہی ساڑھی جو پچھلے سال مجھ سے استری کرتے ہوئے جل گئی تھی۔ اس کا بارڈر میں نے اتار کے سنبھل کے رکھ لیا تھا۔ اسے میں یہاں لگاؤں گی تو کتنا جگ جائے گا نا۔ واہ۔“

رنگ برنگی کتریں جوڑ کے بنایا لباس اس نے اپنے سامنے پھیلا کے رکھا تو کھوسی گئی۔

سالوں سے خوابوں میں سنے منترنوں کی گونج آج کھلی آنکھوں کے ساتھ بازگشت بن کے محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے سر جھٹکا اور جلدی سے لباس کو گول مول کر کے نوکری میں رکھ کے نوکری ہیڈ کے نیچے دوبارہ کھسکا دی۔

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

”چلو اب سو جاؤ بیٹا! صبح بہت کام ہے۔“

اور صبح اسے واقعی بہت کام تھا۔ خیر کام تو وہی سب تھے جو روز ہوتے تھے۔ مگر پہلے ان کاموں کو نمٹاتے نمٹاتے اسے صبح سے رات ہو جاتی تھی۔ مگر آج اسے ہر حال میں دوپہر تک ان کاموں سے فراغت حاصل کرنی تھی۔ اس لیے وہ پھر کی بن گئی۔ ابھی بیڑھیوں پر چاٹا لگا رہی ہے تو ابھی جالے اتار رہی ہے۔ ابھی کچن کی کینٹ خالی کر کے صاف کر رہی ہے تو ابھی کپڑے دھو رہی ہے۔ ساتھ ساتھ کھانا بھی بن رہا تھا۔ پر شکوہ خانم نے اس کی پھرتیاں دیکھ کے پوچھ ہی لیا۔

”کیا ہو گیا ہے بیٹا۔ سکون سے۔۔۔ مٹھیں کیوں بن رہی ہو؟“

”آپ نہیں جانتیں۔۔۔ مرہانے کتنی لمبی لسٹ بتائی ہے کاموں کی۔“

”ہاں تو کون سی نئی بات ہے اور وہ تو ابھی شام ہونے تک دونوں لڑکیوں کے ساتھ نکل جائے گی۔ ملے کے لیے اور ظاہر ہے رات کو دیر سے لوٹے گی۔ تم آرام سے کام کرتی رہنا۔“

”نہیں۔۔۔ مجھے شام سے پہلے پہلے فارغ ہونا ہے۔“

اس کے ہاتھ اور تیزی سے چلنے لگے۔ ”کیوں شام سے پہلے کیوں؟“ وہ شخصیں تو بیٹھا ذرا سنبھل گئی۔

”وہ دراصل۔۔۔ ایک بہت اچھی بک ملی ہے مجھے اسٹور روم کی صفائی کرتے ہوئے وہ پڑھوں گی وہ بھی روم بند کر کے مڑا آتا ہے تاکہ اسے میں پڑھنے کا۔“

”ہاں۔۔۔ یہ تو ہے۔“ وہ مسکرائیں۔ ”چلو۔۔۔ شکر ہے تم نے بھی کوئی ڈھنگ کا کام کرنے کا سوچا۔ میں تمہیں ڈسٹرب نہیں کروں گی۔“

☆ ☆ ☆

ملے میں ابھی شام کی سیاہی پوری طرح نہیں پھیلی تھی۔ گدلی گدلی سی کمر میں روشنیاں اپنا راستہ بنا رہی

تھیں۔

ایمی کی نظرس کھانے پینے کی انواع و اقسام کی چیزوں پر بھٹک رہی تھیں تو زینی کپڑوں اور بننے سنورنے کے دیگر لوازمات کو لپکا کے دیکھ رہی تھی۔ مہر اپنی دوست سارا کے اسٹل پر بھونٹنی محنت کش عورتوں کے ہاتھ کی بنی مصنوعات کا جائزہ لے رہی تھی۔ جن سے سستے داموں محنت کروا کے سارا یہ مصنوعات بڑے مٹکے داموں نیپال، سری لنکا اور بھارت جیسی بڑی مارکیٹوں تک بھیجا کرتی تھی۔ اس نے یہ گراپے مرحوم شوہر سے سیکھے تھے۔

”کتنا خوب صورت ہیٹ ہے۔“ مہر نے تنکوں سے بنا ہیٹ چھوا۔

”تم لے لو۔ تم پہ سوٹ کرے گا۔“ سرخ کھٹکھٹا لے باؤں والی سارا نے ایک کاروباری سی مسکراہٹ کے ساتھ پیش کش کی۔ جس سے مہر ہرگز ہرگز خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہوئی۔ وہ جانتی تھی سارا کے ”لے لو“ سے مراد ہے ”خرید لو۔“

”نہیں۔۔۔ میں لے کر کیا کروں گی۔ ساڑھی کے ساتھ ہیٹ کتنا مٹھکھ خیز لگے گا۔“

”یہ چٹائی دیکھو ہاتھ کی بنی ہے۔“

”ہوں۔“ مہر نے چٹائی کی بہت سے زیادہ اس سے لگے ٹیگ کو زیادہ بغور سے دیکھا اور پھر دلچسپی ظاہر کی۔

”کام بہت بڑھ گیا ہے مہر۔“ سارا نے اتراکے کمل۔ ”مجھ سے تو اب سچ پوچھو تو سنبھالا بھی نہیں جا رہا۔“

”تم نے بتایا تو تھا کہ تمہارے سر نے تبت سے کسی کو بھیجا ہے تمہارے پاس۔“

”ہاں۔۔۔ مگر سسرالی رشتے داروں پہ میں اتنی جلدی اعتبار نہیں کر سکتی۔“ وہ بھی اس صورت میں جبکہ میرے شوہر کے ساتھ بھی میرے تعلقات خاص اچھے نہ رہے ہوں۔“

مہر کو اس کے شوہر اور سسرال والوں کے تذکروں میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس لیے وہ گردن کھما کے اپنی لڑکیوں کو دیکھنے لگی۔ زینی اینڈین اسٹل سے مندی لگوا رہی تھی اور ایمی کسی ایرانی اسٹل پہ کھڑی ان کی

مٹھائیاں چیک کر رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

بیٹا اپنے باپوں کی مانگ نکالے پنوں کی مدد سے جھومر سجا رہی تھی۔ جو اس نے مہر کے کسی پرانے صندوق سے نکالا تھا۔ چاندی کا جھومر۔ جو کالا پڑ رہا تھا۔ بیٹا جانتی تھی۔ لیہوں یا سر کے سے چکا کے اسے نئے جیسا کیا جاسکتا ہے۔ مگر اس نے ایسا کرنے کی قطعاً زحمت نہیں کی تھی۔ کاجل اناڑی پن سے بہت زیادہ تھوپ لیا تھا اور ابروؤں کے اوپر میوون نیل پالش سے نقطے سے بھی لگا رکھے تھے۔ یہ اس نے مہر کی شادی کی تصویروں میں دیکھا تھا۔ وہ کسی بنگالی مشاطہ سے تیار ہوئی تھی اور تب شاید وہاں کی دلہنیں ایسے ہی افشائ اور نیل پالش کی مدد سے چہرے پہ گل کاریاں کیا کرتی تھیں۔ مانتے پہ بڑی سی لمبورنگ بندیا۔ اونٹوں پہ نارنجی رنگ کی لب اسٹک تھوپنے کے بعد اس نے غور سے اپنا جائزہ لیا تو وہ ٹھٹھکی سی گئی۔

”یہ کیا ہے؟“ ابھمن بھرے انداز میں وہ یاد کرنے لگی کہ یہ عجیب و غریب روپ اسے کس کی یاد دل رہا ہے۔ مگر حند نہ چھٹ سکی۔

ہندو دیو مالائی کرداروں والا لباس۔ زرق برق سجاوٹ کے ساتھ۔ ویسے ہی ہندو مال۔

”چلو۔ اچھا ہے۔ ایسے کوئی پہلی نظر میں مجھے پہچان بھی نہیں سکے گا۔“

اس نے بے فکری سے سوچا اور کھڑکی سے کود کے پچھلے راستے باہر نکلنے لگی۔

پر شکوہ خانم اپنے کمرے میں کتب پڑھتے ہوئے اس اطمینان میں تھیں کہ آج ان کی پیاری پوتی بھی مطالعے میں مگن ہے۔

☆ ☆ ☆

”yupooce“

بیٹا نے ملے کا گھوم گھوم کے جھوم جھوم کے جائزہ لیتے ہوئے خوشی سے لہو لگایا۔

اس کے پاس ایک nguttrain (بھونٹانی

کرئی) نہیں تھا۔ مگر وہ ان سب سے زیادہ چمک رہی تھی اور ان سب سے بڑھ کر نمل تھی جو جیبیں بھر کے یہاں آئے تھے۔

وہ چوڑیاں نہیں خرید سکتی تھی۔ پچکا (گول کے) نہیں کھا سکتی تھی۔ مندی نہیں لگوا سکتی تھی۔

مگر وہ اس سرخ ریواقی لباس والی رقصہ کالوک رقص تو دیکھ سکتی تھی۔ جو مجمع کے درمیان بڑی مہارت کے ساتھ اپنے فن کا مظاہرہ کر رہی تھی۔

اس کا بھاری بھر کم لباس بیٹا کو پھنسا رہا تھا تو شاید اس سے دو قدم چلنا بھی دو بھر ہو یا۔ اسی لیے وہ رشک سے اس کے زرت بھاؤ دیکھ رہی تھی۔

رقص دیکھنے والے مجمع کی اکثریت رقصہ کے بجائے جب بیٹا کے عجیب و غریب لباس اور حد سے زیادہ نمائیاں ہوتے میک اپ بہ مبذول ہونے لگی تو بیٹا وہاں سے کھٹک گئی۔ اب وہ شمع بے دکھانے والے کے کمل دیکھنے میں مگن تھی۔

اس سے ذرا فاصلے پہ ایمی آسمانی جھولے میں پھنسی اوپر کی جانب جارہی تھی۔ بیٹا کی ایک جھٹک دیکھتے ہی وہ بری طرح چوگی۔

”بیٹا؟“

اتنے میں جھولا گھوم گیا۔ اب ایمی کی پشت بیٹا کی جانب تھی۔ جھولے کی نشست میں بری طرح پھنس کے بیٹھے ہونے کی وجہ سے وہ گھوم کے اسے دوبارہ غور سے دیکھ بھی نہیں سکتی تھی اور جب تک جھولا مڑ کے دوبارہ پہلی والی حالت میں آیا۔ بیٹا کسی چھلاوے کی طرح ایک بار پھر غائب ہو چکی تھی۔

”کہاں گئی! بالکل بیٹا جیسی ہی تھی وہ۔ اگر اتنا رنگ نہ تھوپ رکھا ہوتا چہرے پہ۔“

زینی کسی اور اسٹل پہ مہر کو زچ کہے دے رہی تھی۔ ”اما۔ پلیز۔ لے دیں نا۔“

”بہت منگا ہے زینی۔ اور تمہارے پاس پہلے سے بہت کپڑے ہیں۔“

”مگر۔ اما۔“

”کتنا ڈرتے ہو تم؟“
”میں اصل میں تم سے ڈر رہا ہوں۔“
”مجھ سے کیوں؟“

”یہ تمہارا آؤٹ فٹس۔ یہ میک اپ۔ یہ سب بہت عجیب لگ رہا ہے۔ مجھے ڈر ہے تم کوئی witch (جادوگر) نہ نکل آؤ۔“
اس کا انداز سراسر مذاق اڑانے والا تھا۔ مگر میٹھا نے اسے خاصی سنجیدگی سے لیا۔
”کوئی نہیں جی۔ جلدو گرنیاں کوئی اتنی حسین ہوتی ہیں؟“

”تو تم حسین ہو؟ انٹرننگ؟“
”اور کیا؟ اتنی زیادہ۔“

”تو اپنے چہرے کو اتنے عجیب و غریب طریقے سے چھپا کیوں رکھا ہے تم نے۔ مجھے اس انداز میں صرف تمہارے ماتھے کا تلمک۔ یہ گول گول سرخ دائرے۔ گندے سے طریقے سے گلی لب اسٹک اور خطرناک حد تک پھیلا کاہل ہی نظر آ رہا ہے۔ لگتا ہے تم نے اپنی میزمری میزمری آنکھوں۔ لمبی ناک یا چہرے کے کسی اور نقص کو چھپانے کے لیے یہ سب کیا ہے؟“

”جان بوجھ کے اسے اکسار رہا تھا۔ اس بہروپ بھرنے کی وجہ جانتا چاہتا تھا۔“
”جی نہیں۔ جن کے چہرے بہت زیادہ حسین ہوں وہ بھی خود کو چھپا کے رکھتے ہیں، تاکہ کسی کی نظر نہ لگ جائے ان کو اور ان کے حسن سے کسی کا دل غ نہ خراب ہو جائے۔“

”نکس نے یہ خوش فہمی دلا دی ہے تمہیں؟“
”سب ہی کہتے ہیں کہ میں بہت سوٹ اور بہت سی کیوٹ ہوں۔ ارے۔ میرا گھر آنے والا ہے۔“

”کشتی روک کے اٹھ کھڑی ہوئی۔“
”کہاں ہے گھر؟ مجھے تو یہاں کوئی گھر نظر نہیں آ رہا۔“

”بس۔ پاس ہی ہے۔ مجھے یہاں سے پیدل جانا ہو گا۔“

”اور میں؟“ وہ گھبرا گیا۔

”تم کشتی کو سیدھا آگے لے جاؤ، آٹھ دس منٹ کے بعد کیپ پوسٹ نظر آئے گی۔ وہاں روک کر اتر جاؤ۔ رائٹ ٹرن لو گے تو سامنے وہ روڈ ہے جس پہ تمہارا گھر ہے۔“

وہ جانے جاتے جلدی جلدی اسے ہدایات دینے لگی۔

”ارے۔ مگر سنو تو۔ لڑکی۔ مجھے کشتی چلانا نہیں آتی۔“

”وہ میرا مسئلہ نہیں ہے سائے۔ بائے۔“
وہ بھاگتی ہوئی دہلی سے چلی گئی۔ ڈر تھا۔ وہ اس کے پیچھے نہ آجائے اور گھر تک کا راستہ نہ دیکھ لے۔ کیا پتا مہمانے شکایت لگانے پہنچ جاتا۔

”وہ گاؤ۔ اب کیا کروں؟“
ماڑ نے پریشانی سے اوہ اوہ کر دیکھا۔

رات کی تاریکی۔ دور دور تک کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ گھبرا کے اٹھا تو کشتی کے ڈگمگانے سے اس کی گھبراہٹ میں اضافہ ہو گیا۔ مگر پھر اس نے خود کو بہت دلائی۔

”کیا ہو گیا ماڑ۔ ذرا سی لڑکی اتنی دیر تک اکیلی چلاتی رہی ہے۔ تم بھی کوشش کر کے دیکھ لو۔“

اس نے چو سنبھالے تب ہی اس کی نظر کشتی میں گرے بندے کی جانب گئی۔

ماڑ نے جھک کے اسے اٹھالیا۔ چاندی کے بندے میں لگے بزرگینے سے شعاعیں پھوٹ رہی تھیں۔ ماڑ کے ہونٹوں پہ ہلکی سی مسکراہٹ آئی اور اس نے بندے کو ہتھیلی میں چھپا کے زور سے منہ بند کر لی۔

میٹھا چوری چھپے ڈبے پاؤں گھر کے اندر داخل ہوئی اور دائیں بائیں چوکس نظروں سے دیکھتی۔ سینڈل انار کے ہاتھ میں پکڑے میڑھیاں چڑھنے لگی۔ آخری میڑھی پہ پہنچ کے وہ ٹھٹھک کے رکی۔ کیونکہ سامنے پر شکوہ خانم کی وہیل چیئر نے اس کا راستہ روک لیا تھا۔

”گر بی!“ دونوں ہی ایک لمحے کے لیے سکتے کے عالم میں آگئی تھیں۔

میٹھا ڈر کے مارے۔
اور پر شکوہ خانم تعجب کے مارے۔
دونوں پٹی پٹی آنکھوں سے ایک دوسرے کو دیکھ رہی تھیں۔

”میٹھا!“ پر شکوہ خانم کے لیے میں حیرت کے ساتھ ساتھ بے پناہ بے یقینی بھی تھی۔ ”یہ سب کیا ہے میٹھا؟“

اچانک ان کی حیرت پہ غصہ غالب آ گیا اور وہ زور سے چلائیں۔ ”عالبا“ سالوں کے بعد کسی نے ان کی اتنی بلند آواز سنی تھی۔

”سوری۔ گرنی۔ وہ میرا بہت دل چاہ رہا تھا۔“
”کیا مطلب ہے، دل چاہ رہا تھا؟ یہ فضول خیال تمہارے ذہن میں آتے ہی کیوں ہیں؟“

”گر بی۔ سوری ہوں۔“ وہ سہم سی گئی، ان کا اتنا شدید رد عمل دیکھ کے۔

”میں بھی آپ سے جھوٹ بول کے نہیں جانا چاہتی تھی۔ مگر آپ نے منع کر دیا تھا تو میں کیا کرتی۔ میرا بھی تو دل چاہتا ہے گھومنے پھرنے کو، مزے کرنے کو، آپ کیوں مجھے بند کر کے رکھنا چاہتی ہیں۔“

”میں تمہارے جھوٹ بول کے جانے پہ اتنی ناراض نہیں ہوں میٹھا۔ جتنا آپ سیٹ میں تمہارے اس ڈریس اور حلیے کو دیکھ کے ہوں۔ کیوں بنایا تم نے یہ حلیہ؟ کیوں اپنا اس روپ کو؟ کیوں؟ کیوں؟“

شدت جذبات و غضب سے ان کی آواز پھٹ سی گئی۔

”میرے پاس کوئی اچھا ڈریس بھی تو نہیں ہے۔ میرا بھی دل چاہتا ہے اچھے اچھے کپڑے پہننے کو۔ ہاں ٹھیک ہے، میں نے چوری کی سب کی کچھ نہ کچھ چیزیں غائب کیں مگر اس لیے کیونکہ مجھے یہ ڈریس بنانا تھا۔“
”آخر یہ ہی کیوں؟ ایسا لباس ہی کیوں بنایا تم نے؟ آخر تم کیوں نہیں وہ سب بھول۔“

دکھ بھرے لہجے میں کہتے کہتے وہ چپ ہو گئیں۔

کیونکہ میٹا لن کی ادھوری بات کا مفہوم جاننے کے لیے یہ سوال ہے ان کو تک رہی تھی۔
”جلدی کرو پکڑے بدل کے آؤ۔ مجھے وہ لباس ایک منٹ سے بھی پہلے آئندہ میں تمہیں اس طرح کے چلے میں نہ دیکھوں اور فوراً اسے پھٹا پھٹا منہ دھو کے آؤ۔“

اور جب تک میٹا رگڑ رگڑ کے اپنے منہ سے وہ رنگ اتار کے آئی مگر بنی احاطے میں موجود اس لباس کو مٹی کا تیل چمڑک کے دیا سلائی دکھا چکی تھیں۔
وہ چپ چاپ سنجیدہ سی شکل بنا کے ان کے برابر کھڑی ہوئی اور آگ کے لپکوں پہ نظر جمادی۔
میرا مٹی اور زینی کے ساتھ بڑی ستالی سے اندر داخل ہوئی تھی۔ مگر احاطے کے عین وسط میں لاؤ دکھتا دیکھ کے وہیں گئی اور سب سے پہلے میٹا کو تیز نظر سے گھورا۔

”تم یہاں کیا کر رہی ہو؟“
”دیکھ رہی ہیں۔ رورہی ہوں۔“ ”کیوں؟“
زینی نے تنک کے پوچھا۔
”جتنا کام تمہاری ماں اسے سوئپ کے گئی تھی اس کے بجائے تمہیں کرنا پڑتا تو تم بھی رورہی ہوتیں۔“
اس بار جواب پر شکوہ خانم کی جانب سے آیا۔ جسے نظر انداز کرتے ہوئے مرنے بدستور شک بھری نظریں میٹا کے پوچھا۔
”کلام کیے بھی ہیں۔ یا؟“

”آپ جا کے چیک کر لیں۔ ایک ایک کام کر کے گئی تھی میں۔“ بے ساختہ کہتے ہی اس نے زبان کی نوک دانتوں تلے دبلی۔
”کہاں؟ کہاں گئی تھیں تم؟“

”میرے ساتھ اسٹور روم کی صفائی کرنے گئی تھی اور اسے کہاں جانا تھا۔“
ر شکوہ خانم نے مہر کی تشفی کرائی۔ جو ہر حال ابھی نہ ہوئی تھی۔ کیونکہ وہاں سے سوال پہ سوال نشر ہو رہا تھا۔

”اور یہ کیا جلا یا جا رہا ہے؟“

”بتایا تو ہے اسٹور روم کی صفائی کروائی ہے کچھ فالتو سامن نکلوایا ہے وہ ضائع کر رہی ہوں۔“
”ماما نے اتنے فون کیے کوئی فون کیوں نہیں اٹھا رہا تھا۔“
”ہم اسٹور روم میں تھے۔ وہاں تک کیسے آواز جاتی۔“

”آخر یہ اسٹور روم میں رات کے وقت جانے کی کیا تک تھی۔“ مہر خود بھی رنج ہو رہی تھی ان کو بھی کر رہی تھی۔
”تم تینوں ماں بیٹیوں کو سوال در سوال کرنے کے علاوہ کوئی کام نہیں ہے۔ میرا گھر ہے۔ میرا جب دل چاہے گا جہاں چاہے گا صفائی کرواؤں گی، تمہیں خیال نہیں ہے ان سب باتوں کا تو کیا مجھے بھی نہیں ہوگا“
خبردار جواب کوئی اور سوال کیا تو چلو میٹا! مجھے اندر لے چلو۔ میں تھک گئی ہوں کام سے کم اور اس تفتیش سے زیادہ۔ تم بھی شام سے میرا سلیہ بنی ہو۔ اب چل کے آرام کر لو۔“

میٹا مسکین سی شکل بنائے ان کی دہل چیر اندر لے جانے لگی۔ مہر وہیں کھڑی ذرا غیر مطمئن سے انداز میں انہیں دیکھ رہی تھی۔
”مطلب یہ کوئی اور تھی جو ہمیں وہاں ملی؟ بس ذرا ذرا میٹا جیسی تھی۔“
ایمی نے منگے جیسا سر ہلایا اور زینی نے سوال کیا۔
”آپ کو کیا لگتا ہے ماما؟“

”مجھے نہ اس لڑکی پہ اعتبار ہے نہ تمہاری گریبی۔“
”تو آپ نے کچھ کہا کیوں نہیں؟“
”تمہاری گریبی سے کوئی بحث کر سکتا ہے بھلا اور میرے پاس ثبوت بھی تو نہیں ہے۔“

”میرا خیال ہے ماما۔ ہمیں ہی غلط فہمی ہوئی ہے“
وہ وہاں ہوئی تو یہاں پہ سب کام کون کرتا۔ اور ہم سے پہلے وہ واپس کیسے پہنچتی۔ ”ایمی جلدی مطمئن ہونے والوں میں سے تھی۔“

☆ ☆ ☆

دن میں جب ایمی اور زینی کلچ میں تھیں۔ میٹا اسی طرح دبے پاؤں وہ سب چیزیں رکھتے ان کے کمرے میں گئی۔ جیسے لینے گئی تھی۔

”یہ ایمی مونی کی پاز سب۔ یہ زینی سڑلی کا کلپ۔ یہ آئی لائن۔“
الماری کھول کے دراز میں رکھتے ہوئے وہ احتیاطاً مڑ مڑ کے ادھ کھلے دروازے کی جانب بھی دیکھ رہی تھی کہ مہر نہ آجائے۔

”اور یہ زینی کے بندے“ ارے اس کے ساتھ کا دو سرا کہاں گیا۔“

بندے رکھتے ہوئے وہ چونکی۔ وہ بس ایک سی تھا۔ سبز رنگ والا چاندی کا بندا۔

”اوقع شاید گرا آئی ہوں۔ مصیبت چلو۔ یہ ایک ہی رکھ دیتی ہوں۔ وہ تو پتا نہیں اب کہاں ہوگا۔“

☆ ☆ ☆

ماڑی آنکھوں میں ابھی تک نیند کا خمار تھا۔ رات جمیل کے راستے سے واپس آنا اور خود کشتی چلا کے آنا اس کے لیے ایک نیا مگر تھکا دینے والا تجربہ تھا۔ رات بہت دیر سے نیند آئی تھی۔ مگر کئی نیند جاگنے کے باوجود وہ خود کو بڑا ہشاش بشاش محسوس کر رہا تھا۔

فرانسیسی طرز کے بنے درتچے سے آتی نرم گرم شعاعوں نے اس کے سنہری گندم کے خوشوں کی رنگت والے چہرے پر ایک نکھار سا روشن کر دیا تھا۔ وہ ہونٹوں پہ ہلکی ہلکی محفوظ ہونے والی مسکراہٹ کے ساتھ باہر دیکھنے لگا۔ جہاں ٹو پیر روز قطار اور قطار ہمار دکھا رہے تھے۔ انکڑائی لیتے ہوئے وہ اٹھا تو کچھ ہلکا سا اس کے پیروں پہ وہم سے آن گرا۔ اس نے جھک کے دیکھا۔

وہی سبز رنگ والا چاندی کا بندا تھا۔
وہ مسکرا دیا۔ اسے میٹا کی باتیں سننے سرے سے یاد آنے لگیں۔

”ارے۔ ڈر گئے۔ اور مجھے لگا تم میرا ڈر دور کرو“

گے

وہی بے ساختہ کھلکھلا ہٹ۔
ماڑنے بند اٹھا کے اپنی پٹیلی پہ رکھ لیا۔
”سب کہتے ہیں۔ میں بہت سوئٹ اور کیوٹ ہوں؟“ ماڑی مسکراہٹ کچھ اور گہری ہوئی۔

”ضرور ہوگی۔ جس کی باتیں اتنی سوئٹ اور کیوٹ ہیں وہ خود کیسی ہوگی۔“

اس نے ذرا اوپر کے لیے آنکھیں بند کر کے اسے تصور کرنا چاہا۔ مگر ایک بھی نقش واضح طور پہ ذہن میں نہیں ابھر رہا تھا۔ ایک تو رات کی سیاہی، دوسرا اس کا عجیب و غریب سوانگ۔

”مگر تم جو بھی تھیں۔ تھیں بہت دلچسپ اور صاف اور شفاف بھی، کیسے ڈھونڈوں تمہیں ماما اس بندے کے سہارے۔“
وہ پٹیلی پہ رکھے بندے کو تنکے لگا۔

اور دور کہیں جمیل کے اس پار کا پی ڈی اینوں سے بنی خورد و جھاڑوں میں چھپی اس عمارت کے سب سے پچھلے کمرے میں کھڑی میٹا دیوار پہ بنی اس پینٹنگ کو سحر کے عالم میں تک رہی تھی۔ جہاں ایک شہزادہ شیشے کی سینڈل ہاتھ میں لیے اپنی سینڈل رٹا کو ڈھونڈ رہا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

خواتین ڈائجسٹ

کی طرف سے بہنوں کے لیے ایک اور ناول

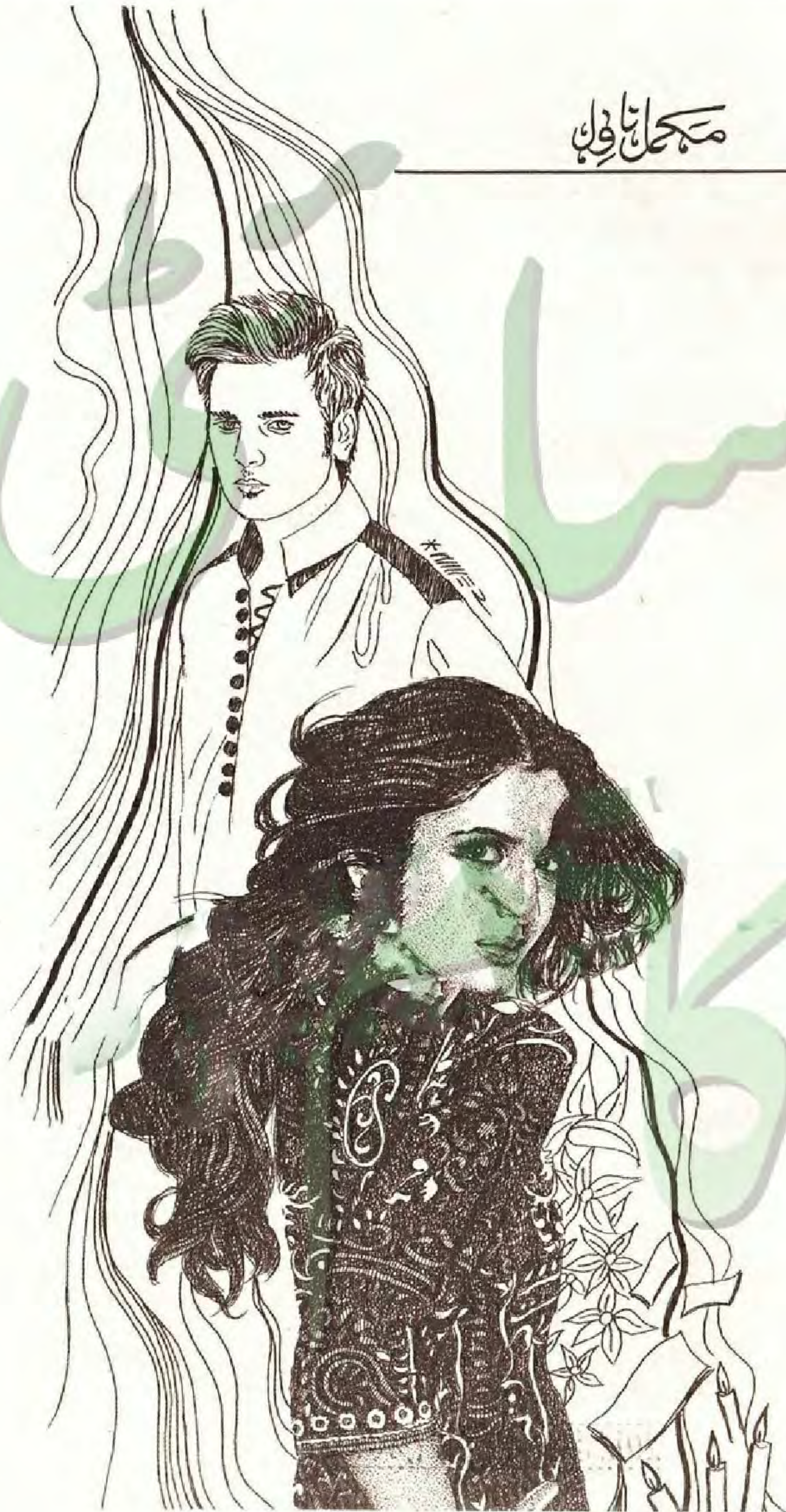
گوئی ایسا اہل دل ہو

فیصلہ شدہ

قیمت --- 250/- روپے

منوانے کا پے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37- اردو بازار، کراچی۔



مگریم مجنزی

رنگ کی رگزدن مٹی

”ایک تو میں اس لڑکی کی سونے کی علوت سے سخت پریشان ہوں۔ پتا نہیں کیسے اتا سولتی ہے۔“
 زاہدہ غصے سے بیڑ پاتی ہوئی اندر داخل ہوئیں تو اسانمنٹ بیٹاتی رمشانے چونک کر انہیں دیکھا۔
 ”کس کی بات کر رہی ہیں امی!“
 ”نمر کے علاوہ اور کون ہے اس گھر میں جسے سونے کے علاوہ اور کوئی کام نہیں۔“
 رمشانس پڑی۔ ”کیا ہو گیا امی! بے چاری سوتی ہی تو ہے۔“
 زاہدہ نے غصے سے اسے دیکھا۔ ”جاؤ جا کر اسے اٹھاؤ، اس سے پہلے کہ میں اسے جوتیاں لگا کر اٹھاؤں۔“
 ان کے دھمکی آمیز انداز پر وہ ابرو اچکاتی کھڑی ہو گئی۔ رمشا کمرے میں داخل ہوئی تو وہ گہری نیند میں تھی۔ اس کے دو تین دفعہ آواز دینے پر بھی جب وہ ٹس سے مس نہ ہوئی تو رمشانے اسے جھجھوڑ ڈالا۔
 ”کیا ہوا؟“ اس اچانک افتاد پر وہ بوکھلا کر اٹھ بیٹھی۔
 ”بھی تو کچھ نہیں ہوا، لیکن ابھی اگر تم نہ اٹھیں تو بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ چلو شاباش اٹھو۔ امی کا میٹر گھوم چکا ہے۔“ رمشانے اسے پچکارنے کے ساتھ اس کا

ہاتھ تمام کر اسے کھڑا ہونے کے لیے سہارا دیا۔
 ”ایک تو امی کو میری ہریات پر اعتراض ہوتا ہے۔“
 بالوں کو کچھو میں سمیٹتے ہوئے وہ بڑبڑاتی۔
 ”غلط امی کو صرف تمہارے زیادہ سونے پر اعتراض ہوتا ہے۔“

دروازے سے نکلے نکلے بھی رمشا کہتا نہیں بھولی تھی۔ نمو بھی برا سامنہ بنا کر اس کے پیچھے باہر نکل آئی۔
 وہ لاؤنج میں داخل ہوئی تو پہلا سامنا زابدہ کی گھورتی ہوئی نظروں کا کرنا ہوا۔ وہ خاموشی سے سامنے والے صوفے پر جا کر بیٹھ گئی۔

”تم نے دنیا میں کوئی کام کرنا ہے یا نہیں۔ حد ہوتی ہے کسی چیز کی۔ ہر وقت نیند۔ نیند میں نے تم سے کہا تھا سعدیہ آنے والی ہے، برائی بتائی تھی۔ کچن کے اور کتنے کام ہیں، لیکن نہیں۔ تمہارے کلن پر تو جوں ہی نہیں رہتی۔“ اور سر جھکائے غینہ کو بھگائی نمو نے سرال کے خیال سے ہی جھرجھری لی تھی۔

”نہ جو تمہارے طریقے ہیں آگے سرال جا کر جوتیاں کھاؤ گی۔ لوگوں نے یہی کہا ہے ماں نے کچھ نہیں سکھایا۔“
 ”چلو، ابھی مگنی تک ہوئی نہیں۔ امی نے نہ صرف مجھے سرال بھیج دیا، بلکہ جوتیاں بھی لگوا دیں۔“ وہ تصور میں خود کو سرال کی جوتیاں کھاتے دیکھنے لگی۔

”اب ہوں نکر نکر میرا منہ کیوں دیکھ رہی ہو۔ ہاتھ کچھ کھانے کو۔ پتا بھی ہے اپنے بہنوئی کی عادت کا پھر بھی۔ اور ہاں۔“ اسے اٹھتا دیکھ کر وہ بولیں۔ ”منہ پر پانی ڈال لو تاکہ تھوڑا ہوش آئے۔“ اب کے وہ تیزی سے لاؤنج سے باہر نکلی تھی۔

برائی کو دم دے کر وہ فریج سے سلاو کے لیے چیزیں نکال رہی تھی۔ جب رمشا اندر داخل ہوئی۔
 ”بھوگنی تیاری؟“
 نمہ نے فریج بند کر کے غصے سے اسے دیکھا۔

”ہاں ہو گئی۔ تم یہ دیکھنے آئی ہو؟“ اس کے جلے ہوئے انداز پر رمشا کی ہنسی نکل گئی۔
 ”نہیں۔ تمہاری پہلپ کرنے آئی ہوں۔“ نمو نے پختے کے انداز میں ٹرے شیف پر رکھی تھی۔
 ”جب سب کام ہو جاتا ہے تب آجائی ہو۔ کسی کو احساس ہی نہیں میرا۔ کام والی سمجھا ہوا ہے مجھے۔ اب تو مجھے لگنے لگا ہے میں امی کی سگی بیٹی نہیں۔ پتا نہیں ترس کھا کر کہاں سے اٹھایا تھا۔“
 اس کے اتنے دھمکی بیان پر بھی پاس کھڑی رمشا کے تاثرات میں کوئی تغیر رونما نہیں ہوا تھا۔ اپنی بات کا خاطر خواہ اثر نہ دیکھ کر نمو نے افسوس سے رمشا کو دیکھا۔

”میں نے کچھ بکواس کی ہے؟“
 رمشا نے تسلی سے شامی کباب کا آخری ٹکڑا منہ میں رکھ کر اسے دیکھا۔ ”من لی تمہاری بکواس اور تمہیں کچھ سمجھانے کا فائدہ تو ہے نہیں، کیونکہ ہر دفعہ کھانا پکانے کے بعد تمہاری اس قسم کی جذباتی تقریر سننے کی میں عادی ہو چکی ہوں اور یہ ترس کھا کر اٹھائے جانے والی بات ذرا امی کے سامنے جا کر کہو بتائیں گی تمہیں۔“

رمشا کی دھمکی کا ٹھیک ٹھاک اثر ہوا۔ وہ برا سامنہ بنا کر دوبارہ کام میں لگ گئی تھی۔
 ”کباب بڑے اچھے بنے ہیں۔“ پلیٹ سے دوسرا کباب اٹھاتے ہوئے رمشا چڑانے والے انداز میں بولی تو نمو ٹپ کر مڑی۔

”اللہ کرے تم یہ کباب کھا کر موٹی بھی بنیں بن جاؤ۔“ اس کے کونے پر رمشا قہقہہ لگا کر باہر نکل گئی جبکہ وہ سارا غصہ برتنوں پر نکالنے لگی۔



”اب تو بڑے بڑے لوگوں کو وقت مل گیا کہ وہ ہم غریب لوگوں سے مل لیں۔“
 جوں ہی اس نے ڈانٹنگ روم میں قدم رکھا، طرافت بھائی کی طنزیہ آواز اس کی سماعتوں سے

نکرائی۔ اس کا حلق تک کڑوا ہو گیا لیکن اس کے باوجود وہ ایک جبری مسکراہٹ ہونٹوں پر لے آئی۔
 ”ایسی بات نہیں طرافت بھائی! کام کی وجہ سے حلیہ خراب ہو رہا تھا۔ بس پینج کرنے گئی تھی۔“
 ”تو تمہارے کہنے کا مطلب ہے ہماری وجہ سے تم سارا دن کچن میں مصروف رہیں۔ بھی اتنی مصیبت تھی تو تباہ تیت۔ ہم آتے ہی نہیں۔“
 نمو نے بے بسی سے اپنی ماں کو دیکھا، جنہوں نے آنکھ کے اشارے سے اسے بولنے سے منع کر دیا تھا۔
 ”طرافت بیٹا! اتنی تھوڑی برائی ڈالی ہے تمہ نے اور لوٹا۔ اور یہ کباب لو۔“

زابدہ کے کہنے پر نمو نے ان کی پلیٹ کا جائزہ لیا۔ جہاں پہلے سے چاول اور چکن کا میاڑ بنا تھا۔ وہ گہرا سانس لے کر کرسی پر بیٹھ گئی اور مسکرا کر اپنی بہن کو دیکھا۔ جس کے چہرے پر حسب معمول ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ پھر اس نے نظریں رمشا کی طرف گھمائیں، جس کے ماتھے کے بل وہ با آسانی دیکھ سکتی تھی وہ جانتی تھی وہ کتنے ضبط سے بیٹھی ہے۔

”اور آئی جی! ہمارے سالے صاحب اور ان کی زوجہ محترمہ نظر نہیں آرہیں۔“ جب کافی دیر تک کوئی بات ان کی گرفت میں نہیں آئی تو انہوں نے نیا نکتہ اعتراض نکال لیا۔

”بیٹا! دسیم دلہن کے ساتھ اس کے میکے گیا ہوا ہے۔“

طرافت بھائی کا ایک قہقہہ گونجا تھا۔ رمشا نے ناگواری سے انہیں دیکھا۔

”جب بھی آؤ دسیم صاحب وہیں پائے جاتے ہیں۔ کہیں گھر والو بننے کی تیاری تو نہیں ہو رہی۔“
 اپنے گھٹیا مذاق سے وہ خود ہی محظوظ ہو کر ہنس رہے تھے۔ جبکہ باقی افراد بالکل خاموش تھے۔

”رمشا بیٹا! آس کریم لے آؤ۔“ زابدہ کب سے رمشا کو دیکھ رہی تھیں اور جانتی تھیں کسی بھی وقت اس کا ضبط جواب دے سکتا ہے۔ اس لیے انہوں نے

اسے اٹھادیا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ خود بھی اس کے پیچھے آئی تھیں۔ وہ کرشل باؤل پختے کے انداز میں ٹرے میں رکھ رہی تھی۔ رمشا نے ایک ناراض نظر ان پر ڈالی۔ اس سے پہلے وہ اسے کچھ کہتیں، گھبراہٹ ہوئی سعدیہ اندر داخل ہوئی تھی۔

”امی! جب دسیم کو پتا تھا میں اور طرافت آرہے ہیں تو کیا ضرورت تھی اسے رخسانہ کو لے کر جانے کی۔ ایک دن صبر نہیں ہو سکتا تھا اس سے۔ اب گھر جا کر ان کی طنزیہ گفتگو شروع ہو جائے گی اور ساتھ ان کی بہنیں بھی شروع ہو جائی ہیں۔“ آخر میں وہ روہاسی ہو گئی تھی۔

رمشا نے غصے سے سعدیہ کو دیکھا۔
 ”تبا! جب تمہیں پتا ہے تمہارے سرتاج کا مذاق اتنا شانہ ہے تو کیوں اسے لے کر یہاں آئی ہو۔“
 ”دیکھ رہی ہیں امی! اب شادی ہو جانے کا مطلب یہ تو نہیں کہ اس گھر پر میرا حق ختم ہو گیا۔ یہاں نہ

خواتین کے لیے خوبصورت تحفہ

حیران کن کھسپ والی انعامی کالری میٹنگ

کانیائیڈن قیمت - 750/- روپے

کے ساتھ کھانا پکانے کی کتاب

گھٹانا کھانا

قیمت 250/- روپے بالکل مفت حاصل کریں۔

آج ہی - 800/- روپے کا مٹی آؤ رار سال فرمائیں۔

منگو انے کا ہند:

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37، اردو بازار، کراچی

فون نمبر: 32216361

اوس تو کہاں جاؤں؟“ سعدیہ تڑپ کر بولی۔
 ”رمشا! تم چپ رہو۔“ زاہدہ نے غصے سے رمشا کو دیکھا۔ ”بڑی بہن ہے تمہاری۔“
 ”پتا ہے مجھے پر اب انہیں کیوں نہیں سمجھاتیں کہ دنیا میں سارے مسئلے صرف ان کے ساتھ نہیں۔ ہم بھی اسی دنیا میں رہتے ہیں۔ ہمارے ساتھ بھی سو مسائل ہیں۔“ کہہ کر وہ رکی نہیں تھی۔
 جبکہ سعدیہ کے آنسوؤں میں روائی آگئی تھی۔
 ”میرا یہاں آنا برا لگتا ہے تو میں آئندہ نہیں آؤں گی۔“

”ارے!“ زاہدہ نے اسے گلے لگالیا۔ کیوں نہیں آؤ گی۔ تمہارے باپ کا گھر ہے۔ تمہاری ماں ابھی زندہ ہے اور رمشا کی باتوں کو دل پر مت لیا کرو۔ وہ تم سے بہت پیار کرتی ہے۔ تمہیں پریشان دیکھتی ہے تو بس ایسے بول جاتی ہے۔ ورنہ تم سے بہت پیار کرتی ہے۔“ وہ اسے ساتھ لگائے تسلیاں دینے لگیں۔



برتن دھو کر جب وہ کمرے میں آئی تو اس کا خیال تھا ”نمو سو گئی ہوگی“ لیکن اسے جاکتے دیکھ کر وہ حیران ہوئی۔
 ”تم سوئیں نہیں؟“
 ”نہیں“ کچھ سوچ رہی تھی۔ ”نمو نے ابرو اچکا کر اسے دیکھا۔

”سعدیہ باجی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ شادی سے پہلے وہ کتنی بولڈ اور باتونی ہوا کرتی تھیں۔ کتنی رونق ہوتی تھی ہمارے گھر میں ان کی وجہ سے۔ اب تو میں جب بھی انہیں دیکھتی ہوں وہ والی سعدیہ باجی لگتی ہی نہیں۔ ان کے چہرے پر جو مسکراہٹ ہوتی ہے وہ بھی اچھی لگتی ہے اور وہ طرافت بھائی۔“ اس نے منہ بنایا۔ ”ان کا صرف نام ہی طرافت ہے۔ ورنہ جتنی ان میں کڑواہٹ ہے۔ کرنا بھی ان سے بہتر ہوگا۔“
 سنجیدگی سے اس کی باتیں سنتی رمشا اس کی مثال پر مسکرا دی تھی۔ نمو نے ناراضی سے اسے دیکھا۔

”اس میں ہنسنے والی کیا بات ہے۔ میں سچ کہہ رہی ہوں۔ تم نے کبھی ان کا ایک ایسا جملہ سنا جس میں طنز نہ ہو۔ سعدیہ باجی بے چاری اسی لیے ایسی ہو گئی ہیں۔ کبھی کبھی تو مجھے ڈر لگتا ہے کہیں اسی ہمارے لیے یہ بھی طرافت بھائی جیسا نمو نہ نہہند کر لیں۔“
 اب کی بار رمشا کھلکھلا کر ہنس پڑی۔
 ”تم سے تو بات کرنا فضول ہے۔ میرا ہی داغ خراب ہے۔“ نمو نے غصے سے اس کی طرف کروٹ بدل لی۔

”بے وقوفوں کی طرح مت سوچا کرو۔“ کچھ دیر بعد اس نے رمشا کی سنجیدہ آواز سنی۔

”میری ہماری دشمن نہیں جو ایسا سوچیں گی۔ سعدیہ باجی کے لیے انہوں نے اچھا ہی سوچا تھا۔ اسی کو کیا پتا تھا کہ طرافت بھائی کا مزاج ایسا ہے۔ ماں باپ اولاد کے لیے سب کچھ کرتے ہیں۔ صرف قسمت نہیں بدل سکتے اور مجھے تو کبھی کبھی سعدیہ باجی پر بہت غصہ آتا ہے۔ اتنے بھی جابر اور ہلا کو ثابت نہیں طرافت بھائی اور نہ ڈر کھولا کے خاندان سے تعلق ہے ان کی مندوں کا۔ میں ان کی جگہ ہوتی تو کب کا ان کی مندوں کو ٹھیک کر چکی ہوتی۔ بجائے اس کے کہ وہ اپنا مسئلہ خود حل کریں یہاں آکر امی کو اپنے دکھڑے سنا کر اور پریشان کر جاتی ہیں اور تم صرف سعدیہ باجی اور طرافت بھائی کے بارے میں سوچتی ہو“ جبکہ میں بھابھی اور بھائی کے بارے میں بھی سوچتی ہوں۔ ایک ہی تو ہمارا بھائی ہے۔ اس کی شادی کے حوالے سے کتنے ارمان تھے اور سب ارمانوں پر پانی پھیر کر رکھ دیا ہمارے بھائی نے۔ خو وہی شادی کر لی۔ یہاں تک بھی ٹھیک تھا۔ زندگی انہوں نے گزارنی ہے جیسی ان کی خوشی، لیکن جس کو وہ اس گھر میں لے کر آئے ہیں، کم از کم اس کو یہ تو بتادیں یہ میری ماں ہے، کتنی مشکل سے اس نے ہمیں پیلا ہے۔ ان کی عزت تو کھوا سکتے ہیں۔ جب سے شادی ہوئی ہے، کتنا عرصہ یہاں پر رہی ہیں۔ نہ خود رہتی ہیں اور نہ بھائی کو رہنے دیتی ہیں۔ اوپر سے ان کے رشتے دار۔ بے انتہا برے لگتے ہیں مجھے۔ لگتا ہی

نہیں ہے کسی شریف خاندان سے ان کا تعلق ہوگا۔“
 رمشا کے کڑوے لہجے پر نمو نے بھی برا سامنہ بنایا۔ بھابھی کے گھروالے اسے بھی اچھے نہیں لگتے تھے۔ خاص طور پر ان کا بھائی۔ عجیب گھٹیا انداز تھا اس کا دیکھنے کا اور گفتگو بھی اتنی ہی فضول کرتا تھا۔
 ”پچلو اب سو جاؤ، تم نے تو صبح کالج جانا نہیں پر مجھے جانا ہے۔“ رمشا نے کہنے کے ساتھ لائٹ آف کر دی اور اس کے قریب آکر لیٹ گئی۔



”نمو!“ وہ دھلے ہوئے کپڑوں کی ٹوکری لیے چھت پر جارہی تھی جب رخسانہ کی آواز پر رک گئی۔ ”ڈراؤ گلاس جوس تو میرے کمرے میں دے جانا۔“

رخسانہ کے آرڈر پر اس نے۔۔۔ اپنے ہاتھ میں تھامی ٹوکری کو دیکھا اور گھبرائی سانس لے کر ٹوکری زمین پر رکھ دی اور کچن کی طرف آئی۔

”وہ قدم کے فاصلے پر کچن ہے، لیکن مجال ہے جو قدموں کو تھوڑی سی زحمت بھی دے دی جائے۔“
 ٹرے میں گلاس رکھتے ہوئے وہ مسلسل بیڑماری تھی اور جب دستک دے کر وہ اندر داخل ہوئی تو سامنے بیڈ پر نیم دراز بھابھی کے بھائی کو دیکھ کر اس کا دل چاہا کہ کاش! اس کو چھو منتر آتا اور وہ پلک جھپکتے میں غائب ہو جاتی۔

اس پر نظر پڑتے ہی وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور جس طرح اس کو دیکھ کر مسکرایا، نمو کا دل چاہا اسے جلا کر خاکستر کر دے۔ وہ ٹرے ٹیبل پر رکھ کر مڑنے لگی تھی۔ جب اس نے اسے کہتے ہوئے سنا تھا۔

”رخسانہ! تمہارے سرال میں گھر آئے مہمان کو سلام کرنے کا رواج نہیں ہے۔“

نمو کی مٹھیاں بچ بچ گئی تھیں۔ جانتی تھی کہ سنایا جا رہا ہے۔ وہ نظر انداز کر کے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

”تمی دور سے آیا ہوں۔ خالی جوس پر ہی رخصاؤ گی۔ کچھ کھانے کو بھی منگوالو۔“

”نمو! ذرا چائے کے ساتھ کباب اور روٹل بھی لے آتا۔“
 نمو تھملائی ہوئی باہر آگئی۔
 رخسانہ پتا نہیں زوار کو کون سے قصے سن رہی تھی، لیکن اس کی پریسوج نظریں دروازے پر جمی تھیں، جہاں سے وہ گئی تھی اور جہاں سے ابھی اسے آتا تھا۔
 ”تمہاری ساس اور تمہاری وہ دوسری خونخوار نند کہاں ہیں؟“

اپنی رام کبابی کے جواب میں یہ سوال سن کر وہ بد مزہ تو ضرور ہوئی تھی، لیکن کہا کچھ نہیں۔

”رمشا تو کالج گئی ہے اور ساس صاحبہ گئی ہیں کسی کی مزاج پر سی کرنے۔“ اس نے کافی بے زاری سے ان کا ذکر کیا۔

”ہوں۔“ اس نے ہنکارا بھرا جوس کا آخری گھونٹ لے کر گلاس سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور کھڑا ہو گیا۔

”تم کہاں جا رہے ہو؟“ رخسانہ نے قدرے حیرت سے اسے دیکھا۔

”یہی سوچ رہا ہوں۔ گھر کا چکر لگالوں۔“
 رخسانہ کے ماتھے پر ہل پڑ گئے تھے۔

”آرام سے بیٹھ جاؤ زوار!“
 ”کیوں؟“

”کیوں کیا میں جانتی نہیں کیا کہ تم چکر لگانے جا رہے ہو یا چکر چلانے۔“

وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ ”جب جانتی ہو تو روک کیوں رہی ہو۔“

”اس لیے کہ تم اس وقت و سیم کے گھر میں ہو اور وہ و سیم کی بہن ہے۔ اگر و سیم کو پتا چل گیا تا۔“ اس نے آگے بات ادھوری چھوڑ دی۔

”وہ! میں ڈر گیا۔“ اس نے ڈرنے کی ایکٹنگ کی تو رخسانہ نے ناگواری سے اسے دیکھا۔

”یہ تم و سیم کی دھمکی اسے دنا جو و سیم کو نہ جانتا ہو اور و سیم تمہارا کیا کر لے گا۔ کاٹھ کا لونیا ہوا ہے تم نے جو کتنی ہو“ آنکھ بند کر کے یقین کر لیتا ہے۔“

”اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم اس کی بہن کو تنگ کرو۔“

”تنگ کہاں کر رہا ہوں۔“ وہ اپنے گلے میں پڑی چین کو گھماتے ہوئے بولا۔

”تو؟“ رخسانہ نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”دل آیا ہے اس پر۔“ رخسانہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑی تھی۔ زوار نے غصے سے اسے دیکھا۔

”بہننے والی کیا بات ہے؟“

”تمہارا دل تو ہر دوسرے دن کسی نہ کسی پر آ رہا ہوتا ہے۔“

”ہاں! لیکن اس سے میں نے شادی کرنے کا سوچا ہے۔“

”کیا؟“ اب کی بار رخسانہ کو صحیح معنوں میں جھٹکا لگا تھا۔ ”ناغ تو ٹھیک ہے تمہارا۔“ رخسانہ ایک دم بیٹھے سے کھڑے ہو گئی تھی۔

”بالکل ٹھیک ہے اور بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے اور تم میری مدد کرو گی یہ شادی کروانے میں۔“

”میں!؟“ رخسانہ نے اپنے سینے پر انگلی رکھ کر کہا۔ ”کوئی نہیں مانے گا۔ اس گھر کے لوگ مجھے پسند نہیں کرتے اور تمہاری رہ پویشیں بھی خیر سے کافی اچھی ہے۔“ وہ طنزیہ انداز میں اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

”سی لیے تو تم سے کہہ رہا ہوں، تم تو اگر دسیم کو منالو گی تو آدھے سے زیادہ مسئلہ تو ہمیں حل ہو جائے گا۔ اور اس کے گھر والے اس کی بات نہ مان کے جائیں گے کہاں۔“

رخسانہ نے گہری سانس لی جس کا مطلب تھا وہ قائل ہو گئی ہے۔

”پر تمہیں اس میں نظر کیا آیا ہے جو ساری دنیا کی لڑکیاں چھوڑ کر تم اس سے شادی کرنے کو تیار ہو گئے ہو۔“

”بیوٹی! خالص پن ہے اس کی ذات میں۔ بڑی معصوم سی ہے اور میرے جیسے بندے کے لیے ایسی ہی لڑکی چاہیے۔ جو مجھ سے میرے دن رات کا میرے کام کا حساب نہ مانگے۔ میں بے شک باہر دس لڑکیوں

کے ساتھ راہ و رسم رکھوں، لیکن وہ بس میرے لیے ہو۔“

رخسانہ نے تلی بجا کر داد دی۔

”کیا سوچ ہے؟“ نو سوچو ہے کھا کر ملی جج کو چلی۔ کیا تمہیں لگتا ہے تم جیسے کرکٹر کیس انسان کو اتنی نیک شریف لڑکی مل سکتی ہے؟“ زوار کے جڑے بھج گئے تھے۔ پھر جیسے غصے پر قابو پا کر ہنس کر آیا۔

”جب تمہارے جیسی پچاس ہوائے فریڈ ز رکھنے والی کو دسیم جیسا شوہر مل سکتا ہے تو مجھے نمو جیسی بیوی کیوں نہیں۔“

”زوار!“

رخسانہ غصے کے مارے جج پڑی تھی۔

”ریلیکس مائی ڈیر سسٹر! جیسا کوئی دسا سنو گی۔ آخر کو میں تمہارا ہی بھائی ہوں۔“

اس سے پہلے وہ کوئی جواب دہی نمو زالی تھی تے ہوئے اندر داخل ہوئی۔ ٹرائی رکھ کر وہ ایک سیکنڈ کا انتظار کیے بغیر واپس مڑ گئی۔ سادا کچھ اور نہ فرمائش کر دی جائے اور پھر تب تک باہر نہیں نکلی جب تک وہ چلا نہیں گیا اور زائدہ گھر واپس نہیں آئیں۔

”خدا کا واسطہ ہے نمو اب آ بھی جاؤ اور کتنا تیار ہو گی۔ ہم اسپتال جا رہے ہیں، کسی فنکشن میں نہیں۔“ اسے مسلسل آدھے گھنٹے سے آئینے کے آگے کھڑے دیکھ کر رشتا اکٹا کر بولی۔ نمو کنگھی رکھ کر اس کی طرف مڑی۔

”پتا ہے مجھے کہ ہم اسپتال جا رہے ہیں، لیکن کتنی بڑی خوشی کے لیے جا رہے ہیں۔ یہ تمہیں پتا ہے؟ ہم اپنے بھانجے کو دیکھنے جا رہے ہیں۔“ اس کی خوشی دیکھ کر رشتا مسکرا دی۔

”وسیم بھائی ابھی تک نہیں آئے۔“ رشتانے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ تب ہی باہر تیل بجی تھی۔

”آگئے بھائی!“ نمو دوڑ کر باہر کی طرف بڑھی تھی۔ رشتانے سب دووازے لاک کیے اور جب وہ

لاؤنج کا دروازہ بند کر کے برآمدے میں آئی تو نمو کے ساتھ کھڑے نیل کو دیکھ کر اس کی مسکراہٹ عائب ہو گئی۔ اس کے مسلسل دیکھنے پر اسے سلام کرنا پڑا تھا۔ لیکن اس کے روکے انداز کے باوجود کافی برحوش انداز میں اس کے سلام کا جواب دے کر وہ باہر نکل گیا تھا۔ نمو بھی اس کے پیچھے بڑھی تھی، جب اس نے نمو کا دھپٹا کھینچ کر اسے روکا تھا۔

”اسے کس نے بلایا ہے؟“

”سی نے بھیجا ہے انہیں۔“

”سی کو کوئی اور نہیں ملا تھا۔“ اب کے وہ غصے سے بولی۔

”وہ ہمارے نوکر نہیں ہیں۔ شکر کرو آگئے ہیں۔“

رشتا کے غصے انداز روختاتے ہوئے بولی۔

”زیے تمہیں پر اہم کیا ہے نیل بھائی سے۔ اتنے اچھے تو ہیں۔“ رشتانے کھا جانے والی نظروں سے نمو کو دیکھا۔

”اس کے برے ہونے کے لیے یہ حوالہ کافی نہیں کہ وہ طرانت بھائی کا بھائی ہے۔“

نمو نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا جب رشتانے اسے ٹوک دیا۔

”تم پلیز اپنی چونچ بند ہی رکھو۔ پہلے ہی میرا موڈ آف ہو گیا ہے۔“

نمو برا سامنے بنا کر گاڑی کی طرف بڑھ گئی۔ جہاں نیل کار کا اگلا دروازہ کھولے ان کا منتظر تھا۔ نمو جانتی تھی یہ دروازہ کس کے لیے کھولا گیا ہے اور وہ یہ بھی جانتی تھی رشتا کبھی نہیں بیٹھے گی۔

اس سے پہلے کہ رشتا کوئی سخت بات کہہ کر ماحول کو خراب کر دے وہ اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ نیل نے ایک خاموش نظر پیچھے رشتا پر ڈالی اور ڈرائیونگ سیٹ پر آکر بیٹھ گیا۔ سارا راستہ خاموشی سے کٹا تھا۔

جب وہ اسپتال پہنچے تو وہاں زائدہ کے علاوہ طرانت بھائی، ان کی والدہ اور دونوں بہنیں بھی موجود تھیں۔ سب کو سلام کر کے وہ دونوں سعدیہ کے پاس لیٹے لیٹے چنے کی طرف آ گئیں۔

”کتنا پیارا ہے بالکل مجھ پر گیا ہے۔“ رشتانے فوراً اسے گود میں اٹھالیا۔

”تم پر گیا ہوتا تو پیارا نہ ہوتا۔“ نمو نے برا سامنے بنا کر کہا۔

تب ہی زائدہ اس کے قریب آکر سرگوشی میں بولیں۔

”وسیم کو فون کیا تھا؟“

”میں نے فون کیا تھا۔ بھائی کہہ رہے تھے بھابھی کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ وہ شام کو آئیں گے۔“ نمو کے جواب پر زائدہ کے چہرے پر پریشانی جھلکنے لگی۔

”تم کہاں چلے گئے تھے؟“ سعدیہ کی سانس کی تیز آواز پر تینوں مڑ کر پیچھے دیکھنے لگے، جہاں نیل کھڑا تھا۔

”نیل کو میں نے ہی بھیجا تھا بچیوں کو لانے کے لیے۔“ زائدہ نے کچھ شرمندہ ہو کر وضاحت دی۔

”تمہیں پتا نہیں تھا بہنوں نے گھر جانا تھا۔“

”میں آگیا ہوں نا، اس میں اتنا شور کرنے والی کیا بات ہے۔“ جواباً وہ اکھڑے ہوئے لہجے میں بولا تو گھرے میں محسوس کی جانے والی خاموشی چھا گئی۔

”نیل بھائی! آپ نے دیکھا اپنا بھتیجا کتنا پیارا ہے۔“

ماحول کے تناؤ کو کم کرنے کے لیے نمو نے ہشاش لہجے میں نیل کو مخاطب کیا۔ تو وہ مسکراتا ہوا رشتا کے پہلو میں آکر کھڑا ہو گیا، جو بچے کو اٹھائے کھڑی تھی۔ اس کے یوں قریب کھڑے ہونے پر اس نے جزبہ ہو کر نمو کو دیکھا، جس کے چہرے پر دبی دبی سی مسکراہٹ تھی۔ نیل کی بہنوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو اشارہ کیا تھا۔ رشتا کی غیر ارادی نظر ان پر پڑی تھی اس نے تیزی سے بچے کو نمو کی گود میں دیا اور خود سعدیہ کے قریب جا کر بیٹھ گئی۔

کچھ دیر بعد جب نیل اپنی بہنوں کو لے کر چلا گیا تو اس کے تھے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑے۔

وہ سڑک کے کنارے یوں کھڑی تھی جیسے بصارت

سے محروم ہو۔ اس وقت اسے نہ دکھائی دے رہا تھا نہ سنائی دے رہا تھا۔ اس کے قریب گاڑی کا ہارن بجاتا تو وہ چونک کر حواسوں میں آئی۔ ارد گرد نظر ڈالنے پر اسے احساس ہوا، کئی لوگ اس کی طرف متوجہ ہیں۔ وہ جلدی سے سڑک پار کرنے لگی، جب ایک گاڑی بڑی تیزی سے اس کی طرف بڑھی۔ اس کے حواس اتنے منتشر تھے کہ وہ نہ آگے جاسکی اور نہ پیچھے مڑسکی۔ اگر کار ڈرائیور بروقت گاڑی نہ روکتا تو وہ اس وقت اوپر پہنچی ہوتی۔

”محترمہ! دماغ خراب ہے آپ کا۔ خودکشی کے لیے آپ کو میری ہی گاڑی ملی تھی۔“ وہ جو کوئی بھی تھا، گاڑی کی کھڑکی سے سر نکال کر اس پر برس رہا تھا اور وہ بند آنکھوں کے ساتھ خود کو یہ یقین دلانے میں مصروف تھی کہ وہ زندہ ہے۔

”بیٹا! آپ ٹھیک ہو، چوٹ تو نہیں آئی آپ کو؟“ ایک شفیق آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی تو اس نے جھٹکے سے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ جیسی شفیق آواز تھی ویسا ہی شفیق چہرہ اس کے سامنے تھا۔

”چوٹ آئی ہے بیٹا؟“ اب کے انہوں نے پریشانی سے اس کی آنکھوں کے آنسو دیکھے۔

نمو کا سر بے ساختہ نفی میں ہلا۔

”پھر ایسے کیوں رو رہی ہو؟“ نمو ان کا چہرہ دیکھنے لگی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا بتائے یا نہیں۔

”بولو بیٹا! شاید میں تمہاری کوئی مدد کر سکوں۔“ عام حالات میں شاید وہ کبھی یہ بات نہ کرتی، لیکن اس وقت وہ اتنی پریشان تھی کہ اپنا پرسل میٹران سے ڈسکس کرنے لگی تھی۔

”وہ آئی! میری سسر بہاں سامنے والے اسپتال میں ایڈمٹ ہیں۔ میں ان کی میڈیسن لینے آئی تھی۔ میرے سوئیٹر کی جیب میں پانچ ہزار کا نوٹ تھا۔ دکان پر جا کر نکالنے لگی تو نوٹ غائب تھا۔“ آخر میں پھر اس کی آواز بھر اگئی۔

”وہ!“ انہوں نے سن کر افسوس کا اظہار کیا۔ اس سے پہلے وہ مزید کچھ کہتیں گاڑی کا ہارن بجا

تھا۔ ان دونوں نے مڑ کر گاڑی کی طرف دیکھا۔ وہ لڑکا جو کچھ دیر پہلے اس پر چلا رہا تھا اب غصے سے ہارن دے رہا تھا۔ سامنے کھڑی عورت نے جلدی سے اپنے کندھے سے لٹکے بیگ کی زب کھولی اور اس میں ہزار ہزار کے نوٹ نکالے اور گرن کر اس کی طرف بڑھائے۔ اب حیران ہونے کی باری نمو کی تھی۔ اس کے ہاتھ بڑے بے ساختہ انداز میں پیچھے کی طرف گھومے تھے۔

”رکھ لو بیٹا! تمہارے پاس جب ہوں مجھے واپس کر دیتا۔“

”لیکن آئی! میں یہ کیسے لے سکتی ہوں۔ آپ مجھے جانتی نہیں اور نہ میں یہ۔“ وہ اتنی مہلانی پر بو کھلا کر رہ گئی تھی۔

”میں جانتی ہوں تم کیا کرنا چاہتی ہو۔ یہ میرا نمبر ہے، جب مل چاہو واپس کر دیتا۔“

زبردستی نوٹ اس کے ہاتھ میں تھا مگر اس کا کمال پتہ تھا کہ گاڑی میں بیٹھ گئیں۔ وہ وہیں پتھر پتھر کر رہ گئی۔ ہوش تب آیا جب گاڑی زن سے اس کے قریب سے گزر گئی۔

رمشا غصے سے اسے گھور رہی تھی اور وہ نظریں جھراتے ہوئے کبھی دائیں طرف اور کبھی بائیں طرف دیکھ رہی تھی۔

”تم اس وقت ہوش میں تو تھیں۔؟ کسی بھی راہ چلنے نے اگر تمہیں پیسے پکڑا دیے اور تم نے پکڑ لیے۔ فقیر بنی ہو تم؟“ رمشا کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس کے منہ پر کھٹکنا لگا۔

”میں کیا کرتی رمشا! مجھے اس وقت کچھ سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا۔ وہ پانچ ہزار روپے مجھے طرقت بھائی نے دیے تھے۔ اگر میں جا کر کہتی کہ مجھ سے کم ہو گئے ہیں تو تمہیں کیا لگتا ہے؟ وہ میرا یقین کرتے؟ الٹا انہوں نے میرے ساتھ ساتھ سعدیہ باجی کی بھی بے عزتی کر دی تھی۔“

”وہ سب تو ٹھیک ہے، پر تم مجھے یہ بتاؤ۔ تم نے جو کیا، وہ ٹھیک ہے۔ آج کل کوئی زمانہ ہے کسی پر یقین کرنے کا۔ اب! مجھے تو یہ سوچ کر شرمندگی ہو رہی ہے کہ تم نے ایک غیر عورت کو اپنی دکھی داستان سنا کر پیسے لے لیے۔ یہ بات میں ای کو بتاؤں تو ابھی تمہیں دس جوتیاں لگا کر ایک گنیں گی۔“ نمو نے برا سامنہ بنایا۔

”تمہیں یہ سب اس لیے نہیں بتایا کہ تم لیکچر دینا شروع کرو۔“ وہ گود میں رکھا کٹن قالین پر بیٹھ کر باہر نکل گئی۔ جبکہ رمشا نے بے اختیار اپنا ہاتھ پیٹ ڈالا۔

چوتھی دفعہ جب اس نے ریسیور واپس کر ڈیل پر رکھا تو رمشا کا ضبط جواب دے گیا۔

”تمہیں آخر تکلیف کیا ہے نمو! یہ چوتھی دفعہ ہے جب تم نے تو ہاتھ بڑھا کر فون بند کر دیا ہے۔“

نمو نے بے بسی سے اس کی شکل دیکھی۔ ”میری سمجھ میں نہیں آ رہا کیا بات کروں۔ مجھے تو ان کا نام بھی نہیں پتا۔“ رمشا نے کمری سانس لے کر اسے دیکھا۔

”کبھی کبھی مجھے تم پر ترس آتا ہے نمو! کیا بنے گا تمہارا۔ ائی چیج کہتی ہیں۔ سسرال میں خوب نام روشن کرو گی ہمارا۔“

”تم پھر شروع ہو گئیں۔ لیکچر دینا باتیں کرنا آسان ہے تم کو رو بات۔“

”کیوں میں کیوں کروں میں نے لیے تھے پیسے؟“ رمشا چمک کر بولی۔

”رمشا! ایسا کرتی ہوں۔ پیسے واپس ہی نہیں کرتی۔ انہیں کیا پتا میں کون ہوں میرے پانچ ہزار بھی بیچ جائیں گے۔“ اس نے بچوں کی طرح تلی بجا کر کہا تو رمشا نے افسوس سے سر ہلایا۔

”اللہ تعالیٰ کو جواب نہیں دینا تم نے۔ یہاں آکر نمو ڈھیلی پڑ گئی۔ اس نے پہلے آنکھیں بند کر کے منہ ہی منہ میں کچھ پڑھا اور پھر پورا نمبر ڈائل کر کے ریسیور کان سے لگا لیا۔ تین ہلن ہو چکی تھیں اور ہرنیل کے

ساتھ اس کی دھڑکن ہوتی جا رہی تھی پانچویں ہیل پر فون اٹھالیا گیا۔ بھاری مردانہ آواز سن کر آواز اس کے حلق میں پھنس کر رہ گئی۔

”کون ہے؟“ بھئی بھول بھی ہو۔“ مسلسل ہیلو کرنے پر اب وہ شخص جھنجھلا کر بولا تھا۔ ہلکا سا کھٹکارنے کے بعد اس نے سلام کیا تھا اور جواب سننے بغیر سوال کر ڈالا تھا۔

”میں آنٹی سے بات کر سکتی ہوں۔“ وہ سری طرف ایک پل کے لیے خاموشی چھا گئی تھی۔

”اچھا جو سلی مجھے ان کا نام نہیں معلوم۔“

”دیکھیں! جب آپ کو پتا ہی نہیں کہ آپ کو کس سے بات کرنی ہے تو میں کس سے بات کرواؤں۔ آپ کو تو شاید یہ بھی نہیں پتا کہ سسر نے فون کس کو کیا ہے آپ نے؟“ اب کے نمو نے گھبرا کر رمشا کو دیکھا جو ہٹا نہیں اسے اشارے سے کیا سمجھا رہی تھی۔

”دیکھیں۔“

”عجیب باتیں کر رہی ہیں آپ۔ اب فون میں سے کیسے دیکھوں آپ کو؟“

”ج۔“ اب کے نمو جھنجھلا کر بولی۔ ”میرا مطلب ہے، آپ آنٹی سے کہیں کہ میرا فون ہے۔“

”میرا کون؟“

”اف!“ نمو کی مٹھیاں بھیج گئی تھیں۔

”میں نے آنٹی سے پانچ ہزار لیے تھے۔ وہ انہیں واپس کرنے ہیں۔ آپ میری ان سے بات کروا میں۔“ اس نے جلدی سے بات مکمل کی۔ مبادا وہ پھر کوئی بات پکڑ کر نہ بیٹھ جائے۔ وہ سری طرف سے جوابا ”اتنا بلند قہقہہ سنائی دیا تھا کہ اسے ریسیور کان سے ہٹانا پڑا۔

”اچھا تو آپ وہ ہیں۔“ اس نے وہ پراچھا خاصا زور دیا تھا، جبکہ نمو بھی سمجھ گئی کہ وہ کون ہے۔

”اب ذرا آنٹی کو بلا دیں۔ پلیز!“ اب کے وہ ذرا غصے سے بولی تو وہ سری طرف خاموشی چھا گئی۔ کچھ دیر بعد جو آواز اسے سنائی دی وہ تین دن گزرنے کے بعد بھی اسے پہچان گئی تھی۔

”السلام علیکم آئی! میں بول رہی ہوں وہ اس دن
ہسپتال کے باہر آپ سے ملی تھی۔ آپ نے مجھے پانچ
ہزار دیے تھے۔“

”وعلیکم السلام بیٹا! میں نے پہچان لیا آپ کو۔ کیسی
ہیں آپ؟“

”میں ٹھیک ہوں آئی! مجھے آپ کے پیسے واپس
کرنے ہیں۔ پلیز آپ مجھے اپنے گھر کا ایڈریس بتا
دیں۔ میں آپ کو بھجوا دیں گی۔“ دوسری طرف سے
اسے ان کی ہنسی سنائی دی تھی۔

”آپ نے اس لیے فون کیا ہے؟“

”جی! نمو کچھ نروس ہو کر بولی۔“

”میں آپ سے پیسے لوں گی، لیکن ایک شرط
ہے۔“

”جی؟“ شرط کا سن کر اس نے گہرا کر رمشا کو دکھا۔
”میسے دینے آپ کو خود آنا ہو گا۔“

”لیکن آئی! وہ پریشانی سے بولی۔ اس کی پریشانی
شاید وہ بھی بھانت گئی تھیں۔“

”بیٹا! آپ ٹینشن نہ لیں۔ میں صرف آپ سے ملنا
چاہتی تھی۔ اگر آپ نہیں آنا چاہتیں تو کوئی بات
نہیں۔“

”نہیں آئی! ایسی بات نہیں آپ مجھے ایڈریس
بتائیں میں آجاتی ہوں۔“ اور غور سے سنتی رمشا نے
اپنا سر پیٹ لیا۔

اس کے ریسپورڈ کرتے ہی وہ غصے سے اسے گھورنے
لگی۔ ”اب تم ان کے گھر جاؤ گی۔“

”تو کیا کروں۔ وہ کہہ رہی ہیں گھر آؤ۔“

”و میرے خدا! کیا کروں میں تمہارا۔۔۔ نمو!“

انہوں نے کہا اور تم چل دو گی پتا نہیں وہ کون ہیں۔

کیا مقصد ہے ان کا تمہیں بلانے میں۔ آج کل کوئی سو

روپے کسی کو ادھار نہیں دیتا اور انہوں نے تمہیں

جانے پہچانے بغیر پانچ ہزار روپے دیے اور اب گھر بلا

رہی ہیں۔ تمہیں پتا ہے آج کل کتنا فراڈ

ہو رہا ہے۔“

”رمشا! وہ ایسی نہیں لگتیں۔“ نمو مری ہوئی آواز

میں بولی۔
”کسی کی بھی شکل سے تم اندازہ نہیں کر سکتیں کہ
وہ کیا ہے۔“ کہہ کر رمشا کھڑی ہو گئی تھی۔

”رمشا پلیز! اب میں نے کہہ دیا ہے۔ تم میرے
ساتھ چلو۔ ہم گیٹ پر پیسے پکڑا کر آجائیں گے۔“
رمشا غصے سے بٹٹی۔

”دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا نمو! ایڈریس انہوں
نے تمہیں بتا دیا۔ منی آرڈر کرو۔ میں نہیں جانے
والی اور اگر تم نے مزید بکواس کی تو میں امی کو بتا دوں

گی۔“ رمشا غصے سے بولتی ہوئی کمرے سے باہر نکل
گئی۔



پانچویں گھر کا دروازہ بھی جب ان پر بند ہوا تو اس
نے ڈرتے ڈرتے رمشا پر نظر ڈالی۔ جس کا چہرہ غصے کے
مارے لال ہو رہا تھا۔

”رمشا! اس نے بے چارگی سے اسے پکارا۔

”شٹ اپ! غلطی میری ہے جو تمہارے آنسوؤں
کو دیکھ کر جذباتی ہو گئی اور اس پاگل پن میں تمہارا
ساتھ دینے کے لیے تیار ہو گئی۔ اب پچھلے ایک گھنٹے

سے خوار ہو رہے ہیں۔ اوپر سے نام تک تمہیں پوچھا تم
نے۔“

وہ پہلے ہی پریشان ہو رہی تھی اوپر سے رمشا کا غصہ
اس نے ایک دم رونا شروع کر دیا۔

”خدا کے لیے نمو! بند کرو یہ بچپنا۔ سڑک پر

کھڑے ہو کر رونا شروع کر دیا ہے تم نے۔ ایک تو غلطی

کرتی ہو اوپر سے روتی ہو۔ چلو! یہ آخری گیٹ ٹاک

کر کے دیکھ لیتے ہیں یہ نہ ہو تو بس پھر گھر چلتے ہیں۔“

رمشا نے نکل دی تو نمو نے آنکھیں بند کر لیں اور

جتنی دعائیں اسے یاد تھیں وہ سب پڑھ ڈالیں۔ گیٹ

کھلنے پر اس نے تیزی سے آنکھیں کھولیں۔ عام

حالات میں یہ چہرہ دیکھ کر اسے کوئی خوشی نہ ہوتی، لیکن

اس وقت اس کا دل چاہ رہا تھا وہ خوشی کے مارے رمشا

کے گلے لگ جائے۔ آنے والے نے پہلے سوالیہ

نظروں سے رمشا کو دکھا۔ اس سے پہلے کہ وہ رمشا
سے کچھ پوچھتا، اس کی دوسری نظر نمو پر پڑی تھی۔
شناسائی کے علاوہ کوئی اور تاثر بھی تھا، جو اس کے
چہرے پر آیا تھا۔

”رمشا! یہ وہی ہے۔“ نمو نے ایک دم جذباتی ہو کر
اس کا بازو دوہرا۔ اس کی اس جذباتی حرکت پر رمشا نے
پوری آنکھیں کھول کر اسے گھورا تو نمو نے شرمندہ
ہو کر اس کا بازو چھوڑ دیا۔

”آئی سے ملتا ہے۔“

اسے یوں ہی گیٹ کے آگے دیوار کی طرح کھڑے
دیکھ کر نمو کو کہنا پڑا۔ اس کے پیچھے ہتے ہی وہ دونوں
تیزی سے اندر داخل ہو گئے اور وہ آئی جیسے ان کے

انتظار میں تھیں۔ اتنے تپاک سے ملیں۔ نمو تو نمو
رمشا بھی اپنے دیے ہوئے بیانات کو یاد کر کے شرمندہ
ہو گئی۔

ان کے بہت منع کرنے کے باوجود انہوں نے
چائے پر اچھا خاصا اہتمام کر لیا تھا۔ نمو نے ایک
ناراض نظر رمشا پر ڈالی جو پچھلے آدھے گھنٹے سے نہ
صرف باتیں کر رہی تھی بلکہ قہقہے لگا رہی تھی۔

”آئی! یہ اتنی بے وقوف ہے“ آپ سے اتنی بڑی
مدد لے لی مگر آپ کا نام تک نہ پوچھا۔ بس پیسے تمام
لیے اور اس دن فون کیا تو بھی آپ کا نام نہیں پوچھا۔

اس کی اس طرح کی بے وقوفیوں کی وجہ سے امی بھی
پریشان رہتی ہیں۔ وہ تو اس کی قسمت اچھی ہے کہ
آپ اچھی ہیں ورنہ اگر کوئی بڑے لوگ مل جاتے تو۔“
رمشا کے سیاسی بیان پر نمو نے دانت چس کر اسے
گھورا۔

”نہیں بیٹا! نمو بے وقوف نہیں معصوم ہے۔ اس
کی یہی بات تو مجھے اچھی لگی تھی۔ آج کل کے دور میں
اتنی سادگی کہاں دیکھنے کو ملتی ہے۔“

اپنی اتنی تعریف پر نمو بے اختیار خوش ہو گئی تھی۔

یہ پہلی بار تھا جب کوئی اسے سمجھا تھا۔ اس کی

معصومیت کو بے وقوفی کا نام نہیں دیا گیا تھا۔

”اور بیٹا! آج کل جیسا دور جا رہا ہے وہاں کسی کی

اچھی نیت کو بھی مشکوک نظروں سے ہی دیکھا جاتا
ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے میں اپنے بیٹے سے یہی بات
کر رہی تھی۔ وہ بھی یہی کہہ رہا تھا کہ میں آپ پر لور
اس لڑکی پر حیران ہوں۔ اس نے کیسے بلا جھجک آپ کو
اپنی پراہم بتادی اور آپ نے کیسے بے وحشک اس کی
مدد کر دی اور اگر وہ آپ کے پیسے لوٹانے واپس نہ آتی تو
میں نے اس سے کہا۔ مجھے پورا یقین ہے، میرا دل
کسی کو پہچاننے میں دھوکا نہیں کھا سکتا اور دیکھ لو! نمو
میرے سامنے ہے۔“

انہوں نے بڑے پیار سے نمو کو دکھا تو وہ نروس
ہو کر رمشا کو دیکھنے لگی۔ رمشا بھی اسے دیکھ کر مسکرا
رہی تھی۔

”آئی! اب گھر میں اکیلی ہوتی ہیں؟“ رمشا نے
خاموشی محسوس کر کے سوال کیا۔

”ہاں!“ انہوں نے گہری سانس لی۔ ”میں اور بس
میرا بیٹا معزز۔“

”اور آپ کے شوہر؟“ اب کے نمو نے پوچھا۔

”معزز پندرہ سال کا تھا جب ان کی دلتھ ہو گئی۔“

ان کے لہجے میں افسردگی محسوس کر کے رمشا نے بات
بدل دی۔

”چھا آئی! اب ہمیں اجازت دیں۔“

”بیٹا تھوڑی دیر اور بیٹھتیں۔ اچھا لگ رہا تھا تم
لوگوں کی وجہ سے۔“

”آئی! اچھا تو ہمیں بھی لگا آپ سے مل کر، لیکن
امی کو ہم بازار کا کہہ کر آئے ہیں اور اب شام ہونے
والی ہے۔“

”کوئی بات نہیں، میں تم لوگوں کو چھوڑ آتی ہوں۔

اسی بہانے تمہارا گھر بھی دیکھ لوں گی۔“ انہوں نے

مسکرا کر دونوں کے چہرے دیکھے۔

”معزز!“ انہوں نے اپنے بیٹے کو آواز دی۔

سارا راستہ رمشا اور آئی باتیں کرتے رہے جبکہ وہ

یہی سوچ کر بولتی رہی اگر امی کو پتا چل گیا کہ وہ کسی غیر

کے ساتھ اس کی گاڑی میں آئے ہیں تو کیا حشر ہو گا اور

اگر بھابھی نے دیکھ لیا تو۔ اس نے بے ساختہ

جھرجھری لے کر سامنے دیکھا تو نظریں مر رہی جا پڑیں
'جہاں دو آنکھیں اسے ہی دیکھ رہی تھیں۔ اس نے
سپٹا کر پورا چہرہ کھڑکی کی طرف موڑ لیا۔

کاران کے گھر کے دروازے کے آگے رکی۔ وہ
دونوں اترنے لگی تھیں۔ جب انہوں نے آئی کی آواز
سنی۔

"بیٹا! آپ نے ابھی بھی میرا نام نہیں پوچھا۔" ان
کی آواز میں شرارت تھی۔ نمونہ شرمندہ ہو گئی تھی
جبکہ رمشا کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"آئی! آپ کا نام؟" اب کے وہ شرارت سے
بولی۔

"تقدیر اشتیاق نام ہے میرا۔" رمشا الوداعی
کلمات کے ساتھ شکریہ ادا کرنے لگی تو اس نے وزویدہ
نظروں سے ڈرائیونگ سیٹ کی طرف دیکھا۔ وہاں
بڑے اطمینان سے اس کا جائزہ لیا جا رہا تھا۔ وہ گہرا کر
کوئی بات کیے بغیر اندر کی طرف بھاگی۔ کچھ دیر بعد
رمشا تیزی سے اس کے پیچھے آئی۔

"نمونہ! تم عقل کے ساتھ لگتا ہے تمیز بھی بچ کر
کھا گئی ہو۔ اخلاق نام کی بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ وہ
ہمیں چھوڑنے گھر تک آئیں اور تم نے شکریہ تک ادا
نہیں کیا۔"

"تم تو رہنے دو۔" نمونہ نے غصے سے اسے دیکھا۔
"میں تم نے مجھے کتنے لیکچرز دیے تھے اور وہاں خود
کیسے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھیں۔"

"تو برا کیا کیا۔ کتنی اچھی آئی تھیں۔"

"جب میں نے کہا تھا تب تو تم نے کچھ اور کہا
تھا۔"

رمشا نظریں چراتے ہوئے بولی۔ "تب میں ان
سے ملی نہیں تھی۔"

"چھا! تو سب عقل مند ہیں یہاں میں ہی بے
وقوف ہوں۔ میں نے جب کہا وہ اچھی ہیں تب کیا
تھا؟"

"چھا بابا معاف کرو مجھے، میرا بحث کاموڈ نہیں۔"
کہہ کر وہ اندر کی طرف بڑھ گئی۔ جبکہ نمونہ کتنی دیر تک

غصے میں وہیں کھڑی رہی۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی اس کی پہلی نظر روتی
ہوئی رخسانہ پر پڑی۔ وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔
"کیا ہوا رخسانہ؟" اس کے پوچھنے کی دیر تھی۔ اس
کے رونے کی رفتار میں مزید اضافہ ہو گیا۔

"رخسانہ! آخر ہوا کیا ہے۔ کچھ پتا بھی تو چلے۔" وہ
کچھ جھنجھلا کر زور سے بولا۔

"وسیم! آپ مجھے بتائیں کیا حیثیت ہے میری اس
گھر میں۔ ایک سال ہونے کو آیا ہے ہماری شادی کو
لیکن ابھی تک اس گھر میں میری حیثیت نوکرانی سے
زیادہ نہیں۔ اگر میں آپ کی امی کی پسند نہیں تو میرا
قصور ہے۔ اگر آپ نے اپنی مرضی سے مجھ سے شادی
کی ہے تو کیا یہ میری غلطی ہے۔ پسند کی شادی کرنا اتنا
بڑا جرم ہے۔ مجھے پتا ہوتا تو مجھے آپ سے شادی نہ
کرتی۔"

وسیم کے چہرے کا رنگ بدیل گیا۔
"کسی نے تمہیں کچھ کہا ہے؟"

"چھوڑیں! رخسانہ نے منہ موڑ لیا تھا۔ وسیم نے
زبردستی اس کا رخ اپنی طرف کیا۔

"رخسانہ! بتاؤ کس نے کہا ہے؟"

"وسیم! میں سب کو خوش رکھنے کی کوشش کرتی
ہوں، لیکن آپ کی امی اور ہمیں ہر وقت مجھ سے
ناراض رہتی ہیں۔ میں باہر جاؤں تو سب اٹھ کر
دوسرے کمرے میں چلے جاتے ہیں۔ کمرے میں
رہوں تو آپ کو اعتراض ہوتا ہے۔"

"امی نے کچھ کہا ہے؟" وسیم کے پوچھنے پر وہ سر
جھکا کر اپنے ہاتھوں کی انگلیاں موڑنے لگی۔

"کیا کہا ہے انہوں نے؟ رخسانہ! میں کچھ پوچھ رہا
ہوں۔" اسے خاموش دیکھ کر وہ غصے سے بولا۔

"آپ کو پتا ہے نا، صبح سے میری طبیعت خراب
ہے۔ امی کو بھی بتایا ہے میں نے، لیکن یہاں تو کسی کو
میری پروا ہی نہیں۔ پتا نہیں کس کی دعوت کرنی ہے۔"

صبح سے اس کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ اسی لیے میں نے
زوار کو فون کیا کہ آکر مجھے ڈاکٹر کے پاس لے جائے۔
امی کو بتانے گئی کہ میں زوار کے ساتھ امی کی طرف
جاری ہوں تو منع کر دیا انہوں نے۔"

آخر میں پھر وہ رونے لگی تو وسیم تیزی سے کھڑا ہوا
اور اسی تیزی سے باہر نکل گیا۔ اس کے باہر نکلتے ہی
رخسانہ نے مسکراتے ہوئے آنسو صاف کیے اور پاس
پڑا موبائل اٹھا کر زوار کا نمبر ڈائل کیا۔

"میلو زوار! میں نے یہ کہنے کے لیے فون کیا تھا تم
مت آنا۔ میں خود وسیم کے ساتھ آ رہی ہوں۔"

"خیریت! دوسری طرف سے اس نے پوچھا۔
"خیریت ہی ہے۔ مل کے بتاؤں گی۔" اس نے
مسکرا کر فون بند کر دیا۔

زوردار آواز کے ساتھ دروازہ کھلتا تو بیوی دیکھتی
نمونہ اور زاہدہ کی ٹانگیں دباتی رمشا نے چونک کر
دروازے کی طرف دیکھا جہاں غصے سے بھرا وسیم کھڑا
تھا۔

"جب آپ جانتی تھیں کہ رخسانہ کی طبیعت
ٹھیک نہیں تو پھر کیوں اسے آپ نے کچن میں جا کر کام
کرنے کو کہا اور کیوں اسے اس کی امی کے گھر جانے
سے منع کیا؟"

"میں نے کبھی اسے کوئی کام کرنے کو نہیں کہا۔
آج مجبوری تھی تو صرف کباب فرائی کرنے کو کہا
تھا۔"

"یہی کیا مجبوری تھی گھر میں نمونہ اور رمشا موجود
ہیں۔ کرنی کیا ہیں سارا دن۔ ان سے کہتیں آپ۔ وہی
نوکرانی نظر آتی ہے آپ کو۔"

"سارے کام نمونہ اور رمشا ہی کرتی ہیں۔ ابھی بھی
سارا کام نمونہ کر کے آئی ہے۔ رمشا نے ابھی سارے
گھر کے کپڑے دھوئے ہیں۔ جس میں تمہارے اور
تمہاری بیوی کے کپڑے بھی شامل ہیں اور رخسانہ کو
اس لیے میکے جانے سے روکا تھا کہ کچھ لوگ رمشا کو
دیکھنے آرہے تھے۔ وہ جاتی تو تمہارا جانا لازمی تھا۔ تم
اس گھر کے اکلوتے مرد ہو اور بد قسمتی سے ان بچیوں کا

باپ بھی نہیں۔ اس لیے مجبوراً تمہیں کہنا پڑتا ہے۔
تم دونوں موجود نہیں ہوتے تو لوگ طرح طرح کے
سوال کرتے ہیں۔"

ان کی مکمل گفتگو پر کچھ لمحوں کے لیے وہ خاموش
رہ گیا۔ گلا کھنکھار کر بولا۔

"بہر حال رخسانہ کو کام کا نہ کہا کریں۔ اس نے پہلے
بھی مجھ سے کافی دفعہ شکوہ کیا ہے۔ میں ہی انکو روکتا
تھا۔ لیکن بار بار انکو نہیں کر سکتا۔"

مزکر اس نے ایک نظروں بہنوں پر ڈالی اور باہر
نکل گیا۔

اس کے باہر نکلتے ہی نمونہ تیزی سے ماں کی طرف
بڑھی اور انہیں بازو کے گھیرے میں لے کر ان کے
آنسو صاف کیے لیکن ان کے آنسوؤں میں مزید روانی
آئی تھی۔ رمشا کے ماتھے کی شکنیں مزید گہری ہو گئی
تھیں۔

"آپ کو صاف صاف بھائی کو سب بتانا چاہیے
تھا۔ وہ بھائی کے کان بھر دیتی ہے اور وہ آپ پر چبھتے
چلاتے ہیں۔ کون سا بھائی توڑنے کو کہہ دیا تھا اس
مہارانی کو سارا دن روک کر کیا ہے۔"

اس کی آواز غصے کے مارے بلند ہوتی جا رہی تھی۔
زاہدہ نے گہرا کر اسے دیکھا۔

"خدا کے لیے رمشا! چپ کر جاؤ۔ کیوں مزید تماشہ
بناؤ گی۔ تم جاؤ تیار ہو جاؤ۔ وہ لوگ آنے والے ہوں
گے۔"

"مجھے نہیں ہونا تیار اور نہ ہی مجھے کسی سے ملنا
ہے۔" وہ غصے سے کہتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی تو
زاہدہ نے آنسو صاف کرتے ہوئے نمونہ کو دیکھا۔

"بیٹا! تم جاؤ۔ اسے سمجھاؤ یہ تو روز کا مسئلہ
ہے۔"

"امی! آپ پریشان نہ ہوں میں اسے سمجھاتی
ہوں۔"

وہ انہیں دلاسا دے کر باہر نکل آئی۔ کمرے میں
داخل ہوئی تو رمشا بیڈ پر دونوں ہاتھوں میں سر ڈالے
بیٹھی تھی۔ وہ ہونٹ چباتے ہوئے اس کے قریب بیٹھ

گئی اس سے پہلے وہ کچھ کہتی، ریشا نے سر گھما کر اسے دیکھا۔

”دیکھو! اگر تم مجھے کوئی نصیحت کرنے یا سمجھانے آئی ہو تو بے کار ہے۔“

”ریشا پلیز! تم کسی کا غصہ خود پر کیوں نکل رہی ہو۔“ ریشا جھٹکتے کھڑی ہوئی۔

”حد ہوتی ہے کسی چیز کی۔ جب سے وہ عورت ہمارے گھر آئی ہے۔ سکون برپا کر کے رکھ دیا ہے۔

کبھی وسیم بھائی نے جواب دیا تھا امی کو۔ اب دیکھو! اس نے کتاب گن کر دیا ہے وسیم بھائی کو ہم سب سے۔

مجھے تو اس کی پراہم سمجھ میں نہیں آئی۔ کبھی ہم نے اس سے روایتی نندوں والا سلوک کیا؟“ وہ نمرو سے

سوال کر رہی تھی۔

نمرو اسے کیا جواب دیتی، وہ خود اس کی سب باتوں سے اتفاق کرتی تھی۔ لیکن اب اس کی حمایت کرنا اس کے غصے کو مزید بڑھاوا دیتا تھا۔

”پلیز ریشا! تم اب اپنا موڈ خراب نہ کرو۔ تم جانتی ہو بھابی یہ سب ہمیں تنگ کرنے کے لیے کرتی ہیں۔

تم اس طرح کرو گی تو وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں گی اور امی پریشان ہوں گی۔ امی کی خاطر پلیز اپنا موڈ ٹھیک کر لو۔“

ریشا کچھ دیر خاموشی سے کارپٹ کو گھورتی رہی جیسے ضبط کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔

”ریشا! نمرو نے اس کے ہاتھ تھام کر ہاتھی انداز میں اسے پکارا تو گھر اس اس لے کر مسکرا دی۔

”تھینک یو۔ اب تیار ہو جاؤ۔ میں کچن میں جا رہی ہوں۔“ وہ مسکرا کر کہتی ہوئی باہر نکل گئی۔

سارا کارنامہ سنانے کے بعد رخسانہ نے داوطلب نظروں سے دیکھا لیکن زوار کی آنکھوں میں غصہ تھا۔

”کیا ہوا؟ تمہیں اچھا نہیں لگا۔“

”نہیں بالکل نہیں۔“ زوار قطعیت سے بولا۔

”اس بلاوجہ کے معرکہ کی کوئی جھک نہیں بنتی تھی۔ گھر

والوں کے ساتھ بگاڑ کرنے صرف تم اپنی رہو ٹیشن مزید خراب کر رہی ہو بلکہ میری پوزیشن بھی کمزور کر رہی ہو۔“

رخسانہ نے برا سامنہ بنایا۔ ”اب تمہارا التوسیدہ کرنے کے لیے میں اپنا بنانا کام نہیں بگاڑ سکتی۔ مجھے

ان لوگوں سے بنا کر رکھنے کی ضرورت نہیں میرا مطلب وسیم ہے اور وہ میرے قابو میں ہے۔ بس جو

تھوڑی بہت اسے اپنے گھر والوں کے لیے ہمدردی ہے۔ وہ ختم ہو جائے تو میرا مقصد پورا۔ میرا ایک الگ

گھر ہو گا۔ جہاں میں آزادی سے اپنی مرضی سے رہوں گی۔“

وہ صحت کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”تو تمہیں وہاں کیا تکلیف ہے اب بھی تمہیں مکمل آزادی ہے۔ وہ تین بے چاری عورتیں تمہیں

کیا تکلیف دیتی ہیں۔“ رخسانہ نے کھا جانے والی نظروں سے اپنے بھائی کو دیکھا۔

”میں دیکھ رہی ہوں زوار! دن بہ دن اس چیز کا جادو زیادہ ہی تمہارے سر پر چڑھ کر بولنے لگا ہے۔ اپنی

ہن کی خوشی تمہیں نظر نہیں آ رہی اور ان بے چاروں کی بے چاری بڑی محسوس ہو رہی ہے۔“

رخسانہ کے جملے ہوئے انداز پر وہ تھمہ لگا کر ہنسا تھا۔

”اب چیزیں تو نہ کہو اسے اتنی معصوم اور خوب صورت ہے۔“ وہ مسکرا کر بولا۔

رخسانہ نے ناگواری سے اسے دیکھا۔ ”ایک بات کہوں تم سے؟“ رخسانہ نے بغور زوار کو دیکھتے ہوئے

کہا۔

”ہاں کہو۔“ وہ اسی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

”میں یہ نمونہ کا قصہ ختم کیوں نہیں کر دیتے۔ دنیا میں خوب صورت لڑکیوں کی کمی تھوڑی ہی ہے۔ اس سے

زیادہ خوب صورت حسین لڑکیاں تمہیں مل جائیں گی۔ بلکہ کئی ایک دو تو میں بھی جانتی ہوں۔“

اس کی مسکراہٹ بڑی تیزی سے غائب ہوئی تھی۔ ”آج تم نے یہ بات کہہ دی ہے۔ آئندہ مت

کہنا۔ نمونہ نہیں تو کوئی نہیں۔ میرے لیے ساری خوب صورتی بس اس کی ذات میں ہے اور کوئی چہرہ چاہے کتنا

ہی حسین کیوں نہ ہو۔ میرے لیے اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ تم کچھ نہیں کر سکتیں تو صاف بولو میں خود ہی

کچھ نہ کچھ کر لوں گا۔“ اس کی ناراضی دیکھ کر وہ کچھ گھبرا گئی تھی۔

”اب ناراض تو نہ ہو میں نے بس ایسے ہی ایک بات کہی تھی۔ میں وسیم سے بات کروں گی۔“

”ہوں۔ میں کچھ دنوں کے لیے دینی جا رہا ہوں“ میرے آنے تک سب کچھ لیتا۔

وہ کہہ کر کمرے سے باہر نکل گیا جبکہ رخسانہ نے غصے سے پاس پڑا کٹن اٹھا کر دیوار پر دے مارا۔

کباب تلنے کے لیے اس نے فراننگ پین میں تیل ڈالا جب ڈور بیل بجی تھی۔ اس نے ایک نظر کرم

ہوتے تیل کو دیکھا اور چونکا کر کے باہر کی طرف دوڑ لگائی۔ وہ متوقع مہمانوں کی گھنٹہ تھی لیکن دروازے

کھلتے ہی سعدیہ اور نبیل کی شکل دیکھ کر وہی رک گئی۔

”ارے بھئی! اندر تو آنے دو۔“ اسے پوچھی دروازے کے سامنے کھڑے دیکھ کر سعدیہ نے ٹوکا تو وہ

کھپا کر پیچھے ہٹی۔ ننھے حمزہ کو اس نے سعدیہ کی گود سے لے لیا تھا۔

”امی کہاں ہیں؟“ خلی لاؤنج دیکھ کر سعدیہ نے پوچھا۔

”اپنے کمرے میں ہیں۔“ وہ حمزہ کو پیار کرتے ہوئے بولی۔

”یہ جلنے کی بو کہاں سے آ رہی ہے؟“ نبیل کے پوچھنے پر اس نے حمزہ کو نبیل کی گود میں تھمایا اور کچن

کی طرف بھاگی۔ فراننگ پین میں پڑا تیل خشک ہو چکا تھا جبکہ فراننگ پین جل کر سیاہ ہو چکا تھا۔

”کیا ہوا کچھ جل گیا؟“ وہ سنک میں فراننگ پین رکھ رہی تھی جب اس نے نبیل کی آواز سنی۔

”نہیں۔ بس تیل جلا ہے۔“ اس نے مسکرا کر

جواب دیا۔

”نہوں! نبیل نے نظروں سے گھما کر کچن کا جائزہ لیا۔

”کافی اہتمام کیا ہے تم نے۔ کوئی خاص مہمان آرہے ہیں؟“ نمرو نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

”جی بالکل صحیح پہچانا آپ نے۔ مہمان آرہے ہیں اور وہ بھی خاص اہم مہمان۔“

”چھا! اب کے نبیل بھی مسکرایا۔ ایسے کون سے خاص مہمان ہیں؟“

”ریشا کو دیکھنے کچھ لوگ آرہے ہیں۔“ وہ حلوے کے لیے باوام کٹ رہی تھی۔ اس نے

نہیں دیکھا کہ نبیل کے ہونٹوں کی مسکراہٹ غائب ہو گئی ہے۔ مسلسل خاموشی پر نمرو نے مڑ کر نبیل کو

دیکھا جو فرش کو دیکھتے ہوئے نہ جانے کس سوچ میں کم تھا۔ نمرو کے زور سے پکارنے پر وہ چونک کر اسے دیکھنے

لگا۔

”نبیل بھائی! کچن میں کافی دھواں ہے۔ آپ اسے باہر لاؤنج میں لے جائیں۔ میں آپ کے لیے چائے

اور کباب مل کر لائی ہوں۔ کھا کر بتائیے گا میں نے بنائے ہیں۔“

نبیل نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس خاموشی سے کچن سے باہر نکل گیا۔ اس نے ریشا کو لاؤنج میں داخل ہوتے دیکھا۔ وہ کھلے بالوں کو کچھو میں جکڑتی

ہوئی اپنے دھیان میں آ رہی تھی۔ اس کے بہت قریب پہنچ کر اس نے نظروں اٹھائیں۔ اسے اتنے

قریب دیکھ کر وہ بے ساختہ انداز میں رکی اور اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی ٹھک بھی گئی۔ کچھ تھا اس کے

چہرے پر جو وہ سمجھ نہیں پاتی تھی۔ اس نے حمزہ کو اس کی طرف بڑھایا۔

”بھابی کو بتا دینا میں جا رہا ہوں، طرانت بھائی کو فون کر دوں۔ میں انہیں لینے نہیں آ سکتا۔“

یہ کہہ کر وہ رکا نہیں تھا جبکہ ریشا کتنی دیر تک اس طرف دیکھتی رہی جہاں سے وہ گیا تھا۔

وہ حمزہ کے لیے دودھ گرم کر رہی تھی جب آہٹ پر

اس نے مڑ کر دیکھا۔ دروازے میں نبیل کھڑا تھا۔ اس نے کچھ حیران ہو کر نبیل کو دیکھا۔

”کچھ چاہیے تھا نبیل؟“
”نہیں بس ایسے ہی پانی پینے آیا تھا۔“ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ بولا تو وہ سر ہلا کر فیڈر میں دودھ ڈالنے لگی۔ وہ کچن سے باہر نکلنے لگی جب نبیل کی پکار پر رک گئی۔

”بھابھی! میں آپ سے بات کرنے آیا تھا۔“ سعدیہ رک گئی اور پریشانی سے اسے دیکھنے لگی۔
”بھابھی! میں گھما پھرا کر بات نہیں کروں گا۔ میں رمشا سے شادی کرنا چاہتا ہوں اور یہ چاہتا ہوں آپ میرا پرہیز لے کر وہاں جائیں۔“
نبیل کی بات اس کے لیے اتنی غیر متوقع تھی کہ الفاظ کہیں کم ہو کر رہ گئے تھے۔

”میں نے کچھ غلط کہا؟“ اسے یوں خاموش دیکھ کر وہ بولا تو وہ گڑ گڑا کر جلدی سے بولی۔
”نہیں مجھے کیا اعتراض ہو گا لیکن وہ آج۔“ اس کی بات پوری ہونے سے پہلے وہ دوبارہ بولا۔

”مجھے پتا ہے آپ کیا گناہ چاہتی ہیں۔ اسی لیے تو آپ سے کہہ رہا ہوں۔“ سعدیہ کے چہرے پر اب پریشانی جھلکنے لگی تھی۔

”کیوں بھابھی! کیا میں آپ کو اپنی بہن کے قابل نہیں لگتا؟“

”نہیں نبیل! ایسی بات نہیں لیکن کیا امی، پاپا، باجی سب مان جائیں گی؟“ اس نے اپنی سانس اور نندوں کا حوالہ دیا۔ ”وہ لوگ کبھی نہیں مانیں گے۔“ سعدیہ نے جیسے اسے جتایا تھا۔

”وہ لوگ نہیں مانیں گے تو ان کی مرضی۔ میرے لیے جس کی مرضی اہم ہے وہ رمشا ہے کیونکہ زندگی میں نے اس کے ساتھ گزارنی ہے۔“ اب کی بار سعدیہ کچھ نہیں بولی۔

”آپ اپنے گھر بات کریں۔ میں امید کرتا ہوں۔ جواب ہاں میں ہی ہو گا۔“ وہ کہہ کر رکھا نہیں تھا سعدیہ کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔



وہ چائے لے کر آئی تو رمشا حنزہ کو گود میں لیے کھلا رہی تھی جبکہ سعدیہ رمشا کو دیکھتے ہوئے گہری سوچ میں گم تھی۔ اس کے پیالی آگے بڑھانے پر بھی اس کی نظروں کے ارتکاز میں کوئی فرق نہ آیا تو نمونہ کو اسے پکارنا پڑا۔ اس نے چونک کر اسے دیکھا اور پھر کپ تھام لیا۔

”کیا بات ہے باجی! آپ کچھ پریشان ہیں۔“
اس کے پوچھنے پر رمشا نے بھی حنزہ سے نظر ہٹا کر اس کا چہرہ دیکھا۔ ان دونوں کو متوجہ دیکھ کر سعدیہ نے خود کو وہ سب کہنے کے لیے تیار کیا جسے کہنے کے لیے وہ رات بھر جملے ترتیب دیتی رہی تھی اور اب پچھلے آدھے گھنٹے سے ہمت جمع کر رہی تھی۔

”دراصل میں امی سے ایک بات کرنے آئی تھی لیکن اس سے پہلے میں نے سوچا۔ میں تم سے بات کر لوں۔“

رمشا سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھنے لگی۔
”کل نبیل میرے پاس آیا تھا۔ اس نے کہا وہ تم سے شادی کرنا چاہتا ہے۔“

غور سے سعدیہ کی بات سنتی نمود اپنی جگہ سے اچھل پڑی۔ اس نے مسکراتے ہوئے رمشا کی طرف دیکھا لیکن اس کے سپاٹ اور قدرے سخت تاثرات دیکھ کر اس کی مسکراہٹ سمٹ گئی۔

”میں آج امی سے یہی بات کرنے آئی ہوں۔ سوچا تمہیں بھی بتا دوں۔“

”امی سے اس سلسلے میں کوئی بھی بات کرنے کی ضرورت نہیں۔“ رمشا کے دو ٹوک انداز پر سعدیہ نے پریشانی سے اسے دیکھا۔
”کیوں؟“

”کیونکہ میں نبیل سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔“
”وہی تو پوچھ رہی ہوں کیوں؟“

”یہ آپ پوچھ رہی ہیں آپ! کیا میں نہیں جانتی کیا سلوک ہوتا ہے وہاں آپ کے ساتھ۔ یا عرافت

بھائی کی عادت مجھے نہیں پتا اور پھر نبیل۔۔۔ وہ بھی ان ہی کا بھائی ہے۔ اسی گھر کا حصہ جہاں میں کبھی ایڈجسٹ نہیں ہو سکتی۔“

”میں مانتی ہوں میرے ساتھ ان لوگوں کا سلوک اتنا اچھا نہیں رہا لیکن حنزہ کی پیدائش کے بعد عرافت بہت بدل گئے ہیں اور جہاں تک نبیل کی بات ہے وہ شروع سے بہت مختلف ہے۔ اپنے والد کے بعد عرافت ہی گھر کے بڑے تھے۔ شادی کے بعد ان کی امی کو لگتا تھا کہ کہیں وہ بدل نہ جائیں ان کی اور بہنوں کی حق تلفی نہ کرنے لگیں۔ عرافت مجبور تھے لیکن نبیل! ذرا اور طرح کا ہے اس نے خود تمہارا نام لیا ہے۔ صاف مطلب ہے وہ تمہیں پسند کرتا ہے اور مجھے یقین ہے وہ تمہارا بہت خیال رکھے گا۔“

سعدیہ نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا اور دوبارہ بات شروع کی۔

”رمشا! اچھے رشتوں کا ملنا بہت مشکل ہے۔ نبیل گڈ لکنگ ہے۔ اچھی جاب پر ہے۔ دیکھا بھالا ہے اور سب سے بڑی بات تمہیں پسند کرتا ہے اور کیا چاہیے۔“

”پاپا پلیز! میں نے آپ کو بتادیا۔ آپ بھی مجھے فورس نہ کریں۔“ وہ حنزہ کو سعدیہ کی گود میں دے کر مزید بات کا موقع دے بغیر کمرے سے باہر نکل گئی۔

سعدیہ نے جن نظروں سے نمونہ کو دیکھا وہ سمجھ گئی تھی کہ ایک بار پھر رمشا کو سمجھانے کی ذمہ داری اس کے کندھوں پر آگئی ہے۔ اس نے گہرا سانس لے کر سعدیہ کے کندھے پر دلا سا دینے کے انداز میں ہاتھ رکھا اور جب کمرے میں آئی تو رمشا سر سے پیر تک چادر تانے سو رہی تھی یا نہیں لیکن اس کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ بات نہیں کرنا چاہتی۔ نمونہ گہرا سانس لے کر کمرے سے باہر نکل گئی۔



وہ درخت کے نیچے کھڑی بوین کا انتظار کر رہی تھی۔ جب چند قدم کے فاصلے پر ایک کار آکر رکی تھی۔ اس

نے بالکل سرسری سی نظر سامنے ڈالی لیکن کار کا دروازہ کھول کر باہر نکلتے شخص کو دیکھ کر اس کی نظریں پلٹتا بھول گئیں۔ اگلے ہی لمحوں وہ اس کے بالکل سامنے تھا۔ رمشا کو رنی بھر امید نہ تھی کہ وہ یہاں پہنچ جائے گا۔
”مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔“ اس کے سنجیدہ انداز پر رمشا نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔
”نبیل۔“

”مجھے تم سے جو بات کرنی ہے وہ یوں راستے میں کھڑے ہو کر نہیں ہو سکتی۔“ اس نے کالج کی آئی جاتی لڑکیوں کو دیکھ کر کہا۔ ”زیادہ وقت نہیں لوں گا۔“
رمشا کو متذبذب دیکھ کر وہ بولا تو وہ سر جھکا کر گاڑی کی طرف بڑھ گئی۔ وہ بہت دیر تک سیدھی بیٹھی بیٹھی کے پار بھاگتی ٹریفک کو دیکھ رہی تھی۔ اسے نبیل کی خاموشی سے الجھن ہونے لگی تھی جو اسے بات کرنے کے لیے لایا تھا اور اب خاموش تھا۔ جب کلنی وقت اسی خاموشی میں گزر گیا تو اس کی برداشت جواب دے گئی۔

”آپ نے کوئی بات کرنی تھی۔“ رمشا نے چہرہ گھما کر حنائے ہوئے انداز میں نبیل کو دیکھا۔

”تم نے مجھ سے شادی کرنے سے انکار کیوں کیا؟“
نبیل نے سیدھا سوال کیا تھا۔ وہ بالکل حیران نہیں ہوئی تھی کیونکہ وہ اس سے اسی سوال کی توقع کر رہی تھی۔

”میرا خیال ہے اتنا تو مجھے حق ہے کہ میں اپنی شادی کے لیے ہاں یا نہیں کہہ سکوں۔“ گاڑی ایک جھٹکے سے رکی تھی۔ اس نے چونک کر نبیل کی طرف دیکھا۔ جس کے چہرے کے تاثرات کافی سنجیدہ تھے اور وہ جو کافی مطمئن بیٹھی تھی ایک دم گھبرا گئی۔

”ہے حق۔ لیکن میں یہ جانتا چاہتا ہوں کہ مجھے رجحان کیوں کیا؟“ اس کے تند لہجے پر اس نے بے چینی سے اپنے ہاتھ مسکے۔

”میں نے آپ کو رجحان کیوں نہیں کیا۔ صرف اتنا کہا ہے کہ میں آپ سے شادی نہیں کر سکتی۔“
”وہی پوچھ رہا ہوں کیوں؟“

”میں اس بارے میں کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔ آپ پلیز مجھے گھر چھوڑ دیں۔“

”مجھے میرے سوال کا جواب چاہیے۔ اس کے بغیر تم نہیں جاسکتیں۔“ اس کے دھمکی آمیز انداز پر اس غصے کے ساتھ رونا بھی آنے لگا تھا۔

”آپ میرے ساتھ زبردستی نہیں کر سکتے۔“

”میں کوئی زبردستی نہیں کر رہا، صرف جواب مانگ رہا ہوں۔“ رمشا نے کوئی جواب نہیں دیا تھا، چرو دو سری طرف موڑ لیا تھا۔

”کیا تم کسی کو پسند کرتی ہو؟“ کچھ دیر بعد اس نے نیل کی آواز سنی۔

”نہیں۔“ وہ اسی طرح منہ موڑے بھولی۔

”تو کیا تمہیں میں پسند نہیں؟“ اب کی بار رمشا نے مرکز اس کا چہرہ دیکھا۔

”جی مجھے آپ پسند نہیں۔ آپ کے گھر والے گھر کا ماحول کچھ پسند نہیں۔ آپ کے گھر میں سعدیہ باجی کے ساتھ جو سلوک ہوتا رہا ہے اس کے بعد بھی آپ توقع رکھتے ہیں کہ میں اس گھر کا حصہ بنوں گی۔ جس طرح عرافت بھائی اور آپ کی بہنیں مل کر باجی کو مار چر کرتی ہیں۔ آپ چاہتے ہیں میرے ساتھ بھی ویسا ہی ہو اور میں بھی احساس کمتری کا شکار ہو کر ذہنی مریض بن جاؤں۔“

”میں یہ نہیں کہوں گا جو تم نے کہا غلط ہے۔ بے شک ایسا ہی ہوتا ہو گا لیکن پہلے میں یہاں نہیں تھا۔ مجھے کینڈا سے آئے چند ماہ ہوئے ہیں۔ جو ہوا میں اسے بدل تو نہیں سکتا لیکن یہ کہہ سکتا ہوں آئندہ ایسا نہیں ہو گا۔“

”ہو نہ!“ رمشا نے سر کو جھٹکا دیا۔ ”یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔“ اس کے کہنے پر وہ مسکرا دیا تھا۔

”خیر تم جو بھی کہو، میں صرف اتنا جانتا ہوں میں تم سے محبت کرتا ہوں اور مجھے بس تم سے ہی شادی کرنی ہے۔“

اور رمشا نے اتنی حیرت سے نیل کو دیکھا، جیسے اس کے سر پر سینگ نکل آئے ہوں۔ ابھی کچھ ماہ

ہوئے تھے کہ وہ ملے تھے۔ ایک دوسرے کو ٹھیک سے جانتے بھی نہیں تھے اور اسے یاد نہیں پڑا تھا کہ اس نے کبھی نیل سے آرام سے مسکرا کر بات کی ہو۔ اس کے اتنے بڑے رویے کے باوجود وہ اس سے محبت کرتا ہے۔ حیران نہ ہوتی تو کیا کرتی۔

وہ کتنی دیر اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی، پھر خود ہی نظریں ہٹائیں۔ صرف ایک جملے کے بعد اس کے پاس جیسے کہنے کو کچھ بچا ہی نہیں تھا۔ اس کی خاموشی پر نیل نے مزید کوئی سوال نہیں کیا تھا یوں سارا راستہ خاموشی میں گنا تھا۔

وہ گاڑی سے اترنے لگی تھی جب نیل نے اسے پکارا تھا۔

”میں نہیں جانتا رمشا! تمہیں میری باتوں پر یقین ہے یا نہیں لیکن میری تم سے ایک ریکونسلٹ ہے تم ایک دفعہ نیوٹرل ہو کر میرے بارے میں سوچو۔“

رمشا نے کوئی جواب نہیں دیا تھا بس خاموشی سے کار سے اتر گئی تھی۔



”کیا ہوا۔ آج دیر ہو گئی۔“ وہ منہ ہاتھ دھو کر واش روم سے باہر آئی تو نموا اسی کے انتظار میں بیٹھی تھی۔

”ہاں!“ وہ مختصر سا جواب دے کر بیٹھ گئی اور ہاتھوں کی انگلیوں سے اپنی کنپٹیوں کو دبائے لگی۔

”طبیعت ٹھیک ہے تمہاری؟“ نمونے تشویش سے اسے دیکھا۔

”ہوں۔ بس سر میں درد ہے۔“

”کھانا کھاؤ پھر چائے کے ساتھ ٹیبلٹ دیتی ہوں۔“

”تم رہنے دو، میں لے لوں گی۔“ نمونے غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔

”کیا بات ہے رمشا! تم کچھ چھپا رہی ہو مجھ سے۔“ رمشا نے سر اٹھا کر سامنے بیٹھی اپنی ہماراز بن کو دیکھا اور فیصلہ کن انداز میں گہرا سانس لیا۔

”آج نیل کلج آیا تھا۔“ نمونے حیران تو ہوئی لیکن

کوئی بھی سوال کیے بغیر خاموشی سے رمشا کو دیکھتی رہی۔

”اس نے کہا وہ مجھ سے محبت کرتا ہے اور شادی کرنا چاہتا ہے۔“

”ہوں پھر!“ اب کے رمشا نے حیرت سے نمونے کو دیکھا۔

”تمہیں حیرت نہیں ہوئی؟“

”اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔“ نمونے کندھے اچکا کر کہا۔

”نمونا! محبت؟ وہ کیسے مجھ سے محبت کر سکتا ہے۔ میں نے تو کبھی اس سے اچھی طرح بات کرنا تو دور اسے دیکھا تک نہیں۔“ اس کے استعجاب بھرے انداز پر نمونہ کل کر مسکرائی۔

”کبھی تو بات ہے رمشا! کہ تم نے کبھی انہیں دیکھا۔ نہیں اگر کبھی غور سے ان کی آنکھوں میں دیکھتیں تو تمہیں خود ہی اندازہ ہو جاتا۔“ رمشا نمونے کو دیکھتے ہوئے سرفنی میں ہلانے لگی جیسے اسے جھٹلا رہی ہو۔

”ہتا ہے، جب حمزہ پیدا ہوا تھا تو اسپتال میں تم اور نیل بھائی ساتھ کھڑے اتنے اچھے لگ رہے تھے۔ میں نے دل سے دعا کی تھی تم دونوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے پوری بھی کر دی۔ نیل بھائی نے پرو پونزل بھی بھجوا دیا لیکن تم۔“

آخر میں نمونے برا سامنہ بنایا لیکن رمشا نے کوئی جواب نہیں دیا تھا وہ عتاب دہانی سے سامنے لگی تصویر کو دیکھ رہی تھی۔



دروازے میں کھڑی شخصیت کو انہوں نے کافی حیرانی سے دیکھا تھا۔

”السلام علیکم!“ اجنبی، خوش لباس اور خوش شکل عورت نے انہیں سلام کیا تھا۔

”وعلیکم السلام۔ معاف کیجئے گا۔ میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔“ زاہدہ کے معذرت خواہانہ انداز پر وہ مسکرا دیں۔

”یقیناً“ نہیں پہچانا ہو گا کیونکہ ہم لوگ پہلی بار مل رہے ہیں۔ کیا میں اندر آسکتی ہوں؟“ ان کے اجازت مانگنے پر زاہدہ نے کچھ شرمندہ ہو کر راستہ دیا۔

”میرا نام قدسیہ ہے۔“ اندر داخل ہو کر انہوں نے اپنا تعارف کروایا۔

”نمونا!“ رمشا اونچی آواز میں اسے پکارتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔

”ہاں بولو!“ وہ بالوں میں تیل کا مساج کرتی ہوئی بولی۔

”وہ قدسیہ آئی ہیں۔“ تیل کی بوتل اس کے ہاتھ سے چھوٹے چھوٹے بجی تھی۔

”وہ امی کے پاس بیٹھی ہیں اور تمہیں بلا رہی ہیں۔“

نمونے کے چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا۔ اس نے نچلا ہونٹا اتار تے دبا لیا۔

”پریشان کیوں ہو رہی ہو۔ اپنا حلیہ ٹھیک کرو اور ڈرائنگ روم میں آ جاؤ۔ میں چائے لے کر آتی ہوں۔“

جب وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو بڑے خوشگوار ماحول میں باتیں ہو رہی تھیں۔ اس کی پہلی نظر قدسیہ بیکم پر پڑی۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرائی تھیں پھر تیزی سے اس کی نظریں پاں کے چہرے تک گئی تھیں۔ وہ بھی اسے دیکھ رہی تھیں۔ ان کے چہرے پر بھی نرم سی مسکراہٹ تھی۔ اس کے پریشان دل کو قدرے قرار ملا تھا۔

”لگتا ہے نمونے اپنی آنٹی کو پہچانا نہیں۔“ اس کو مسلسل دروازے میں کھڑے دیکھ کر وہ بولیں تو وہ کھسیا کر سلام کرتی ہوئی زاہدہ کے قریب جا کر بیٹھ گئی۔

”آپ بہت خوش قسمت ہیں زاہدہ بن! جو آپ کے پاس نمونہ جیسی بیٹی ہے۔ سچ پوچھیں تو مجھے کبھی افسوس نہیں ہوا کہ میری کوئی بیٹی نہیں لیکن نمونہ کو دیکھ کر ایک کمی کا احساس ہوا کہ کاش! میری بھی نمونہ جیسی بیٹی ہوتی۔ کتنے دن سوچتی رہی اور پھر دل غ نے کہا کہ یہ تو اب بھی ہو سکتا ہے نمونہ ابھی میری بیٹی بن

سکتی ہے۔“ وہ جو مسکراتے ہوئے اپنی تعریف سن رہی تھی، آخری جملے پر کچھ الجھ کر انہیں دیکھنے لگی۔ جو بہت پیار سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

”نمو! تم نے بتایا نہیں کہ تمہاری ملاقات قدسیہ بہن سے ہوئی تھی۔“

زاہدہ کے سوال پر وہ پریشان ہو کر ماں کا منہ دیکھنے لگی۔ اس سے پہلے وہ کوئی جواب دیتی۔ قدسیہ بیگم نے اس کی مشکل آسان کر دی۔

”ہنس اتفاقاً ملاقات ہوئی تھی۔ ہمارے عزیز ایڈمٹ تھے اسپتال میں۔ ان کی عیادت کے لیے گئے تھے ہم وہیں ہماری ملاقات نمو سے ہوئی۔“

ان کے بیان پر اس کی سانس بحال ہوئی تھی۔ وہ رسمی سی ملاقات اپنے اختتام تک خاصی بے تکلفی میں بدل چکی تھی۔ قدسیہ بیگم نے زاہدہ کو اپنے گھر آنے کی دعوت دی اور رخصت ہو گئیں۔ ان کے جانے کے بعد زاہدہ نے قدسیہ بیگم کی آمد کی وجہ بتائی تو حیرت کی شدت سے اس کا منہ کھل گیا۔ اس کی حالت دیکھ کر زاہدہ اور رمشا دونوں ہنس پڑے تھے۔

”منہ تو بند کرو پاگل!“ رمشا نے منٹے ہوئے اسے چپت لگا لی تو وہ جھینپ کر ماں کو دیکھنے لگی جنہوں نے اسے ساتھ لپٹا لیا۔

”یہ پاگل نہیں میری بہت پیاری بیٹی ہے۔“ ان کی بات پر رمشا نے شرارتی انداز میں ان کے کندھے سے سر نکالے نمو کو دکھا۔

”پیاری تو ہے امی! براہِ انتہا درجے کی بے وقوف بھی ہے۔ میں تو آنٹی کی چوائس پر حیران ہوں۔ انہیں اچھا کیا لگا؟“ اس کے ہونٹوں پر مسلسل شرارتی مسکان تھی۔

”امی! دیکھیں اسے۔“ نمو نے شکایتی انداز میں زاہدہ سے کہا۔

”رمشا! تنگ مت کرو اسے۔“ انہوں نے رمشا کو ٹوکا تھا۔ ”اور ویسے بھی میرے کی پہچان جو ہری کوئی ہوتی ہے۔ اور میری بیٹی ہیرا ہے ہیرا۔“

نمو نے زبان نکال کر رمشا کو چڑایا، جو تھکے لگا کر ہنس پڑی تھی۔

”دیکھیں امی! کیسے خوش ہو رہی ہے۔“ رمشا نے مسکراتی ہوئی نمو کی طرف اشارہ کیا تو انہوں نے مسکرا کر اس کا ہاتھ چوما۔

”اللہ تعالیٰ تم دونوں کو اپنے گھروں میں آباد رکھے۔ کہاں میں رمشا کے بارے میں سوچ رہی تھی اور اللہ نے بیٹھے بھائے تم دونوں کے اتنے اچھے رشتے بھیج دیے۔“ ان کا چہرہ ان کی سچی خوشی کی غمازی کر رہا تھا۔

”قدسیہ بیگم انوائٹ کر کے گئی ہیں۔ وسیم آتا ہے تو اس سے بات کر کے ان کے گھر کا پروگرام بناؤں گی۔“ وہ رمشا سے کہہ رہی تھیں جبکہ نمو سر جھکائے اپنے ناخنوں سے کھیل رہی تھی۔

”رات بہت ہو گئی ہے سو جاؤ اب تم دونوں۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولیں۔ ان کے باہر نکلتے ہی رمشا بول پڑی۔

”مجھے تو ان پر اور ان کے بیٹے پر ترس آ رہا ہے۔“

چہ۔ ”رمشا نے باقاعدہ افسوس کا اظہار کیا تھا تو نمو نے پاس بڑا تکیہ اٹھا کر اسے دے مارا جسے بچ کر کرنے کے بعد وہ پھر نہ گئی تھی۔

”یہاں سب اپنی مرضی کرتے ہیں۔ مجھ سے کسی نے پوچھنے کی زحمت ہی نہیں کی۔ خود ہی سب ملے کر لیا ہے۔“

”ہوں!“ رمشا کے ہنکارا بھرنے پر نمو نے چونک کر اسے دیکھا جو پاؤں میں سلیپر ڈال رہی تھی۔

”کہاں جا رہی ہو؟“ اسے دروازے کی طرف بدھتا دیکھ کر نمو نے حیرت سے پوچھا۔

”امی کو بتائے کہ تمہیں یہ رشتہ پسند نہیں۔“

”رمشا!“ وہ چیخی۔ ”میں نے یہ کب کہا۔“

”تو پھر پسند ہے؟“ رمشا نے زیر لب مسکراتے ہوئے اسے دکھا۔

”رفع ہو جاؤ۔“ وہ جاکر بیڈ پر لیٹ گئی تھی۔

”بتاؤ۔“ رمشا اس کے قریب جا کر بولی تو اس نے تکیہ منہ پر رکھ لیا۔

”رمشا! مجھے تنگ مت کرو تیند آ رہی ہے مجھے۔“

”تیند آ رہی ہے یا معیذ کے سنے دیکھنے لگی ہو۔“

”بکو مت۔“ وہ تکیے میں منہ دبے ہوئے بولی تو رمشا ہنستی ہوئی اس کے پہلو میں لیٹ گئی۔

”تم بھی دیکھو رمشا کے سنے۔“

نمو کے کہنے پر اس نے مسکراتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں۔ اگلے ہی لمحوں اس نے جھٹکے سے آنکھیں کھول دیں۔ اس کی مسکراہٹ سمٹ گئی تھی۔ بند آنکھوں کے پیچھے کوئی اور ہی مسکراہٹ تھا۔

”نیل!“ وہ حیرانی سے بڑبڑاتی تھی۔



وہ غصے سے سارے کمرے میں چکراتی پھر رہی تھی۔ تقریباً ایک گھنٹہ پہلے زاہدہ بیگم اس کے کمرے میں آئی تھیں۔ یہ کہنے کہ وہ رشتہ دیکھنے جا رہی ہیں۔ وہ ان کے ساتھ چلے۔ اس نے تفصیل سے بغیر طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر کے جانے سے انکار کر دیا۔ اگر اسے ذرا سا بھی اندازہ ہو تاکہ وہ اکیلی نہیں وسیم کے ساتھ جا رہی ہیں تو وہ کبھی بھی انکار نہ کرتی۔ وہ دونوں ماں بیٹا ایک ساتھ گئے تھے۔

پتا نہیں راستے میں کیا کیا پٹیاں پڑھا رہی ہوں گی۔ یہ خیال اسے غصہ دلانے کو کافی تھا اور زیادہ غصہ اسے وسیم پر آ رہا تھا۔ اس نے اسے بتانے کی زحمت تک نہیں کی۔

وہ ہاتھ مسلتی کتنی دیر گھڑی کو دیکھتی رہی۔ پھر کچھ سوچ کر باہر آ گئی۔ نمو اور رمشا دونوں لاؤنج میں بیٹھی نی دی دیکھ رہی تھیں۔ وہ دونوں کسی ڈرامے پر تبصرو کرتے ہوئے اتنی مگن تھیں کہ اس کی وہاں موجودگی کا نوٹس ہی نہ لیا۔

”چھا ہے اس کا رشتہ ہو جائے اور یہ جائے۔“ قینچی کی طرح تیز زبان ہے۔“ ہنستی ہوئی رمشا کو دیکھ کر رخسانہ نے منہ بنایا اور پھر اس کی نظر نمو پر ٹھہر گئی ساتھ ہی زوار کی خواہش بھی ذہن میں آ گئی۔

”آخر کیا ہے اس لڑکی میں۔“ اس نے بغور نمو کو

دیکھا۔ ”بالکل ساہی تو ہے۔“ اس کے ذہن میں اور بہت سی لڑکیاں آئیں جو زوار میں دلچسپی رکھتی تھیں۔ نمو سے کئی درجہ حسین، طرح دار اور دولت مند۔ اس نے ایک بار پھر اسے دیکھا۔

اس کے نقوش خوبصورت ہیں لیکن وہ تو رمشا کے بھی ہیں ہاں! کچھ دیر بعد جیسے وہ کسی نتیجے پر پہنچی۔ اس کی مقصودیت۔ اس کے چہرے پر ایک خاص نرمی اور ملاحظت تھی جو اسے سب سے نمایاں کرتی تھی۔ وہ شاید یونہی کھڑی جائزہ لیتی رہتی لیکن گاڑی کے مخصوص بارن پر وہ چونکی اور تیزی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھی۔ وسیم جب کمرے میں داخل ہوا وہ بازو آنکھوں پر رکھے لیٹی تھی۔

”اب طبیعت ٹھیک ہے تمہاری؟“ وسیم کے پوچھنے پر اس نے آنکھوں سے بازو ہٹا کر اسے دیکھا تھا۔

”آپ کو اپنی مصروفیت میں یاد رہا کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں۔“

”کیا مطلب؟“ وسیم ہاتھ روم کی طرف جاتے جاتے رک گیا۔

”مطلب یہ کہ آپ چلے گئے۔ جانے سے پہلے آپ نے ایک دفعہ زحمت نہیں کی کہ مجھے بتاویں۔ آپ نے ضروری نہیں سمجھا کہ مجھے بھی ساتھ لے جائیں۔“

”امی نے تم سے پوچھا تو تھا۔“

”ہاں۔ جس دل سے پوچھا تھا۔ مجھے پتا ہے صاف لگ رہا تھا کہ وہ مجھے لے جانا نہیں چاہتیں۔“ وسیم کوئی جواب دے بغیر ہاتھ روم چلا گیا۔

رخسانہ نے غصے سے ہاتھ روم کے بند دروازے کو دیکھا۔ مگر وسیم کے باہر آنے تک اپنا غصہ کنٹرول کر چکی تھی۔

”کر آئے آپ لوگ رمشا کی بات کی؟“

وسیم نے کچھ حیرت سے اسے دیکھا۔ ”ہم نمو کے رشتے کے لیے گئے تھے۔“

”کیا؟“ رخسانہ کو لگا، اسے سننے میں غلطی ہوئی

”کس کے؟“

”ارے بابا نموکے۔“

”یہ نموکا رشتہ کہاں سے آگیا۔ بات تو رمشا کی چل رہی تھی۔“

”ہاں رمشا کی بھی چل رہی ہے۔ ای نے کل بتایا تھا کہ ایک خاتون نموکا رشتہ لے کر آئی تھیں۔ اسپتال میں نموکے ملی تھیں وہ ای کو اچھی لگیں۔ آج ہم ان کے گھر گئے تھے۔ کافی ویل آف نیل ہے۔ ایک سی جٹا ہے ان کا اپنا بزنس ہے۔ مجھے تو وہ لوگ پسند آئے اسی لیے تو ای نے ہمیں بھی ساتھ چلنے کو کہا تھا۔“

رخسانہ کو تو جیسے مرچیں سی لگ گئیں تھیں۔

”سب کچھ آپ دونوں بلا ہی بلا ملے کر آئے۔ نہ کچھ بتایا نہ کچھ پوچھا۔ اب بھی بتانے کی کیا ضرورت تھی؟“

شادی والے دن بتاتے۔

اس کے طیش بھرے انداز کو وسیم نے حیرت سے دیکھا۔

”اس میں اتنا غصہ کرنے والی کیا بات ہے۔ رمشا کی دفعہ میں تم نے کوئی انٹرسٹ شو نہیں کیا تھا۔ اسی لیے میں نے ہی ای سے کہا تھا کہ تمہیں بعد میں بتادیں گے۔“

رخسانہ کا بس نہیں چل رہا تھا۔ وہ کیا کر ڈالے۔ اسے واقعی وسیم کے علاوہ گھر کے لوگوں اور ان کے معاملات میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ لیکن بات یہاں نموکہ تھی۔ اس کے بھائی کی پسند کی۔ وہ بھائی جو اکلوتا تھا۔ اس کا مہکمہ اس کا ماں اور اسے ناراض کرنے کا وہ ریسک بھی نہیں لے سکتی تھی۔ وسیم کی جتنی تنخواہ تھی اس میں تو بس گھر ہی چلتا تھا۔ اس کے خرچے اس کے خرچے تو زوار ہی اٹھا تھا اور اس کی ضدی طبیعت سے بھی وہ واقف تھی۔ اگر زوار نے نموکا نام لیا تھا تو ضرور بات پسند سے زیادہ تھی اس نے تو اس لیے گھر میں بات نہیں کی تھی کہ رمشا بڑی تھی۔ ابھی رمشا کی بات کہیں ملے نہیں ہوئی تو نموکا کیا ذکر لیکن کیا پتا تھا کہ اندر ہی اندر کیا گھڑی پک رہی ہے۔

اس نے نظر گھما کر وسیم کو دیکھا جو بیڈ پر نیم دراز ٹوی دکھ رہا تھا۔ وہ پریشانی سے زوار کے بارے میں سوچنے لگی۔

رمشا کو دیکھ کر سعدیہ پہلے حیران ہوئی اور پھر ایک دم خوش ہو کر اس کے گلے لگ گئی۔

”یوں اچانک!“ اس سے الگ ہو کر سعدیہ نے پوچھا۔

”کیوں مجھے دیکھ کر آپ کو خوشی نہیں ہوئی؟“ وہ مصنوعی ناراضی سے بولی تو سعدیہ نے پھر اسے گلے لگالیا۔

”ارے باگل! خوشی اتنا اچھا لگ رہا ہے تمہیں دیکھ کر تم سے کل بات ہوئی تھی لیکن تم نے آنے کا ذکر نہیں کیا۔“

”سوچا آپ کو سربراہزادوں کی۔“ اس کے ساتھ چلتے ہوئے رمشا نے کہا۔

”بڑا اچھا کیا۔“ وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے لاؤنج میں داخل ہوئیں جہاں سعدیہ کی ساس لیوی دیکھ رہی تھیں۔ اس کے سلام کے جواب میں انہوں نے اسے خود سے لینا کر بڑے والہانہ انداز میں پیار کیا۔ رمشا کتنی دیر تک تو حیرت کے مارے مل ہی نہیں سکی۔ یہی سعدیہ کی ساس تھیں جن کے کما تھے کے بل ان کی آمد پر صاف دیکھے جاسکتے تھے اور آج اتنا پیار۔

”کیلی آئی ہو جیٹا!“

”جی وسیم بھائی چھوڑ کے گئے ہیں۔“

”اچھا اور گھر میں سب ٹھیک ہیں۔“

”جی!“ اس نے جواب دے کر سعدیہ کو دیکھا جو پھل اس کے آگے رکھ رہی تھی۔

”سعدیہ! بہن کو اپنے کمرے میں لے جاؤ اور وہاں آرام سے بیٹھ کر باتیں کرو۔“

یہ دوسرا انقلاب تھا اور نہ پہلے تو سعدیہ کو اکیلے بیٹھنے کی اجازت نہ تھی۔ وہ اسی حیرانی کے ساتھ سعدیہ کے کمرے میں چلی آئی۔

”باجی! سب ٹھیک ہے نا آپ کی ساس اور اتنی مہربان۔“ اس کی حیرانی پر سعدیہ ہنس پڑی۔

”ہاں بس سب نیل کی وجہ سے ہے۔“

”اچھا۔“ بہت لگا ساس کے منہ سے نکلا تھا۔

”اچھا یاد آیا۔ تم نے اس رشتے سے انکار کیوں کیا؟ اتنے اچھے لوگ تھے پتا ہے ای کو کتنا افسوس ہے۔“

”ایسے ہی۔“

”ایسے ہی؟“ سعدیہ نے آنکھیں پھیلا کر اسے دیکھا۔ ”تمہیں پتا ہے اچھے رشتے کتنی مشکل سے ملتے ہیں اور تم نے ایسے ہی کہہ کر اتنے اچھے رشتے کو ٹھکرا دیا۔“

”باجی پلیز۔“ اب کہ وہ آگیا کر بولی۔ ”اسی بحث سے تنگ آکر میں آپ کے پاس آئی تھی اور آپ بھی وہی قصہ لے کر بیٹھ گئیں۔“

اس کے جواب پر سعدیہ خاموشی سے اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔

”اتنے اچھے رشتے سے انکار کے پیچھے کوئی توجہ ہوگی۔“ سعدیہ کے جتاتے ہوئے انداز پر بیڈ شیٹ کے ذرائع پر چلتی اس کی انگلی لمحہ بھر کے لیے رک سی گئی۔ ”میں تمہاری بہن ہوں اگر تم مناسب سمجھو تو مجھ سے شیئر کر سکتی ہو۔“

رمشا نے نظریں اٹھا کر سعدیہ کا چہرہ دیکھا۔

”پتا نہیں باجی! میں خود نہیں جانتی کیوں کیا۔“ وہ بے بسی سے بولی۔

”لیکن میں سمجھ گئی ہوں۔“ اب کے سعدیہ مسکرا کر بولی تھی۔

رمشا نے چونک کر اسے دیکھا۔ ”کیا؟“

”کچھ نہیں۔ تم یہ بتاؤ جو نموکے لیے رشتہ آیا ہے وہ کیسا ہے؟“

”اچھے لوگ ہیں۔ قد سیہ آئی سے پہلے بھی مل چکی ہوں۔“

”اچھا کہاں؟“ سعدیہ نے حیران ہو کر پوچھا۔ ”جواباً“

رمشا نے نموکے مدد لینے سے لے کر ان کے گھر جانے تک کا سارا احوال سنا ڈالا۔ ساری بات سن کر سعدیہ

ہنس پڑی۔

”اپنی نموکہ شروع سے ہی لگی ہے۔ لیکن جو ہوا اسے قسمت کہتے ہیں۔ نموکہ خوش ہے؟“ سعدیہ کے پوچھنے پر رمشا کھل کر مسکرائی۔

”در رخسانہ وہ کیسی ہی؟“ رمشا نے گہرا سانس لیا۔

”وہ بھی ٹھیک ہیں۔ آج کل کچھ امن ہے۔ شاید انہیں کوئی ایٹو نہیں مل رہا جس کو برحاجہا کر بھائی کے کلن بھریں۔“

”اس سے اس کے حل پر چھوڑ دو اور اس کے لیے ہدایت کی دعا کرو۔ اللہ تعالیٰ اچھے اچھوں کو سیدھا کر دیتے ہیں۔ میرے سرال والوں کی مثال تمہارے سامنے ہے۔“

سعدیہ کے کہنے پر رمشا مسکرا دی۔ تب ہی دروازے پر ہونے والی دستک پر دونوں مڑ کر دیکھا۔

”بھابھی! اجنزم۔“ نیل بولتا ہوا اندر آیا اور رمشا پر نظر پڑتے ہی پلٹنے لگا۔

”ارے نیل آؤ۔“ اسے مڑا دیکھ کر سعدیہ جلدی سے بولی۔

”وہ میں حمزہ کو لینے آیا تھا۔“

”ہاں لے جاؤ۔“ سعدیہ نے حمزہ کو اٹھاتے ہوئے کہا۔ اور اس دوران وہ مسلسل سر جھکائے اپنے پیروں کو دیکھنے میں مصروف تھی۔ نہ اس نے نیل کو سلام کیا تھا اور نہ نیل نے اسے مخاطب کیا۔ زبردستی جگائے جانے پر حمزہ گلا پھاڑ کر رونے لگا تھا۔ نیل نے آگے بڑھ کر اسے گود میں اٹھالیا تھا۔ ”بیٹھو نیل! میں تمہارے لیے چائے لے کر آتی ہوں۔“

”نہیں بھابھی!“

”مجھے رمشا کے لیے بھی چائے بتانی ہے تمہارے لیے بھی بنادوں گی۔ تم ابھی آئے ہو میں۔“

کہہ کر سعدیہ باہر نکل گئی اور کمرے میں وہ دونوں رہ گئے۔ مسلسل خاموشی پر اس نے نظریں اٹھا کر نیل کو دیکھا۔ وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ رمشا نے اپنی نظریں اس پر سے ہٹا کر دوبارہ اپنے پاؤں پر نکادیں۔ کتنے ہی

پل خاموشی سے گزر گئے اسے اب الجھن ہونے لگی تھی۔
 ”یہ کچھ کہتا کیوں نہیں۔“ اس نے دانت پیٹتے ہوئے سوچا۔ اسی وقت سعدیہ ٹال دھکیلتے ہوئے اندر داخل ہوئی۔
 ”ارے تم دونوں اتنے خاموش کیوں بیٹھے ہو؟“ سعدیہ کے مسکرا کے پوچھنے پر بھی ان دونوں کے زاویوں میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔
 ”نیل! تمہیں ایک زحمت دینی تھی۔“
 ”جی! وہ چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے بولا۔
 ”مجھے اور رمشا کو شاپنگ پر جانا ہے اگر تم ہمیں ڈراپ کرو۔“
 ”شاپنگ!“
 ”وہ منگنی کی شاپنگ کرنی ہے۔“
 ”منگنی؟“ اس نے دہرائے کے ساتھ ایک غصیلی نظر رمشا پر ڈالی۔ ”بہت مبارک ہو۔“ اس کے طنزیہ انداز پر رمشا نے بڑی خاموش نظر اس پر ڈالی تھی۔
 ”ارے رمشا کی نہیں منگنی کی۔“
 ”اور وہ جوان کے لیے پڑپونل آیا ہوا تھا۔“ وہ پتا نہیں کیا جانا چاہتا تھا۔
 ”ہاں وہ رمشا نے منع کر دیا۔ میں ابھی تھوڑی دیر پہلے اس سے یہی پوچھ رہی تھی۔ یہاں تم شادی سے منع کر دیتے ہو وہاں رمشا منع کر دیتی ہے عجیب ہو تم دونوں۔“
 سعدیہ کے معنی خیز بات پر ان دونوں کی نظریں بیک وقت ایک دوسرے کی طرف اٹھیں ان دونوں کو کچھ کہنا نہیں پڑا تھا۔ آنکھوں نے جیسے سب واضح کر دیا تھا۔ سعدیہ نے بغور دونوں کی شکلیں دیکھی تھیں۔
 ”نیل! تم فریش ہو جاؤ پھر چلتے ہیں۔ میں حمزہ کو ای کووے آتی ہوں۔“
 وہ اٹھ کر باہر نکل گئی تو رمشا بھی کھڑی ہو گئی۔
 ”تم نے اس پڑپونل کو منع کیوں کیا؟“ وہ رمشا کے بالکل سامنے کھڑے ہو کر پوچھ رہا تھا جبکہ ہونٹوں پر بڑی گہری مسکراہٹ تھی۔

”میری مرضی۔“ وہ نظریں چراتے ہوئے بولی کیونکہ اس کی جاتی ہوئی مسکراہٹ سے وہ اچھی خاصی کنفیوز ہو گئی تھی۔
 ”رمشا!“ وہ اس کی سائیڈ سے ہوتی ہوئی باہر جانے لگی تھی جب اس کی آواز برر رک گئی۔
 ”میں ای اور بھابھی کو بھیجوں گا۔ مجھے یقین ہے اب تم انکار نہیں کرو گی۔“
 ”آپ کو ایسا کیوں لگتا ہے کہ میں انکار نہیں کروں گی۔“
 اب کے وہ کھل کر مسکرایا۔ ”اس کا جواب تم اپنے آپ سے پوچھنا۔“
 اس نے دھیرے سے کہا اور باہر نکل گیا۔ رمشا کھل کر مسکرا دی۔ نیل کے ایک اظہار محبت نے اسے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ نہ صرف اس سے محبت کرتا ہے بلکہ عزت بھی کرتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اسے یقین ہو چلا تھا کہ وہ اس کی عزت کو ابھی سکتا ہے۔ نیل پر کسی اور کو فوقیت دینا زری بے وقوفی ہوتی۔ آج سعدیہ کے گھر جا کر اس کی تھوڑی بہت کشمکش بھی ختم ہو چکی تھی۔

”رخسانہ۔“
 ”کیا ہو گیا ہے۔“ وسیم کے تیسری دفعہ پکارنے پر وہ جھنجھلائی ہوئی اندر آئی تھی۔
 ”کب سے آوازیں دے رہا ہوں۔ زوار کا فون ہے۔“ اور فون کی طرف بڑھتے اس کے قدم رک سے گئے تھے۔
 ”ارے بھئی پکڑو اتنی دیر سے کل کر رہا ہے۔“ رخسانہ نے بڑے مرے مرے انداز میں فون اٹھا۔
 ”ہیلو سسٹر! کیسی ہو۔“
 ”ٹھیک ہوں تم سناؤ۔“
 ”میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔ کچھ دنوں تک آرہا ہوں سوچا تم سے پوچھ لوں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے۔“

POUNTRY CHINA JULY 2012

اس کے انکار پر۔ وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ ”پہلی دفعہ تم نے منگی ہے خیر یہ بتاؤ وہ کیسی ہے۔“
 ”کون۔“ رخسانہ نے وزیدہ نظروں سے وسیم کو دیکھا جو ڈائری پر جھکا پتا نہیں کون سے حساب کتاب میں مصروف تھا۔
 ”ارے تمہاری نند اور اپنی ہونے والی بیوی کا پوچھ رہا ہوں۔“ جواباً وہ چپکتے ہوئے انداز میں بولا۔ مگر اس کے سیاٹ سے جواب پر وہ قدرے غصے سے بولا۔
 ”تم نے ابھی گھر میں بات نہیں کی؟“
 ”نہیں۔“
 ”کیوں۔“ اب کے اس کے لہجے میں ہلکا ہلکا غصہ تھا۔
 ”کر لوں گی۔“ وہ جھنجھلا کر بولی۔
 ”ٹھیک ہے جلدی کرنا کیونکہ میں نے اس کے لیے ڈائمنڈ رنگ لی ہے اور اس کو پہنانے کے لیے بے چین ہوں۔“
 رخسانہ نے کوئی جواب نہیں دیا تھا اور اس کی خاموشی کو پتا نہیں وہ کیا سمجھا نہیں کر بولا۔
 ”جھلس مت ہو تمہارے لیے بھی سیٹ لیا ہے۔“ آخر میری بہن کی وجہ سے مجھے اتنی بڑی خوشی ملنے والی ہے۔ اگر تم وسیم سے شادی نہ کرتیں تو مجھے میری محبت مجھے کیسے ملتی۔“ آخر میں وہ قہقہہ لگا کر بولا تو رخسانہ کی پریشانی میں کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا۔
 ”او کے رکھتا ہوں۔ اللہ حافظ۔“
 شکر تھا اس نے خود ہی فون بند کر دیا ورنہ اس کی اتنی خوشی محسوس کر کے رخسانہ کو آنے والے وقت سے خوف آرہا تھا۔ وہ کتنی دیر تک موبائل ہاتھ میں لیے گم سم بیٹھی رہی۔
 ”کیا ہوا ایسے کیوں بیٹھی ہو۔“ وسیم کی آواز پر اس نے چونک کر اسے دیکھا۔ ”کیا کہا زوار نے۔“ وسیم کے پوچھنے پر اس نے اسی گم سم انداز میں سرنگی میں ہلا کر انا اس سے سوال کر دیا۔
 ”آپ کیا کر رہے ہیں۔“ رخسانہ نے اس کے ہاتھ میں پکڑی ڈائری کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”حساب لگا رہا ہوں، منمو کی منگنی میں ہونے والے خرچے کا۔ اتنا ہی رمشا کا بھی ہوگا۔ صرف منگنی پر لاکھوں کا خرچ آرہا ہے۔ سوچ رہا ہوں شادی پہ کیا بنے گا۔“
 وہ پریشانی سے بالوں میں ہاتھ چلاتا ہوا بولا۔ تب ہی رخسانہ کے دماغ میں خیال آیا۔ ”غیروں میں شادیاں کریں گے تو ناک اونچی رکھنے کے لیے لاکھوں تو خرچ کرنے ہی پڑیں گے۔ اسی لیے تو اپنے اپنے ہوتے ہیں۔ لا جوڑے پکڑوں میں بھی خوشی خوشی اپنانے کو تیار ہو جاتے ہیں۔“
 ”میں سمجھا نہیں۔“ اس کے چہرے پر واقعی نا سمجھنے والی کیفیت تھی۔
 ”اس میں نہ سمجھنے والی کیا بات ہے۔ اگر ہم منمو کی شادی زوار سے کر دیتے ہیں تو خرچہ ہی نہیں ہوگا۔ آپ کو تو پتا ہے زوار کے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ دل کا بھی کتنا سخی ہے اور پھر آپ کا دیکھا بھلا بھی ہے۔“
 وسیم کے چہرے پر تذبذب کی کیفیت دیکھ کر مزید بولی۔
 ”اور یہ میری بھی خواہش ہے اور زوار کی بھی۔ ہمیں منمو بہت پسند ہے میں تو آپ سے آئی سے بات کرنے والی تھی، لیکن آپ لوگ چھپ چھپاتے سب طے کر آئے مجھے بتایا بھی نہیں۔“
 وہ نروٹھے انداز میں بولی تو وسیم پر سوچ انداز میں ڈائری کے صفحے پلٹنے لگا۔
 ”اب ایسے خاموش کیوں بیٹھے ہیں۔ جواب دیں مجھے۔“
 ”رخسانہ! تم نے مجھے عجیب معیبت میں ڈال دیا ہے۔“
 ”کیوں اس میں معیبت کیا ہے۔ آپ کو کوئی اعتراض ہے میرے بھائی پر۔“ اب کے رخسانہ ماتھے پر ہل ڈال کر غصے سے بولی۔ وسیم گڑبڑا گیا۔
 ”مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ مجھے تو زوار پسند ہے۔ بلکہ اچھا ہی ہوگا اگر ایسا ہو جائے، لیکن بات ای

کی ہے۔ اسی کو وہ لوگ پسند ہیں اور تقریباً بات بھی ملے ہو چکی ہے۔

”صرف بات ہوئی ہے، ممکن نہیں ہوئی اور اگر ممکن بھی ہوئی ہوتی تو کوئی بڑی بات نہیں۔ لوگوں کی مشکلیاں ٹوٹی نہیں کیا اور جہاں تک آنٹی کی بات ہے، اگر آپ آنٹی سے کہیں گے تو وہ ضرور مان جائیں گی۔“ اب کےوسیم کچھ نہیں بولا تھا۔

ریسور رکھتے ہی اس نے آنکھیں بند کر کے کمراساں لیا۔ لیکن جوں ہی اس نے آنکھیں کھولیں اسے جھٹکا لگا تھا۔ بالکل سامنے رخسانہ بھا بھی کھڑی مشکوک نظروں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

”کس کا فون تھا۔“

”وہ رائگ نمبر تھا۔“ ہاتھ ملتے نمونہ بمشکل بول تو رخسانہ کے چہرے پر بڑی طنز مہکراہٹ آئی تھی۔

”یہ کیسا رائگ نمبر تھا؟ جس سے تم پچھلے پندرہ منٹ سے بات کر رہی تھیں۔“ نمونہ تھوک نکل کر سر جھکا دیا۔ کوئی بہانہ نہیں سوچا تھا۔ وہ ان کی جھپٹی ہوئی نظروں سے بچنے کے لیے تیزی سے چلتی ہوئی اپنے کمرے میں آگئی۔ تھوڑی دیر پہلے معیض سے بات کرتے ہوئے وہ جس سرشاری میں مبتلا تھی وہ یکدم غائب ہو گئی تھی۔ اب بس حواسوں پر رخسانہ بھا بھی کی آ رہا ہوتی نظریں سوار تھیں۔

وسیم پریشانی اور گھبراہٹ کے ساتھ الماری سے کپڑے نکالتی رخسانہ کو دیکھ رہا تھا۔

”یہ تم کیا کر رہی ہو۔“ رخسانہ نے ایک غصیلی نظر وسیم پر ڈالی اور دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہوئی۔

وسیم نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے کپڑے چھین لیے تھے۔

”میں پوچھ رہا ہوں کیا کر رہی ہو تم۔“

”پکینگ کر رہی ہوں۔“

”رخسانہ پلیز! سمجھے کی کوشش کرو۔ اتنی سی بات پر

کوئی ناراض ہو کر جاتا ہے۔“ رخسانہ نے غصے سے وسیم کو دیکھا۔

”اتنی سی بات۔ اتنی سی بات نہیں ہے۔ میرے بھائی کے پروپونل کو رتبہ جیکٹ کر دیا ہے آپ نے۔ یہ میرے بھائی کی نہیں میری بھی بے عزتی ہے۔“

”اسی نے انکار نہیں کیا۔ نمونہ کی مرضی نہیں تھی واصل۔“ اور کپڑے بیک میں رکھتا رخسانہ کا ہاتھ رک گیا۔

”وہ مجھے پہلے ہی پتا تھا کہ آپ کی بہن کی مرضی نہیں ہوگی۔ یہ رشتہ جس طرح آیا تھا، مجھے تو تب ہی شک ہوا تھا۔ یوں ہی کوئی سڑک پر ملنے کے بعد منہ اٹھا کر رشتہ نہیں لے آتا۔ میں نے خود اپنے گناہ گار کاٹوں سے آپ کی بہن کو فون پر رو مانس کرتے سنا ہے۔ یہاں آپ کی والدہ نے کوئی پیکچر نہیں دیا ہوگا۔ جب آپ نے مجھ سے شادی کی تھی، رمشا اور آنٹی نے کتنی باتیں سنائی تھیں۔ اب انہیں نظر نہیں آ رہا کہ ان کی بیٹی کیا گل کھلا رہی ہے۔“

”رخسانہ۔“ وسیم غصے سے بولا۔

”چلائیں مت“ آپ سے زیادہ اونچی آواز میں بات کر سکتی ہوں۔“ اس نے بیک کی زپ بند کی اور بیک اٹھا کر دروازے کی طرف بڑھی۔ وہ باہر نکلی تو زاہدہ دروازے کے قریب ہی کھڑی تھیں۔

”بیٹا! یوں ناراض ہو کر کوئی اپنا گھر چھوڑ کر جاتا ہے۔“

”یہ میرا گھر نہیں ہے اور کبھی اس گھر کے لوگوں نے مجھے اپنا سمجھا بھی نہیں۔“

”یہاں نہیں رخسانہ! میں نے کبھی تمہیں رمشا اور نمونہ سے الگ نہیں سمجھا۔“

”مگر ایسا ہوتا آنٹی تو آپ کبھی زوار کے رشتے سے انکار نہ کرتیں۔ کیا برائی ہے اس میں، یہی کہ وہ میرا بھائی ہے؟“

”نہیں بیٹا! زاہدہ نے پیار سے اس کا بازو تھاما۔

”تو پھر انکار کی وجہ۔“ اب کے زاہدہ نے بے بسی سے وسیم کو دیکھا جو نظریں چرا گیا تھا تو کب سے

خاموشی سے سختی رمشا زاہدہ کے پہلو میں آکر کھڑی ہو گئی۔

”بھابھی! یہ رشتے دل کی آلودگی سے ملے ہوتے ہیں، زور زور سے نہیں۔ اگر ہم نمونہ کا رشتہ معیض سے ملے کر رہے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ ہم زوار کو برا کہہ رہے ہیں۔“

”تم لوگ کیا سمجھتے ہو مجھے اس سے کوئی مطلب نہیں اور جس کی دلی آلودگی سے یہ رشتہ ہو رہا ہے وہ بھی مجھے پتا ہے۔“

رخسانہ نے ایک طنز پرکھن کے دروازے کے قریب کھڑی نمونہ پر ڈالی اور بیک کھینچی ہوئی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

وہ لاؤنج میں داخل ہوا تو رخسانہ ریوٹ ہاتھ میں لیپ ٹاپ کی طرف متوجہ تھی۔

”تم کب آئیں۔“

”ابھی تھوڑی دیر پہلے تم سو رہے تھے۔“

”سب ٹھیک ہے؟“

”ہوں۔“ رخسانہ نے چونک کر اسے دیکھا۔

”ہاں۔ سب ٹھیک ہے۔“

”پچھلے۔ مگر یہ بیک؟“ اس نے بیک کی طرف اشارہ کر کے رخسانہ کو دیکھا۔

”میرا ہے۔ رہنے آئی ہوں۔“ اب کے زوار پوری طرح اس کی طرف ٹھوم گیا۔

”تمہاری وسیم سے کوئی لڑائی ہوئی ہے؟“

”میں نے تمہارا پروپونل دیا تھا۔ انہوں نے منع کر دیا۔“ وہ کچھ دیر خاموش رہا۔

”وسیم نے منع کیا ہے؟“ زوار کے پوچھنے پر اس نے سر نیچی میں ہلایا۔

”نہیں۔ نمونہ۔ مجھے کسی نے بتایا کہ اس کا پروپونل آیا ہے۔ وسیم اور آنٹی جا کر پسند بھی کر آئے ہیں۔ جب وسیم نے مجھے بتایا تو میں نے تمہارا ذکر کیا۔ انہوں نے تو کوئی اعتراض نہیں کیا، لیکن نمونہ۔“

اتنا کہہ کر وہ رک گئی۔ وہ تو مجھے بعد میں پتا چلا کہ یہ جو رشتہ ہو رہا ہے نمونہ پہلے سے اس لڑکے کو جانتی ہے اور اس لڑکے کی پسند پر یہ رشتہ آیا ہے۔ فون پر باتیں ہوتی ہیں اور تم اس کی معصومیت پر فدا تھے۔“

رخسانہ نے طنز پر نظر زوار کے سیاہ پڑتے چہرے پر ڈالی اور پھر اس کے چہرے کے تاثرات پر اسے خود ہی اپنے طنز پر لبے کا احساس ہوا تو اٹھ کر اس کے قریب آئی۔

”زوار پلیز! تم اپنا دل برانہ کرو، میں تو پہلے بھی اس حق میں نہیں تھی۔ تم ہی قربان ہوئے جا رہے تھے اس کی معصومیت پر۔ دیکھ لی اس کی معصومیت، خود ہی اپنے لیے لڑکا بھی پسند کر لیا۔ خیر مع کرو۔ میں اس سے زیادہ اچھی اور خوب صورت لڑکی سے تمہاری شادی کرواؤں گی۔“

لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا، نہ پچھلی دفعہ کی طرح غصہ کیا۔ بس خاموشی سے پلٹ گیا تھا۔

”رمشا! یہ دیکھو کیا ہے۔“ نمونہ نے ریک سے کاہی رنگ کا کامیو لافراک نکل کر اسے دکھایا۔

”زبردست۔“ رمشا کو وہ پہلی نظر میں ہی اچھا لگا تھا۔

”نبیل بھائی کو بھی دکھا دو۔ اگر انہیں پسند آتا ہے تو فائل کرو اور خدا کا واسطہ ہے! اب کچھ لے لو۔“ چو گھٹنے سے خوار ہو رہے ہیں اور تمہیں ایک ڈریس بھی پسند نہیں آیا۔“

”میرا نکاح ہے کوئی مذاق نہیں۔“ رمشا نے مسکرا کر اس کا پھولا ہوا چہرہ دیکھا۔

”سنو! میں نے بھی ابھی شاپنگ بھی کرنی ہے اور دو سرائے بھوک بھی لٹی ہے۔“

”چھاپا باپم کر لو اپنی شاپنگ اور کر کے یہاں آجانا۔“ پھر کچھ کھاتے ہیں اوگے۔“ وہ سر ہلا کر دوسرے سیکشن میں آگئی۔ وہ ریک میں لٹکے کپڑوں کو الٹ پلٹ کر رہی تھی۔

رائل بلو ٹیغون کے فراک پر اس کا ہاتھ ٹھہر گیا تھا۔

"نہ رنگ تم پر سوٹ کرے گا۔" وہ بہت غور سے فراک دیکھ رہی تھی۔ جب اس نے پیچھے آتی آواز پر اس نے چونک کر پیچھے دیکھا اور نوار کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اس کی حیرت پر وہ کھل کر مسکرایا۔

"کیسی ہو۔" نمونے کوئی جواب نہیں دیا تھا اور مزہ کر سوٹ دوبارہ ہنگ کر دیا۔

"کیوں سوٹ پسند نہیں آیا۔ چلو کوئی بات نہیں تم پر تو سب ہی رنگ اچھے لگتے ہیں۔"

"یہ دیکھو۔" اس نے ریک سے ایک گلابی سوٹ نکال کر اس کے سامنے کیا۔ نمونے ایک نظر سوٹ پر ڈال کر قدم آگے کی طرف برسادیے۔ لیکن اگلے قدم پر اسے رکنا پڑا۔ اس کا بازو نوار کے ہاتھ میں تھا۔ اس کی جرات پر وہ پریشانی سے اسے دیکھنے لگی جونے سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"میں تم سے بات کر رہا ہوں۔"

"ہاتھ چھوڑیں میرا۔" اس نے اپنا ہاتھ کھینچتے ہوئے کہا مگر وہ مزید اس کے قریب آگیا تو اس نے ہراساں ہو کر ارد گرد کسی کومد کے لیے تلاش کیا لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔

"ڈر کیوں رہی ہو تمہیں کھاتو نہیں جاؤں گا۔" اور جب تک تم میری بات سن نہیں لیتیں تم یہاں سے نہیں جا سکتیں۔

نمرو جو اس سے بازو چھڑوانے کے لیے زور لگا رہی تھی رک گئی۔ کیونکہ اس کے انداز بتا رہے تھے کہ وہ واقعی اسے جانے نہیں دے گا۔

ابنی بے بسی پر اس کی آنکھ میں آنسو آگے تھے۔ "گڈ! تمہاری یہی بات مجھے اچھی لگتی ہے۔" اس کے ساکت ہو جانے پر وہ مسکرا کر بولا۔

"سنا ہے مجھ سے شادی کرنے سے تم نے انکار کیا ہے۔" وہ تم پر زور دے کر بولا تو نمرو جو سر جھکائے اپنے پیروں کو دیکھ رہی تھی۔ دزیدہ نظروں سے دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔ نہ جانے سب لوگ کہاں چلے گئے

تھے۔

اپنے بازو پر اس کے ہاتھ کا لمس اسے بری طرح چبھ رہا تھا۔ اس نے ایک بار پھر بے چین ہو کر اپنا بازو کھینچا۔

"میری بات پوری نہیں ہوئی۔" وہ اس کے بازو پر اپنے ہاتھ کا دباؤ بڑھاتے ہوئے بولا۔

"مگر تم نے اس وجہ سے انکار کیا ہے کہ میں تمہیں پسند نہیں تو۔ پھر ٹھیک ہے۔ تمہاری پسندیدگی بھی سر آنکھوں پر۔ میرے لیے میری پسندیدگی کافی ہے۔ چونکہ تم ایک مشرقی لڑکی ہو تو شادی کے بعد خود بخود مجھے پسند کرنے لگو گی ہے نا۔"

وہ تھوڑا سا جھک کر اس کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔

"مجھے جانا ہے۔" وہ روبانسی ہو کر بولی۔

"بات سنو نمرو! وہ ایک دم اتنی سنجیدگی سے بولا کہ وہ سب بھول کر اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔

"میں تمہیں اب سے نہیں تب سے پسند کرتا ہوں جب پہلی بار تمہیں دیکھا تھا۔ کہا اس لیے نہیں کہ میں تمہیں پرار طریقے سے اپنا نا چاہتا تھا۔ وہ سب کچھ جو تمہارے لیے سوچتا ہوں وہ شادی کے بعد تانا چاہتا تھا۔ مجھے جو بھی اچھا لگتا ہے میں اسے حاصل کر لیتا ہوں۔ میں چاہتا تو تمہیں بھی حاصل کر سکتا تھا لیکن تمہیں پانا چاہتا تھا تمہاری مرضی سے۔ اتنا انتظار میں نے صرف تمہاری محبت پانے کے لیے کیا اور تم نے کیا کیا۔"

اب کے اس نے اس کا بازو چھوڑ کر اسے کندھوں سے تھام لیا۔

"تم اگر اس وجہ سے انکار کرتیں کہ تمہیں میں اچھا نہیں لگتا تو مجھے بالکل برا نہیں لگتا لیکن تم نے کسی اور کو مجھ پر ترجیح دی۔ تمہیں کوئی اور اچھا لگتا ہے یہ میری برداشت سے باہر ہے۔ یہ جو تمہارا چہرہ ہے نا۔" اس نے ایک ہاتھ سے اس کی ٹھوڑی پکڑی۔ "اس سے میں بہت محبت کرتا ہوں۔ اگر اس چہرے کو دیکھنے کا حق کسی اور کو دوں گی تو یہ میری برداشت

سے باہر ہو گا۔

نوار نے اس کے چہرے سے ہاتھ ہٹایا تھا لیکن وہ تو جیسے مجھد ہو کر رہ گئی تھی۔ نوار نے ایک گہری نظر اس کے سفید پڑتے چہرے پر ڈالی۔

"میں کبھی بھی تم سے اس طرح بات نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن تم نے مجھے مجبور کر دیا۔"

وہ ایک دم اس کے قریب آکر کھڑا ہو گیا۔ یہاں تک کہ اس کی سائیس اسے اپنے ماتھے پر محسوس ہونے لگیں لیکن ڈرنے اس کے حواس اس طرح سلب کر لیے تھے کہ وہ اپنی جگہ سے اٹھ بھی نہیں سکی۔ اس نے اس کے بازو کو حرکت میں آنے دیکھ اور پھر پیچھے دیک میں لگاؤ گلابی سوٹ اس کے سامنے تھا۔

"چلو۔" وہ اس کا بازو پکڑ کر بولا اور وہ کسی رپورٹ کی طرح اس کے پیچھے چل پڑی۔

"تھینکس فار یور کو آپریشن۔" باہر نکلتے ہی اس نے سیلز مین سے کہا اور ہزار کانوٹ اسے تھمایا۔ نمونے نے چونک کر پہلے نوار کو اور پھر اس سیلز مین کو دیکھا۔ اسے اب سمجھ میں آئی تھی کہ اتنی بڑی شاپ ہونے کے باوجود کوئی کیوں وہاں نہیں آیا تھا۔ اس نے آنکھ میں آنے والے آنسو کو روکنے کے لیے مچلا ہونٹ سختی سے دانتوں تلے دبایا۔

"سرا میرے لائق کوئی اور خدمت۔" وہ ہزار کا نوٹ تھامے نوار سے پوچھ رہا تھا۔

"بس یہ سوٹ پیک کروا دیں۔" اس نے گلابی سوٹ اسے تھماتے ہوئے کہا۔

"نمرو۔" پیچھے سے رمشا کی آواز پر وہ دونوں تیزی سے مڑے تھے۔

"کہاں تھیں تم ڈھونڈ ڈھونڈ کر پریشان ہو گئے ہم لوگ۔" وہ واقعی اپنی پریشان تھی کہ اسے نمرو کے ساتھ کھڑا نوار نظر نہیں آیا تھا اور کب سے ضبط کرتی نمرو کا ضبط نوٹ کیا تھا۔ وہ رمشا کے گلے لگ کر رو پڑی تھی۔ پریشان رمشا حیران بھی ہو گئی تھی۔

"نمرو کیا ہوا ہے۔" وہ اس کی پشت سہلاتے ہوئے

بولی۔ تب ہی اس کی نظر نوار پر پڑی۔

"السلام علیکم۔" وہ مسکرا کر بولا۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں میرا خیال ہے نموکا بی بی لو ہو گیا ہے۔ میں شاپنگ کرنے آیا تھا۔ یہاں سے گزرا تو نمرو پر نظر پڑی۔ میں ابھی حل احوال پوچھ رہا تھا کہ تم آ گئیں۔" اتنے بڑے جھوٹ پر نمونے روتے روتے ناراض نظر اس پر ڈالی تو وہ نیل کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"اور بھی نیل! بہت مبارک ہو۔" عنقریب شادی شدہ ہونے والے ہو اور خوش قسمت ہو کہ جسے چاہا اسے پایا۔" اس کی بات پر نیل بے ساختہ مسکرا دیا اور رمشا بھی مسکرا دی تھی۔ جبکہ رمشا کے ساتھ لگی نمونے ہونٹ بھیج لیسے۔

"مجھے لگتا ہے واقعی اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" نیل نے اس کا سرخ پڑا چہرہ دیکھ کر کہا۔

"گری بھی تو بہت ہے۔ رمشا نے بھی اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے اتفاق کیا۔

"چلیں میں آپ کو چھوڑ دوں۔"

"نہیں نوار! تھینک یو۔ نیل ہمیں ڈراپ کر دیں گے۔" رمشا کے کہنے پر وہ کندھے اچکا کر ان کے ساتھ چلنے لگا۔

"ہیلو۔" وہ گاڑی کی طرف بڑھ رہے تھے جب قریب سے آواز سن کر رک گئے۔ معجزہ کو دیکھ کر جہاں وہ سب حیران ہوئے تھے وہیں نموکا آنکھیں چمک اٹھی تھیں۔

"کیسی ہیں آپ۔" اس نے رمشا سے پوچھنے کے بعد نموکا کو دیکھا تھا۔

"میں ٹھیک ہوں۔ آپ بتائیں انہی کیسی ہیں۔" وہ بھی ٹھیک ہیں۔ آپ۔" وہ جانے گیا کہنے جا رہا تھا۔ نوار کو دیکھ کر چونک کر خاموش ہو گیا۔ ان تینوں نے اس کا چوکنا نوٹ کیا تھا۔ رمشا نے مڑ کر نوار کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔

"آپ دونوں جانتے ہیں ایک دوسرے کو؟"

"بہت اچھی طرح۔" رمشا کے پوچھنے پر نوار زور

دے کر بولا۔
 ”او کے! میں چلتا ہوں۔“ معین ایک دم بوکھلا کر
 مزید بات کیے بغیر مڑ گیا۔
 ”یہ کون تھا؟“ نبیل نے کچھ حیرت سے اس کی
 بوکھلاہٹ دیکھی۔
 ”یہ معین تھا۔ بتایا تھا آپ کو نمونے کے لیے اس کا
 پروپوزل آیا ہوا ہے۔“ اب کے زوار نے چونک کر
 رمشا کو دکھا اور اس کے بعد نمونہ کو جو اسی طرف دیکھ
 رہی تھی، جہاں سے معین گیا تھا۔ اس کے ماتھے پر ہل
 پڑ گئے۔



وہ بیڈ پر چپٹ لیٹی کب سے چھت پر چلتے چلتے کو
 گھور رہی تھی۔ وہ سہرے کے مناظر پوری جڑیات کے
 ساتھ اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم رہے تھے۔
 اسے وہ نہ کراچی بڑی پر غصہ آ رہا تھا۔ وہ کیوں اس
 کے سامنے کمزور پڑ گئی تھی۔ کیا ضرورت تھی اسے اس
 کی بکواس سننے کی اور پھر اس کی دھمکی۔ اس نے بے
 اختیار اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے ڈھک لیا۔ تب ہی
 اس کے نیچے کے نیچے رکھا موبائل بج اٹھا تھا۔ اس نے
 بڑی بے زاری سے موبائل نکال کر نمبر دکھا مگر نمبر
 دیکھ کر اس کی بے زاری ہوا ہو گئی۔

”ہیلو کیسی ہو۔“ وہ سری طرف سے اس نے پوچھا
 تو وہ مسکرا دی۔
 ”ٹھیک ہوں۔“

”چھا تمہاری آواز سے تو نہیں لگ رہا اور وہ سہرے کو
 جب مل میں ملا تھا تو تب بھی تم مجھے ٹھیک نہیں لگی
 تھیں۔“ وہ ٹھنڈی سانس لے کر رہ گئی۔
 ”آپ وہاں سے اتنی جلدی چلے کیوں گے تھے۔“
 یاد آنے پر اس نے شکوہ کیا۔

”تو کیا کرتا تھم پوری فوج کے ساتھ باہر نکلی تھیں۔
 میں تو سمجھا تھا اکیلی آؤ گی۔ تھوڑی دیر ساتھ بیٹھیں
 گے۔ کچھ دل کی باتیں تمہیں سناؤں گا۔ لیکن۔“

اس کے افسوس۔ بے انداز پر نمونہ کو بھی افسوس ہوا۔
 ”چھا چھو نمونہ یہ بتاؤ وہ تمہارے ساتھ آؤ گی کون
 تھا۔“ اس کا ذکر کرتے ہوئے نمونہ کا حلق تنک کڑوا
 ہو گیا۔

”وہ بھابی کے بھائی ہیں۔“
 ”مہوں صرف بھابی کے بھائی یا کچھ اور بھی۔“ نمونہ
 کو اس کا لہجہ عجیب لگا۔
 ”آپ دونوں کو دیکھ کر تو لگا تھا آپ ایک دوسرے کو
 جانتے ہیں؟“
 ”ہاں جانتے تو ہیں۔ بہت اچھی طرح سے۔“
 ”چھا وہ کیسے؟“

”یہ چھو نمونہ! بس یہ شخص مجھے بہت برا لگتا ہے۔“
 اور نمونے پوری طرح اس سے اتفاق کیا۔
 ”وہ ہے ہی اس قاتل کہ اس کو برا سمجھا جائے۔“
 ”کیوں۔“ اب کہ معین کی آواز میں تجسس تھا۔
 نمونے گہری سانس لی۔

”در اصل ان کا پروپوزل آیا تھا میرے لیے اور
 بھابی چاہتے ہیں کہ میں ان سے شادی کر لوں۔“
 ”تو کیا تم اس سے شادی کرنا چاہتی ہو؟“
 ”بالکل نہیں۔“ وہ قطعی انداز میں بولی۔ ”وہ وہ
 شخص سخت ناپسند ہے مجھے۔“

”اور میں؟“ اب کہ وہ سری طرف سے مسکرا کر
 پوچھا گیا تھا۔ نمونہ کوئی جواب دیے بغیر مسکرا دی۔
 ”مجھ سے شادی کرو گی نا؟“

”جی۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔
 ”ٹھیک ہے اب اس بات پر قائم رہنا اور کیسے بھی
 حالات ہوں تم نے پیچھے نہیں ہٹنا میں تمہارے ساتھ
 ہوں۔“

”کیسے بھی حالات؟“ اس نے پریشانی سے دہرایا۔
 ”ہاں! میں نے ابھی تمہیں بتایا نا میں زوار کو جانتا
 ہوں۔ وہ میرا بہت بڑا دشمن ہے اور مجھے نقصان
 پہنچانے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دے گا۔
 ہو سکتا ہے وہ تمہیں یا تمہارے گھر والوں کو میرے

خلاف کرنے کے لیے غلط باتیں کرے۔ لیکن تم اس کا
 یقین مت کرنا۔ تمہیں مجھ پر یقین ہے نا نمونہ۔“
 ”جی۔“ اس کے پوچھنے پر وہ اٹھے ہوئے انداز میں
 بولی۔

”میں اب پیچھے نہیں ہٹ سکتا۔ اگر تمہارے گھر
 والے نہ مانے تو تمہیں مجھ سے کورٹ میں جرح کرنی
 ہو گی۔“ نمونہ کے سر پر دھماکا ہوا تھا۔
 ”اس کی نوبت نہیں آئے گی۔“
 ”نہ ہی آئے تو اچھا ہے، لیکن اگر ایسا ہوا تو تم میرا
 ساتھ دو گی نا؟“ اس نے بمشکل اثبات میں جواب دیا۔
 ”آئی لو پو۔“

اس کی بھاری آواز پر اس نے فون بند کر دیا۔ وہ الجھ
 گئی تھی۔ وہ وہاں کھٹنے پر اس نے تیزی سے سیل فون
 نیچے کے نیچے رکھا اور کورٹ بدل کر لیٹ گئی۔ وہ اس
 وقت کسی سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔



رخسانہ جب اندر داخل ہوئی تو وہ بے چینی سے
 سارے کمرے میں چکرانا پھر رہا تھا۔
 ”نوا! اس نے چونک کر رخسانہ کو دیکھا۔“ تم
 سوئے نہیں ابھی۔“

لیکن وہ کوئی جواب دیے بغیر پھر چکر لگانے لگا۔
 رخسانہ نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا جو کٹنی پریشان
 لگ رہا تھا۔ اس سے پہلے وہ مزید کچھ پوچھتی اس کا
 موبائل بج اٹھا۔

”یہ نمبر کفرم ہے؟“ وہ وہ سری طرف سے پوچھ رہا
 تھا۔ ”او کے تو بھینکس۔“

اس نے فون بند کر کے جلدی سے دوسرا نمبر ملایا۔
 اب وہ فون کلن سے لگائے شاید وہ سری طرف سے
 فون اٹھائے جانے کا انتظار کر رہا تھا، جبکہ رخسانہ
 مسلسل الجھی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”نوا! بات کر رہا ہوں۔“ اس کے تعارف کروانے
 پر وہ سری طرف سے عقبہ سنائی دیا تھا۔
 ”بتانے کی ضرورت نہیں میں پہچان گیا ہوں اور

تمہارے ہی فون کا انتظار کر رہا تھا۔“ اس کے جتانے
 ہوئے انداز پر زوار کے ہونٹ ہنسنے لگے تھے۔
 ”ہو لو کیوں فون کیا ہے۔“

”نمونہ سے دور رہو۔“ وہ ایک ایک لفظ پر زور دے
 کر بولا تو معین ہنس پڑا۔
 ”کیوں؟“

”اس سے تمہیں مطلب نہیں ہونا چاہیے۔“ وہ
 طنز پر انداز میں بولا۔

”تمہیں جتنی تکلیف ہو رہی ہے معلوم ہوتا ہے
 بات کچھ اور ہی ہے۔ بڑی حیرت ہو رہی ہے زوار شاہ کو
 محبت ہو گئی اور وہ بھی ایسی لڑکی سے جو زوار سے محبت
 نہیں کرتی، بلکہ زوار شاہ کے سب سے بڑے دشمن
 سے شادی کرنا چاہتی ہے۔“

”بکواس بند کرو اپنی۔“ وہ ایک دم چیخ اٹھا۔
 ”اور چیخو زوار شاہ! بڑا سکون مل رہا ہے تمہاری چیخ
 سن کر۔“

”میں آخری دفعہ کہہ رہا ہوں نمونہ سے دور رہو۔
 ورنہ تمہارا وہ حشر کروں گا کہ تمہیں اپنی زندگی سے
 نفرت ہو جائے گی۔“

”پہلے بھی تم میرے ساتھ بہت برا کر چکے ہو، لیکن
 اب میری باری ہے مجھے بیش اس لمحے کا انتظار رہا ہے
 کہ تمہیں تڑپتے دیکھوں۔ وہ لمحہ اب آگیا ہے۔ میں
 تمہاری محبوبہ کا وہ حشر کروں گا کہ وہ اپنی زندگی سے
 نفرت کرنے لگے گی۔“ اس کے لہجے میں سانپ کی سی
 پھنکار تھی۔

”اسے اس طرح اپنے جال میں پھنسا رہا ہے کہ اس
 کا ٹکنا مشکل ہے۔ پچا سکتے ہو تو پچالو۔“ وہ ہنستے ہوئے
 بولا۔

”تم باز نہیں آؤ گے۔“ زوار نے کافی سنجیدگی سے
 پوچھا۔

”مجھے کیوں کہہ رہے ہو نمونہ کو وہ مجھ سے
 شادی سے انکار کر دے۔“ معین نے جیسے اس کی بے
 بسی کا مذاق اڑایا۔

”چہ زوار شاہ! ایک لڑکی نے تمہیں میرے

سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا۔

اس سے زیادہ اس میں ضبط نہیں تھا۔ اس نے فون آف کر کے بند کر پھینک دیا۔ رخسانہ جو خاموشی سے ٹیلی فون پر ان کی گفتگو سن رہی تھی۔ کافی حد تک سمجھ گئی تھی۔ ”یہ وہی معیذ ہے“ رخسانہ کے پوچھنے پر اس کے سر اثبات میں ہلایا۔

”یہ جیل سے باہر کب آیا؟“

”پتا نہیں۔“ ڈپریشنالی سے بالوں میں ہاتھ چلاتا ہوا بولا۔

”نمو کو روکنا ہوگا۔“ وہ جیسے خود کلامی کے انداز میں بولا۔ رخسانہ نے کچھ حیرت سے اسے دیکھا۔

”جب وہ خود کنویں میں چھلانگ لگانا چاہتی ہے تو تم کیوں اسے بچانا چاہتے ہو۔ ٹھوکر کھائے گی تو اسے اندازہ ہوگا میرے بھائی کو ٹھکرا کر اس نے کیا کھویا ہے۔“ زوار نے غصے سے اسے دیکھا۔

”رخسانہ! بے حس کی کوئی حد ہوتی ہے۔ وہ صرف وسیم کی بہن نہیں میری محبت بھی ہے۔ میری محبت یعنی میری عزت۔“

رخسانہ قدرے شرمندہ ہو کر بولی۔ ”تو تم کیا کرنے والے ہو۔“

”معیذ کی باتوں سے لگتا ہے کہ وہ کافی حد تک نمو کا برین واش کر چکا ہے۔ سو اس سے بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ وسیم کو یا آئی کو معیذ کی حقیقت بتانی ہوگی۔ اس نے رخسانہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اور تم کل تیار رہنا“ میں تمہیں چھوڑنے تمہارے گھر جاؤں گا۔“

رخسانہ نے گہرا سانس لے کر سر ہلایا۔ وہ خود بھی اب اپنے گھر جانا چاہتی تھی۔

ان سب کے چروں پر ناقابل یقین تاثرات تھے۔ وسیم نے پریشانی سے اپنی پیشانی کو مسلاتا تھا۔ جبکہ رمشا کے ذہن میں کل کا منظر ایک دم واضح ہوا تھا۔ جب زوار کو دیکھ کر معیذ بوکھلا کر بھاگا تھا۔ سب سے زیادہ

بری حالت زاہدہ کی تھی۔

”پامیرے مولا! اتنا بڑا دھوکا۔“ ان کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے تھے۔ ”کوئی اس طرح بھی دھوکا دیتا ہے۔ یوں بیٹیوں کی عزتوں سے کھیلتے ہیں اور اگر میں اپنی بچی ان لوگوں کو دے دیتی تو۔“ وہ اس تصور سے ہی کانٹا نہیں بلکہ وہاں موجود سب لوگ۔

لیکن زوار لہو قدسیہ آئی وہاں ہو کر اس گھناؤنے کام میں اس کا ساتھ دیتی ہیں۔ ”رمشا کے سوال پر زوار طنزیہ انداز میں مسکرایا تھا۔

”وہ اس کی ماں نہیں ہے“ بلکہ جرم کے اس کھیل میں اس کی پارنر ہے۔ وہ پہلے بھی اس طرح کئی لڑکیوں کی زندگیوں برباد کر چکے ہیں۔“ کمرے میں محسوس کی جانے کی والی خاموشی چھا گئی تھی۔

”میں نے آپ کو یہ سب اس لیے بتایا ہے کہ آپ نمو کو سمجھائیں کیونکہ مجھے نہیں لگتا وہ میری بات پر یقین کرے گی۔ اور اس کے فیوج کو سیکور کرنے کے لیے ضروری ہے آپ جلد از جلد اس کی شادی کر دیں۔“

اس کی تجویز پر وہ تینوں حیرانی سے اسے دیکھنے لگے۔ ”بیٹا! اتنی جلدی کیسے کوئی اچھا رشتہ طے گا۔“

زاہدہ پریشانی سے زوار سے پوچھ رہی تھیں۔ ”مگر آپ کو اعتراض نہ ہو اور اگر آپ کو مجھ پر بھروسہ ہے تو میں آج ہی نمو سے نکاح کرنے پر تیار ہوں۔“ ان تینوں نے چونک کر زوار کا چہرہ دیکھا۔

وہ کمرے میں داخل ہوئی تو ٹھٹھک کر رہ گئی۔ سارا کمرہ بکھرا ہوا تھا۔

”نمو؟“ وہ چیختی ہوئی اس کی طرف بڑھی جو ڈرائنگ ٹیبل پر رکھی چیزیں پھینکنے لگی تھی۔ ”کیا کر رہی ہو یا کل ہو گئی ہو۔“

”ہاں پاگل ہو گئی ہوں۔“ رمشانے حیرت سے اس کے بکھرے بالوں اور سوچی ہوئی لال آنکھوں کو دیکھا۔ ”کس سے پوچھ کر زوار کے ساتھ میرا نکاح طے کیا

ہے۔“

”مجھے سخت نفرت ہے اس آدمی سے۔ کیا مجھے اتنا بھی اختیار نہیں کہ میں اپنی پسند کے شخص کے ساتھ شادی کر سکوں۔ وسیم بھائی نے اپنی پسند کی شادی کی۔ ائی نے کچھ نہیں کہا۔ تم نے بھی ائی کی پسند کے لڑکے کو بھجھک کر کے نیل بھائی کو پسند کیا۔ وہاں بھی کسی کو اعتراض نہیں ہوا۔ پھر میری دفعہ کیوں؟“

وہ اب روتے ہوئے گھٹنوں کے بل قالین پر بیٹھ گئی تھی۔ ”ہم نے تمہاری پسند کو ترجیح دی تھی لیکن شاید تم نے سنا نہیں زوار نے کیا بتایا ہے معیذ کے بارے میں۔ وہ ایک کریمٹل ہے۔ جیل گٹ کر آچکا ہے۔ اسٹپر ہے۔ لڑکیوں کو اسمگل کرتا ہے اور تم سے محبت کے لیے شادی نہیں کر رہا۔ تمہیں بیچنے کے لیے یہ شادی کا ڈھونگ کر رہا ہے۔“

رمشانے ساری مروت بھلا کر اسے تلخ حقیقت سنائی۔ لیکن اس وقت اس کی عقل پروردہ چکا تھا۔ ”جھوٹ بولتا ہے۔ وہ صرف مجھے حاصل کرنے کے لیے اور تم لوگوں کو معیذ کے خلاف کرنے کے لیے جھوٹ بول رہا ہے۔ جو اس نے کہا تم لوگوں نے مان لیا۔ کسی نے اس سے پوچھا کہ معیذ کے بارے میں اسے اتنی افغانیشن کیسے ہے؟“

وہ اب سوالیہ نظروں سے رمشا کو دیکھ رہی تھی۔ ”اسے کچھ پتا ہے تو وہ یہ سب کہہ رہا ہے نا۔ ورنہ اسے کیا فائدہ ہے۔“ نمو روتے ہوئے طنزیہ انداز میں مسکرا دی تھی۔

”فائدہ اسی کا ہے۔ معیذ کا دشمن ہے وہ اور اگر تم لوگ میری شادی معیذ سے نہیں کرنا چاہتے تو ٹھٹھک ہے مگر زوار سے بھی نہیں کرو۔“ رمشا ہونٹ بیچتی اس کا ضدی انداز دیکھنے لگی۔

”تم ایسی تو نہیں تھیں۔“ اس نے اب قدرے افسوس سے کہا۔ ”زوار صرف تمہیں بچانے کے لیے اتنی جلدی نکاح کر رہا ہے۔“

”ہو نمس۔“ وہ زہر خندہ انداز میں بولی۔ ”اس کی

شرافت بھی دیکھ چکی ہوں۔ کل کھول کر سن لو! میں معیذ سے ہی شادی کروں گی۔“ وہ ایک بار پھر قطعی انداز میں بولی تو رمشا غصے سے کھڑی ہو گئی۔

”مگر تمہاری عقل پروردہ بڑچکا ہے تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ باقی سب بھی اندھے ہو چکے ہیں۔ کل شام کو تمہارا نکاح زوار کے ساتھ ہے۔ اب چاہے تم رو کر گویا نہ کر۔ یہ تمہاری مرضی ہے۔“ رمشا کہہ کر باہر نکل گئی۔ جبکہ وہ پیچھے چینی رہی اور آخر میں تھک کر رونے لگی۔

اس نے مندی مندی آنکھوں سے گھڑی کی طرف دیکھا۔ رات کے تین بج رہے تھے۔ اس وقت کس کا فون ہو سکتا ہے۔ اس نے بڑبڑاتے ہوئے فون ریسیو کیا تو سسکی کی آواز سنائی دی تھی۔ وہ گہرا سانس لے کر رہ گیا۔

”نمودیات کر رہی ہوں۔“

”پتا ہے بھولو۔“ اس کے روکے لمبے پردہ سری طرف چند لمحوں کی خاموشی چھا گئی۔

”آپ نے اتنا بڑا جھوٹ بول کر جو کیم کھیلایا ہے۔ میں اس میں آپ کو کامیاب نہیں ہونے دوں گی۔ معیذ مجھے پہلے ہی بتا چکے ہیں کہ آپ ان سے بدلہ لینے کے لیے ان پر ایسے ہی گندے الزامات لگائیں گے اور آپ نے ویسا ہی کیا۔“

”اور معیذ صاحب نے یہ نہیں بتایا تمہیں کہ میں کس بات کا بدلہ لے رہا ہوں اس سے۔ کیا دشمنی ہے میری اس سے۔“ ایک پل کے لیے وہ کوئی جواب ہی نہ دے سکی پھر تیزی سے بولی۔

”کیونکہ آپ ایک برے انسان ہیں اور میں آپ کو جتنا برا سمجھتی تھی آپ اس سے بھی زیادہ برے نکلتے ہیں اور یہ یاد رکھیں! اب میں کبھی بھی آپ سے شادی نہیں کروں گی“ بے شک آپ مجھ پر تیزاب پھینک دیں۔“

”اور کچھ؟“ اس کی ساری تقریر کے جواب میں

عمران ڈائجسٹ

جولائی 2012ء کے شمارے کی جھلک

تین سلسلے دار تحریریں

اس تاریخی کہانی میں آپ کو جہاں جنگوں کا احوال ملے گا وہیں محبت کی لازوال داستان بھی نظر آئے گی۔ معروف مصنف اسلم راسی کے قلم سے

وہ دیوتاؤں اور دیویوں جیسے حسن کی مالک تھی... اس کو ناجائز کون کون سی شکلیاں حاصل تھیں غزالہ جلیل راؤ کی تہلکہ خیز سلسلہ دار تحریر

سرزمین عجب کی حسین وادی جہلم کا ایک سادہ لوح جوان جو دشمن کے لیے ناقابل تسخیر 'خولاؤ بن گیا۔ ایم اے راحت کے قلم سے

اس کے علاوہ احمد صغیر صدیقی کی "برائے انصاف" ایم ایس کی "ذہنی شیرینی" صفدر شاہین کی "بولناک ایڈ ونچر" محمد مقصود خان کی "حسب الحکم" حسن علی خان کی "ہم ذوق" وقار بن سعید کی "آمد دشت" دانش کمال کی "تشنہ جاں" محمد صدیق طاہر کی "مریض کا قتل" صابر علی ہاشمی کی "بیکار مباحث" اردو ادب سے انتخاب میں شوکت صدیقی کی "خان بہادر" ابراہیم جلیس کی "کالے چور کے نام" رام لعل کی "پہلا آدمی" نچی داستانوں میں ہما صفدر کی "پاکل نہ ہو جاؤں" نواز شہین کی "داغ دار" محمد سلیم اختر کی "شاہو" اور آخری صفحات پر ایم اے راحت کے قلم سے معاشرتی ناول "زرگزشت"

آج ہی قریبی بکسٹال سے تازہ شمارہ حاصل کر لیں

"یہ ہم کہاں آگے ہیں۔"
"میرے دوست کا گھر ہے۔ اس نے یہاں قاضی اور گواہ کا انتظام کیا ہے۔"
وہ اترا تو وہ بھی ابھی ابھی سی اس کے پیچھے چلنے لگی۔ وہ ایک چھوٹا سا گھر تھا۔ اس نے سسی سی نظر گھر کی خاموش دیواروں پر ڈالی۔
"آئی کہاں ہیں۔"

"تم بیٹھو تو اس نے کہنے کے ساتھ اسے ملکا سا دھکا بھی دیا تو وہ جواب دہی دھیان میں کھڑی تھی مگر کھڑا کر صوفے پر گری۔ اس نے بے یقینی سے سامنے کھڑے معیذ کو دیکھا جو فون پر کوئی نمبر مل رہا تھا۔
"جی شیخ صاحب! کدھر ہیں آپ۔" وہ کسی سے پوچھ رہا تھا۔ "دکے جلدی آئیں میرے پاس ٹائم نہیں۔ اپنی امانت لے جائیں اور میری امانت مجھے سونپ جائیں۔"

دوسری طرف سے پتا نہیں کیا کہا گیا تھا۔ وہ تھکے لگا کر فون پر آ۔
"ہیہ نہیں ہے آپ دیکھیں گے تو مجھے داد دے بغیر نہیں رہ سکیں گے۔" اس نے ایسی نظر سے نمو کو دیکھا کہ خوف کی ایک لہر اس کے پورے وجود میں سرایت کر گئی۔ کچھ غلط ہونے کا احساس الارم کی طرح اس کے ارد گرد بجنے لگا۔

"ہوں تو مس نمو! اس سے پہلے کہ میرے اور تمہارے راستے جدا ہو جائیں تمہیں کچھ باتیں بتانا چاہتا ہوں تاکہ تمہارے دل میں کوئی افسوس نہ رہے۔ پہلی بات تو یہ کہ نہ تو یہاں کوئی قاضی آنے والا ہے نہ میں تم سے شادی کر رہا ہوں۔ پہلے تم کو ٹریپ کرنا میرے بزنس کا حصہ تھا۔ بعد میں اس میں میرا بدلہ بھی شامل ہو گیا۔ جو کچھ نذرانے تمہیں میرے بارے میں بتایا تھا بالکل ٹھیک بتایا ہے۔ میرا بزنس یہی ہے اسمگلنگ۔ وہ بھی خوب صورت لڑکیوں کی۔ انہی میں بھی میں نے تمہارا سودا ایک شیخ سے کیا ہے دس لاکھ میں۔"

نمو کے لیے یہ انکشاف اتنا اچانک اور جان لیوا تھا

"مطلب؟" قدسیہ بیگم نا سمجھی سے اس کے چہرے پر پھیلی مسکراہٹ کو دیکھنے لگیں۔
"میں نمو کا فون آیا تھا کہ وہ میرے علاوہ کسی اور سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔"
"پھر؟" قدسیہ بیگم دلچسپی سے بولیں۔
"پھر یہ کہ اب میں اسے لینے جا رہا ہوں۔ میں سوچ رہا تھا کیسے اسے یہاں بلاؤں اور اب وہ خود ہی آرہی ہے پر بلاؤں کے لیے تو میں یہ موقع کھو کر نذرانہ کو کوئی موقع نہیں دینا چاہتا۔ آپ شیخ صاحب کو فون کر دیں کہ ایک گھنٹے میں پہنچ جائیں۔"
وہ ٹیبل سے چایاں اٹھا کر سیٹی بجاتا ہوا باہر کی طرف بڑھ گیا۔

اس نے شیشے سے جھانک کر دیکھا، وسم جاچکا تھا۔ اس نے کچھ لمبے پر سوچ نظروں سے پار کر کے دروازے کو دیکھا اور گہرا سانس لے کر موبائل سے معیذ کا نمبر ڈائل کر دیا۔ چند منٹ بعد وہ اس کے سامنے تھا۔ گھر سے جب وہ نکلی تھی تو اسے کوئی ڈر یا خوف نہیں تھا لیکن جوں جوں گاڑی آگے بڑھ رہی تھی اس کی پریشانی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ ایک احساس ندامت تھا جو مسلسل کچھ کے لگا رہا تھا۔
"تمہاری طبیعت ٹھیک ہے؟"

معیذ کے پوچھنے پر اس نے پریشانی کو انگلی سے دبایا تھا۔

"میں پوچھ رہا تھا نذرانے کیا کہا تھا میرے بارے میں۔"
"یہی کہ آپ مجرم ہیں۔ لڑکیاں اسمگل کرتے ہیں اور سب جیسے اس کی بات پر ایمان لے آئے لیکن میں نے یقین نہیں کیا۔" کہنے کے ساتھ اس نے داؤطلب نظروں سے معیذ کو دیکھا جس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی تھی۔ نمو نے نا سمجھی سے اس کی مسکراہٹ کو دیکھا۔ کار رکتے ہی اس نے حیرت سے اطراف پر نظر ڈالی۔

جب وہ یہ بولا تو نمو ہری طرح چڑھ گئی۔
"میں سچ کہہ رہی ہوں، میں آپ سے شادی نہیں کروں گی۔ میں گھر سے بھاگ جاؤں گی۔" ساتھ ہی فون بند ہو گیا۔
نذرانہ بھی فون آف کر کے دوبارہ لیٹ گیا لیکن اب نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

☆ ☆ ☆
"کیا بات ہے بڑے خوش لگ رہے ہو۔" قدسیہ بیگم نے چائے پیٹے ہوئے بغور مسکراتے ہوئے معیذ کو دیکھا۔
"بات ہی خوشی کی ہے۔" وہ ہاتھ میں پکڑا چھچھکاتے ہوئے بولا۔

"نذرانہ یاد ہے آپ کو۔"
"میں کو کیسے بھول سکتی ہوں۔" وہ زہر خندہ انداز میں بولیں۔ "کیوں اب کیا ہوا ہے۔"
"میں بھی تو کچھ نہیں ہوا، پر بہت کچھ ہونے والا ہے۔ میں ہمیشہ اس وقت کے انتظار میں رہا جب اس سے بدلہ لے سکوں۔ لیکن اب تک اس کی کوئی کمزوری میری ہاتھ نہیں آسکی۔ لیکن اب میں اس سے ایسا بدلہ لوں گا کہ ساری عمر یاد رکھے گا۔"
وہ بڑی دلچسپی سے اس کا چہرہ دیکھنے لگیں۔ "نذرانہ شاہ کو ایک لڑکی سے محبت ہو گئی ہے۔"

"تو؟" قدسیہ بیگم نے صہنویں اچکا کر پوچھا۔
"تو یہ کہ وہ لڑکی کوئی اور نہیں بلکہ نمو ہے۔"
قدسیہ کی مسکراہٹ سکڑ گئی تھی۔ "اور تم خوش ہو رہے ہو، جانتے ہو نذرانہ کو پہلے بھی وہ ہمیں کافی نقصان پہنچا چکا ہے اور اب اگر اس نے تمہاری حقیقت نمو کو بتادی تو جیل میں پھنسی چڑھا دیا جائے گی۔" وہ تھکے لگا کر فون پر آ۔

"نذرانہ کو شش کر چکا ہے، بلکہ شام کو نکاح بھی کر رہا ہے نمو۔ لیکن ایسا کیسے ہو سکتا ہے جسے میں اپنی محبت کا جھانساؤں اور وہ آسانی سے اس سے نکل سکے آج تک تو ایسا ہوا نہیں۔"

کہ اس کا سارا وجود برف کی طرح ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ صرف آنکھیں دیکھ اور کلن سن رہے تھے۔ باقی سارا جسم مغلوج ہو گیا تھا۔

”آج سے پانچ سال پہلے میں ایک لڑکی کو اسی سلسلے میں دبی لے کر جا رہا تھا۔ پتا نہیں کیسے اس لڑکی کو میری حقیقت پتا چل گئی تھی۔ میں جس ہوٹل میں ٹھہرا تھا وہیں زوار بھی ٹھہرا تھا۔ پتا نہیں کیسے اس لڑکی کی زوار سے ملاقات ہوئی اور اس نے نہ صرف اس لڑکی کو بچا لیا بلکہ مجھے جیل بھی بھجوا دیا۔ اس کی وجہ سے مجھے جو لاکھوں کا نقصان ہوا سو ہوا۔ لیکن جو وقت میں نے جیل میں گزارا وہ میں نہیں بھول سکتا اور جب مجھے پتا چلا زوار تم سے محبت کرتا ہے تو میں پتا نہیں سکتا مجھے کتنی خوشی ہوئی۔ آج جب وہ نکاح کے لیے جانے کا اور تم نہیں ہوگی تو کیسے اس کی عزت کی دجیاں اڑیں گی۔ کاش! میں اس وقت اس کا چہرہ دیکھ سکتا۔“ وہ ہنسنے ہوئے بولا۔

”تمہیں بچانے کی اس نے بہت کوشش کی۔ مجھے دھمکیوں بھرے فون کیے۔ لیکن افسوس وہ ہار گیا۔“ وہ افسوس کرتا ہوا کھڑا ہو گیا۔

”پہلے میرا ارادہ صرف تمہارا سودا کرنے کا تھا لیکن اب میں زوار کی عزت کو اپنے ہاتھوں سے پامال کرنا چاہتا ہوں۔“

نمرو نے اس وقت پوری شدت سے اپنے مرنے کی دعا کی تھی۔ اس نے سختی سے آنکھیں بند کر لیں۔

”یا اللہ! اگر میں نے زندگی میں ایک نیکی کی ہے تو اس کے صدقے میری عزت کی حفاظت فرما۔“

”آنکھیں بند کر لینے سے بد قسمتی راستہ نہیں پڑتی۔“ اس نے اپنے بہت قریب اس کی آواز سنی تھی۔ تب ہی باہر دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ معین بد مزاج ہو کر پیچھے ہٹا تھا۔

”یہ شیخ اتنی جلدی کیسے ٹپک پڑا۔“ وہ جھنجھلاتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔ وہ اسی طرح آنکھیں بند کیے پوری شدت سے اللہ سے مدد مانگ رہی تھی۔ باہر ایک دم بے تحاشا شور مچا تھا۔ بھاگتے قدموں کی آواز

قریب سے آنے لگی تھی۔

”نمرو! قریب سے آتی جاتی پہچانی آواز اسے اپنا دہم لگی تھی۔“

”نمرو! اب کسی نے اس کا چہرہ پتہ بتایا تھا۔ اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ اس نے دوبارہ آنکھیں بند کر کے کھولیں لیکن چہرہ نہیں بدلتا تھا۔

”تم ٹھیک ہو؟“ وہ پریشانی سے اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا اس کی آنکھوں میں پانی اکٹھا ہونا شروع ہو گیا حتیٰ کہ وہ چہرہ دھندلا سا گیا۔

”نمرو! اس نے اس کا کندھا ہلایا۔ وہ ایک دم اس کے سینے سے لگ کر چچا اٹھی تھی۔ وہ کافی دیر یونی چینی رہی پھر اس کی چینی آنسوؤں میں اور آنسو سسکیوں میں بدل گئے۔ اتنی دیر زوار یونی ساکت اس کو ساتھ لگائے کھڑا رہا۔ یہاں تک کہ نمرو نے خود ہی سر اٹھا کر اس کا چہرہ دیکھا۔

”سب ٹھیک ہے اب آؤ۔“ وہ آگے بڑھا تو نمرو نے اس کی شرٹ مضبوطی سے تھام لی۔

زوار نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہ بری طرح ڈری ہوئی لگ رہی تھی۔ اس نے مضبوطی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ باہر پولیس کی گاڑیاں تھیں۔

”ماجد! زوار کی آواز پر پولیس دروی میں ملبوس آوی جو ایس ایس پی تھا۔ ان کے قریب آیا۔

”زوار! تم فکر مت کرو بھابھی کو لے کر جاؤ میں ان لوگوں کو دیکھ لوں گا۔“ بھابھی۔ کتنے پر نمرو نے چونک کر اسے دیکھا۔

”ماجد! اب کی بار یہ چھوٹا نہیں چاہیے۔ لوگوں کی عزتوں سے کھیلنے والے یہ لوگ معاشرے کا ناسور ہوتے ہیں۔ انہیں جتنی جلدی ختم کر دیا جائے اتنا ہی اچھا ہے۔“

زوار نے غصے سے اس طرف دیکھا جہاں معین پولیس کے زرخے میں بیٹھا تھا۔

”تج بھی پکڑا گیا اور معین کی وہ آنٹی بھی۔ مجھے لگتا ہے اس گروہ میں اور لوگ بھی ہیں۔ لیکن خیر میں دیکھ لوں گا تم بے فکر رہو اور بھابھی! آپ کو بھی گھبرانے کی

ضرورت نہیں۔“ زوار نے اسے پتا نہیں کیا بتایا تھا جو وہ اسے بھابھی کہہ رہا تھا۔ وہ اسے لیے گاڑی میں بیٹھ گیا اور چپ چاپ ڈرائیو کرنے لگا۔ نمرو نے بے چینی سے دو تین بار اس کی طرف دیکھا۔ وہ چاہتی تھی وہ اس سے کچھ پوچھے اسے ڈانٹے لیکن وہ بالکل خاموش تھا۔

”گھر میں کافی مہمان ہیں اور کسی کو کچھ پتا نہیں۔“ گھر کے قریب پہنچ کر اس نے کہا تو نمرو سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

”میرا مطلب ہے کہ کسی کو کچھ کہنے اور بتانے کی ضرورت نہیں۔“

نمرو کتنی دیر اسے دھندلی نظروں سے دیکھتی رہی۔

”تم تو پارلر گئی تھیں؟“ رمشا نے حیرت سے اس کے سادھے چہرے کو دیکھا تو وہ گڑبگڑا کر اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔

”راستے میں ہنگامہ ہو گیا تھا پارلر کے شیشے بھی توڑ دیے ان لوگوں نے اسی لیے تو دیر ہو گئی۔ شکر کرو جان بچ گئی۔“ پیچھے سے زوار نے آکر اس کی مشکل آسان کی۔

”اور اپنی بہن کو صرف اچھے کپڑے پہنا دو۔ یہ سادگی میں ہی مجھے اچھی لگتی ہے۔“

رمشا ہنس پڑی تھی جبکہ نمرو ایک بار پھر زوار کی طرف دیکھنے پر مجبور ہو گئی تھی۔ نکاح نامے پر سائن کرتے ہی وہ اس بری طرح روئی تھی کہ سب پریشان ہو گئے تھے لیکن اس قدر ٹوٹ کر رونے کے پیچھے کیا وجہ تھی صرف دو لوگ جانتے تھے۔ ایک وہ خود اور

دوسرا زوار۔

☆ ☆ ☆

زائد کب سے اسے دیکھ رہی تھیں جو پچھلے ایک گھنٹے سے مسلسل ایک ہی زاویے میں بیٹھی تھی جبکہ سامنے کھلے رسالے کا صفحہ تک نہیں پلٹا تھا۔

”نمرو! ان کی آواز پر بھی اس میں جنبش نہیں ہوئی تو گھر آکر اس کے قریب آئیں۔“

”جی ای! اس نے چونک کر انہیں دیکھا تو انہیں

جھٹکا لگا۔ وہ رو رہی تھی اور شاید اسے احساس بھی نہیں تھا۔

”کیا بات ہے میرے بچے! کیا ہوا ہے۔“ وہ دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھام کر پریشانی سے بولیں تو نمرو ایک دم ان کے گلے لگ گئی۔

”می پلیز! مجھے معاف کر دیں مجھ سے غلطی ہو گئی بہت بڑی غلطی ہو گئی۔“ اس کا یوں رونا اور کسی غلطی کا اعتراف۔ زائد کا دل انجانے خدشے پر تیز دھڑکنے لگا۔

”کیسی غلطی نمرو!“

”می! آپ وعدہ کریں آپ مجھے معاف کر دیں گی۔“ وہ۔ نوہی ان کے ساتھ لگے ہوئے بولی۔

”نمرو! میرا دل بند ہو جائے گا۔ جلدی بول۔“ پھر اس نے اٹکتے اٹکتے انہیں سب بتا دیا۔ اس کی پشت سلاتا ان کا ہاتھ بالکل ساکت ہو گیا تھا۔ انہوں نے اسے خود سے الگ کر کے اس کا چہرہ دیکھا۔

”یہ غلطی نہیں گناہ ہے نمرو! جو تم کرنے جا رہی تھیں۔ میں تمہیں جس دلدل میں گرنے سے بچانا چاہتی تھی تم اسی میں چھلانگ لگا رہی تھیں۔ اگر زوار وہاں نہ پہنچتا تو تم نے سوچا ہے کیا ہوتا تمہارے ساتھ۔“ انہوں نے کہنے کے ساتھ اسے جھنجھوڑ ڈالا تھا۔

”نہ تم کسی قابل رہتیں اور نہ ہمیں کہیں منہ دکھانے کے قابل چھوڑیں۔“ انہوں نے جھٹکے سے اسے چھوڑا تو وہ لڑکھڑا کر رہ گئی۔ ”تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟“

وہ اب دونوں ہاتھوں میں سر دیے پریشانی سے پوچھ رہی تھیں۔

”زوار نے منع کیا تھا مجھے۔“ وہ روتے ہوئے بولی تو زائد نے افسوس سے اس کا سر جھکایا ہوا چہرہ دیکھا۔

”تم نے کوئی نیکی کی ہے جو تمہیں زوار جیسا شوہر ملا۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو تمہاری اتنی غلط حرکت کے بعد تمہیں اپنا ناتواں زوار نہ مانے پھر میں رونا کر دیتا مگر اس نے نہ صرف تمہاری عزت بچائی بلکہ تمہیں اپنا

ماہنامہ شعاع 220 جولائی 2012

ماہنامہ شعاع 221 جولائی 2012

ہام دیا بلکہ تمہیں تمہارے بھائی بہنوں اور دنیا کی نظروں میں بھی گرنے سے بچالیا۔
 نموکے رونے میں شدت آگئی تھی۔ کیونکہ زوار کی محبت اور اس کی اعلا عمری کی تو وہ کب کی قائل ہو چکی تھی۔
 ”پی پلیر! مجھے معاف کر دے ورنہ میں اس بوجھ تلے مر جاؤں گی۔“ وہ ایک بار پھر گڑ گڑائی۔
 ”میں مل ہوں تمہاری نموکا تمہاری سوغطیلیں معاف کر سکتی ہوں لیکن اب تمہیں معافی زوار سے مانگنی ہوگی۔ اس نے تمہیں معاف کر دیا تو سمجھو میں نے تمہیں معاف کر دیا۔“ وہ کہہ کر رکی نہیں تھیں جبکہ و برستی نظروں سے کتنی دیر بند دواڑے کو دیکھتی رہی۔



”بھابھی! زوار نہیں آئے گا؟“ ریشا نے کچن میں داخل ہوتی رخسانہ سے پوچھا تو نموکے کلن کھڑے ہو گئے۔
 ”کب سے اس کا نمبر زاری کر رہی ہوں نمون ریسیو نہیں کر رہا۔ مسج کیا ہے کھو! آتا ہے یا نہیں۔“
 ریشا دہاتے نموکے ہاتھ ست پڑ گئے تھے۔ ان کے نکاح کو ایک مہینہ ہو گیا تھا اور پندرہ دن اس کی اور ریشا کی شادی تھی۔ شادی کی ساری تیاریاں رخسانہ کر رہی تھی اور جو یہ شادی کرنے کے لیے پاگل ہوا جا رہا تھا، منظر سے ہی غائب ہو گیا تھا۔
 ”تمہیں کیا ہوا؟ کیوں رہی ہو۔“ ریشا کے حیرت سے پوچھنے پر رخسانہ چونک کر اسے دکھا۔
 ”نہیں! باز کٹ رہی تھی نا۔“ اس نے جلدی سے باز آگے کھینچی پھر ایک دم سب چھوڑ کر جلدی سے کچن سے نکل گئی۔ کافی دیر بعد دوبارہ کچن میں آکر اپنا چھوڑا ہوا کلم کرنے لگی تو رخسانہ نے کہا۔
 ”نمو پلیر! یہ کام بعد میں کرنا پہلے یہ جوس زوار کو دے آؤ۔ میرے کمرے میں بیٹھا ہے۔“ اور نموکو جیسے سکتہ ہو گیا تھا۔

”کیا ہوا۔“ اسے ہوں ساکت کھڑے دیکھ کر رخسانہ نے زور لب مسکراتے ہوئے پوچھا تو اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے گلاس تمام لیا۔ باہر آئی تو زوارہ لاؤنج میں موجود تھیں۔
 وہ نظریں چرائی کمرے کی طرف بڑھنے لگی۔ کمرے کی طرف بڑھتے اس کے قدم ست جبکہ دل کی دھڑکن بے حد تیز تھی۔
 ایک وقت تھا جب اسے اس کے سامنے جانے سے الجھن ہوتی تھی اور اب تو آنکھوں کو کب سے اس کا انتظار تھا۔
 وہ دستک دے کر اندر آگئی وہ آرام کرسی پر آگے پیچھے جھولنے لگی دیکھ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر چونکا۔ نمو نے سلام کرنے کے بعد گلاس اس کی طرف بڑھالیا۔
 ”تھینکس۔“ وہ گلاس تمام کر دیا۔ وہ وہیں کھڑی اسے دیکھتی رہی جو اسے نظر انداز کر کے پوری توجہ سے نیوی پاسکریں کو گھور رہا تھا۔
 ”آپ مجھ سے ناراض ہیں؟“ پوری ہمت جمع کر کے اس نے یہ فقرواد کیا تھا۔
 ”ہاں۔“ آگے سے جواب اس کی توقع کے برعکس تھا۔ وہ ایک دم گھٹنوں کے بل اس کے سامنے بیٹھ گئی اور دونوں ہاتھ اس کے گھٹنے پر رکھ دیے۔
 ”مجھے معاف کر دے پلیر! مجھ سے غلطی ہو گئی۔“ ساتھ ہی اس نے دوتا بھی شروع کر دیا۔ اس رد عمل کے لیے زوار تیار نہیں تھا، وہ بوکھلا گیا۔
 ”نمو پلیر۔“
 ”پلیر! آپ مجھے معاف کر دیں۔“
 ”چھا بابا! اٹھو تو میں نے معاف کیا۔“ وہ جلدی سے بولا۔
 ”نہیں ایسے نہیں، صحیح طریقے سے معاف کریں۔“ زوار کی ہنسی چھوٹ گئی تھی۔
 ”یہ صحیح طریقہ کون سا ہوتا ہے۔“ وہ کچھ نہیں بولی تھی۔ بس سر جھکائے روٹی رہی تو زوار نے جھک کر اس پیشانی چوم لی۔ وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔
 ”نمو۔“ وہ کھڑی ہو گئی۔

”نمو۔“ اس نے اس کا بازو پکڑ کر اسے اپنی ٹانگوں پر بٹھالیا۔
 ”اب بولو۔“ وہ مسکرا کر اس کا بیگ ہوا چہرہ دیکھنے لگا۔
 ”میں نے آپ سے اتنی بد تمیزی کی برا بھلا کہا۔ آپ نے ایک دفعہ بھی مجھے کچھ نہیں کہا۔ اتنا بوجھ ہے میرے دل پر۔“ اس کی آواز پھر بھرا گئی۔
 ”میں اپنی غلط حرکت کرنے جا رہی تھی، مجھے ڈانٹتے، پھینٹتے، کچھ تو کہتے۔ اگر اس دن آپ نہ آتے تو۔“
 کہتے ہوئے اس کے آنسوؤں میں روانی آگئی۔ زوار نے مسکراتے ہوئے اس کے آنسو صاف کیے۔
 ”کیسے نہ آتا میری جان! جو بے وقوفی تم نے کی تھی اس کی توفیق تھی مجھے تم سے۔ جب رات کو تم نے مجھے فون کر کے کہا تم بھاگ جاؤ گی تب ہی مجھے شک ہو گیا تھا۔ ساری رات نہیں سویا۔ تم اگر دھیان دیتیں تو تمہیں اندازہ ہوتا، کوئی تمہارا پیچھا کر رہا ہے۔ جب دسیم تمہیں بار بار چھوڑ کر گیا تھا، میں دہیں تھا اور جب تم معذ کی گاڑی میں بیٹھیں تب بھی میں وہیں تھا۔“ نمو بے ساختہ بول اٹھی تھی۔
 ”جب آپ سب جانتے تھے تو مجھے روکا کیوں نہیں مجھے جانے کیوں دیا اس گھٹیا آدمی کے ساتھ۔“
 ”میں چاہتا تو ایسا کر سکتا تھا لیکن میں نے خود نہیں کیا۔ کیونکہ میں چاہتا تھا تم خود اپنی آنکھوں سے اس کا اصل چہرہ دیکھو۔ کیونکہ جب تک تم خود نہ دیکھ لیتیں تم نے میرا تو یقین کرنا نہیں تھا۔ اور نہ تمہیں میری محبت کا اندازہ ہوتا۔“
 نمو شرمندہ ہو کر رہ گئی۔ وہ بالکل ٹھیک کہہ رہا تھا۔
 ”خیر چھوڑو، جو بھی ہوتا ہے اچھے کے لیے ہوتا ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو کیا تم مجھ سے نکاح کے لیے مانٹیں؟“ اس نے مسکراتے ہوئے اس کی ناک دبا لی تو وہ شرما کر مسکرا دی۔
 ”اگر آپ مجھ سے ناراض نہیں تھے تو پھر آپ اتنے دنوں سے آئے کیوں نہیں اور فون بھی نہیں

کیا۔“
 ”کیوں تم انتظار کر رہی تھیں؟“ وہ مسکراتے ہوئے بولا تو اس نے مسکرا کر سر ہلایا۔ وہ بے تحاشا خوش ہو گیا اور اس سے پہلے کہ وہ اپنی خوشی کا عملی مظاہرہ کرتا وہ پھرتی سے اٹھ کر بھاگی۔
 ”کہاں جا رہی ہو؟“
 ”معافی مانگنے آئی تھی۔ مانگ لی اب جا رہی ہوں۔“ وہ کھلکھلا کر ہنستے ہوئے بولی۔
 ”کتنی دیر بھاگو گی، تھوڑے دنوں کی بات ہے۔“ وہ بھی اسی کے انداز میں بولا تو وہ ہنسی دہانی ہوئی باہر نکل آئی۔
 اس کے انتظار میں بیٹھی زوارہ نے چونک کر اسے دیکھا، چہل سے وہ مسکرائی ہوئی اپنے دھیان میں آ رہی تھی۔ اس کو یوں طمانیت سے مسکراتے دیکھ کر وہ بھی کھل کر مسکرا دیں۔





”یہ کیا کپڑوں کا جمعہ بازار لگا کر بیٹھی ہو؟“ اپانے منہ کو الماری سے دھڑا دھڑا کر پڑے نکال کر بیڈ پر ڈھیر کرتے ہوئے دیکھا تو نوکے بغیر نہ رہ سکیں۔

”کپڑوں کی چھانی کر رہی ہوں جو کپڑے پہننے کے نہیں ہیں“ انہیں نکال کے رکھ دوں گی۔ عارف فلاحی ادارے میں دے آئیں گے۔ میں تو اکثر اپنے عارف کے اور بچوں کے کپڑے جو تے وغیرہ ہیں بھجواتی ہوں۔“

سینہ نے اپنے ریشمی کام دار جوڑے ایک ایک کر کے تہہ کرنے شروع کر دیے اور سوئی لمبوسات ایک طرف رکھنے لگی۔ مختلف تقارب میں بتائے گئے کئی ریشمی جوڑے اب آؤٹ آف فیشن ہو چکے تھے اور گھر میں وہ بنے نہیں جاسکتے تھے سوئی لمبوسات وہ نکالے تھے جو کئی بار پہن کر اور دھل دھل کر اپنی آب و تاب کھو چکے تھے۔ یہی حال عارف اور بچوں کے کپڑوں کا تھا۔ اس نے جلدی جلدی سب سمیٹ کر بڑے بڑے شاپر ز تیار کر کے ایک طرف رکھ دیے۔

”سارے ہی نکال دیے تم نے؟“ اپانے شاپر ز کو بغور دیکھا۔

”نہیں! ابھی بھی باقی ہیں کچھ کپڑے۔ اب اگلے سال دیکھوں گی۔ ابھی تو دو تین بار پہننے کے قابل ہیں یہ سب تو اس لیے نکال دیے کہ عون کی شادی پر سب کے نئے نئے جوڑے بنیں گے۔ وہ بھی کم از کم تین تین تو بنیں گے ہی اتنے کپڑے رکھنے کی جگہ نہیں ہے الماری میں“ اسی لیے پہلے کا کچرا نکال دیا۔ اب نئے کپڑوں کی جگہ بن گئی۔“ سینہ آرام سے بیڈ

پر بیٹھ گئی۔

”بڑا خرچہ کر رہے ہیں بھائی صاحب“ عون کی شادی پر۔“ اپانے تبصرہ کیا۔

”ظاہر ہے! پہلی شادی ہے پھر بیٹے کی ہے“ خرچہ تو ٹھیک ٹھاک کریں گے ہی۔“ سینہ کے لہجے میں خود بخود تفاخر ابھر آیا۔

”ہاں بھئی وہ کر سکتے ہیں یوں کھلا خرچ“ آخر کو سرکاری افسر گھر سے ہم جیسے تھوڑی ہیں کہ دانتوں سے پکڑ پکڑ کر ایک ایک پائی خرچ کرتے ہیں پھر بھی مہینے کے آخر میں ادھار کا منہ دیکھنا پڑ جاتا ہے۔“ اپانے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

”چھوڑیں نا اپنا! یہ بتائیں شادی پہ کیسے کپڑے بتائیں گی؟ میں نے تو ابھی سے اپنے کپڑوں کے رنگ اور ڈیزائنز سوچ لیے ہیں۔ جیسا سوچا ہے ویسے ہی لاؤں گی“ چاہے کتنے ہی مہنگے پڑیں۔“ سینہ کے لہجے میں بڑا جوش و خروش تھا۔

”دیکھو! جیسی گنجائش ہوگی ویسے ہی تیاری کر لیں گے۔ اپنی چادر دیکھ کر ہی پاؤں پھیلانے پڑتے ہیں۔“ اپانے حسرت زدہ لہجے میں کہا۔

ایسا نہیں تھا کہ وہ کوئی بہت ہی غریب غراء قسم کے گھر سے تعلق رکھتی تھیں یا شوہر کی آمدنی بہت کم تھی۔ اچھی خاصی ٹھیک ٹھاک آمدنی تھی۔ بس یہ ہے کہ وہ ہر وقت اپنا موازنہ اپنے شادی شدہ بہن بھائیوں سے کرتی تھیں جو ان کی نسبت زیادہ خوش حال تھے۔ لہذا یہ موازنہ انہیں ہر وقت پیسے کی تنگی کے گلے شکوے میں ہی مصروف رکھتا تھا۔

عون کی شادی کی تاریخ کیا ٹھہری“ سینہ کے پاؤں میں تو گویا پستے لگ گئے بازاروں کے چکر اور شاہنگ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ ہر شے اعلا سے اعلا بہتر سے بہتر تھی۔ ہزاروں روپے اس نے ان تیاریوں میں پھونک ڈالے تھے اور یہی وجہ تھی کہ شادی کی ہر ہر تقریب میں وہ اس کا شوہر اور بچے سب سے نمایاں اور الگ ہی دکھائی دے رہے تھے۔

”بہت خوب صورت جوڑے بنوائے ہیں تم نے۔“ جیولری کا بھی کوئی جواب نہیں۔“ اس کی کزن مرثیا نے بے حد فراخ دلی سے ولیمہ والے دن اس کی تعریف کی۔

”تھینک یو تیا!“ سینہ فخر سے مسکرا دی۔

”اتنے مہنگے کپڑے بنا تو لو پھر وہی ہو کہ آؤٹ آف فیشن ہو جائیں تو پہننے میں نہیں آتے“ بس وارڈروپ بے کار میں بھرتی رہتی ہے۔“ ان کی ٹیبل پر بیٹھی ایک دو سری کزن شازیہ نے تبصرہ کیا۔

”اب اگر یہ سوچ لیں تو کوئی بھی اپنی مرضی اور پسند کے کپڑے ہی نہ بتائے۔ کیا فائدہ دل کو مارنے کا۔ میں

تو بھی جی بھر کے اپنے ارمان پورے کرتی ہوں۔ جب کپڑے آؤٹ آف فیشن ہو جائیں یا ہمارے پہننے کے قابل نہ رہیں تو اللہ نام پر نکال دیتی ہوں۔ غریبوں کے لیے تو وہ پھر بھی اچھی کنڈیشن میں ہی ہوتے ہیں۔ کوئی ہنستا ہے تو ہمیں ثواب ہی ملتا ہے۔“ سینہ نے بغیر منہ بتائے شازیہ کے بصرے کے جواب میں کہا۔

”ہاں! یہ تو ہے۔ میں بھی سال کے سال اپنے اور گھر والوں کے پرانے جوڑے نکال کر کسی نہ کسی کو دے دیتی ہوں۔ جب پہننے نہیں تو کیا فائدہ سنبھل سنبھل کر رکھنے کا۔ اللہ نامہ کسی کو دے کر یہی ہی کمالو“ مرثیا نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ پھر کچھ دیر بعد ان کی گفتگو کا رخ دولہا اور دلہن کے لمبوسات زیورات اور دوسری تیاریوں کی طرف مڑ گیا۔ بڑے جوش و خروش سے سب کے بصرے جاری تھے۔

ولیمہ سے فارغ ہو کر رات کو سینہ بھائی کے گھر میں رگ گئی تھی۔ اگلے دو دن بچوں کے اسکول کی چھٹیاں تھیں۔ اتوار کی رات شوہر لینے آ جاتے۔ ولیمہ کے اگلے دن دلہن اپنے رواج کے مطابق



پاک سوسائٹی ڈاٹ کام آپکو تمام ڈائجسٹ

ڈائریکٹ ڈاؤنلوڈنگ لنک کے ساتھ

ڈاؤنلوڈ کرنے کی سہولت دیتا ہے

آج ہی وزٹ کریں

www.paksociety.com

غیرے تو نہیں ہیں۔ پستانوں میں کوئی ایسے جوڑے دیے جاتے ہیں کہ بس سر پر سے بوجھ اتار کر دوسرے کے منہ پر مار دیا۔ ”منہ کو اپنا جوڑا دیکھ کر شدید غصہ آ رہا تھا۔

”چھوڑو! ہر ایک کا دل اتنا بڑا نہیں ہو گا کہ جو اپنے لیے پسند کریں دوسرے کے لیے بھی کریں دوسروں کو تو لوگ ایسے ہی نر خا دیے ہیں۔“ اپنا نے بھی جلے دل کے پھپھو لے پھوڑے۔

”خود تو ہر تقریب میں پانچ پانچ ہزار کے جوڑے بنے ہوئے تھیں۔ دینے کی باری آئی تو ہتا نہیں کہاں سے ستے ستے، آؤٹ آف فیشن جوڑے خرید کر دے دیے۔ توبہ ہے! بہت ہی سنجوس ہیں عمن کے سر ریل والے۔“ منہ کا پارہ کسی طور نیچے آنے پر راضی نہیں تھا۔

”چلو! اب غصہ تھوڑا۔۔۔ تو بھی آیا ہے اسے ہی لے جاؤ۔“ بھابھی نے نرم اور مصالحت آمیز انداز میں اس کا پارہ نیچے کرنے کی کوشش کی۔

”میں کیا کروں گی اس کا؟ جب پھنسا ہی نہیں ہے۔ اللہ نام۔ اپنی ماسی کو دے دوں گی۔ بے چاری خوش ہو جائے گی۔ ہمیں ثواب مل جائے گا۔“ منہ کے تیوری کے بل کچھ کم ہونے لگے۔

”چلو بھی یعنی! پھپھو کے لیے کچھ ٹھنڈا لے آؤ تاکہ ان کا غصہ ٹھنڈا ہو۔“ بھابھی علت مزاج کی بہت اچھی تھیں ہسکراتے ہوئے جی سے کہنے لگیں۔

”ابھی لاتی ہوں۔“ یعنی فوراً! اٹھ کھڑی ہوئی۔

”مجھے جوڑے کا کوئی لالچ نہیں ہے۔ اللہ کا شکر ہے بہت کپڑے ہیں میرے پاس۔ بس یہ ہے کہ بندہ اتنے قریبی رشتے اور تعلق میں کسی کو کچھ دے تو ڈھنگ کا دے ورنہ نہ دے۔“ منہ نسبتاً نرم لہجے میں بولی۔

”چلو! چھوڑو! ان باتوں کو۔ کوئی اور بات کرو۔“ بھابھی نے موضوع بدلا اور اوپر ادھر کی باتیں کرنے لگیں۔

میکے چلی گئی۔ تھکے ہوئے میزبانوں اور مہمانوں سب کی صبح فیسر میں ہوئی تھی سپیٹ پوجا سے فارغ ہو کر سب کے سب لاؤنج میں بیٹھے شادی پر تبصرے کر رہے تھے۔

”ارے ہاں منہ! تمہارا اور اپنا کاپستانوں کا جوڑا آیا رکھا ہے۔ یاد سے لے جاؤ۔ میں ابھی نکل دیتی ہوں۔“ بھابھی کو اچانک کچھ یاد آیا تو وہ منہ اور اپنا دونوں سے مخاطب ہوئیں۔

”اپنے بھی دکھائیے! کیسے جوڑے آئے ہیں؟“ منہ پر جوش ہو گئی۔

”ہاں ہاں! سارے جوڑے منگوا رہی ہوں۔ آرام سے دیکھ لو۔“ بھابھی مسکرائیں۔

جوڑوں کی پینلنگ کھلتا شروع ہوئی اور سب کے تبصرے بھی۔ بھیا اور بھابھی کے سوٹ تو قیمتی تھے مگر منہ کو ان کے رنگ پسند نہیں آئے۔

”کیسے عجیب عجیب کمر کے سوٹ دیے ہیں۔ کم سے کم گھر تو اچھے لینے چاہیے تھے۔ آخر خاص الخاص رشتہ ہے، سہ من اور سہ منی کا۔“ منہ نے منہ بتایا۔

بلی گھر والوں کے سوٹ بھی اسے بس عام سے ہی لگے۔ اپنا کا سوٹ تو بالکل گزارے لائق تھا۔ اس نے منہ پھاڑ کر اپنے خیالات با آواز بلند بیان بھی کر دیے۔ سب سے آخر میں اس کے جوڑے کی پینلنگ کھلی دیکھتے ہی وہ چیخی۔

”پائے بھابھی! یہ سوٹ تو میں نے دو سال پہلے عروہ کی منگنی میں بنایا تھا۔ بالکل یہی کمر۔ یہی ڈیزائن۔ یاد ہے آپ کو؟“

”ہاں! کچھ دیکھا دیکھا تو لگ رہا ہے۔“ ذہن پر زور ڈالتے ہوئے بھابھی نے غور سے جوڑا دیکھا۔

”ابھی ایک دو مہینے پہلے تو اس سوٹ کو میں نے اللہ نام پر دیا ہے۔ اب کون پہن رہا ہے یہ کمر اور یہ ڈیزائن۔ لوگ بھی پتا نہیں کیسے دل کے ہوتے ہیں۔ بھئی! آپ اپنے سہ منیہ میں کوئی تحفہ دے رہے ہیں نہ بھی پستانوں۔ ذرا دل بڑا کر کے اچھا جوڑا دے دیں۔ آخر ہم بھی لڑکے کی پھپھو ہیں۔ کوئی ایرے





سلیمان صاحب کے دو بچے ہیں، حیا اور دو خیل۔ دو خیل بڑھائی کے سلسلے میں امریکہ گیا ہوا ہے۔ حیا سلیمان کو پورپی یونین نے اسکا لرشپ کے لیے منتخب کیا۔ اب وہ پانچ ماہ کے لیے ترکی جا رہی ہے۔ حیا سلیمان کا ایک برس کی عمر میں سین پھپھو کے آٹھ سالہ بیٹے جہان سکندر سے نکاح ہو چکا ہے۔ سین پھپھو ترکی میں رہتی ہیں۔ بائیس سال پہلے ہونے والے نکاح کو سب جیسے بھول چکے ہیں مگر حیا کے لیے وہ رشتہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔

تایا فرقان کے بیٹے داؤر کی مسندی کے فنکشن میں حیا اور ارم (تایا فرقان کی بیٹی) کے ڈانس کی ویڈیو کوئی انٹریسٹ پر چلا رہا ہے۔ حیا بدنامی کے خوف سے ساہر کرائم سیل سے رابطہ کرتی ہے۔ وہاں جبر احمد سے میٹنگ ہوتی ہے۔ حیا کے شکایت کرنے پر وہ ویڈیو ہٹا رہا ہے۔

تایا فرقان، سلیمان صاحب حیا کے نکاح کو بھول کر اس کی شادی اپنے دوست کے بیٹے دلید لغاری سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ وہ دلید والے دن حیا سے بے ہودگی کرتا ہے تو ایک خواجہ سراؤلی اس کی عزت بچاتا ہے۔ یہ خواجہ سرا حیا کو اکثر اہم مواقع پر ملتا رہتا ہے۔

حیا کے ساتھ اس کی کالج فیلو خدیجہ عرف ڈی بے ترکی جا رہی ہے۔ وہ دونوں بہت جدوجہد کر کے پاسپورٹ اور ویزا بنواتی ہیں۔ دونوں کی دوستی ہو جاتی ہے۔

اسلام آباد جاتے ہوئے فلائٹ میں انہیں عثمان شیر ملتے ہیں۔ ابو ظہبی ایرپورٹ پر ایک حبشی فون بوتھ پر ان کی مدد کرتا ہے۔ چغتائی اور احمت انہیں ترکی میں ریسیو کرتے ہیں۔ پھر ترک لڑکی ہالے ہاسٹل تک ان کی رہنمائی کرتی ہے۔



ترک روایت کے مطابق خدیجہ اور حیا کی مسز عبد اللہ اپنے کھروخت کرتی ہیں جو حیا کو پاشا کے متعلق بتاتی ہیں۔ ہالے حیا کو جہان کے گھر لے جاتی ہے۔ جہان سکندر سرد مزانہ سے حیا سے ملتا ہے جبکہ بین چھو محبت سے ملتی ہیں۔ جہان کے گھر میں حیا کو پھر سفید پھول ملے ہیں جس پر جہان غصا ہوتا ہے۔ جہان نے حیا سے بات کرتے ہوئے ماضی کی یادوں کو دہرایا تب حیا کو بتا چلا کہ جہان کو اس کا اور اپنا نکاح یاد ہے۔ جہان نے اسے بتایا کہ اس کا باپ ملک کا غدار ہے اور اسے اس پر شرمندگی ہے۔ وطن سائن کی رات حیا کو حسب معمول سفید پھول ملے تو اس کے دوست معصوم نے محسوس کیا کہ کانڈ کے کنارے پر لیوں کا رس لگا ہوا ہے۔ اس نے ماچس کی ٹیلی جلا کر کانڈ کو پیش پہنچائی تو وہاں "اے آر پی" لکھا ہوا نظر آیا۔ حیا جہان سے ملنے گئی تو وہ ایک لڑکی کے ساتھ تھا۔ اس نے حیا کو نظر انداز کر دیا۔ حیا ناراض ہو کر آگئی۔ جہان نے اسے مٹانے کے لیے ڈنر پر مدعو کیا۔

حیا نے جہان کے ساتھ مل کر جزیرہ بیوک او کی سیر کا پروگرام بنالیا۔ وہ تین وہاں گئے تو حیا کو ایک جنگلے پر "اے آر پاشا" لکھا نظر آیا۔

جزیرے سے واپس لانے والی آخری فیری جاری تھی۔ جہان اور ڈی جے اس میں سوار ہو گئے تو اسی وقت ایک بچہ حیا کا برس چھٹ کر بھاگا۔ حیا اس کے پیچھے گئی تو وہ "اے آر پاشا" کے جنگلے میں داخل ہو گیا۔ حیا اندر گئی تو دروازہ مقفل ہو گیا اور کسی شخص نے اسے عقب سے خوش آمدید کہا۔

جنگلے میں حیا کی ملاقات عبدالرحمن پاشا کی ماں سے ہوتی ہے۔ وہ حیا کو بتاتی ہے کہ پاکستان میں ایک چیریٹی شو میں عبدالرحمن پاشا نے حیا کو پہلی بار دیکھا تھا اور اسی رات پہلی مرتبہ وہ سفید پھول بیجے تھے۔ بھرا احمد سے پاشا نے ہی کہہ کر ویڈیو بنائی تھی۔ بھرا احمد کرل گیلانی کا بیٹا ہے جسے جہان کے ابا نے پھنسا دیا تھا۔ عبدالرحمن پاشا حیا سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ حیا کہتی ہے کہ وہ شادی شدہ ہے اور عبدالرحمن سے قطعی شادی نہیں کر سکتی پاشا کی ماں وعدہ کرتی ہے کہ پاشا آئندہ حیا کے راستے میں نہیں آئے گا۔ پاشا کی ماں حیا کا کلچر دے کر اسے جانے دیتی ہے۔ مایا فرقان کو ارم کے معاملے کی بھنگ پڑ جاتی ہے۔

حیا عبدالرحمن پاشا سے فون پر بات کرتی ہے کہ جہان کی اس طرح مدد کرنے کے اس کی ریسورٹ کی مالکن اسے کچھ مہلت دے دے یا شاہان جاتا ہے مگر کچھ ہی دیر بعد جہان کے ریسورٹ پر توڑ پھوڑ کی خبر ملتی ہے۔ حیا سخت شرمندہ ہو جاتی ہے اور پچھتاہی ہے۔ ڈی جے کے سر میں درد اٹھتا ہے حیا اسے اسپتال لے کر جاتی ہے مگر اسپتال میں ڈی جے انتقال کر جاتی ہے۔ اس کی میت کے ساتھ جہان اور حیا بھی پاکستان آ جاتے ہیں۔

۵

پانچویں قسط

مسوخ صنوبر کے اونچے درختوں کے درمیان ہوا سرسزئی ہوئی گزر رہی تھی۔ وہاں ہر سو گھٹنا جنگل تھا۔ اونچے درختوں کے پتے سنہری دھوپ کو مٹی تک پہنچنے نہیں دیتے تھے۔ وہ پھر کے وقت بھی لوہر ٹھنڈی میٹھی سی چھایا تھی۔

ہمارے اسی چھایا میں لوہر اور بھاری بھول کے سفید پھول توڑ توڑ کر نوکریاں بھر رہی تھیں۔ عاتشے

گل ایک درخت تلے زمین پر بیٹھی سامنے پھیلے کپڑے پر رکھے بست سے سرخ جنگلی پھولوں کو دھاگے میں پرو رہی تھی۔ قریب ہی ایک درخت کا کٹا ہوا تانہ گر اڑا تھا۔

جب بست سے پھول جمع ہو گئے تو وہ عاتشے کے پاس آئی۔

"عاتشے۔۔۔ سفید پھولوں سے بھری نوکری اس

کپڑے پر ایک طرف اٹھلتے ہوئے اس نے پکارا۔ "ہوں" اس نے ایک ہاتھ سے دھاگے میں سرخ پھول پروتے دوسرے ہاتھ سے سفید پھولوں کا ڈھیر نئے پھولوں سے ایک طرف سمیٹ دیا۔ "سفیر اتم سے لڑکیوں رہا تھا؟" وہ خالی نوکری رکھ کر اس کے سامنے آتی پالتی مار کے یوں بیٹھ گئی کہ اب دونوں کے درمیان پھولوں والا کپڑا بچھا تھا۔ "لڑ نہیں رہا تھا اپنی بات سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔"

"مگر وہ اونچا اونچا کیوں بول رہا تھا؟" ہمارے دونوں ہتھیلیوں پر چہرہ کرائے ابھی ابھی سی پوچھ رہی تھی۔ گردن جھکا کر سوئی پھول میں ڈالتی عاتشے نے مسکرا کر سر جھٹکا۔

"جب انسان دوسرے کی بات نہیں سمجھتا چاہتا تو وہ یونہی اونچا اونچا بولتا ہے۔ تمہیں پتا ہے نا؟ وہ اس کے پیرٹس نے اس کی شادی اس کی پاکستانی کزن سے ملے کر دی ہے اور وہ اس سے شادی نہیں کرنا چاہتا۔"

"کیوں نہیں کرنا چاہتا؟"

"اس کی مرضی نہیں ہوگی!" اس نے سوئی کو پھول کی دوسری طرف سے نکل کر کھینچا۔ دھاگا کھینچتا چلا آیا۔ پھولوں کی لڑی لمبی ہوتی جا رہی تھی۔

"شادی مرضی سے ہوتی ہے نا؟"

"ہاں!" وہ اب ہمارے گئے سفید پھولوں کو ہاتھ سے اوہرا دھر ٹٹول رہی تھی۔

"پھر جب میں بڑی ہوں گی تو میں عبدالرحمن سے شادی کروں گی۔"

پھولوں کو سمیٹتا اس کا ہاتھ رکا۔ اس نے ایک جنگلی بھری نگاہ ہمارے دل لے لی۔

"برائی بات ہمارے گل! اچھی لڑکیاں یوں ہر بات نہیں کر لیتیں۔"

"مگر میں نے عبدالرحمن کو کہہ دیا تھا۔"

وہ ایک دم ٹھنک کر رک گئی اور بے یقینی سے اسے دیکھا۔

"کیا کہا تم نے اسے؟"

"یہی کہ جب میں بڑی ہوں گی تو کیا وہ مجھ سے شادی کرے گا؟"

"تو اس نے کیا کہا؟"

"اس نے کہا، تمہیں ایسی بات کس نے سکھائی؟"

"پھر؟" وہ سانس روکے سن رہی تھی۔

"میں نے کہا۔ عاتشے گل نے!" رولانی سے بولتی ہمارے ایک لخت اٹکی۔

"کیا؟" وہ ششدر رہ گئی۔ "تم نے اس سے جھوٹ بولا؟ تم نے وعدہ کیا تھا کہ اب تم جھوٹ نہیں بولو گی۔ خدایا! کیا سوچتا ہو گا میرے بارے میں۔"

اس نے تاسف سے ماتھے کو چھوا۔ ہمارے نے لا پرواہی سے شانے اچکائے۔

"مگر اسے پتا چل گیا تھا۔ اس نے کہا، عاتشے گل اچھی لڑکی ہے اور مجھے پتا ہے اس نے ایسا کچھ نہیں کہا ہو گا۔"

اس کی بات پر عاتشے کے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔ ایک بے اختیار سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر بکھر گئی۔ وہ ہونے سے سر جھٹک کر پھول اٹھانے لگی۔

"مگر تم نے جھوٹ نہیں چھوڑا میں۔"

"وعدہ اب نہیں بولو گی۔"

"ہر دفعہ اللہ سے وعدہ کرتی ہو۔ وہ ہر دفعہ تمہیں ایک اور موقع دے رہا ہے، مگر تم پھر وعدہ توڑ دیتی ہو۔ اتنی دفعہ وعدہ توڑ دی تو وہ تمہارے دندوں کا اعتبار کرنا چھوڑ دے گا۔"

"آئندہ میں سچ بولو گی اب کی بار مضبوط والا وعدہ۔"

"چلو ٹھیک ہے۔" وہ مسکرا دی۔ "اب تم نے ہمیشہ سچ بولنا ہے، کیونکہ جب انسان بہت زیادہ جھوٹ بولتا ہے تو ایک وقت ایسا آتا ہے اس کے سچ کا بھی اعتبار نہیں رہتا۔"

پرندوں کا غول پھر پھڑپھڑاتا ہوا ان کے اوپر سے گزرا۔ عاتشے نے گردن اٹھا کر اور دیکھا۔ وہ برندے یقیناً

پورے یوک ادا کا چکر لٹ کر اب سمندر کی طرف محو پرواز تھے۔

”عائشے گل!“ چند لمحوں پر ندوں کے پتہ کی مانند اڑ کر بالوں میں گم ہو گئے تو ہمارے نے پکارا۔

”بولو۔“ وہ گردن جھکائے اپنی لڑی میں اب سرخ پھولوں کے آگے سفید پھول پروردی گئی۔

”تم تو ہمیشہ سچ بولتی ہو نا۔ ایک بات بتاؤ گی۔“ ہمارے ذرا ڈرتے ڈرتے کہہ رہی تھی۔

”پوچھو۔“

”عبداللہ کی بہن کسی کو کہہ رہی تھی کہ یوک ادا کی پولیس بہت بری ہے۔ وہ عبدالرحمن پاشا کو کچھ نہیں کہتی اور یہ کہ وہ جزیرے کا سب سے برا آدمی ہے۔“

عائشے! کیا عبدالرحمن واقعی برا آدمی ہے؟ وہ رک رک کر متذبذب سے پوچھ رہی تھی۔

عائشے سانس روکے اسے دیکھ رہی تھی۔ ہمارے خاموشی، وہی تو اس نے ذرا غلطی سے سر جھٹکا۔

”نہیں، وہ بہت اچھا آدمی ہے عبداللہ کی بہن کو کیا پتا؟ اور تم نے کسی سے جا کر عبدالرحمن کے بارے میں کوئی بات نہیں کہی۔ تمہیں اپنا دندہ یاد ہے نا؟“

ہمارے نے گردن اثبات میں ہلا دی۔

”مجھے یاد ہے۔“

عائشے دھاگا دانت سے توڑ کر لڑی کے دونوں سروں کی آپس میں گرہ لگانے لگی۔ اس کے چہرے پہ واضح اراسی بکھری تھی۔

وہ سہ پہر میں خدیجہ کے گھر سے واپس آئی تھی۔ کچھ دیر کمرے میں لیٹی رہی۔ سر درد سے پہنا جا رہا تھا۔

بخار بھی ہو رہا تھا اور نیند بھی کہ آہی نہیں رہی تھی۔ بند کمرے میں ٹھن ہونے لگی تو وہ گھبرا کر اٹھی اور کھڑکیوں کے پردے دونوں ہاتھوں سے ہٹائے۔

سامنے لان میں کرسیوں پہ ابا اور اماں کے ساتھ تیار فرقان اور صائمہ تائی چائے پیتے نظر آ رہے تھے۔

میز پہ اسپیکس اور دیگر لوازمات رکھے تھے اور وہ لوگ باتوں میں مگن تھے۔ صائمہ تائی بہت سلیقے سے سر پہ

دھپٹا جمائے فاطمہ کی طرف چہرہ کیے کچھ کہہ رہی تھیں۔ فاطمہ، تیار فرقان کے سامنے سر پہ دوپٹا لے لیتی تھیں جو پیچھے کھینچ کر ڈھلک جاتا تھا۔ ان کی آنکھیں جیسا جیسی تھیں اور لوگ کہتے تھے کہ بیس سال بعد جیسا ایسی ہی ہوگی اور اب وہ سوچتی تھی کہ پتا نہیں بیس سال بعد وہ ہوگی بھی یا نہیں۔

وہ شاور لے کر، ساہ سفید ٹراؤزر پہ ٹخنوں کو چھوتی سفید لمبی قمیص پہنے ہم رنگ دوپٹا سر پہ لپیٹے باہر آئی۔

پہلے عصر کی نماز پڑھی کہ نمازیں ان تین دلوں میں وہ قریباً ساری پڑھ رہی تھی۔ خدیجہ کے لیے بہت مؤخیر ساری دعاؤں کر کے وہ انٹھی اور پھر دوپٹا شانوں پہ پھیلائے کھلے بالوں کو کھلا چھوڑے کچن کی طرف آئی۔

فاطمہ فریج سے کچھ ٹکال رہی تھیں۔ اسے آتے دیکھا تو فریج کا دروازہ بند کر کے مسکراتی ہوئی اس کی طرف آئیں۔ شانوں تک آتے بالوں کو کھینچ کر پاندھے، وہ عام چلیے میں بھی بہت جاذب نظر لگتی تھیں۔

”میرا بیٹا اٹھ گیا؟“ انہوں نے اسے گلے سے لگایا۔

پھر ہاتھ چوما۔

”جی!“ وہ مسکراتا چاہتی تھی مگر آنکھیں بھیگ گئیں۔

”بس صبر کرو۔ اللہ کی چیز تھی، اللہ نے لے لی۔“

”صبر اتنا آسان ہوتا تو کوئی دوسرے کو کرنے کو نہ کہتا میں ہر شخص خود ہی کر لیتا۔ مگر میں کوشش کروں گی۔“

”گڈ! اچھا باہر آ جاؤ، تیار تائی ملنے آئے ہیں۔“

”مجھ سے؟“

”ہاں اور جہان سے بھی۔“

”اوہ ہاں، کدھر ہے وہ؟“ اسے یاد آیا کہ وہ بھی ساتھ آیا تھا۔

”بس کھانا کھا کر سو گیا تھا، ظاہر ہے تھکا ہوا تھا، ابھی میں نے دیکھا تو اٹھ چکا تھا کہ رہا تھا بس آ رہا ہوں۔“

ویسے سین کا بیٹا ذرا۔“ وہ کہتے ہوئے جھجکیں۔

”ذرا براؤڈ سا ہے، نہیں؟“

”نہیں، وہ شروع میں یونی ریڈ سار رہا ہے۔“

”اور بعد میں؟“

جیائے مہری سانس لی۔

”بعد میں بھی ایسا ہی رہتا ہے۔ اس شروع اور بعد کے درمیان کبھی بھی نارمل ہو جاتا ہے۔“

وہ باہر آئی تو اسے دیکھ کر تیار فرقان مسکرائے۔ وہ جھک کر ان دونوں سے ملی۔

”اتنے عرصے بعد ملا ہوں اپنی بیٹی سے اور وہ بھی ایسے موقع پر۔ تمہاری دوست گان کر بہت افسوس ہوا اللہ اس کی مغفرت کرے۔“

”آمین!“ وہ سر کے اثبات کے ساتھ تعزیت وصول کرتی کرسی کھینچ کر بیٹھی۔

”ہوا کیا تھا اسے؟“ صائمہ تائی نے تاسف سے پوچھا۔

”برین ہیمبرج۔“

چند لمحوں کے لیے ملال زدہ خاموشی چھا گئی، جسے برآمدے کا دروازہ کھلنے کی آواز نے چیرا۔ وہاں سے فاطمہ باہر آئی تھیں اور ان کے عقب میں جہان بھی تھا۔

اس نے سیاہ ٹراؤزر جس کے دونوں پہلوؤں پہ لمبی سفید دھاری تھی، کے اوپر آدھے بازوؤں والی سرمئی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ آنکھیں خمار آلود تھیں، جیسے ابھی سو کر اٹھا ہو۔ چہرہ اور سامنے کے بال کیلے تھے وہ شاید پانی کے چھینٹے مار کر تویلیے سے منہ خشک کیے بغیر ہی باہر آ گیا تھا۔

اسے آتے دیکھ کر سب اس کی طرف متوجہ ہو گئے وہ لان کے وہانے پہ پہنچا تو کچھ بھر کے لیے ذرا تذبذب سے گھاس کو دیکھا، پھر ایک نگاہ سامنے بیٹھے افراد کے قدموں پہ ڈالی جو جوتوں میں مقید تھے، پھر ذرا جھجک کر گھاس پہ چلتا ہوا ان تک آیا۔

جی جاتی تھی کہ وہ کیوں جھجکا ہے۔ ترکی میں

گھاس پہ چلنا سخت معیوب سمجھا جاتا تھا اور موقع ملنے پہ وہ اور ڈیڑی جے اپنی دلی تسکین کے لیے گھاس پہ ضرور جوتوں سے چل کر دیکھتی تھیں۔

”شکر ہے تمہاری شکل تو دیکھی ہم نے۔“ اس سے مل کر رسمی انداز میں سب کا حال احوال پوچھ کر تیار فرقان نے کھنی مونچھوں تلے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

”تھینکس!“ وہ رہا۔ کبھی نہیں مسکرایا اور اسی سرد انداز میں کہتا جیائے کے مقابل کرسی کھینچ کر بیٹھا۔ وہ

یہاں آنے پہ قطعاً راضی نہ تھا، وہ جانتی تھی۔

”سین نے تو گویا قسم کھا رکھی تھی کہ ہمیں اپنے بیٹے کی شکل نہیں دیکھنے دے گی۔ اسے کیسے خیال آیا تمہیں بھیجے گا؟“ اس کے لیے دیے سے انداز کا اثر تھا کہ تیار فرقان کے مسکراتے لہجے کے پیچھے ذرا سی جھجھک در آئی۔

”مئی کو اپنی بیٹی کو اسلے بھیجنا آکر ڈولگ رہا تھا، سو مجھے آنا پڑا۔“ بغیر کسی لگی لپٹی کے اس نے کہہ ڈالا۔

ملگتیر، منگودہ کے الفاظ تو دور کی بات، اس نے تو میری کزن تک نہیں کہا تھا، گویا رشتوں کی حدود واضح کیں۔

سلیمان صاحب کے ماتھے پہ ذرا سی شکن ابھر آئی، اور صائمہ تائی کے لبوں کو ایک معنی خیز مسکراہٹ نے چھو لیا۔ جیائے بالکل لا تعلق سی لان کی کیار یوں میں اگے پھولوں کو دیکھنے لگی۔ وہ اور ڈیڑی جے ہمیشہ ٹائم پارک سے پھول چرانے کی کوشش کرتے تھے مگر وہ کیئر فیکر ان پہ بڑی سخت نگاہ رکھتا تھا۔

”اور تمہاری مئی کب آئیں گی؟“ سلیمان صاحب نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے پوچھا۔

”مئی کی بھیجی اور تمہاری مئی۔“ اس کے گھر کے مردان بہت تول تول کر الفاظ ادا کر رہے تھے۔

”کچھ کہہ نہیں سکتا۔“ اس نے شانے اچکا دیے۔

”جہان! جوس لوگے یا چائے، یا پھر کافی؟“ فاطمہ نے چائے کے خالی کپڑے میں رکھتے ہوئے اس کو

مخاطب کیا۔ وہ مردوں کی بہ نسبت اس کو دالو والا پروٹوکول دے رہی تھیں۔

”بس اہل بیست ہے۔“ اس نے روانی میں کہہ دیا، مگر فاطمہ کی آنکھوں میں ابھرتی نا سمجھی دیکھ کر لمحے بھر کو متذبذب ہوا، پھر فوراً ”صحیح کی۔“

”بس چائے!“ فاطمہ نے مسکرا کر سر ہلایا اور بڑے اٹھائے اندر کی طرف بڑھ گئیں۔

”تو بیٹا! آپ کی اسٹڈیز کھلیٹ ہو گئیں؟“ صائمہ تائی اب بہت قہقہے لہجے میں پوچھ رہی تھیں۔ وہ ہر کسی کے لیے اتنی میٹھی نہیں ہوتی تھیں، کچھ تھا جو اسے چونکا گیا۔

”جی، اب تو کافی عرصہ ہو گیا۔“

”پھر کیا کر رہے ہو آپ؟“

”میرا استقلال اسٹیٹ پہ ایک ریسٹورنٹ ہے وہی دیکھتا ہوں۔“

جواباً ”صائمہ تائی ذرا حیران ہوئیں، البتہ تایا فرقان نے متانت سے سر ہلاتے اپنے تاثرات چھپا لیے۔ وہ جانتی تھی کہ وہ لوگ استقلال اسٹیٹ کی قیمتی زمین کی اہمیت کو نہیں سمجھتے، اس لیے متاثر نہیں ہوئے اور گو کہ وہ اپنی لا تعلقی توڑنا نہیں چاہتی تھی، پھر بھی دھیرے سے بولی تھی۔

”استقلال اسٹیٹ پہ ایک ریسٹورنٹ کا مطلب ہے کلاہور کی ایم ایم عالم روڈ پہ دور ریسٹورنٹس۔“ وہ کہہ کر۔۔۔ کیاریوں کو دیکھنے لگی۔

”اوہ اچھا۔۔۔ گڈ!“ ان کے تاثرات فوراً ہی بدلے تھے۔

”والد صاحب کی طبیعت کیسی ہے اب؟“

”جی ٹھیک ہیں۔“ وہ مختصر جواب دے رہا تھا۔ تب ہی فاطمہ اس کی چائے کا مک ٹرے میں لیے چلی آئیں۔

”کچھ لوٹا بیٹا! تم نے کچھ نہیں لیا۔“

”جی“ میں لیتا ہوں۔ اس نے مک اٹھا لیا مگر دوسری

کسی شے کو چھوا تک نہیں۔

تایا فرقان اور صائمہ تائی ادھر ادھر کی چھوٹی موٹی باتیں کر کے جلد ہی اٹھ کر چلے گئے۔ البتہ جاتے وقت وہ جہان کے لیے دے جانے والے آج رات کے ڈنر پہ سب کو مدعو کر کے گئے تھے۔

”تمہاری چھٹی کب تک ہے پھر؟“ کن کے جانے کے بعد سلیمان صاحب جہان سے پوچھنے لگے۔

”بس یہی چار دن۔“

”پھر تم اپنی فلائٹ بک کروانا تو حیا کی مت کروانا۔“

وہ واپس نہیں جائے گی۔“ حیا نے چونک کر ابا کو دیکھا۔

”لو کہ!“ جہان نے ایک سرسری نظر اس پہ ڈالتے ہوئے شانے اچکا دیے۔

”مگر ابا۔۔۔ ہمارا کانٹریکٹ۔“ وہ ایک دم بہت پریشان ہو گئی تھی۔

”میں تمہارا میڈیکل سرٹیفکیٹ بنوا دوں گا۔“ کانٹریکٹ کی فکر چھوڑ دو۔ اب میرا مزید حوصلہ نہیں ہے تمہیں باہر بھیجے گا۔ اس نجی کاجازہ بھگتا یا ہے میں نے۔ اتنی دور اگلی پچیاں بھیجتا کہیں کی عقل مندی ہے۔ کل کو کچھ ہوا تو۔“

”ابا! اس کے برن میں اندر بہت پہلے سے۔“

”حیا! جو میں نے کہا، وہ تم نے سن لیا؟“ کن کا انداز اتنا دو ٹوک اور سخت تھا کہ اس نے سر جھکا دیا۔

”جی ابا!“

جہان لا تعلقی سا بیٹھا چائے کے گھونٹ بھر رہا تھا۔

تایا فرقان کے پورج کی بتیاں رات کی تاریکی میں جھلگا رہی تھیں۔ وہ اور جہان، فاطمہ کے ہمراہ چلتے ہوئے برآمدے کے دروازے تک آئے تھے۔

سلیمان صاحب کا کوئی آفیشل ڈنر تھا، موانہوں نے معذرت کر لی تھی۔

دروازے کے قریب جہان رکا اور جھک کر بوٹ کا تسمہ کھولنے لگا۔ فاطمہ نے رُک کر اچھبے سے اسے

دیکھا۔

”پاکستان میں جوتے پہن کر گھر میں داخل ہوتے ہیں۔“ وہ اتنی کبیدہ خاطر اور بے زار تھی کہ جہان سے مخاطب ہونے کا دل نہیں چاہ رہا تھا، پھر بھی کہہ اٹھی۔

”اوہ سوری!“ وہ ذرا چونکا، پھر جلدی سے کسے کی کرہ لگا کر سیدھا ہوا۔ یہ وہ پہلی باضابطہ گفتگو تھی جو پاکستان آکر ان دونوں کے درمیان ہوئی تھی۔

”ترکی میں جوتے گھر کے باہر اتارتے ہیں اس لیے وہ رکا تھا۔“ اس نے ابھی سی کھڑی فاطمہ کے قریب سرگوشی کر کے وجہ بتائی اور آگے بڑھ گئی۔

ڈائننگ ہل میں بہت پر تکلف کھانا سجا تھا۔ صائمہ تائی نے خوب اہتمام کر رکھا تھا۔ جہان بہت مختصر گفتگو کر رہا تھا۔ کوئی کچھ پوچھتا تو جواب دیتا اور پھر خاموشی سے کھانے لگ جاتا۔

ارم، سونیا بھانجی اور داور بھائی کے اس طرف بیٹھی تھیں۔ وہ حیا سے ذرا رکھائی سے ملی۔ اس کا کھنچا کھنچا اور خاموش سا انداز حیا کو ساری وجہ سمجھا گیا مگر اس نے اثر نہیں لیا۔ وہ ڈی جے کا صدمہ اتنا گہرا لیے ہوئی تھی کہ اسے اب ان باتوں سے فرق نہیں پڑتا تھا۔

داور بھائی اور تایا فرقان، جہان سے ترکی کے متعلق چھوٹی چھوٹی باتیں یونہی برسیں تیز کر کے پوچھ رہے تھے، مگر وہ نے تلے جواب دے رہا تھا۔

”آگے کا کیا ارادہ ہے تمہارا؟“ کھانا درمیان میں تھا، جب تایا فرقان نے بہت سرسری سے انداز میں کہتے ہوئے گویا تاش کا پہلا پتہ پھینکا۔

حیا نے ذرا چونک کر انہیں دیکھا اور پھر فاطمہ کو، جو حیا کی طرح ہی چونکی تھیں۔ جو بات ان دو ماہ میں وہ خود اور اتنے عرصے سے اس کے ماں باپ، بہن بھائی یا جہان سے نہیں پوچھ سکے تھے، وہ تایا فرقان نے بڑے آرام سے پوچھ لی تھی۔

”کچھ سرمایہ جمع ہو تو جو اہر مال میں ایک ریسٹورنٹ کھول لوں گا۔“ بچے اور کانٹے سے چاول پلیٹ سے اٹھاتے ہوئے اس نے جواب دیا تھا۔

”کام تو خیر تمہارا بھی اسٹیبلشمنٹ ہو گیا ہے۔“

جواباً ”اس نے ذرا سے شانے اچکا دیے۔“

”میرے اور ابھی کافی قرض ہے، وہ ذرا ہلکا ہو جائے تو ہی کچھ سوچوں گا۔“

حیا نے گردن مزید جھکا لی۔ کیا تھا اگر وہ اپنی لینڈ لیڈی کے قرضے کا ذکر نہ کرتا، کچھ بھرم تو رہنے دیتا۔

”یہ بھی ٹھیک ہے، انسان اس وقت ہی شادی کرے، جب وہ اس ذمہ داری کو نبھاسکے۔ ذمہ داری نبھانا بھی مشکل کام ہوتا ہے۔ ہاں اگر والدین ساتھ دیں تو یہ مشکل آسان ہو سکتی ہے، مگر یہاں پاکستان میں تو اب اکثر شادیوں پہ والدین ناخوش ہی ہوتے ہیں، کیونکہ آج کل کے بچے ان کی پسند کو اہمیت نہیں دیتے اور اپنی مرضی کرتے ہوئے ان کے طے کردہ رشتوں کو راجھکٹ کر دیتے ہیں۔ یہ تو میرے بچے ہیں کہ جو ماں باپ نے کہا، اس پہ راضی ہو گئے، ورنہ تو۔۔۔“ انہوں نے معاشرے پہ ایک تبصرہ کرتے ہوئے تاسف سے سر جھٹکا۔

سونیا بھانجی نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ فاطمہ کی پیشانی پہ ناگواری سی شکنیں ابھرتی تھیں، مگر وہ کچھ کہہ نہیں سکتی تھیں۔

”تم داور سے سال بھر ہی چھوٹے ہوتا؟“

اس نے اثبات میں سر ہلادیا۔

”بھئی داور میاں تو اب مزید اسٹیبلشمنٹ ہونے کے حق میں بالکل نہیں تھے اور صاحبزادے کا خیال یہ تھا کہ اس عمر میں میٹلی شروع کر دینی چاہیے، سو ہم نے ان کی شادی کر دی۔ تمہارا کیا خیال ہے؟“

تایا فرقان چاولوں کی پلیٹ میں راستہ ڈالتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔ حیا کے حلق میں نوالہ پھنسنے لگا، اس نے جھکا کر مزید جھکا دیا۔

”داور کے پاس اس کے والد کا اسٹیبلشمنٹ بزنس تھا، سو وہ اس پوائنٹ پہ شادی انورڈ کر سکتا تھا۔“ جہان نے سلاوا کی پلیٹ سے کھیرے کا ایک ٹکڑا اپنی پلیٹ میں رکھتے ہوئے کہا۔

”کام تو خیر تمہارا بھی اسٹیبلشمنٹ ہو گیا ہے۔“

جواباً ”اس نے ذرا سے شانے اچکا دیے۔“

”میرے اور ابھی کافی قرض ہے، وہ ذرا ہلکا ہو جائے تو ہی کچھ سوچوں گا۔“

حیا نے گردن مزید جھکا لی۔ کیا تھا اگر وہ اپنی لینڈ لیڈی کے قرضے کا ذکر نہ کرتا، کچھ بھرم تو رہنے دیتا۔

”یہ بھی ٹھیک ہے، انسان اس وقت ہی شادی کرے، جب وہ اس ذمہ داری کو نبھاسکے۔ ذمہ داری نبھانا بھی مشکل کام ہوتا ہے۔ ہاں اگر والدین ساتھ دیں تو یہ مشکل آسان ہو سکتی ہے، مگر یہاں پاکستان میں تو اب اکثر شادیوں پہ والدین ناخوش ہی ہوتے ہیں، کیونکہ آج کل کے بچے ان کی پسند کو اہمیت نہیں دیتے اور اپنی مرضی کرتے ہوئے ان کے طے کردہ رشتوں کو راجھکٹ کر دیتے ہیں۔ یہ تو میرے بچے ہیں کہ جو ماں باپ نے کہا، اس پہ راضی ہو گئے، ورنہ تو۔۔۔“ انہوں نے معاشرے پہ ایک تبصرہ کرتے ہوئے تاسف سے سر جھٹکا۔

سونیا بھانجی نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ فاطمہ کی پیشانی پہ ناگواری سی شکنیں ابھرتی تھیں، مگر وہ کچھ کہہ نہیں سکتی تھیں۔

”کام تو خیر تمہارا بھی اسٹیبلشمنٹ ہو گیا ہے۔“

جواباً ”اس نے ذرا سے شانے اچکا دیے۔“

”میرے اور ابھی کافی قرض ہے، وہ ذرا ہلکا ہو جائے تو ہی کچھ سوچوں گا۔“

حیا نے گردن مزید جھکا لی۔ کیا تھا اگر وہ اپنی لینڈ لیڈی کے قرضے کا ذکر نہ کرتا، کچھ بھرم تو رہنے دیتا۔

”یہ بھی ٹھیک ہے، انسان اس وقت ہی شادی کرے، جب وہ اس ذمہ داری کو نبھاسکے۔ ذمہ داری نبھانا بھی مشکل کام ہوتا ہے۔ ہاں اگر والدین ساتھ دیں تو یہ مشکل آسان ہو سکتی ہے، مگر یہاں پاکستان میں تو اب اکثر شادیوں پہ والدین ناخوش ہی ہوتے ہیں، کیونکہ آج کل کے بچے ان کی پسند کو اہمیت نہیں دیتے اور اپنی مرضی کرتے ہوئے ان کے طے کردہ رشتوں کو راجھکٹ کر دیتے ہیں۔ یہ تو میرے بچے ہیں کہ جو ماں باپ نے کہا، اس پہ راضی ہو گئے، ورنہ تو۔۔۔“ انہوں نے معاشرے پہ ایک تبصرہ کرتے ہوئے تاسف سے سر جھٹکا۔

”دل۔۔۔ یہ فیصلہ کرتا ہے۔“ جہان نے کولڈ ڈرنک کے گلاس سے چھوٹا سا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

”میرا خیال ہے، ماں باپ اگر اپنی مرضی مسلط نہ کریں تو چیزیں ٹھیک رہتی ہیں۔“

صائمہ تائی کی مسکراہٹ گہری ہوتی چلی گئی۔ فاطمہ کے چہرے پہ ایک تاریک سلیہ لہرایا اور حیا کی گردن مزید جھک گئی۔ بھرے پنڈل میں گویا اس کی بے عزتی کردی گئی تھی۔

”یہ بھی ٹھیک ہے۔“ تایا فرقان نے سر ہلا کر تائید کی۔ ”تمہاری واپسی کب ہے؟“ جواب مل گیا تھا، سو بات بدل دی۔

”سو مواری فلاٹ ہے۔“

”حیاتو نہیں جا رہی نا۔ شکر ہے سلیمان نے کوئی عقل کے ناخن لیے۔ ویسے میرا بھائی میری طرح بزدل نہیں ہے بلکہ کافی بہادر ہے۔ میری بیٹی نے بھی آکر اسی اسکا لرشپ کا کما تھا، مگر میں نے اس کی ماں سے کہا کہ اسے سمجھاؤ اکیلی لڑکی جب دوسرے ملک یوں تنہا جاتی ہے تو پورا خاندان انگلیاں اٹھاتا ہے۔ بھیجی جتنی احتیاط کرے، لوگ تو باتیں بناتے ہیں کہ کو ایجوکیشن میں پتا نہیں کیسے رہتی ہے، وہاں اکیلے باہر آنا جانا ہو گا، کس سے ملتی ہے، کس سے نہیں، پھر کوئی اونچ نیچ ہو جائے تو ماں باپ تو ہو گئے بدنام۔ خیر، ویسے ترکی تو اچھا مسلمان ملک ہے اور تمہاری فیملی ساتھ تھی تو ہمیں اپنی بیٹی کی طرف سے بے فکری رہتی تھی۔“

انہوں نے کہتے ہوئے مسکرا کر حیا کو دیکھا جو خاموشی سے پلیٹ میں دھرے چاول کاٹنے سے ادھر ادھر کر رہی تھی۔ وہ کھا نہیں رہی، کسی نے محسوس نہیں کیا۔

”حیاتم نے شادی کے کپڑے بنوائے؟“ صائمہ تائی نے گفتگو کا رخ اس کی طرف موڑا۔ اس نے ذرا سی لہنی میں گردن ہلائی۔

”ابھی دیکھوں گی۔“ اسے علم نہیں تھا کہ ماں نے

کپڑے بنوائے ہیں یا نہیں۔

”چلو تم تو ریڈی میڈ بھی لے سکتی ہو، آسانی ہو جائے گی۔ سارا مسئلہ میری ارم کا ہوتا ہے۔ وہ پشٹا شیفون کا نہ ہو، پشٹا وہ پشٹا سر پہ ہی نہیں نکلتا، آستین باریک نہ ہو اور پھر جو اچھا جوڑا لگتا ہے اس کی آستینیں ہی غائب ہوتی ہیں۔ تمہاری تو خیر ہے، تم سب ہی کچھ پہن لیتی ہو، ساری مصیبت تو میری آئی رہتی ہے۔ بار بار درزی کے چکر لگانے پڑتے ہیں۔“ بات ختم کر کے انہوں نے ایک نظر جہان پہ ڈالی۔ وہ نشو سے ہاتھ صاف کر رہا تھا۔

”بس کیوں کردی بیٹا؟ اور لوٹا کھانا ٹھیک لگا تمہیں؟“

”جی! ماں! کھانا تو بہت اچھا تھا، بس ذرا مرچ زیادہ تھی۔“ وہ پہلی دفعہ ذرا سا مسکرا کر بولا۔

جہاں تائی کی مسکان پھٹکی ہوئی، وہاں سونیا بھابھی نے اپنی مسکراہٹ چھپانے کے لیے چہرہ جھکا دیا۔

رات دیر تک جاگنے کے باعث وہ صبح دن چڑھے تک سوئی رہی اور آٹھ کھلی بھی تو موبائل کی آواز سے۔

اس نے مندی مندی سی آنکھیں کھولیں اور سائیڈ ٹیبل پر رکھا اپنا پاکستانی موبائل اٹھا کر دیکھا۔ وہاں پر ایسٹ نمبر کا ٹنگ ”جتنا جھٹکا کھائی دے رہا تھا۔“

”اف۔۔۔ یہ پھر پیچھے پڑ گیا۔“ اور اسے پتا تھا کہ جب تک اٹھائے گی نہیں وہ کل کرتا رہے گا۔

”ہیلو؟“ اس نے کمینوں کے بل اٹھتے ہوئے فون کان سے لگایا۔

”دیکھ بیک۔ کیسی ہیں آپ؟“ وہی دھیما، خوب صورت، کبیر لہجہ۔ اس کی پیشانی پہ بل پڑ گئے۔

”کیوں فون کیا ہے آپ نے؟“

”آپ کی دوست کا سنا تھا بہت افسوس ہوا۔“

”آئندہ آپ کو کبھی افسوس ہو یا خوشی ہو، مجھے فون مت کیجیے گا۔“

”آپ اتنی بدگمان کیوں رہتی ہیں؟ آپ اگلے بندے کی پوری بات کیوں نہیں سنتیں؟“ اسے جیسے غصہ آیا تھا۔

”دیکھیں! میں جانتی ہوں کیا آپ کون ہیں، میں یہ بھی جانتی ہوں کہ آپ کس کے بیٹے ہیں اور یہ بھی کہ آپ کا میرے خاندان سے کیا ایٹھ ہے، مگر بات جو بھی ہے، اس کا مجھ سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ آپ آئندہ فون کریں گے بھی تو میں نہیں اٹھاؤں گی۔ خدا حافظ۔“

اس نے زور سے مٹن دیا کہ فون بند کیا اور نیکے پہ اچھل دیا۔ پتا نہیں کون سا گناہ تھا اس کا جو وہ شخص اس کے پیچھے پڑ گیا اور اپنے ساتھ بہت سے مسئلے اس کے پیچھے لگا دیے۔

شام میں فاطمہ کے بے حد اصرار اور پھر ناراض ہونے کی دھمکی کے بعد حیا وہ کادار اٹار کھلی فراک پہننے پہ راضی ہوئی جو رنگ کے فرق کے ساتھ تمام لڑکیوں نے مندی کے لیے بنوائے تھے۔ اس کا قطعاً تیار ہونے کو دل نہیں چاہ رہا تھا، مگر فاطمہ نے اس کی ایک نہیں سنی۔

”جو ہو چکا ہے، ہم اسے بدل تو نہیں سکتے۔ پھر لوگوں کو خود پہ سنسخر کرنے کا موقع کیوں؟ فریش ہو کر جاؤ ورنہ تمہاری تائی کوئی نہ کوئی قصہ بنا دیں گی۔“

لہذا اٹار کھلی فراک گہرے سبز رنگ کا تھا اور اس پہ دیکے کا سلور کام ہوا تھا۔ ساتھ میں سونیا بھابھی نے اس کو اپنا سبز اور سلور پراندا باندھ دیا کہ سب لڑکیاں پراندا پہن رہی تھیں۔ سلور چمکا بھی سونیا نے ہی اس کی پیشانی پہ سجایا، مگر کسی بھی قسم کے سنگھار کے لیے وہ قطعاً راضی نہ تھی۔

”کاہل تو ڈال لو۔“ سونیا اس کے ساتھ میزبانیوں کے اوپر کھڑی بحث کر رہی تھی۔ وہ اس وقت تایا فرقان کے گھر میں تھیں۔ میزبانیوں سے نیچے لاؤنج میں ہر طرف رشتہ داروں کی چہل پھل تھی۔ مہوش اور سحرش کی چھوٹی بہن ثنا کیرا لیے ادھر ادھر بھاگ

رہی تھی۔ اس کا فراک سرخ کلر کا تھا۔ سونیا کا اپنی بری کا تھا، ہلکا گلابی۔

”نہیں رہنے دیں بھابھی!“ اس نے بدلی سے چہرہ پیچھے ہٹایا۔ چاندی کے گول ٹیکے نے دھلے دھلائے چہرے کو سجا دیا تھا۔

سونیا تاسف سے سر جھٹک کر گویا اس پہ ماتم کرتی، میزبیاں اتر گئی۔ اس نے ایک آخری نگاہ دیوار پہ آویزاں آئینے پہ ڈالی، کادار سبز وہ پشٹا کاندھے پہ ڈالا۔ اور دو سرالپو بائیں بازو سے آگے کو نکال لیا اور پلیٹ کر میزبیاں اترنے لگی۔ تب ہی اس نے جہان کو دیکھا۔ وہ سب سے لا تعلق سا اپنے موبائل پہ کچھ پڑھتا سامنے سے چلا آ رہا تھا۔ فاطمہ اس کے لیے دو مٹن کرتے لے آئی تھیں اور اس وقت اس نے ان میں سے ایک سیاہ والا کرنا زیب تن کر رکھا تھا، جس کے گلے پہ سنہرے دھاگے کا کام تھا۔ آستین کمینوں تک موڑے وہ کوئی میسج لکھ رہا تھا۔

وہ سچ سچ کر باریک ہیل سے زینے اترنے لگی۔ تاقیم والا واقعہ اسے نہیں بھولتا تھا۔ وہ آخری میزبانی تھی، جب جہان نے سراٹھایا، ایک لمحے کے لیے رنگ کر اسے دیکھا، پھر اس کی طرف آیا۔

”حیا۔۔۔!“ وہ آخری زینے پہ ایک ہاتھ رنگ پہ رکھے ٹھہری گئی۔

”میں نے اپنی سو مواری فلاٹ بک کروائی ہے۔ تمہاری بکنگ تو نہیں کروائی؟ تم واپس نہیں جا رہی رائٹ؟“ اس لا تعلق سے انداز میں وہ شخص کام کی بات پوچھ رہا تھا۔ اس کے گلے میں آنسوؤں کا گولہ اٹکنے لگا۔

”نہیں، میں واپس نہیں جا رہی۔ اب ایک دفعہ فیصلہ کر لیں تو پھر وہ اسے نہیں بدلتے۔“ وہ آخری زینہ اتر کر اس سے چند قدم کے فاصلے پہ کھڑی ہوئی۔

”اوکے!“ وہ شانے اچکاتے ہوئے پلٹنے ہی لگا تھا کہ ثنا اس بل کیرا لیے ان کے سامنے آئی۔

”ایک منٹ جہان بھائی! ہمیں کھڑے رہیں، میں

آپ دونوں کی پکچر لے لوں۔“ خوش دلی سے کہتے ہوئے اس نے کیمرا اپنے چہرے کے سامنے کیا۔ جہاں نے ذرا چونک کر ساتھ کھڑی حیا کو دیکھا اور پھر قدرے ناگواری سے وہ چند قدم آگے کو آیا۔ شاہ جو فوکس کر رہی تھی نے ذرا حیران ہو کر کیمرا چہرے سے نیچے کیا۔

”کسی کی پکچر بنانے سے پہلے اس سے پوچھ لینا چاہیے۔“ لب نیچے ذرا درستی سے کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا۔ شاہ کارنگ ساند پڑ گیا۔ اس کا کیمرے والا ہاتھ ڈھیلا ہو کر ہوا میں آگرا۔ اس نے پلٹ کر راہداری کی سمت دیکھا جہاں وہ جا تا کھائی دے رہا تھا پھر دبے دبے غصے سے سر جھٹکا۔

”میری توبہ جو کبھی ان کی تصویر بناؤں یا ان سے بات بھی کروں۔“ وہ حلق سے بڑبڑاتے ہوئے آگے چلی گئی۔

حیا نے انگلی کی نوک سے آنکھ کا بھیجا گوشہ صاف کیا اور سر کو خفیف سی جنبش دے کر آگے بڑھ گئی۔ اس کے پاس روٹ کے لیے بہت سے غم تھے۔

ہندی کا فنکشن زائد پچا کے لان میں ہی منعقد کیا گیا تھا۔ لان کافی کھلا اور وسیع تھا سو قاتلوں سے صرف اوپر کی چھت بنائی گئی باقی اطراف کھلی رکھی گئیں۔ جہاں ہر سو دیواروں پر لڑیوں کی صورت بیاں جھمکا رہی تھیں۔

اسٹیج پر رکے لکڑی کے جمولے کو گیندے کے پھولوں سے آراستہ کیا گیا تھا اور موش اس پر کسی ملکہ کی شان سے بیٹھی تھی۔ اس کا انار کلی فرائگ باقی لڑکیوں کے برعکس دور نکا تھا۔ سرخ اور زرد۔ ان ہی دو رنگوں کا پرانہ آگے کندھے پر ڈالے دوپٹا سر پر نکائے وہ مسکرا کر بہت براعتاؤ طریقے سے سب سے باتیں کر رہی تھی۔ اس اعتماد میں غور کی جھلک بھی تھی۔ وہ خوب صورت نہیں تھی مگر خوب سارا پیسہ اپنی تراش

خراش پر لٹانے کے بعد اب بے حد پرکشش لگ رہی تھی۔

پہلو میں بیٹھا اس کا ماموں زاد عقلم عام سی شکل کا کینیڈین پیتھل تھا مگر سننے میں آیا تھا کہ تازہ تازہ بے حد امیر ہوا ہے۔ ابھی یہ کہانی حیا نے پوری سنی نہیں تھی۔

وہ بالکل کونے میں رکھی ایک میز کے گرد کرسی پر بیٹھی تھی۔ وہاں جگہ جگہ ایسے ہی میزوں کے گرد کرسیوں کے پھول بنے تھے۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ بھی اپنے سبز فرائگ میں ادھر ادھر خوش باش پھر رہی ہوتی مگر آج وہ اندر سے اتنی بے زار اور اداس تھی کہ وہیں بیٹھی سب کو خالی خالی نگاہوں سے دیکھ گئی۔

ہر طرف لڑکیاں لڑکے آ جا رہے تھے۔ شاہنا کیمرا اٹھائے مانتے۔ جھوٹا کاسنبھالتی اور ادھر ادھر اٹھلاتی تصویریں کھینچتی پھر رہی تھی۔ اسٹیج پر صائمہ تالی جھک کر موش کو ہندی لگا کر اب مٹھائی کھلا رہی تھیں۔ ارم بھی وہیں تھی۔ اس کا انار کلی فرائگ ہلکا فیوزی تھا اور کبھی وہ دوپٹا گردن میں ڈال لیتی تو کبھی سر پہ کستی کہ خواتین اور مردوں کا ایک ہی جگہ انتظام تھا اور تیارا فرقان بھی آس پاس ہی تھے۔

زاہد چچا روشن خیال تھے تو موش کے ماموں کا خاندان بھی آزاد خیال تھا سو ہندی کا فنکشن مشترکہ رکھا گیا تھا۔ البتہ ان کے خاندان کے لڑکے اور مرد ذرا الگ تھلک چند میزوں پر براجمان تھے تاکہ برائے نام ہی سہی مگر پارٹیشن ہو جائے۔ تیارا فرقان اور سلیمان صاحب سب وہیں تھے۔

وہ اسی طرح بیٹھی پرانہ آگے کو ڈالے غیر دلچسپی سے سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ اس نے ایک سرسری سی نگاہ میں گرد پیش کا جائزہ لے کر جہاں کو ڈھونڈنا چاہا تھا اور وہ اسے نظر آ بھی گیا تھا۔ دور مردوں کی طرف تیارا فرقان اور سلیمان صاحب کے ساتھ کرسی پہ ٹانگ پہ ٹانگ جمائے ہوئے آستین علاتا کینیڈیوں تک موڑے وہ خالصا تعلق سا بیٹھا تھا۔ یقیناً وہ جی بھر کر رور ہو رہا

تھا۔ وہ تلخی سے سر جھٹک کر واپس اسٹیج کو دیکھنے لگی۔ جہاں اب فاطمہ موش کو مٹھائی کھلا رہی تھیں۔ ساتھ ہی اس کی جڑواں بہن سحرش بیٹھی مسکرا کر کمرے کو دیکھتی تصویر بنوا رہی تھی۔ اس کا انار کلی فرائگ پستی رنگ کا تھا۔ دونوں بہنوں کی شکل و صورت سمیت سب مختلف تھا۔ مگر بدلے بدلے یہ مغرورانہ انداز یکساں تھے۔ شاہ جو تک چھوٹی تھی یا فطرتاً مختلف تھی سو اس نے یہ اثر قبول نہیں کیا تھا۔

”حیا۔ ادھر بیٹھی ہو؟“ ارم اپنا فیوزی کلاہار دوپٹا سر پہ ٹھیک سے جماتے ہوئے اس کے ساتھ کرسی پہ آ بیٹھی۔ کل کی نسبت اس کا رویہ قدرے دوستانہ تھا۔ ”ہاں تم سناؤ! تھک گئی ہو؟“ وہ بھی جواباً نرمی سے بولی۔

”ہاں بس تھوڑی بہت۔ اچھا وہ۔“ لہجہ ذرا سرسری بنا کر وہ بولی ”فون فارغ ہو گا تمہارا؟ مجھے ذرا فضا کو کال کرنی تھی کچھ نوٹس کا کتنا تھا۔ میرا فون خراب ہے آج کل۔“ حیا نے گہری سانس اندر کو کھینچ کر خارج کی۔ ”تو ارم سے اس کا فون بھی لے لیا گیا تھا۔“

”ہاں! فون فارغ ہے جب چاہے لے لو مگر کریڈٹ ختم ہے جب سے آئی ہوں ڈلوایا ہی نہیں ہے۔ دوسرے فون کو ڈھونڈ رہی تھی کہ وہ ملے تو اس کو بھیج کر کارڈ منکواؤں۔“

اس نے تیارا فرقان کے کل وقتی لگ کا نام لیا۔ گو کہ یہ سچ نہیں تھا اور کریڈٹ اس نے سچی ڈلوایا تھا مگر وہ ارم کو فون نہیں دینا چاہتی تھی۔

”اچھا۔“ ارم کے چہرے پہ واضح مایوسی پھیلی تھی۔

”اماں! فون فارغ ہو گا لے آؤں؟“ وہ اٹھنے لگی تو اس کی توقع کے عین مطابق ارم نے جلدی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر روک دیا۔

”رہنے دو میں بعد میں ابا سے لے لوں گی۔ میرا

فون ذرا رہنرنگ کے لیے نہ گیا ہوتا تو۔ خیر تم سناؤ۔“

ترکی میں سب ٹھیک تھا؟“ وہ بات کا سرخ پلٹ گئی۔ ”بس۔ وہاں کی تو اب دنیا ہی بدل گئی ہے اور یہ موش سحرش کے انداز اتنے بدلے بدلے کیوں لگ رہے ہیں؟“ اس نے پرانے کو ہاتھ سے پیچھے کر کے ڈالتے ہوئے حیرت کا اظہار کر رہی دیا۔ آخر دونوں کزنز تھیں اور کبھی بہت اچھی دوستیں بھی ہوا کرتی تھیں۔

”داغ خراب ہو گیا ہے ان دونوں کا۔“ ارم سرگوشی میں کہتے ہوئے ذرا قریب کھٹک آئی۔ ”یہ جو عنان صاحب ہیں نا جن کو میں اپنا ڈرائیور بھی نہ رکھوں۔ انہوں نے کینیڈا میں کسی ریفیلٹیشن کی وی شو میں حصہ لے کر ڈیڑھ ملین ڈالر زیتے ہیں اور ان سب کی جون ہی بدل گئی ہے۔ سنا ہے دونوں ہنی مون پہ یورپ کے ٹور پہ جا رہے ہیں۔“ ارم کے لہجے میں نہ حسد تھا نہ رشک۔ بس وہ آنکری ہوئی لگ رہی تھی۔

”تب ہی میں کہوں!“ اس نے استہزائیہ سر جھٹکا۔ ارم کچھ دیر مزید بیٹھی پھر اٹھ کر چلی گئی۔ اسے اگر کسی نے اسٹیج کی طرف بلایا تو بھی وہ نہیں گئی اور اصرار بھی کسی نے نہیں کیا۔ اس کے صدمے سے سب واقف تھے مگر اس کی دوست کے غم میں کسی نے اپنا کام نہیں چھوڑا تھا اور وہ کسی سے ایسی توقع کر بھی نہیں رہی تھی۔ پھر بھی دل پہ ایک بوجھ سا تھا۔ کتنی بے حس تھی۔ دنیا۔ کیسے کچھوں میں لوگ ختم ہو جاتے ہیں اور یہاں کسی کا کچھ نہیں بگڑتا۔ سب کام جاری و ساری تھے اور۔

ایک دم سے بجلی ٹائب ہو گئی۔ رزنی بتیاں گل ہو گئیں۔ ہر طرف اندھیرا اور سناٹا چھا گیا۔ صرف کیمرا مین کے کیمروں کی ٹیلیفون لائٹس کی روشنی رہ گئی۔ پھر مایوسی غصہ پھری مسکھل سی آوازیں بلند ہوئیں۔ موبائل کی ٹارچز آگن ہوئیں کسی نے بھاگ کر برآمدے کی یو پی ایس کی ٹیوب لائٹ جلائی تو مدھم مدھم سفید روشنی برآمدے میں پھیل گئی۔

رضا فرخ۔ مسیح دغیو کو ان کی ماں نے آوازیں دیں۔ جزئیٹر آٹو ٹنک تھا پھر کیوں نہیں چلا؟

”کوئی تو جزیئر چلائے۔“ ہر طرف اذیت بھری آوازیں سنائی دینے لگیں۔

لڑکے بھاگ کر برآمدے میں آئے اور سمجھنے جلدی سے آگے بڑھ کر جزیئر چلانے کی کوشش کی مگر اس کا انجن مردہ پڑا رہا۔

ابچھے بھلے فنکشن میں بد مزگی سی ہو گئی۔ ہر طرف بے چینی اور اضطراب برپا رہا تھا۔ ہر میز پر ایک ٹھنڈی موبائل کی ٹارچ جگمگا رہی تھی۔

”ہا نہیں اب! نہیں چل رہا۔“ دادور بھائی نے دو چار دفعہ کوشش کی مگر بے سود۔ وہ ہاتھ جوڑ کر ایسی تکتے ہوئے کھڑے ہوئے۔

ابا اور تایا فرقان بھی برآمدے کے ستونوں کے پاس تن کھڑے ہوئے تھے۔ حیا کی میز چونکہ برآمدے سے بہت قریب تھی سو وہ گردن موڑ کر بیٹھی سب کچھ دیکھ رہی تھی۔

”جاؤ، کمینک کو بلا کر لاؤ یا دوسرے جزیئر کا بندوبست کرو۔ جلدی۔“ تایا فرقان برہمی سے ڈانٹتے اپنے بیٹوں کو دھڑارہے تھے کوئی ادھر بھاگا تو کوئی ادھر۔ ہر طرف ایک شرمندگی اور بے زاری پھیل گئی تھی۔

وہ ایک کہنی میز پر نکائے ٹھوڑی ہتھیلی پر رکھے گردن ترچھی کر کے برآمدے کو دیکھے گئی جہاں مدھم سی روشنی میں رکھا جزیئر دکھائی دے رہا تھا۔ قریب ہی تایا فرقان اور سلیمان صاحب کھڑے قدرے متاسف سے آپس میں کچھ کہہ رہے تھے۔

”لفتنا“ وہ ذرا چونکی۔ اس نے جہاں کو برآمدے کے زینے چڑھتے ہوئے دیکھا۔ تایا فرقان اور ابانے اسے نہیں دیکھا تھا وہ آپس میں مصروف تھے۔

وہ خاموشی سے آستینیں مزید پیچھے موڑتے ہوئے آگے بڑھا اور جزیئر کے سامنے ایک بچے اور ایک کھٹے کے بل بیٹھا۔ نچلا لب دانتوں سے دبائے وہ اب گردن جھکے جارتہ لینے لگا تھا۔

پھر نہ اٹھایا اور متلاشی نگاہوں سے ادھر ادھر

دیکھا۔ پھر قریب سے افرا تفری کے عالم میں گزرتی ٹاکو اس نے آواز دی وہ ٹھنک کر رکی۔ اس نے کچھ کما تو وہ ذرا حیرت سے سر ہلاتی واپس اندر چلی گئی۔ لمحوں بعد اس کی واپسی ہوئی تو اس نے چھری، پیچ کس اور ایسی چند چیزیں لا کر اس کے ساتھ رکھیں اور پھر خود بھی وہیں کھڑی ہو گئی۔

وہ جزیئر کا کورا اتارنے لگا۔ تب ہی تایا فرقان کی نگاہ اس پر پڑی تو وہ چونکے۔ بغیر اپنے کرتے کی پروا کیے، زمین پر بیٹھا جزیئر میں ہاتھ ڈال کر کچھ دیکھ رہا تھا۔ تایا فرقان کی نگاہوں کے تعاقب میں سلیمان صاحب نے بھی اس طرف دیکھا۔

”فیول والو میں کچھ پھنس گیا ہے، ابھی صاف ہو جائے گا۔“ اس کی آواز مدھم مدھم سی حیات تک پہنچی تھی۔ شا بہت حیرت، بہت متاثر سی اس کے ساتھ کھڑی اس کو کام کرتے دیکھ رہی تھی جو بالکل کسی ماہر کمینک کے انداز میں بہت مہارت سے تاریں ادھر ادھر کر رہا تھا۔

چونکہ ہر سواند حیرا تھا اور روشنی صرف برآمدے میں تھی سو برآمدے کا منظر سارے منظر پر چھانے لگا۔ لڑکیاں اور رشتہ دار خواتین مڑ مڑ کر اسے دیکھ رہی تھیں۔ ماحول پر چھائی بے چینی ذرا کم ہوئی۔

اس نے کور واپس ڈالا۔ اس کے ہاتھوں پر کالک لگ گئی تھی۔ پھر اس نے جزیئر کالیور کھینچا اور پیچھے کو ہٹا تو ساتھ ہی ایک جھماکے سے ساری بیاں روشن ہو گئیں۔ اتنی تیز روشنی سے حیا کی آنکھیں لمبے بھر کو چند حیا میں اس نے بے اختیار انہیں پیچ کر دھیرے دھیرے کھولا۔

شا خوشی اور تشکر سے کچھ کہتے ہوئے چہرے اٹھا رہی تھی۔ وہ ہاتھ جھاڑتے ہوئے اٹھ رہا تھا۔ ٹانے اس کے ہاتھوں کی طرف اشارہ کر کے کچھ کما تو وہ اسی سنجیدگی سے سر ہلا کر اندر چلا گیا۔ شا بھاگ کر اس کے پیچھے گئی۔

سلیمان صاحب جو قدرے دم بخود سے دیکھ رہے تھے ذرا سنبھل کر واپس مڑ گئے۔ وہ متاثر ہوئے تھے

اور وہ اس تاثر کو چھپانے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ حیا مسکراہٹ باندھنا پس سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

جس شخص نے اندھیوں میں روشنیاں بکھیری تھیں اس سے سب ہی متاثر تھے۔ البتہ وہ جانتی تھی کہ ابانے بھی یہ توقع نہیں کی ہوگی کہ جہاں یوں زمین پر بیٹھ کر جزیئر کھولنے لگ جائے گا۔ اس کے دل میں ایک بے پایاں سا غر جاکا۔ اس کی اور یقیناً ”شا کی بھی خود ساختہ سی خطی اب کہیں نہیں گئی۔

مہمانوں کے لیے ریفرنشمنٹ کھی اور ان کے جانے کے بعد کمر والوں کے لیے کھانے کا انتظام تھا۔ جب مہمان چلے گئے اور صرف وہی اپنے لوگ رہ گئے تو لان میں خواتین کا کھانا لگا دیا گیا جبکہ مردوں کا انتظام اندر تھا۔ مرد حضرات اور لڑکے وغیرہ اٹھ کر اندر چلے گئے تھے۔ لان خالی خالی سا ہو گیا تھا۔

وہ پانچوں کزنز اب اسٹیج پر جموے اور ساتھ رکھی کر سیوں پر آ بیٹھی تھیں۔ موش تھوڑی دیر بیٹھی پھر ”میں اب آرام کروں گی“ کہہ کر نزاکت سے اپنا فراک سنبھالے اٹھ کر اندر چلی گئی۔

”جہاں بھائی تو بڑے کمل کے ہیں۔“ شا اپنی پہلو اتار کر دیکھتے پیروں کو ہاتھ سے سسلا رہی تھی۔ ”میں نے تو ان سے کہہ بھی دیا کہ جہاں بھائی! میں نے آپ کو پاس کر دیا۔“ پہلے تو حیران ہوئے پھر ہنس پڑے۔ پیچ ”حیا آئی! آپ کے فیانیسی ہیں بڑے اسمارٹ۔“

”چھا۔“ وہ پھیکا سا مسکرا دی۔

”ان فیانیسی صاحب کو تو شاید خود بھی اپنی ممکنہ کا علم نہیں ہے۔ سلوک دیکھا ہے ان کا حیا کے ساتھ؟“ ارم جو قدرے بے زاری بیٹھی تھی تنگ کر دی اور جب سبج بھائی کمینک کو لا ہی رہے تھے تو کیا ضرورت تھی بھرے مجمع میں الیکٹریٹیشن بننے کی ہلوگ بھی کیا سوچتے ہوں گے ترکی سے یہی سیکھ کر آئے ہیں؟

شا کے تو کمروں پر لگی سرپہ بھیجی۔

”ارم آئی! بات سنیں سبج بھائی کو الیکٹریٹیشن لانے

میں پون گھنٹہ تو لگ ہی جاتا تھا جبکہ جہاں بھائی نے چھ سات منٹ میں سارا مسئلہ حل کر دیا اور ایچ کی کیا بات ہے لوگ تو امپریس ہوئے ہوں گے۔“

”ہاں بہت امپریس ہوئے ہوں گے کہ ہمارا ٹرکس کزن باورچی ہونے کے ساتھ ساتھ کمینک بھی ہے۔ ارم بڑے تسخیر سے ہنس کر اٹھ گئی۔ ٹانے غصے بھری نگاہوں سے گردن موڑ کر اسے جاتے دیکھا۔

”ارم آئی! بھی نا، ہر وقت مرچیں ہی چباتی رہتی ہیں۔“

”اچھا جانے دو۔ اس کی تو علت ہے۔ تم مجھے آج کی پکچر دکھاؤ“ اس کے بعد کھانا کھائیں گے۔“ اس نے کما تو شا سر ہلائی اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتی اندر آئی تھیں۔

لاؤنج میں سارے مرد حضرات بیٹھے تھے۔ جہاں بھی ادھر ہی تھا۔ ایک سنگل صوفے پر بیٹھا وہ غور سے دادور بھائی کی باتیں سن رہا تھا جو وہ اپنے مخصوص انداز میں با آواز بلند کر رہے تھے۔ وہ دونوں تیز تیز چلتی لاؤنج کے سرے پر بنے دروازے تک آئیں۔ وہ باہر کھڑی رہ گئی جبکہ ٹانے دھیرے سے دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔ وہ موش کا کرا تھا جس کے اندر شا کا کیرا رکھا تھا۔ ٹائٹ بلب کی مدھم روشنی میں بیڈ پر لیٹی آنکھوں پر بازو رکھے موش نظر آرہی تھی۔ ٹاؤبے قدموں اندر گئی اور ڈرنگ روم خیل سے کیرا اٹھایا۔ آہستہ موش نے بازو ہٹایا۔

”کیا ہے شا! سونے نہ نا مجھے۔“ وہ تنک کر دی۔

”سوری آئی! بس جارہی ہوں۔“ شا کیرا اٹھا کر جلدی سے باہر آئی اور دروازہ بند کیا۔

”ایک تو موش آئی بھی نا۔“ وہ ذرا خطی سے کہتی اس کے ساتھ کچن کی جانب بڑھ گئی۔ ایک دفعہ پھر لاؤنج سے گزر کر وہ دونوں کچن میں آئی تھیں اور حیا جانتی تھی کہ وہ بنامیک اب کے بھی اتنی خوب صورت لگ رہی تھی کہ اس کے بہت سے کزنز نے نگاہوں کا زاویہ موڑ کر اسے دیکھا ضرور تھا البتہ وہ ویسے ہی دادور

بھائی کی جانب متوجہ تھا۔

وہ دونوں اب کچن میں کانٹر سے ٹیک لگائے کھڑے تھے۔ ہاتھ میں پکڑے کمرے کی چمکتی اسکرین پر گزرتی تصویر دیکھ رہے تھے۔ جنہیں ٹائٹلنگ سے بٹن دہائی آگے کرتی جا رہی تھی۔ تب ہی دھاڑ سے دروازہ کھل کر بند ہونے کی آواز آئی۔ ان دونوں نے چونک کر سر اٹھایا۔

”داؤر بھائی! یہ کیا تماشا ہے؟“ وہ ضبط کھو کر چلانے والی موش تھی۔

لمحے بھر کو تو وہ دونوں ساکت رہ گئیں، پھر ایک دم سے دوڑ کر کھٹ میں آکھڑی ہوئیں۔

لاؤنج میں جیسے سب کو ساپ سوکھ گیا تھا۔ سب ششدر سے موش کو دیکھ رہے تھے جو اپنے کمرے کے دروازے کے آگے کھڑی کمرہ ہاتھ رکھے چلا رہی تھی۔

”یہ کون سی جگہ ہے تقریریں کرنے کی؟ کسی کو میرا احساس ہی نہیں ہے کہ میں نے آرام بھی کرتا ہے“ کل سارا دن میرا پارلر میں گزرے گا، مگر آپ تو میرے سر پہ چیخ رہے ہیں۔ آپ کو آہستہ بولنا نہیں آتا؟ حد ہو گئی۔“ وہ پیرچ کر واپس مڑی اور اپنے پیچھے اسی دھاڑ سے دروازہ بند کیا۔

لاؤنج میں یکدم موت کا سناٹا چھایا تھا سب کو جھٹکا لگا تھا کہ بیان سے باہر تھا۔ پھر ایک دم سے جلن اٹھا۔ ”داؤر! فرخ! مجھے کھڑا پکڑو گے یا میں تم میں سے کسی کی کار لے جاؤں؟“

وہ تہے ہوئے نقوش کے ساتھ بہت قطعیت سے

پوچھ رہا تھا۔ اس کے سوال پر سلیمان صاحب، تایا فرقان اور ان کے تیوں بیٹے ایک جھٹکے سے اٹھ کر جواب سننے کے لیے نہیں رک۔ تیزی سے بیرونی دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ وہ سب اس کی معیت میں باہر نکل گئے۔ ذرا پریشان سے زاہد چچا اور رضا بھی ان کے پیچھے لپکے۔

”موش! آئی۔ آئی کانٹ بلو دس!“ ٹائٹلنگ بے حد تحیر سے نفی میں سر ہلایا۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبائی تھیں۔ جیانی افسوس سے اسے دیکھا اور پھر خالی پڑے لاؤنج کو۔

”ابا لوگ بہت غصے میں گئے ہیں، مجھے لگتا ہے وہ ہمیں جانے کا کہیں گے۔“ اسی بل اس کا فون بجنے لگا۔ اس نے موبائل سامنے کیا۔ ”ابا کانگ“ باہر پہنچنے کا بلاوا آ گیا تھا۔

”سوری ٹا!“ اس نے بے بسی سے شانے اچکائے، پھر اس کا کندھا تھمتھایا۔

”کل شادی کے فنکشن تک سب کا غصہ اتر چکا ہو گا۔ فکر نہ کرنا اچھا!“ کہہ کر وہ تیزی سے باہر لپکی۔



سب سونے جا چکے تھے اور وہ اپنے کمرے میں آئینے کے سامنے کھڑی پراندے کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھی۔ سونیا نے کالی تخت باہر دھاڑا مگر کھل کے ہی نہیں دے رہی تھی۔ بلا آخر پراندہ چھوڑ کر اس نے پیشانی پر جھولتے ٹیکے کو کھینچنے کے لیے چھوایا تھا کہ دروازہ سے دستک ہوئی۔

اس نے ٹھٹھا چھوڑا اور پھر حیرت سے دروازے کو دیکھتی اس تک آئی۔ ابا تو سونے چلے گئے تھے، پھر

— اس نے دروازہ کھولا۔ سامنے جہان کھڑا تھا۔ ”سوری! تم سو تو نہیں گئی تھیں؟“ وہ قدرے جھجک کر بولا۔ سیاہ ٹراؤزر کے لوپر آدھی آستین والی سفیدی شرٹ پہنے ہوئے ترکی والا جہان لگ رہا تھا۔ ”نہیں تم تھکاؤ خیر بہت؟“

”ہاں ابھی میں لاؤنج میں بیٹھا تھا تو فرقان ماموں کی بیٹی آئی تھی۔“

”ارم؟“ اس نے ذرا حیرت سے سوالیہ ابرو اٹھائی۔ ”ہاں وہی۔ تمہارا فون اور پرس میز پر رکھا تھا اس نے فون اٹھا کر مجھ سے کہا کہ اسے ایک کل کرنی ہے، ابھی پانچ منٹ میں فون لاوے گی، مگر اب۔۔۔“ اس

نے کھائی۔ بندھی کھڑی دیکھی۔ ”اب میں منٹ ہونے کو آئے ہیں مگر وہاں نہیں آئی۔ میں نے سوچا تمہیں بتا دوں۔“

”اف! تم نے اسے میرا فون کیوں لے جانے دیا؟“ جواباً جہان نے بے چارگی سے شانے اچکائے۔ ”اس نے مجھ سے اجازت نہیں مانگی تھی اور میں اسے کیسے روک سکتا تھا؟ مجھے تو فرقان ماموں کی فیل سیویس ہی بہت ڈر لگتا ہے۔“

”کیوں؟“ وہ چونکی۔ ”کیونکہ وہ سرخ مرج کا استعمال بہت زیادہ کرتے ہیں۔“ وہ گہری سانس لے کر بولا تو وہ بے اختیار ہنس دی اور یہ ترکی سے آنے کے بعد پہلی دفعہ تھا جب وہ یوں پورے دل سے ہنسی تھی۔

”سرخ مرج کا استعمال ہمیں بھی آتا ہے۔ تم ادھر ہی ٹھہرو، میں ذرا ارم سے فون لے آؤں۔“ اور آج تو ویسے ہی ارم کی طرف اس کے بہت سے حساب اکٹھے ہو گئے تھے۔

”اچھا۔ میں انتظار کر رہا ہوں۔“ وہ مسکرا کر کہتا صوفیہ بیٹھ گیا اور وہ باہر چلی آئی۔

تایا فرقان کے لاؤنج میں سب ہی موجود تھے سوائے ارم اور سونیا کے۔ تایا ابا بہت پر ملال انداز سے نفی میں سر ہلاتے کچھ کہہ رہے تھے شاید آج والے واقعے کا تذکرہ جب حیا کو آتے دیکھا۔

”او آؤ بیٹا۔“ انہوں نے مسکرا کر اپنے ساتھ صوفیہ بیٹھنے کا اشارہ کیا اور پھر سونیا کو آواز دی۔

”سونیا! حیا کی چائے بھی لے آنا۔“

”جی! اچھا ابا!“ سونیا نے جواباً کچن سے آواز لگائی۔

”نہیں تایا ابا! میں چائے نہیں پیوں گی، بس اب سونے ہی جا رہی تھی۔“ وہ بے تکلفی سے کہتی تایا ابا کے ساتھ صوفیہ آ بیٹھی۔

ان کی گھریلو سیاستیں اور وقتی تندی تیکسی باتیں ایک طرف، تایا فرقان اس سے پیار بھی بہت کرتے تھے اور

آج موش کی بد تمیزی پر جہان دھکی تھے وہاں انہیں حیا کی قدر بھی آئی تھی۔

”ابا سو گئے تمہارے؟“

”جی، کب کے میں بس ذرا ارم سے فون لینے آئی تھی۔“

”فون، کیوں؟“ تایا ابا بری طرح چونکے۔ صائمہ تائی بھی ٹھنک کر اسے دیکھنے لگیں۔

”ارم کو کوئی کل کرنی تھی تو وہ میرا فون لے کر گئی تھی، مگر ابھی مجھے اپنی فرزند کو مسیح کرنا ہے، سو سوچا فون لے لوں۔“ وہ بہت سادگی سے کہہ رہی تھی۔

تایا کے چہرے کا رنگ فوراً ہی بدل گیا تھا۔ نری کی جگہ سختی نے لے لی۔

”ارم۔ ارم۔“ انہوں نے بلند آواز میں پکارا۔ ”جی ابا!“ وہ دو ٹا سنہالتی بھانگتی ہوئی آئی، مگر حیا کو بیٹھ دیکھ کر اس کا رنگ ایک دم سے فق ہوا۔

”حیا کا فون اسے واپس دو۔“ تایا نے اسے کڑی نگاہوں سے گھورتے ہوئے بڑے ضبط سے کہا۔

”جج۔ جی وہ دفعہ کو مسیح کرنا تھا تو۔۔۔“ وہ ہٹکا گئی۔ تایا اتنی شعلہ بار نگاہوں سے اسے دیکھ رہے تھے کہ وہ رکی نہیں۔ اٹے قدموں واپس مڑی اور چند ہی لمحوں بعد فون لا کر حیا کو تھمایا اور ساتھ ہی ایک کینہ توڑ نگاہ اس پر ڈالی تھی، گویا کچا جانا چاہتی ہو۔ وہ جواباً ”سادگی سے مسکرا دی۔

”تھنک یو“ میں چلتی ہوں، آپ لوگ چائے انجوائے کریں۔“ وہ فون لے کر وہاں سے اٹھ آئی اور وہ جانتی تھی کہ اب چائے انہوں نے خاک انجوائے کرنی تھی۔

واپس لاؤنج میں آتے ہوئے اس نے موبائل کا log چیک کیا۔ مسیح اور کل لاگ بالکل کلیئر تھا۔ سارا کل ریکارڈ غائب۔

”ارم کی بیٹی!“ اسے ارم پر بے طرح سے غصہ آیا۔ کل ریکارڈز میں موجود تمام نمبرز اس کے پاس محفوظ ہی تھے، البتہ جب وہ ترک فون ریسٹورنٹ میں

چھوڑ آئی تھی، بیوک ادا جانے سے قبل تو اس کے اسی پاکستانی موبائل پر عبدالرحمن ہاشاکا فون کیا تھا۔ اس کا نمبر اس نے محفوظ نہیں کیا۔ وہ بس کل لاگ میں پڑا رہ گیا تھا۔ اب وہ مٹ گیا تھا۔ چلو خیر اس نے کون سا کبھی اسے آرپی کو کل کرنی تھی۔

جہاں صوفے پر اسی طرح بیٹھا تھا۔ اسے آتے دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

”کیسے ملا؟ مرحلوں کے استعمال سے؟“ اس کی نگاہیں حیا کے ہاتھ میں پکڑے موبائل پر تھیں۔

”نہیں، جہاں شکر کے استعمال سے باتیں جانی ہو وہاں مرحلوں ضائع نہیں کرتے۔“

”دیے پاکستان کے لوگ دل کے بہت ہی اچھے ہیں۔ ایک کزن بغیر پوچھے فون اٹھا لیتی ہے، ایک بہت عزت سے بغیر کھانا کھائے گھر سے نکالتی ہے اور ایک کھانا بھی نہیں پوچھتی۔“

”اور خدا! اس نے بے اختیار اسے کو چھوا۔“ تم نے کھانا نہیں کھایا؟“

”کہاں کھانا؟ وہاں تو ابھی لگا ہی نہیں تھا اور یہاں گھر کی دونوں خواتین نے پوچھا ہی نہیں۔“ وہ اس کی بات مکمل ہونے سے قبل ہی بھاگ کر جلدی سے کچن کی طرف آئی اور فریج کھولا۔

”آج وہاں کھانا تھا تو کچھ بنا یا ہی نہیں۔ ہمارے یہاں رات کا سالن اگلے دن کوئی نہیں کھاتا۔ ٹھہرو! میں انڈے بنا لیتی ہوں۔“ اسے یاد آیا۔ کھانا تو اس نے بھی نہیں کھایا تھا مگر اسے اتنی بھوک نہیں تھی۔ اینڈوں کا خانہ کھولا تو اندر دو ہی انڈے رکھے تھے۔ اسے بے پناہ شرمندگی ہوئی۔

”ان دو اینڈوں سے تو کچھ بھی نہیں بنے گا۔“ اس نے خفت سے کہتے ہوئے فریج کا دروازہ بند کیا۔

جہاں نے جیسے اس پر افسوس کرتے ہوئے سر نہی میں ہلایا۔

”تمہیں شاید بھول گیا ہے کہ تم استنبول کے بہترین شیفس میں سے ایک سے بات کر رہی ہو۔“

آرام سے بیٹھ جاؤ اور کرسی پر۔ میں خود بہانوں کا سب کچھ۔“

اس نے اپنا سلور اسمارٹ فون میز پر رکھا اور پھر آگے بڑھ کر فریج، فریزر، کھینچس، ہر چیز کھول کھول کر الابا ہر نکلنے لگا۔ فروزن قیمہ پاستا کا پیکٹ، جے مٹروں کا لفافہ، ساسز، سبزیوں کے خانے سے چند سبزیاں جن میں۔ تمام چیزیں کاؤنٹر پر جمع کرتا جا رہا تھا۔

”تم اس وقت پاستا بناؤ گے؟“ وہ متوجہ سی کرسی پر بیٹھی اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ ابھی تک اپنے سبز فراک پر اندے اور نیچے سمیت بیٹھی تھی اور اسے کپڑے تبدیل کرنا بالکل بھول گیا تھا۔

”ہاں اور مجھے کوکٹ کے درمیان نوکناست۔ میں بہت برا ماننا ہوں۔“ مسکراتے ہوئے وہ سبزیاں دھو رہا تھا۔ ”اور تمہارا بخار کیسا ہے؟“

”اب ٹھیک ہے۔“ اس نے خود ہی اپنا ہاتھ چھوا۔ وہ کل کی نسبت قدرے ٹھنڈا تھا۔

”ویسے مجھے حیرت زاہد ماموں اور ان کے بیٹے پر ہے۔ اس لڑکی نے اتنی بد تمیزی کی اور انہوں نے اسے کچھ بھی نہیں کہا۔“ وہ واقعاً حیرت سے کہتا سبزیاں کتنی بورڈ پر رکھ کر کھنا کھٹ کاٹ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ شیشی انداز میں چل رہے تھے۔

”اس کی ایک دن کے بعد رخصتی ہے شاید وہ اس کا دل برا نہیں کرنا چاہتے ہوں گے۔“ اس نے شانے اچکا کئے۔

”مگر اس نے بہت مس لی ہو کیا۔“ وہ افسوس سے کہتا پانی اٹنے کے لیے رکھ رہا تھا۔ دوسری جانب اس نے فرانک پین میں ذرا سا تیل گرم ہونے رکھ دیا تھا۔

”اصل میں اس کے فیلسی نے کسی کینیڈین رنہلمی شو میں ایک ڈیزہ ملین ڈالرجیتے ہیں اسی پر اس کا دلغ ساتویں آسمان پر ہے اور وہ زمین پر بغیر دماغ کے گھوم رہی ہے۔“ وہ ٹیک لگائے ٹانگ پر ٹانگ رکھے بیٹھی بتا رہی تھی۔

”کینیڈین شو میں ڈیزہ ملین ڈالرجیتے؟ بہت اچھی کوری ہے۔“ اس نے ذرا سا ہنس کر سر جھٹکا۔ ساتھ ہی وہ فرانک پین میں فراکی ہوتی سبزیوں کو بجائے کفلیک سے ہلانے کے، فرانک پین کا ہینڈل پکڑے دائیں بائیں تو کبھی اوپر نیچے ہلا رہا تھا۔ سبزیاں چند انچ اوپر کو اڑتیں اور پھر واپس پین میں آگرتیں۔

”کیا مطلب؟“ اس نے نا سمجھی سے اسے دیکھا۔

”اگر کسی پاکستانی نے کینیڈین شو میں اتنی خطیر رقم جیتی ہوتی تو میڈیا پر ہر جگہ آچکا ہوتا۔ مجھے تو وہ لڑکا شکل سے ہی کمنٹ لگ رہا تھا۔ تانہ تانہ آئی بلیک منی کو دائٹ کرنے کے لیے کور بنایا ہے اور کیا۔“

”اچھا! اسے تعجب ہوا۔ اس سچ پر تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا! البتہ کمنٹ سے اسے کچھ یاد آیا تھا۔

”جہاں! تمہارے ریٹورنڈ پر جو حملہ ہوا تھا اس کا کچھ پتا چلا؟“

”نہیں۔“ وہ گردن ترچھی کیے ساس کی بوتل پین میں اینڈل رہا تھا۔ ”حالانکہ میری استنبول میں کسی سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ قوی امکان ہے کہ کسی اور کے دھوکے میں ان لوگوں نے میرا ریٹورنڈ الٹ دیا۔“

ایک دشمنی تو خیر اب اس کی دن چکی تھی مگر وہ خود بھی اس سے واقف نہیں تھا۔

”تم تو کہتے تھے کہ استنبول میں ایسا کوئی کرائم سین نہیں ہے؟“

”خیر، اب اتنے بھی برے حالات نہیں ہیں اور ڈارک سائڈ تو ہر بڑے شہر کی ہوتی ہے۔“

وہ چولہے کے سامنے کھڑا اس کی طرف پشت کیے، پین میں قیمہ بھون رہا تھا۔ میے اور شملہ مرچ کی بھینٹی بھینٹی آستھانگیزی مسک سارے میں پھیلنے لگی تھی۔ اس کی کم کشتہ بھوک ایک دم سے جاگ اٹھی۔

”تمہیں پاکستان آکر کیسا لگا جہاں؟“ وہ ٹھوڑی تلے مٹھی رکھے اسے دیکھتی سادگی سے پوچھنے لگی۔ یہاں آنے کے بعد ان کی پہلی باضابطہ گفتگو تھی۔

”اچھا لگا بلکہ بہت اچھا لگا، مگر فرقان ماموں کی باتیں

میں نے تو خواب میں بھی نہیں سوجھا تھا کہ میرے رشتے دار اتنی تنکیس باتیں بھی کر لیتے ہوں گے۔“ اس نے جیسے جھر جھری لے کر سر جھٹکا۔ آج وہ سارا دن تیا فرقان کی کمپنی میں رہا تھا تو یہ وہ عمل فطری تھا۔

”وہ اتنے تنکیس نہیں ہیں، اور بہت پیار کرتے ہیں ہم لوگوں سے بس ان کے اپنے نظریات ہیں جو اتنے سخت ہیں کہ اگر کوئی ان پر پورا نہ اترے تو وہ اس کی گریڈنگ بہت نیچے کر دیتے ہیں۔“

”واٹ ایور!“ وہ اب الٹی پاستا کے پیلے میں قیمہ اور ساس اینڈل رہا تھا۔ پھر ان کو اچھی طرح کس کر کے اس نے اسے دم پر رکھ دیا اور سنگ کی نوٹی کھول کر ہاتھ دھونے لگا۔ وہ سمجھی کب وہ اس کے پاس آکر بیٹھے گا، مگر وہ ہاتھ دھو کر اب سارا پھیلاوا ٹینے لگا تھا۔

جھوٹے برتن، سبزیوں کے چھلکے، خالی شاہرہ جلدی سے اٹھی۔

”میں کر دیتی ہوں۔“

”پلیز تم جیسی رہو، جتنی پھوڑ تم ہو، میں جانتا ہوں۔ اگر تم نے میری مدد کرائی تو وہ کھٹے لگ جائیں گے، جبکہ میں اکیلا کروں تو وہ منٹ میں ہو جائے گا۔“

”ٹھیک ہے، خود ہی کرو۔“ وہ قدرے غفلت سے کہتی دوبارہ بیٹھ گئی۔

اور واقعی اس نے دو تین منٹ میں ہر چیز اپنی جگہ پر رکھ دی۔ چند ایک برتن جو پکانے کے دوران میلے ہوئے تھے، وہ دھل کر اسٹینڈ میں لگ گئے اور سلیب چکانے گئے۔ وہ بندہ مکمل کا تھا۔

”تم کب سے ریٹورنڈ چلا رہے ہو؟“

”اب تو بہت عرصہ ہو گیا۔ اچھا۔ میں برتن لگاتا ہوں، تم سلیمان ماموں کو بلا لاؤ، انہوں نے بھی کھانا نہیں کھایا تھا۔“

”ارے ہاں!“ وہ ماتھے پر ہاتھ مارتی اٹھی، پھر نگاہ اس کے سلور اسمارٹ فون پر پڑی جو میز پر رکھا تھا۔

”تمہیں پتا ہے ڈی جے کو تمہارا فون بہت پسند تھا۔ وہ ہمیشہ کہتی تھی کہ جہاں سے کہنا، جب اپنا یہ وہ

ڈھالی لاکھ کافون پھینکا ہو تو سب انجی کے باہر ہی پھینکے۔
وہ اداسی سے مسکرا کر بولی تو، ہنس دیا۔
”ویسے یہ اس کے لگائے گئے تھینے سے کہیں زیادہ
منگاہے۔“

”اچھا۔“ اسے ذرا حیرت ہوئی۔ ”اتنا قیمتی فون
کیوں خرید اتم نے؟“
”خرید انہیں تھا گفت ملا تھا۔ اس پیش گفت!“ وہ
مسکرا کر جیسے کچھ یاد کر کے بولا۔
”کس نے دیا تھا؟“

”سم دن اس پیش! اچھا جاؤ۔ ابھی ماموں کو بلا لاؤ!“
وہ ہل گیا تو وہ شانے اچکا کاتی وہاں سے چلی آئی۔ ابا کا
دروازہ بجا کر وہیں سے بلا کر وہاں لاونج میں آئی تو وہ
وہاں میز پر پلیٹیں اور گلاس رکھ رہا تھا۔ وہ بڑے صوفے
پر بیٹھی اور ریوٹ اٹھا کر لیوی چلا دیا۔

جس وقت ابازراچر ان سے باہر آئے، جہاں پاستا کی
ڈش اٹھائے کچن سے نکل رہا تھا اور وہ مزے سے اپنے
کام دار جوڑے میں ٹانگ پہ ٹانگ رکھے بیٹھی چیتل
بدل رہی تھی۔

”ابا!“ ان کو دیکھ کر جلدی سے انہی اور جہاں کے
ہاتھ سے ٹرے لی۔

”سوری ماموں! ہم نے آپ کو اٹھا دیا۔ آپ نے
کھانا نہیں کھایا تھا سو۔“ پھر اوہو را چھوڑ کر اس
نے ان کی طرف پلیٹ پر بھائی۔

”تھینک یو۔“ ابا نے قدرے نا سبھی سے کھانے
کو دیکھا اور پھر حیا کو۔ ”یہ تم نے بنایا ہے؟“
”نہیں جہاں نے!“ وہ مسکرا ہٹ پائی۔

”ویسے ماموں! یہ اٹالین رہی نہیں ہے ذرا
دسی اشاکل میں بنایا ہے جیسے می بناتی ہیں“ آپ کو
پاستا میں قیمر بند ہے نا، لمی نے بتایا تھا مجھے۔“
سلیمان صاحب چونک کر اسے دیکھنے لگے۔ اس کو
دل توڑنے کافن آتا تھا تو ٹوٹے ہوئے دلوں کو دوبارہ
سے جوڑ کر انہیں جیتنے کافن بھی آتا تھا۔

وہ اپنی جگہ بیٹھی رہ گئی۔ اسے اب احساس ہوا تھا کہ
وہ رف اور ٹلف سا بندہ تو بھوکا بھی سو جاتا مگر رات کے

ایک بجے اگر ابا نے اتنا اہتمام کیا تھا تو صرف اور
صرف ابا کے لیے کیونکہ اسے یاد تھا کہ ابا نے کھانا
نہیں کھایا اور اسے شاید احساس ہو گیا تھا کہ وہ اس سے
ذرا کھینچنے کھینچنے سے رہتے ہیں۔ اور حیا کو خود اب یاد آیا
تھا کہ قیمر والا پاستا ابا کا پسندیدہ تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس
عمل سے جہاں نے اپنے اور ابا کے درمیان حائل
برف کو پکھلانے کی کوشش کی تھی۔

پاستا بہت مزے کا تھا۔ منہ میں جاتے ہی کھل
جانے والا۔ سلیمان صاحب نے تعریف نہیں کی مگر
ان کے چہرے سے ظاہر تھا کہ انہیں اپنا یوں خیال کیا
جانا اچھا لگا تھا۔ وہ خود بھی بہت شوق سے کھا رہی تھی۔
ڈی جے کے بعد یہ پہلا کھانا تھا جو اس نے دل سے
کھایا تھا۔

”کونیا میں دو لڑکیوں کا اغوا۔“
ٹی وی اسکرین پر بی بی سی چل رہا تھا اور جو خبر نیوز
کاسٹر نے بڑھی، اس پر ان تینوں نے چونک کر سر
اٹھایا۔ کونیا ترکی کا شہر تھا۔

جہاں نے بجلی کی تیزی سے ریوٹ اٹھایا اور چیتل
بدل دیا۔

”کیا کہا اس نے۔۔۔ کونیا؟“ ابا جو ہاتھ روک کر
اسکرین کو دیکھنے لگے تھے، چیتل تبدیل ہونے پر الجھ کر
جہاں کو دیکھا۔ سادگی سے مسکرا دیا۔

”نہیں کونیا نہیں اس نے کہا تھا کینیا۔ اور لیس نا!“
وہ ریوٹ ایک طرف رکھ کر انہیں پھر سے سرو
کرنے لگا۔ ابا نے ذرا تذبذب سے سر ہلایا مگر وہ اپنی
سماعت کے دھوکا دینے پر الجھے ہوئے تھے۔ حیا نے
جہاں کو دیکھا اور جہاں نے اسے پھر دونوں زیر لب
مسکرا دیے۔

ابھی وہ ابا کے سامنے ترکی کا بیج سیوا تازہ نوادیکھنے
کے متمثل نہیں تھے۔



بارات کے لیے وہ میرج ہل کی جانب رواں دواں
تھے ابا ڈرائیو کر رہے تھے اور آج وہ خاموش نہیں تھے

بلکہ فرنٹ سیٹ پر بیٹھے جہاں کو سڑک کے اطراف
میں گزرتی جگہوں کے بارے میں مختصر فقروں میں
آگاہی دے رہے تھے۔ وہ بھی جواہر کو کی مختصر سا
جواب دے رہا تھا۔ آج بھی اتنا ہی کم کو تھا جتنا وہ روز
قبل تھا، مگر برف کی دیوار پکھل گئی تھی۔

وہ پچھلی نشست پر بیٹھی لالہ لعل کی باہر دیکھ رہی
تھی۔ اسے ڈی جے کے بغیر یوں ان خوشی کی تقارب
میں شرکت کرنا سخت برا لگ رہا تھا۔ وہ اندر ہی اندر
احساس جرم کا شکار تھی۔ ابھی اسے پچھڑے دن ہی
کتنے ہوئے تھے مگر مجبوری تھی۔ جانا تو تھا۔ آج بھی
خاص تیار نہیں ہوئی تھی۔

کابل اور پچھلے اسٹک کے علاوہ کوئی میک اپ
نہیں کیا، بال یونٹی کھلے چھوڑ دیے۔ جیولری بھی
نہیں پہنی۔ ضرورت بھی نہیں تھی کہ اس کی لمبی
ٹخنوں سے ہاشت بھر اور نمی قیصر کے کھلے۔ کلنی کام
تھا۔ وہ شیفلون کی قیصر تھی، اور اس کا رنگ آلو
بخارے کے چھلکے کا سا تھا۔ قیصر کا گلا گردن تک بند
تھا اور گردن سے لے کر وہ ہاشت نیچے تک سیاہ اور آلو
بخارے کے رنگ کے چھوٹے بڑے ہر سائز کے
Diamontics (نگ) لگے تھے۔ ان کی جھلک لہٹ
بہت خوب صورت تھی۔ نیچے ہم رنگ سلک کا پاجامہ
تھا اور آستینیں کلائیوں تک آتی چوڑی دار تھیں۔
لیکن آج بھی اسے کل کی طرح اپنے لباس کی خوب
صورتی سے قطعاً دلچسپی نہ تھی۔

میرج ہل کے باہر بارات ابھی ابھی اتری تھی۔
داخلی دروازے پر خاصا رش تھا۔ جی سنوری زیورات
قیمتی لمبوسات اور خوشبودوں میں رچی بسی لڑکیاں اور
خواتین گاڑیوں سے نکل کر اپنے بل اور میک اپ
ٹھیک کرتی دروازے کی جانب بڑھ رہی تھیں۔ رضا
اور زاہد بچا وہاں کھڑے خوش اخلاقی سے مسکراتے
مہمانوں کو دیکھ کر رہے تھے۔ اسے پتا تھا کہ مہوش کی
کل والی بات کو آج بھلا کر سب شادی میں شرکت
کریں گے اور واقعی یہ ہو رہا تھا۔

کار رکنے پر اس نے دروازہ کھولا اور باریک ہل باہر

مشہور و مزاح نگار اور شاعر

انشاء جی کی خوبصورت تحریریں،

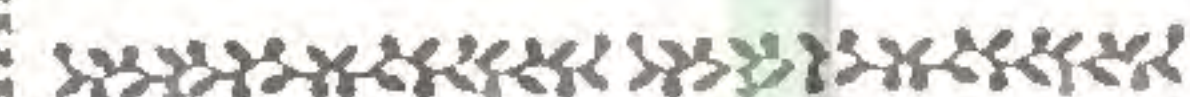
کارٹونوں سے مزین

آفسٹ طباعت، مضبوط جلد، خوبصورت گرد پوش



قیمت	سب کام
------	--------

450/-	آوارہ گرد کی ڈائری	سفر نامہ
450/-	دیبا کول ہے	سفر نامہ
450/-	ابن بطوطہ کے نقاب میں	سفر نامہ
275/-	چلنے ہو تو چین کو چلیے	سفر نامہ
225/-	مکرمی مری پھر اسافر	سفر نامہ
225/-	خمار گندم	طرح و مزاح
225/-	آرزو کی آخری کتاب	طرح و مزاح
300/-	اس ہستی کے کوچے میں	مجموعہ کلام
225/-	چاند مگر	مجموعہ کلام
225/-	دل دہنی	مجموعہ کلام
200/-	اندر حاکمواں	ایڈ گراہین پو ابین انشاء
120/-	لاکھوں کا شہر	ادبیری الامین انشاء
400/-	ہاتھیں انشاء جی کی	طرح و مزاح
400/-	آپ سے کیا پردہ	طرح و مزاح



مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37، اردو بازار، کراچی

پتھر ملی زمین پر رکھی۔ بے اختیار اسے اپنی ٹوٹی ہوئی سرخ ہیل یاد آئی۔ سر جھٹک کر وہ باہر نکلی اور پرس سنبھالتے ہوئے دروازہ بند کیا۔ ابا، جہان اور امل ایک ساتھ میز جہل کے داخلی دروازے کی جانب بڑھ رہے تھے اور وہ بھی وہیں چلی جاتی اگر جو اس کے پاؤں پر پتھر آکر نہ لگتا۔

”آؤج!“ اس نے کراہ کر پیر ہٹایا۔ وہ بھری کاچھوٹا سا ٹکڑا تھا۔ اس نے گردن اٹھا کر اوپر ادھر ادھر دیکھا۔ وہ مخالف سمت سے آیا تھا، جہاں پارکنگ میں گاڑیاں کھڑی تھیں اور کسی نے بہت تاگ کر اسے مارا تھا۔ ان گزرے تین چار ماہ میں اسے اتنا اندازہ تو ہو گیا تھا کہ اس کے ساتھ اتفاقات نہیں ہوتے تھے۔ اس نے متلاشی نگاہوں سے اس سمت دیکھا اور پھر ٹھہری گئی۔ پارکنگ کے پیچھے سے ایک ہیولا سا نکلا اور اس کی جانب بڑھنے لگا۔ چند لمحوں میں وہ اپنی جگہ سے ہل نہیں سکی۔ رات کی تاریکی میں پارکنگ ایریا کو اونچے پولر کی زرد تیلوں نے مدھم مدھم روشنی بخش رکھی تھی۔ اس روشنی میں وہ صاف دکھائی دے رہا تھا اور وہی تھی۔

بھڑکتا ہوا نیلا زرد تار دوپٹا ہم رنگ جوڑے کے اوپر پہنے ہوئے کالچر چرے۔ ذرا سا ڈالے اسے دانتوں سے یوں پکڑے ہوئے تھا کہ دھڑ سے اس پر کسی عورت کا گمان ہوتا تھا۔ چرے کو سفید پینٹ کیے گھرے آئی میک اپ، سرخ چوچ سی لپ اسٹک اور سنہرے بالوں کی دگ لگائے، وہ اس کی طرف چلتا آ رہا تھا۔ اسے ایک نظر میں ہی پہچان گئی تھی۔

”پنگی!“ اس نے ہر اسٹاپنگاہوں سے گردن موڑ کر درہل کی طرف کو دیکھا۔ ابا کی اس کی جانب پشت تھی۔ وہ واپس مڑی تب تک کہ قریب آچکا تھا۔

”کیسی ہو باجی جی؟“ وہ مسکرایا تھا۔

”آپ سے ملنے آئی تھی جی! پنگی کہتے ہیں مجھے۔ یاد ہے جی؟“ وہ مسکرا کر بولا۔

”اچھی طرح یاد ہے اور بھولی تو تمہاری ہل اور بہن بھی نہیں ہوں گی! اب ہٹو میرے راستے سے۔“

”غصہ کیوں کر رہی ہو جی! میں تو آپ کو کچھ بتانے آئی تھی۔“

”مالی فٹ! مسئلہ کیا ہے آپ کو۔ مگر احمد؟“ وہ پیرنچ کر بولی۔

”اتنے باوقار عہدے پہ فائز ہو کر کیسی حرکتیں کر رہے ہیں آپ؟“

”تو جی۔ میں تو ڈولی کا پیغام دینے آئی تھی مگر۔“

”کیسا پیغام؟“ وہ اسی رکھا کی سے بولی۔

”ڈولی کی حالت امید بخش نہیں ہے، پتا نہیں کتنے دن جی پائے۔“

”کیا ہوا اسے؟“ وہ ذرا چوکی۔

”اوپر ہسپتال میں ہے، خود چل کر دیکھ لیجیے۔“

”آئیے! میں آپ کو لے جاتی ہوں۔“

”نہیں نہیں، مجھے کہیں نہیں جانا۔“ وہ بدک کر دم پیچھے ہٹی۔

”ایک دفعہ تو اس سے مل لیں اس نے کچھ بتانا ہے آپ کو۔“

”مجھے کچھ نہیں جانا۔ تم لوگوں کی ساری معلومات مجھے اے آر پی کی ماں سے مل گئی تھیں۔“ تنخی سے کہتے ہوئے اس نے پھر سے پلٹ کر دیکھا۔ ساراات کے مسمان اندر کی جانب بڑھ رہے تھے۔ کوئی اس کی طرف متوجہ نہ تھا۔

”ہو سکتا ہے کچھ ایسا ہو جو اس کی ماں کو بھی نہ پتا ہو۔“

”کیا؟“ وہ چوکی، پھر بغور پنگی کو دیکھا۔ اس کے اونچے قد کے سوا کوئی چیز اس روز جتنا سپر کی شاپ میں ملنے والے اس اسٹارٹ گلاسز والے نوجوان کا پتا نہیں دیتی تھی۔ پنگی کا تو چہرہ بھی جلا ہوا نہیں لگتا تھا مگر نہیں۔ اس کا چہرہ تو سلیٹ کی طرح چپٹا تھا۔ ایسی جھلی جس نے سب نقش چھاپ دیے ہوں۔ خدایا! کیسے یہ لوگ اپنے چہرے بدل لیتے تھے۔ مگر آنکھیں۔ وہ چوکی یہ

آنکھیں وہی تھیں۔ وہی گلاسز کے پیچھے سے جھلکتی آنکھیں۔ اب آئی شیڈ کی چمکیلی تہ کے باوجود وہ انہیں پہچان گئی تھی۔

”اس بات کا جواب تو بس ڈولی کے پاس ہے جی اور اس نے مجھے یہی آپ کو بتانے کا کہا تھا۔ سلیٹ کی دوستی بھاری ہوں میں تو جی! اور نہ میری جوتی کو بھی شوق نہیں ہے آپ جیسی بد زبان خاتون کے منہ لگنے کا۔“

چڑ کر کہتے ہوئے اس نے ڈولے کے اندر چھپے ہاتھ باہر نکالے۔ اس میں ایک چھوٹا سا لکڑی کا ڈبا تھا۔

”یہ ڈولی نے بھیجا ہے۔ اسے اسی طریقے سے کھولے گا جو اس نے لکھا ہے، مگر جب تک آپ اسے کھول پائیں گی، وہ شاید اس دنیا میں نہ رہے۔“

حیائے اس کے بڑھے ہوئے ہاتھوں میں پکڑے اس ڈبے کو دیکھا۔ اس کی کلائی پر وہی کانٹے کا سرخ بھورا سا نشان تھا۔

”یہ کیا ہے؟“ اس نے اچنبھے سے سراٹھا کر پنگی کو دیکھا۔ وہ کھل کھڑی ہے اسے لے کر بھر کو بالکل بھول گیا تھا۔

”یہ ایک پہلی سے کھلے گا، مگر یہ پہلی صرف آپ ہی بوجھ سکتی ہیں اور آپ بوجھ ہی نہیں کی۔ یہ بہت آسان ہے، لیکن اس کے اندر موجود چیز نکالنے کے لیے اسے توڑنے کی کوشش مت کیجیے گا۔ اسے توڑ دیا تو وہ چیز آپ کے کام کی نہیں رہے گی۔“ پنگی نے مسکرا کر کہتے ہوئے ڈبا اس کے مزید سامنے کیا۔ اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی اسے تمام لیا۔

”اچھا باجی جی! رب را کھا۔“ وہ وہی خواجہ سراؤں والا لہجہ بنا کر بولتا، سلام جھار کر وہ پٹا منہ پہ ڈالے پلٹ گیا۔

اس نے جلدی سے ڈبا پرس میں رکھا اور پشیمانی سے نمودار ہوئے سینے کے قطرے نشو سے تھپتھپاتی خود کو کپڑوں کی ہل کی جانب بڑھ گئی۔

بارات کا فنکشن ویسا ہی تھا جیسا کسی بھی شاندار شادی کا ہونا چاہیے۔ جھٹ نور بنا ہل، بہترین سجاوٹ،

ولسن کا قیمتی ڈیزائنر سوٹ اور جیولری مہوش کی نخیالی کزنز کے گروپ ڈانس اور پر تکلف طعام کی اشتہا انگیز خوشبو جو ابھی کھلا نہیں تھا۔ آج بھی مرد و خواتین اکٹھے تھے مگر یوں کہ آٹھ ہل میں مرد اور بانی آٹھ کی میزوں پر خواتین پر اجماع تھیں تاکہ ایک حد تک علیحدگی رہے۔ ان کی فیملی کی کسی بھی لڑکی نے رقص میں حصہ نہیں لیا مگر مہوش کی کزنز ہر طرف چھائی رہیں۔

وہ آج بھی ایک الگ تھلک کرنے والی میز پر بیٹھی رہی۔ اس کا دل اسٹیج پر جا کر مودی بنوانے کو قطعاً نہیں چاہ رہا تھا۔ اس شریفوں کے بھرے نے اسے ایسا احساس عدم تحفظ بخشا تھا کہ وہ کسی بھی دوسرے کے کیمرے یا موبائل میں تصویر کھنچوانے سے احتیاط برت رہی تھی۔ یہ مودی اور تصویر کھلی کھلی نہیں کھومتی ہوں گی۔ اس نے جھرجھری لے کر سر جھٹکا۔

اتنے بڑے ہل میں کوئی بھی اس کی جانب متوجہ نہ تھا۔ وہ ویسے بھی اس میز پر اکیلی بیٹھی تھی۔ اس نے چند لمحوں کے لیے سوچا، پھر میز پر رکے پرس سے وہ ڈبا نکالا اور فائوس کی چکا چوند روشنی میں الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔

وہ ایک ہاتھ جتنا لمبا اور پانچ انچ موٹا مستطیل ڈبا تھا۔ ڈبے نہ بہت بھاری تھا نہ بہت ہلکا۔ وہ گہری بھوری لکڑی کا بنا تھا اور اس کے ڈھکن کے علیحدہ ہونے کی جگہ پر چھ خانے بنے تھے جن کے اندر A لکھا نظر آ رہا تھا۔ اس نے ایک A پر انگلی رکھ کر نیچے کو رگڑا تو A نیچے چلا گیا اور B سامنے آ گیا۔ وہ اسے نیچے کرتی گئی۔ ان چھ خانوں میں پوری انگریزی کے حروف تہجی لکھے تھے۔ جیسے عموماً ”بریف کسز“ میں ایسی اسٹریٹس لگی ہوتی ہیں جو تین زبردہ کھل جاتی ہیں، ویسے ہی اس باکس کو کھولنے کے لیے کوئی چھ حروف لفظ سامنے لانا تھا۔

پنگی نے کہا تھا کہ اسے کھولنے کا طریقہ اس ڈبے پر لکھا ہوا ہے۔ اس نے ڈبے کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور

پتھر ملی زمین پر رکھی۔ بے اختیار اسے اپنی ٹوٹی ہوئی سرخ ہیل یاد آئی۔ سر جھٹک کر وہ باہر نکلی اور پرس سنبھالتے ہوئے دروازہ بند کیا۔ ابا، جہان اور امل ایک ساتھ میز جہل کے داخلی دروازے کی جانب بڑھ رہے تھے اور وہ بھی وہیں چلی جاتی اگر جو اس کے پاؤں پر پتھر آکر نہ لگتا۔

”آؤج!“ اس نے کراہ کر پیر ہٹایا۔ وہ بھری کاچھوٹا سا ٹکڑا تھا۔ اس نے گردن اٹھا کر اوپر ادھر ادھر دیکھا۔ وہ مخالف سمت سے آیا تھا، جہاں پارکنگ میں گاڑیاں کھڑی تھیں اور کسی نے بہت تاگ کر اسے مارا تھا۔ ان گزرے تین چار ماہ میں اسے اتنا اندازہ تو ہو گیا تھا کہ اس کے ساتھ اتفاقات نہیں ہوتے تھے۔ اس نے متلاشی نگاہوں سے اس سمت دیکھا اور پھر ٹھہری گئی۔ پارکنگ کے پیچھے سے ایک ہیولا سا نکلا اور اس کی جانب بڑھنے لگا۔ چند لمحوں میں وہ اپنی جگہ سے ہل نہیں سکی۔ رات کی تاریکی میں پارکنگ ایریا کو اونچے پولر کی زرد تیلوں نے مدھم مدھم روشنی بخش رکھی تھی۔ اس روشنی میں وہ صاف دکھائی دے رہا تھا اور وہی تھی۔

بھڑکتا ہوا نیلا زرد تار دوپٹا ہم رنگ جوڑے کے اوپر پہنے ہوئے کالچر چرے۔ ذرا سا ڈالے اسے دانتوں سے یوں پکڑے ہوئے تھا کہ دھڑ سے اس پر کسی عورت کا گمان ہوتا تھا۔ چرے کو سفید پینٹ کیے گھرے آئی میک اپ، سرخ چوچ سی لپ اسٹک اور سنہرے بالوں کی دگ لگائے، وہ اس کی طرف چلتا آ رہا تھا۔ اسے ایک نظر میں ہی پہچان گئی تھی۔

”پنگی!“ اس نے ہر اسٹاپنگاہوں سے گردن موڑ کر درہل کی طرف کو دیکھا۔ ابا کی اس کی جانب پشت تھی۔ وہ واپس مڑی تب تک کہ قریب آچکا تھا۔

”کیسی ہو باجی جی؟“ وہ مسکرایا تھا۔

”تم۔ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“ اس نے سراپسنگی سے اسے دیکھتے اپنے پرس پر گرفت مضبوط کر لی گویا ذرا بھی وہ آگے بڑھتا تو وہ بھاگ اٹھے گی۔

”کیا؟“ وہ چوکی، پھر بغور پنگی کو دیکھا۔ اس کے اونچے قد کے سوا کوئی چیز اس روز جتنا سپر کی شاپ میں ملنے والے اس اسٹارٹ گلاسز والے نوجوان کا پتا نہیں دیتی تھی۔ پنگی کا تو چہرہ بھی جلا ہوا نہیں لگتا تھا مگر نہیں۔ اس کا چہرہ تو سلیٹ کی طرح چپٹا تھا۔ ایسی جھلی جس نے سب نقش چھاپ دیے ہوں۔ خدایا! کیسے یہ لوگ اپنے چہرے بدل لیتے تھے۔ مگر آنکھیں۔ وہ چوکی یہ

آنکھیں وہی تھیں۔ وہی گلاسز کے پیچھے سے جھلکتی آنکھیں۔ اب آئی شیڈ کی چمکیلی تہ کے باوجود وہ انہیں پہچان گئی تھی۔

”اس بات کا جواب تو بس ڈولی کے پاس ہے جی اور اس نے مجھے یہی آپ کو بتانے کا کہا تھا۔ سلیٹ کی دوستی بھاری ہوں میں تو جی! اور نہ میری جوتی کو بھی شوق نہیں ہے آپ جیسی بد زبان خاتون کے منہ لگنے کا۔“

چڑ کر کہتے ہوئے اس نے ڈولے کے اندر چھپے ہاتھ باہر نکالے۔ اس میں ایک چھوٹا سا لکڑی کا ڈبا تھا۔

”یہ ڈولی نے بھیجا ہے۔ اسے اسی طریقے سے کھولے گا جو اس نے لکھا ہے، مگر جب تک آپ اسے کھول پائیں گی، وہ شاید اس دنیا میں نہ رہے۔“

حیائے اس کے بڑھے ہوئے ہاتھوں میں پکڑے اس ڈبے کو دیکھا۔ اس کی کلائی پر وہی کانٹے کا سرخ بھورا سا نشان تھا۔

”یہ کیا ہے؟“ اس نے اچنبھے سے سراٹھا کر پنگی کو دیکھا۔ وہ کھل کھڑی ہے اسے لے کر بھر کو بالکل بھول گیا تھا۔

”یہ ایک پہلی سے کھلے گا، مگر یہ پہلی صرف آپ ہی بوجھ سکتی ہیں اور آپ بوجھ ہی نہیں کی۔ یہ بہت آسان ہے، لیکن اس کے اندر موجود چیز نکالنے کے لیے اسے توڑنے کی کوشش مت کیجیے گا۔ اسے توڑ دیا تو وہ چیز آپ کے کام کی نہیں رہے گی۔“ پنگی نے مسکرا کر کہتے ہوئے ڈبا اس کے مزید سامنے کیا۔ اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی اسے تمام لیا۔

”اچھا باجی جی! رب را کھا۔“ وہ وہی خواجہ سراؤں والا لہجہ بنا کر بولتا، سلام جھار کر وہ پٹا منہ پہ ڈالے پلٹ گیا۔

اس نے جلدی سے ڈبا پرس میں رکھا اور پشیمانی سے نمودار ہوئے سینے کے قطرے نشو سے تھپتھپاتی خود کو کپڑوں کی ہل کی جانب بڑھ گئی۔

بارات کا فنکشن ویسا ہی تھا جیسا کسی بھی شاندار شادی کا ہونا چاہیے۔ جھٹ نور بنا ہل، بہترین سجاوٹ،

لختہ بھر کو ٹھٹھکی۔ اسے ڈھکن کی اوپری سطح پر کچھ کھدا ہوا نظر آیا تھا۔ وہ چہرہ ڈبے پہ جھکائے آنکھیں سکڑ کر بڑھنے لگی۔ وہ بہت باریک انگریزی میں لکھا ایک فقرہ تھا۔

"Into the same river
no man can enter twice."
(ایک ہی دریا میں کوئی شخص دو دفعہ نہیں اتر سکتا۔)

اس نے الجھن بھرے انداز میں وہ فقرہ دہرایا۔ کیا یہی وہ پہلی تھی جس کا ذکر چنگی نے کیا تھا؟ مگر یہ پہلی تو نہیں نکلتی تھی۔ اس میں تو کوئی سوال نہ تھا۔
"السلام علیکم جیابا!"

آواز پر اس نے کرنٹ کھا کر گردن اٹھائی اور ساتھ ہی گود میں رکھے ڈبے پہ دو ہٹا ڈالا۔

سامنے شہلا کھڑی تھی۔ سیاہ عبایا کے اوپر گہرے سبز اسکارف کا نقاب انگلیوں سے تھامے، اپنے انہی نرم انداز میں مسکراتے ہوئے۔

"وعلیکم السلام شہلا بھابی! کیسی ہیں آپ؟ آئیں بیٹھیں۔" وہ ذرا استنبھل کر انہی اور جلدی سے ڈبا پرس میں ڈال کر ان سے گلے ملی۔

"میں ٹھیک ہوں۔ تم سناؤ مجھے علم نہیں تھا کہ تم آئی ہوگی ہو۔" وہ رسلان سے کستی ساتھ والی کرسی پر بیٹھی۔ "پھر ابھی فاطمہ پیمپو نے تمہاری فرزند کا بتایا۔ ریکی سوری فارہر۔"

ڈی جے کے ذکر پر اس کے سینے میں ایک ہوک سی انہی سے پھر سے افسردہ ہو گئی۔

"چاہ نہیں شہلا بھابی! اللہ تعالیٰ کی کیا مرضی تھی۔ میری ایک ہی دوست تھی ترکی میں اور وہ میری تمام دوستوں سے بڑھ کر ہو گئی تھی۔ بہت دعا کی میں نے اس کے لیے مگر کوئی دعا قبول نہیں ہوئی۔" نہ چاہتے ہوئے بھی شکوہ لبوں پہ آگیا۔

"اللہ تمہیں مبرورے گل۔ ہم سب ہیں نا تمہارے ساتھ۔" شہلا نے اس کا ہاتھ نرمی سے دبایا۔ "بہنیں آئی کا بیٹا بھی آیا ہے؟"

"جی وہ ادھر ہے۔" اس نے نگاہوں کا زاویہ موڑا تو شہلا نے تعاقب میں دیکھا۔

اسیج کے قریب وہ سلیمان صاحب کے ساتھ کھڑا تھا۔ سیاہ ڈنر سوٹ میں ملبوس اس کی مقناطیسی شخصیت بہت شاندار لگ رہی تھی۔ سلیمان صاحب اس کے شانے پہ ہاتھ رکھے کسی سے اس کا تعارف کروا رہے تھے اور وہ جیسے انداز میں مسکرا رہا تھا۔ آج وہ اس کے ساتھ اتنے مطمئن اور مسرور لگ رہے تھے گویا وہ جیل واپس آگیا ہو۔

"بہت اچھا ہے شاء اللہ۔"

"تھینکس۔" شہلا بھابی! ایک بات کہوں۔ آپ کی ساس نے آپ کی اتنی خوب صورت بری برائی تھی اور آج بھی آپ نے ان ہی میں سے کوئی سوٹ پہنا ہو گا، اس طرف تو غور نہیں ہی ہیں۔ آپ کا عبایا۔ میرا مطلب ہے، آپ کے کپڑے تو نظری نہیں آرہے۔" وہ رک رک کر ہچکچاتے ہوئے بولی تھی۔ دادر بھائی کی منندی پہ اس نے بہت کھنگ وار لہجے میں شہلا کو نقاب اتارنے کے لیے کہا تھا مگر آج اس کی آواز سے وہ کھنگ مفقود تھی۔

جواباً شہلا بہت حشکن سے مسکرائی تھی۔

"کیا فرق پڑتا ہے جیابا! اتنے مردوں کو اپنے کپڑے دکھا کر مجھے کیا مل جائے گا؟"

"تو نقاب ہی اتار دس۔" اس کا لہجہ بہت کمزور تھا۔ اس نے نقاب ڈھیلا بھی نہیں کیا۔ حیا نے پھر نہیں کہا۔ اس سے کہا ہی نہیں گیا۔

وہ تو خود دل سے نہیں چاہتی تھی کہ شہلا نقاب اتار دے۔ وہ تو بس اس کا جواب سننا چاہ رہی تھی۔ اسے شریفوں کے مجرے کا وہ منتظر اچھی طرح سے یاد تھا جب سنہری اور چاندی کی محور قص پر یوں کے پیچھے کرسی پہ ترچھی ہو کر بیٹھی کسی آئی سے بات کرتی شہلا نظر آرہی تھی مگر نقاب میں ہونے کے باعث اسے کوئی پہچان نہیں سکتا تھا۔ سو اس کے حصے میں وہ بدنامی نہیں آئی جو ان دونوں کے نصیب میں آئی تھی مگر آج وہ اتنی پرمردگی اور تھکن سے کیوں مسکرائی

تھی۔ یوں جیسے اس کا دل اندر تک زخمی ہو۔ وہ کہہ نہ سکتی تھی کہ زخمی نگاہیں۔ اسے کسی نے پکار لیا اور وہ اٹھ کر چلی گئی مگر حیا کی نگاہیں کلنی دور تک اس کا تعاقب کرتی رہیں۔

پچھلی دفعہ اسے شہلا کو عبایا میں دیکھ کر عجیب کو فٹ بھرا احساس ہوا تھا مگر آج ایسا نہیں ہوا تھا۔ وہ اس کی ان دکھ بھری آنکھوں میں انگ کر رہ گئی تھی۔ شہلا کو کیا غم تھا۔ اتنی اچھی فیملی میں شادی ہوئی۔ اتنا ہینڈ سم شوہر امیر کبیر، باب کا اکلوتا بیٹا، پھر۔ پھر اسے کیا دکھ تھا؟ وہ پھر سارا انکشن کی سوچے گئی۔



تو وہی رات گئے اپنے کمرے میں بیٹھے وہ پھر سے اس ڈبے کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔ جہان ڈوبی ہوئی تھی احمد پاشا مگر انگریزی میں یہ سارے نام پانچ حنی تھے۔ چھنا حرف نہیں ملتا تھا۔ وہ بار بار اس سطر کو بڑھے گئی مگر کوئی حل نظر نہیں آتا تھا۔ مگر کون سا شخص تھا جس کے پاس ایسے ہر محنت طلب مسئلے کا حل ہو تا تھا؟

وہ ڈبا لے بھاگ کر باہر آئی۔ جہان کچن میں کھڑا کاؤنٹر پر گلاس رکھ پانی کی بوتل اس میں اندر مل رہا تھا۔ وہ اس کے سامنے آئی اور باکس اس کے ساتھ رکھا۔

"یہ مجھے کسی نے دیا ہے اور مجھے اس کا پاس ورڈ نہیں معلوم اسے کھول دو۔"

وہ آواز پہ چونکا پھر بوتل رکھ کر ڈبا اٹھایا۔

"یہ ہے کیا؟" وہ ذرا اچنبھے سے اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔

"جو بھی ہے تم اسے کسی طرح کھول دو۔"

"ہوں اچھل جائے گا نور ابلیس۔" وہ ڈھکن اور ڈبے کی بند دراز پہ انگلی پھیر کر کچھ محسوس کر رہا تھا۔ "تم مجھے ایک بڑا پتھر اور ایک ہتھوڑا لا دو۔"

"افوہ! توڑنا نہیں ہے اسے بلکہ تم تو رہنے ہی دو۔"

اس نے خفگی سے ڈبا اس کے ہاتھ سے واپس لے لیا۔

"کیا ہوا؟ میں کھول تو رہا تھا ایک منٹ مجھ دیکھنے تو

د۔"

"میں خود کر لوں گی تم رہنے دو۔ تم میرے لیے کچھ نہیں کرتے۔" چاہ نہیں وہ کس بات پہ اس سے خفا تھی جو جھنجھلا کر بولی۔

"پھر سوچ لو۔ میں تو ابھی ماموں کے پاس جا رہا تھا انہیں تمہیں دوبارہ استنبول بھیجنے کے لیے راضی کرنے مگر ٹھیک ہے، میں تمہارے لیے کچھ نہیں کرتا۔" وہ شانے اچکا کر پانی پینے لگا۔

"سچ؟" اس نے بے یقینی سے پلکیں جھپکائیں۔

"تم انہیں متا سکتے ہو؟"

"میں ایک اچھا شیف اور اچھا مکینک ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھا وکیل بھی ہوں۔ ٹرائی ی!" وہ گلاس رکھ کر ذرا سا مسکرایا۔

"ابا ایک دفعہ اڑ جائیں تو کبھی فیصلہ نہیں بدلتے۔

تم انہیں کیسے مناؤ گے؟"

"ویسے تو تمہارا دوبارہ استنبول جانا میرے مفاد میں قطعاً نہیں ہے کیونکہ اب تم ہر فورسٹ انٹرکشن دیکھنے جانے کے لیے مجھے ہی خوار کرواؤ گی، مگر مجھے لگا تم جانا چاہتی ہو۔ سو میں ماموں سے بہت کرنے ہی جا رہا تھا اور وہ ملن جائیں گے۔ بدوقت کو نیا کو کینیا نہ بتاتا تو شاید وہ کبھی نہ مانتے۔"

"ہاں استنبول تو بہت محفوظ شہر ہے اور پاکستان میں تو روزیم دھماکے ہوتے ہیں اور پاکستان میں تو پتا نہیں لوگوں کے پاس انٹرنیٹ کی سہولت موجود ہے بھی یا نہیں! وہ ذرا جل کر بولی۔ وہ بنا کچھ کہے مسکراتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

اگلا ایک گھنٹہ وہ کچن میں کرسی پہ بیٹھی جہان کا انتظار کرتی رہی۔ بالآخر جب ابا کے کمرے سے نکلا تو وہ تیزی سے اٹھی۔

"کیا ہوا؟"

"پیننگ کر لو۔ ہم کل صبح کی فلائٹ سے واپس جا رہے ہیں۔" وہ دھیماسا مسکرا کر بولا۔ "مگر اس شرط پہ کہ فی الحال تو تم ہمارے ساتھ رہو گی بعد میں جب تمہاری اسپرنگ بریک ختم ہو جائے تو بے شک چلی جانا۔"

”ج“ وہ بے یقینی و خوشگوار حیرت میں گہری اسے دیکھ رہی تھی۔ ایک طمانیت بھرا احساس اس کے پورے وجود کو اپنی لپیٹ میں لینے لگا تھا۔ البتہ ایک بات وہ جانتی تھی۔ استنبول ڈی جے کے بغیر کبھی بھی ویسا نہیں ہوگا جیسا پہلے تھا۔

”تمہارا دل غدرست ہے؟“
باشم نے بے یقینی سے اپنی بیوی کو دیکھا جو بستر کے دوسرے کنارے پہ بیٹھی اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ ان دونوں کے درمیان حارث آنکھیں موندے سو رہا تھا۔ اس کا دایاں ہاتھ باشم کے ہاتھ میں تھا۔
”ایسا کیا غلط کہہ رہا ہے میں نے؟“ وہ جی بھر کر کوفت کا شکار ہوئی۔

”تم پاگل ہو گئی ہو“ تمہارے حواس جواب دے گئے ہیں۔“ حیرت کی جگہ اب جھنجھلاہٹ نے لے لی تھی۔

”حواس تو تمہارے جواب دے گئے ہیں۔ میں تمہیں ایک سیدھا سا حل بتا رہی ہوں اس سارے مسئلے کا۔ تم روز کے چوبیس گھنٹے بھی کام کرو تو اس رقم کے تو مجھے لیراز بھی اکٹھے نہیں ہوں گے جو ہمیں حارث کی سرجری کے لیے چاہیے۔ اور ایسے مست و کمبو مجھے۔“ آخر میں وہ خفا ہو کر بولی۔

”پاشا مجھے جان سے ماروے گا۔ وہ اس کی لڑکی ہے۔“

”اور پاشا کو تائے گا کون؟ تو مہینہ بھر پہلے ہی انڈیا چلا گیا تھا۔ تم نے خود ہی مجھے بتایا تھا۔“ وہ چمک کر بولی۔ نیم روشن کمرے میں سبز بلب کی یہ دم روشنی اس کے چہرے کو عجیب سا تاثر دے رہی تھی۔
”وہ انڈیا گیا ہے“ مر نہیں گیا جو اسے کبھی ہمت نہیں چلے گا۔ مجھے جان سے ماروے گا سلسلی۔“

”تو پھر تم اپنی جان سنبھال کر بیٹھے رہو اور حارث کو مرنے کے لیے چھوڑ دو۔“ غصے سے کہتی اٹھ کر چادریں تہہ کرنے لگی۔

”سلسلی۔ میں ایسا نہیں کر سکتا۔“ اب کے وہ قدرے تذبذب سے بولا تھا۔
”تو تم کر کیا سکتے ہو؟ اور کیا کیا ہے تم نے حارث کے لیے؟“

”میرا بیٹا مجھے بہت پیارا ہے۔“ اس نے سوتے ہوئے حارث پہ ایک نظر ڈالی۔ ”مگر وہ بھی تو کسی کی بیٹی ہے۔“

”میں بھی تو کسی کی بیٹی تھی“ مجھے اس ڈر بے میں لا کر پہل مل مارنے سے پہلے تم نے یہ سوچا؟“ وہ چادر کا گولہ بنا کر ایک طرف پھینکتی جارحانہ انداز میں اس کی طرف آئی۔ ”تم مرد ہو کر ڈرتے کیوں ہو؟“

”تم پاشا کو نہیں جانتیں۔“
”میں بس اتنا جانتی ہوں کہ اگر میرا بیٹا مر رہا ہے تو اس کا ذمہ دار عبدالرحمن پاشا ہے۔ اگر وہ تمہیں تمہاری مطلوبہ رقم دے دیتا تو ہم کبھی یہ کرنے کا نہ سوچتے۔ کوئی کمی تو نہیں ہے اس کو پیسے کی پھر بھی اس نے ہاتھ روک کر رکھا ہوا ہے۔ اب یا تو تم اس کا خیال کر لو یا اپنے بیٹے کا۔ فیصلہ تمہارا ہے۔“ سلسلی کے نقوش مدھم روشنی میں بگڑے بگڑے دکھائی دے رہے تھے۔ اس وقت یوں تیز تیز بولتی وہ میک بٹھ کی جو تھی جلد کرنی لگ رہی تھی۔
باشم تذبذب سا اسے دیکھے گیا۔ وہ جو کہہ رہی تھی وہ اتنا مشکل تو نہ تھا مگر۔

وہ جہان کے ساتھ سیدھی اس کے گھر آئی تھی پھر کھانا کھا کر اس نے اجازت چاہی۔ اس کا سارا سامان سبائی کے دُورم میں رکھا تھا اور جس افزائش میں وہ گئی تھی سوائے چند چیزوں کے کچھ بھی نہیں اٹھایا تھا۔ پھپھو نے اصرار بھی کیا کہ وہ چھٹیاں ختم ہونے تک ان کے پاس رک جائے مگر وہ کل آنے کا وعدہ کر کے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”میں تو پھر کہوں گی کہ رک جاؤ۔“ پھپھو ذرا خفا تھیں۔

”پھپھو! میں کل آؤں گی میں پر اس۔ اب چلتی ہوں۔“

”ٹھیک ہے مگر کل ضرور آنا۔“ جہان ٹٹو سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے ڈانٹنگ ٹیبل سے اٹھا۔ اس کی آنکھیں اور ناک گلابی پڑ چکے تھے۔ سرد گرم علاقوں کے مابین سفر کا موسمی اثر تھا کہ استنبول پہنچتے پہنچتے اس کا نگو بخار میں بدل گیا تھا۔

”آؤ میں تمہیں چھوڑ دیتا ہوں۔“
”صرف با قسم تک چھوڑنا۔ آگے سے میں گور سل پکڑ لوں گی۔“

”میں سبائی تک چھوڑ دوں گا“ نوپر اہلم۔“ وہ چابی پکڑے جب تک پہنچتے ہوئے بولا۔

”نہیں اس بخار میں تم سے پینتالیس منٹ کی ڈرائیونگ کروالی تو پینتالیس دن تک تم جلتے رہو گے۔ ویسے بھی مجھ پر تمہارے احسان بہت جمع ہو گئے ہیں اتنے سارے کیسے اتاروں گی؟“ وہ اس کے سامنے سینے پہ بازو لپیٹے کھڑی مسکراتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”اتارنے کے لیے کس نے کہا ہے۔“

وہ ذرا سا مسکرا کر دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ وہ اس کی پشت کو دیکھے گئی۔ وقت گزارنے کے ساتھ ساتھ جہان کا رویہ اس کے ساتھ نرم پڑتا جا رہا تھا۔ پاکستان میں پہلے وہ دن تو وہ لا تعلق رہا شاید اس لیے کہ دونوں کو ٹھیک سے بات کرنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا مگر پھر اس نے خود ہی کچھ محسوس کیا تھا سب ہی وہ خود آگے بڑھا اور ان کے درمیان کھڑی سرد دیوار ڈھادی لیکن کیا وہ اس کے لیے وہ محسوس کرتا تھا جو وہ اس کے لیے کرتی تھی؟ کیا اسے ان کا وہ بھولا بسرا رشتہ یاد تھا جس کے متعلق اس گھر میں کوئی بات نہیں کرتا تھا۔ ابھی کچھ دن وہ اس کے گھر رہے گی تو ان سارے سوالوں کے جواب جاننے کی کوشش ضرور کرے گی۔ اس نے تہہ کر لیا تھا۔

باشم اسکو آڑ کا مجسمہ آزادی اسی طرح تھا جیسے وہ چھوڑ کر گئی تھی۔ مجسمے کے گرد گول چکر میں اگی گھاس

پہ سرخ اور زرد ٹیولپ فیشنل کے پوسٹرز لگے تھے جو ہر سال کی طرح اس موسم بہار میں بھی استنبول میں منعقد ہوتا تھا۔ ٹیولپ کا پھول استنبول کا ”سمبل“ تھا۔ مگر ان کی دل فریب منگ میں ڈوبا باشم اسکو آڑ حیا کو خزاں اکوڑ لگا تھا۔ وہ بار بار وہاں نہیں تھی جیسے ڈی جے نہیں تھی۔

”تم جاری ہو“ حالانکہ میں چاہتا تھا کہ تم کچھ دن ہمارے گھر رہو۔“ گاڑی روکتے ہوئے جہان نے چرو اس کی طرف موڑے سنجیدگی سے کہا تھا۔
”میں کل آجاؤں گی مگر کل تک میں سبائی اپنا دُورم بلاک“ جمیل اور ہر وہ جگہ جہاں میں اور ڈی جے اکٹھے گئے تھے ایک دفعہ پھر دیکھنا چاہتی ہوں۔ اکیلے بالکل اکیلے۔ میں ان بڑے لمحوں کو پھر سے جینا چاہتی ہوں۔“

”مت کرو۔ تمہیں تکلیف ہوگی۔“
”بہت تکلیف سہیلی اب اس سے زیادہ تکلیف مجھے نہیں مل سکتی۔“ اس نے بیگنی آنکھ کا کوٹا انگلی کی نوک سے صاف کرتے ہوئے کہا تھا۔

”اوکے!“ اس نے سمجھ کر سر ہلادیا۔ اس کے چہرے پہ ابھی تک نقاہت تھی۔

جہان چلا گیا اور وہ مجسمہ آزادی کے گرد اگی گھاس کے قریب جا کھڑی ہوئی۔ وہ گھاس کا گول قطعہ اراضی دراصل یوں تھا جیسے کوئی چپڑا کھاکول سا سبز بھول ہو جس کی سبز پتیاں نی ہوں اور جی کے درمیان ایک سیدھی روش تھی جو مجسمے تک لے جاتی تھی۔

باشم کے ہر پھول ہر پتھر اور ہر پتھر پہ جیسے یادیں رقم تھیں۔ وہ اس کا اور ڈی جے کا زیرو پوائنٹ تھا۔ مین اسٹاپ۔ تقریباً ہر دوسرے روز وہ ادھر آتی تھیں۔ گور سل انہیں یہیں جو اتار کر لیتی تھی۔ یہاں سے آگے وہ عموماً میٹرو ٹرین پکڑ لیا کرتی تھیں۔ اس اسکو آڑ کا چپہ چپہ انہیں یاد تھا اور ڈی جے کے بغیر سب کچھ ادھورا تھا۔

اور اس طرف استقلال اسٹریٹ تھی وہاں سے کی گئی ان کی ڈھیروں شاہنگ۔ جو ایٹھ گلی گئی۔ استقلال

اسٹیٹ آف بھی دیکھی تھی، بہت طویل، نہ ختم ہونے والی۔ مگر زندگی ختم ہو گئی تھی۔

گورنر کی کھڑکی کے شیشے کے پار وہ باغوں کا عظیم الشان سمندر دیکھ رہی تھی۔ وہاں سے ایک فیری گزر رہا تھا۔ اسے یاد تھا جب پہلی دفعہ ان دونوں نے اسی جگہ مل بار کرتے ہوئے نیچے فیری تیرتا دیکھا تھا تو وہ تو خوشی اور جوش سے پاگل ہی ہو گئی تھیں۔ وہ کبھی بحری جہاز میں نہیں بیٹھی تھیں اور صرف اسے دیکھ کر ہی وہ رنجوش ہو گئی تھیں پھر فیری وہیں رہ گیا اور زندگی ختم ہو گئی۔

وہ پہلی ٹھنڈی ٹھنڈی دھوپ سبائی کے دروازے پر پھیلی تھی۔ ڈورم بلاکس تقریباً "دیران پڑے" تھے۔ اسپرنگ بریک ابھی ختم نہیں ہوئی تھی اور اسٹوڈنٹس اپنے اپنے ٹورز پر تھے۔ اسے کسی کو اطلاع دینے کا ہوش ہی نہیں تھا مگر پاکستان روانگی والے دن جانے والے کو کسی نے بتایا اور پھر سب کے فون آنے لگے تھے۔ معصوم، حسین، ملی، سارہ، لطیف، انجم، باجی سب اسے برابر فون کرتے رہے تھے مگر وہ سب یقیناً "ابھی" واپس نہیں آئے تھے۔

وہ اپنے ڈورم بلاک کی گول چکر کھاتی بیڑھیاں چڑھنے لگی۔ جب وہ سبائی آئی تھیں تو ان زینوں پر برف جمی ہوئی تھی۔ اب وہ برف ہمارے گئی تھی۔ اس نے گردن اوپر اٹھا کر بالکونی کے بلب کو دیکھا اور پھر اواسی سے مسکرا دی۔ کتنا ڈر گئے تھے وہ اپنے پہلے دن کہ پتا نہیں۔ سال کون سے جن بھوت ہیں۔

"نکلے، ہم وہی پاکستان کے پینڈو۔" ہالے کے یہ بتانے پر کہ یہ نیکناوچی کا کرشمہ تھا، ڈی جے اس کے جانے کے بعد کتنی ہی دیر افسوس کرتی رہی تھی۔ اس نے ڈورم کالاک کھولا۔

مگر اسٹائن پڑا تھا۔ صاف ستھرے بنے ہوئے بستر، میز پر ترتیب سے رکھی چیزیں، ڈی جے کے بینک کی میز البتہ خالی تھی۔ اس کی ساری چیزیں حیات کے بھائی کو پیک کر کے دی گئیں تھیں۔ وہ کھڑکی میں آکھڑی ہوئی اور سلائیڈ کھولی۔

"گنڈ گنڈا۔" اس نے کنا چاہا مگر آواز گلے میں انک گئی۔ آنسوؤں نے اس کا گلا بند کر دیا تھا۔ دور کہیں کسی دوسرے بلاک سے ڈی جے کو جواب دینے والے لڑکے نے اتنے دن کی غیر حاضری پر کچھ تو سوچا ہو گا، مگر شاید وہ خود بھی اسپرنگ بریک ہو۔ اب وہ آئے گا تو اسے کوئی آواز نہیں آئے گی۔ اسے کیا معلوم کہ اب ساری آوازیں ختم ہو گئیں۔

"گنڈا رنگ ڈی جے!" اس نے کھڑکی میں کھڑے بھنگی، بے حد مدھم آواز سے ڈی جے کو پکارا۔ آنسو اس کی پلکوں سے ٹوٹ کر چہرے پر لڑھک رہے تھے۔ جواب نہیں آیا۔ اب جواب بھی نہیں آتا تھا۔ وہ پلیٹ کر اپنے بینک کی طرف آئی اور شانے سے پرس اتار کر اپنی میز پر رکھا، پھر زپ کھول کر اندر سے لکڑی کا وہ چھوٹا سا ڈبا نکالا۔ اس کا جواب بھی اسے ڈھونڈنا تھا۔

"آج حیات تم کب آئیں؟" آواز پر وہ چونک کر پلٹی۔ کھلے دروازے میں معصوم کھڑا تھا، ریلواری سے گزرتے ہوئے اسے دیکھ کر حیرت سے رہا تھا۔ "آج ہی آئی ہوں۔ تم سب واپس آگئے؟" اسے ایک گونا گونا طہانیت کا احساس ہوا۔ وہ ڈبا ہاتھ میں لیے اس کی طرف آگئی۔

"نہیں، وہ سب تو ابھی کونیا میں ہیں۔ مجھے ذرا کام تھا اس کے لیے آیا تھا۔" وہ دانستہ لمحہ بھر کورک "مجھے ابھی تک یقین نہیں آ رہا کہ خدج بے اتا چانک کیسے ہوا؟"

"اللہ کی مرضی تھی معصوم! اکثر کہہ رہا تھا کہ میری ایورزم بچے تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ اچانک سے انسان کو لپھس کر تا ہے اور اچانک مر جاتا ہے۔ بہت کم لوگوں کو چند روز قبل سرور شروع ہوتا ہے ڈی جے کو بھی ہوا تھا مگر اس نے میکرین سمجھ کر نظر انداز کیے رکھا اور پھر پھر سب ختم ہو گیا۔"

"دوستوں کو کھونا بہت تکلیف دہ ہوتا ہے۔ میں سمجھ سکتا ہوں۔" وہ دونوں اسی طرح چوکھنڈہ کھڑے تھے۔

"میں تو تب سے ہی سوچ رہی ہوں معصوم! کہ کیا زندگی اتنی غیر یقینی چیز ہے؟ ایک لمحے پہلے وہ میرے ساتھ تھی اور اگلے لمحے وہ نہیں تھی۔ موسم جی کے شعلے کی طرح بے ثبات زندگی جو ذرا سی پھونک سے بھج جائے۔ لمحے بھر کا کھیل؟"

"یہی اللہ تعالیٰ کا ڈیزائن ہے حیات اور ہمیں اسے قبول کرنا پڑے گا۔ یہ کیا کوئی ریل باکس ہے؟" وہ اس کے کبا تھ میں پکڑے ڈبے کو دیکھ کر ذرا سا چونکا۔

اس نے ناگہی سے ڈبا اس کی طرف بڑھایا۔ "چانٹنے ریل باکس؟ تم نے یہ کہاں سے لیا؟" وہ ڈبا الٹ پلیٹ کر دیکھنے لگا۔

"تس نے دیا ہے مگر میں اسے کھول نہیں پا رہی۔ کیا تم اسے کھول سکتے ہو؟" اس نے پر امید نگاہوں سے معصوم کو دیکھا۔

"میں دیکھتا ہوں، ٹھہرو۔" وہ اس کا اوپر نیچے سے جائزہ لے رہا تھا۔ "یہ قدیم چانٹنے باکس کی طرز پر بنایا گیا ہے۔ اس کے اوپر عموماً کوئی ریل بنا ہوتا ہے جس کو سالو کرنے سے یہ کھلتا ہے یا پھر کوئی پانچ حرفی لفظ لگانے سے۔ ایک منٹ۔" اسے جیسے اچھٹا ہوا۔ "پانچ نہیں، اس پر تو چھ حروف ہیں۔ اس طرح کی چیزوں پر ہمیشہ پانچ حروف ہوتے ہیں، مگر شاید اس کا جواب کوئی خاص لفظ ہو جس پر چھ حروف ہی پورے آتے ہوں۔"

"مگر اب یہ کھلے گا کیسے؟" وہ بے چینی سے بولی۔ "یہ تو جس نے دیا ہے اس کو ہی۔" وہ رکا اور اوپر لکھی سطر پڑھنے لگا۔

"ایک ہی دریا میں کوئی شخص دو دفعہ نہیں اتر سکتا۔ ہوں۔۔۔ حیا! تمہارا واسطہ کسی جینٹلمن سے پڑ گیا ہے۔ یہ ایک پہلی ہے اور اسے حل کرنا ہے۔"

"اور اس نے کہا تھا کہ اسے صرف میں ہی حل کر سکتی ہوں اور اگر اسے توڑا تو یہ میرے کسی کام کا نہیں رہے گا۔"

"یعنی وہ چاہتا ہے کہ تم داغ استعمال کرو۔ ویسے یہ فقرہ "وہ اس سطر پر انگلی پھیرتے ہوئے کچھ سوچ رہا

تھا۔" یہ فقرہ مجھے کچھ سنا سنا لگ رہا ہے۔ شاید۔ شاید۔" وہ جیسے یاد کرنے لگا۔ "اس دن جب ہم جیو انفارمیشن کی کلاس میں لکھ لکھ کر باتیں کر رہے تھے تب شاید پروفیسر نے یہ بولا تھا۔"

"نہیں، مجھے تو ایسا کچھ یاد نہیں۔"

"پتا نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "انسان کی یادداشت چیزوں کو بہت کوریٹ کرتی ہے۔ ہمیں ایک چیز کو دیکھ کر اس سے متعلقہ چیز یاد آ جاتی ہے۔ مجھے بھی اس کو دیکھ کر وہی کلاس یاد آئی۔ خیر! جو بھی ہے، تم فکر نہ کرو، ہم اس کا کوئی حل نکال ہی لیں گے۔ ابھی تو میں کام سے جا رہا ہوں، دیر سے آؤں گا۔ تم دروازہ اچھی طرح لاک کر دینا، آج کل ڈورم بلاک تقریباً "خالی" ہے ٹھیک ہے؟"

اس کے یوں خیال کرنے پر وہ زیر لب مسکرا دی۔ وہ چلا گیا تو اس نے واقعی کراچی طرح لاک کر لیا۔ سبائی اتنی دیر ان تھی کہ اسے انجانا سا خوف محسوس ہو رہا تھا۔ ناقص سے یہاں آنے تک اسے مسلسل محسوس ہوتا رہا کہ کوئی اسے دیکھ رہا ہے۔ کوئی اس کے پیچھے ہے۔ حالانکہ پیچھے مڑ کر دیکھنے پر اسے سب کچھ معمول کے مطابق ہی نظر آتا تھا، مگر کچھ تھا جو اسے بے چین کیے ہوئے تھا۔

رات بہت دیر تک لیٹے لیٹے وہ ریل باکس کو دونوں ہاتھوں میں پکڑے، انگوٹھے سے حروف سبائی کی سلائیڈز اوپر نیچے کرتی رہی۔ اس نے حروف کے کئی جوڑے بنائے مگر وہ مقفل رہا۔ اسے نیند نے کب گھیرا، اسے علم بھی نہیں ہوا۔ ریل باکس اس کے گرد۔ ایک طرف لڑھک گیا۔ وہ اب بھی ویسا ہی تھا۔ سرد، جلد اور مقفل۔



صبح دیر سے انہی۔ ناشتا کر کے رات والے شمن آلود لباس پہ ڈھلا سا سویٹر پہنے، بالوں کو جوڑے میں باندھتی وہ نیچے آگئی۔ اس کا رخ یونیورسٹی میں فوٹو کلب کی طرف تھا۔ وہاں سے اس نے کچھ نوٹس کئی

روز پہلے فوٹو اسٹیٹ کرائے تھے اور انہیں اٹھانے کا موقع ہی نہیں مل سکا تھا۔

صبح کی چمکی مگر ٹھنڈی ہوا سہانگی کے سبز زار پہ بہہ رہی تھی۔ وہ فوٹو کاہنوں کے پاس آئی اپنے نوٹس اٹھانے، سہانگی کے کارڈ سے اوچکی کی اور پھر واپس جانے کے لیے پلٹی ہی تھی کہ اسے ایک میز پر رکھا لاوارث سار جسر آ گیا۔ رجسٹر جانا پچھانا تھا۔ اس نے پہلا صفحہ پلٹا اس پر بڑا بڑا DJ لکھا تھا۔

”او ڈی جے۔“ ایک اداس مسکراہٹ اس کے لبوں کو چھو گئی۔ ڈی جے کا نسیان۔ وہ ہمیشہ اپنا رجسٹر فوٹو کاہنوں پر چھوڑ جایا کرتی تھی۔ اس نے رجسٹر اٹھالیا۔ وہ اب اس کا تھا۔ بلی چیمز تو وہ ڈی جے کی فیکلٹی کو دے چکی تھی مگر اس کی ایک یادگار سنبھالنے کا حق تو اسے بھی تھا۔

وہ باہر آگئی اور گھاس پر بیٹھ کر ڈی جے کے رجسٹر کے صفحے پلٹنے لگی۔ وہ اس گارف رجسٹر تھا جسے وہ زیادہ تر لکھ لکھ کے باتیں کرنے کے لیے استعمال کرتی تھی اور ایسی باتیں عموماً وہ آخری صفحے پر ہی کیا کرتی تھیں۔ اس نے آخری صفحہ پلٹا تو دھیرے سے مسکرا دی۔

اس روز جیو انفارمیشن سسٹم کی کلاس میں ان کی اور فلسطینیوں کی اسپرنگ بریک کی پلاننگ اس پر لکھی تھی۔ وہ بہت محبت سے ڈی جے کے لکھے الفاظ پر انگلی پھیرتی انہیں پڑھ رہی تھی جب ایک دم وہ رک گئی۔ رجسٹر کے اس آخری صفحے کے اوپر بڑا بڑا کر کے ڈی جے کی لکھائی میں لکھا تھا۔

Into the same river no man can enter twice - Heraclitus 535-475.b.c

(ایک سی دریا میں کوئی شخص دو دفعہ نہیں اتر سکتا) ہراقلیطس ۵۳۵-۴۷۵ قبل مسیح

وہ بالکل شل سی سانس روکے، تھیر سے اس سطر کو دیکھ رہی تھی۔ کیا یہ پزل باکس اسے ڈی جے نے بھیجا تھا؟

”جب تک آپ اسے کھول پائیں گی وہ شاید اس دنیا میں نہ رہے۔“

وہ رجسٹر کے ایک دم سے اٹھ کر ڈورم کی طرف بھاگی۔ اسے مقصم کو ڈھونڈنا تھا۔

”ہراقلیطس۔ یونانی فلسفی۔ یاد آگیا۔“ مقصم نے وہ سطر دیکھتے ہوئے بے اختیار ماتھے کو چھوا۔ ”یہ ہراقلیطس کا ایک قول ہے جیسے تم اس کے دوسرے اقوال سے ہوں گے مثلاً۔“ ”وہ یاد کر کے بتانے لگا۔“ ”کتے اسی پر بھونکتے ہیں جسے وہ نہیں جانتے ہوئے یا انسان کا کردار اس کی تقدیر ہوتا ہے۔“ وہ انگریزی کے چند مشہور اقوال بتا رہا تھا۔

”ہاں بالکل۔“ ”جیانی ثابت میں سرہلایا۔ اس نے اس میں سے کوئی بھی قول نہیں سن رکھا تھا۔“

”تو ثابت ہوا کہ ہم اس پزل کے ٹھیک راستے پر چل نکلے ہیں۔ اور اس راستے پر اس شخص نے یقیناً بڑی کمر بیز کرائے ہوں گے اب ہمیں ایک ایک کر کے پنسل اور گرنٹل کے ان بڑی کمر بیز کو چھنا ہے۔“

”شش!“ ”دور بیٹھی لائبریرین نے کتاب سے سر اٹھا کر عینک کے پیچھے سے ان کو ناگواری سے ٹوکا۔ وہ دونوں اس وقت لائبریری میں آنے سے پہلے بیٹھے تھے۔“ ”سوری میم! جیانی نے گرنٹل کو ایک معذرت خواہانہ مسکراہٹ ان کی طرف اچھالی اور واپس پلٹی۔“

”اچھا اب کیا کرنا ہے؟“ ”وہ بھی سرگوشی میں پوچھ رہی تھی۔“ ”اگر اس نے ہراقلیطس کا ایک قول ڈبے کے اوپر لکھا ہے تو یقیناً اس کے لوڈورڈ کا تعلق اسی قول ہو گا۔“

”یا پھر شاید ہراقلیدس کی ذات سے۔ ٹھہرو! میں ایک منٹ آیا۔“ وہ اٹھا اور چند لمحوں بعد جب وہ واپس آیا تو اس نے دونوں ہاتھوں میں مولی مولی چند کتابیں اوپر نیچے پکڑ رکھی تھیں۔

”یہ رہا ہراقلیدس کا اعمال نامہ۔“ اس نے دھپ

کی آواز کے ساتھ کتابیں میز پر رکھیں۔ لائبریرین نے چہواٹھا کر اسے تھملا کر دیکھا۔

”سوس۔ ری!“ وہ دونوں ہاتھ اٹھا کر کتا واپس کرسی پر بیٹھا۔

”میں لاع کی اسٹوڈنٹ ہو کر فلاسفی کی یہ اتنی وزنی کتابیں پڑھوں؟ یہ مجھ سے یہ نہیں ہو گا۔ میں ہراقلیطس کو گوگل کرتی ہوں۔ لیپ ٹاپ اوپر دکھاؤ۔“ اس نے ساتھ رکھے مقصم کے لیپ ٹاپ کا رخ اپنی طرف گھمایا اور کی پیز پر انگلیاں رکھیں۔

”آف!“ ”جب اتنے ڈھیر سارے نتیجے کھلے تو وہ بے زاری ہو گئی۔ اسے جلدی سے کوئی جواب چاہیے تھا اور بس جلدی سے وہ باکس کھولنا تھا۔ اتنے لمبے لمبے ڈاکو منٹس پڑھنے کا حوصلہ اس میں نہیں تھا۔“

”اوہ لاؤ!“ میں پڑھ کر تمہیں مین یونائنٹس بتاتا ہوں۔“ اس کی کوفت دیکھ کر مقصم نے لیپ ٹاپ اپنی طرف گھمایا اور پھر اسکرین پر نگاہیں دوڑاتے ہوئے پڑھنے لگا۔

”ہوں۔ اچھا۔ ہراقلیطس کا تعلق ایشیا مینز سے تھا۔ خاصا بد مزاج فلاسفر تھا۔ اپنے علاقے میں چیف پریسٹ بھی رہا ہے اور بہت خاندانی بھی تھا۔ بڑے بڑے فلسفیوں کو خاصی تعارت سے دیکھا کرتا تھا۔ اس کے خیال میں لہنا غورٹ ہو مر کو بھرے چوک میں لے جا کر درتے مارنے چاہئیں اور Hesoid اتنا جاہل ہے کہ اسے دن اور رات کا فرق نہیں پتا۔ ہراقلیطس کے مشہور اقوال یہ ہیں۔۔۔

”گدھے سونے پر گھاس کو ترجیح دیتے ہیں، کتے ہر اس شخص پر بھونکتے ہیں جسے وہ نہیں جانتے۔ اور۔“ ”بس کرو مقصم! اور نہ میں پاگل ہو جاؤں گی!“ اس نے جھنجھلا کر لیپ ٹاپ کی اسکرین ہاتھ سے دبا کر فولڈ کر دی۔ مقصم ہنس دیا پھر اپنا موبائل نکالا۔

”لطیف رات کو آگیا تھا۔ اس کا ایک سائیڈ کورس فلاسفی ہے اس کو پڑھنا ہوں۔“

لطیف کو اوپر آنے اور اس کو ساری بات سمجھانے میں پندرہ منٹ لگ گئے۔ اب وہ مقصم کے ساتھ والی

نشست پر بیٹھا سوچتے ہوئے اس پزل باکس کو دیکھ رہا تھا۔ وہ کشتیوں لگ اور خالصتاً ”ڈیج ٹاگر افغانستان میں پیدائش کے وقت اس کے ماں باپ نے اپنے کسی افغانی دوست لطیف کے نام پر اس کا نام رکھا تھا اور چونکہ اس کو پہلی خوراک ایک مسلمان نرس نے دی تھی سو لطیف ذہنی اور اخلاقی طور پر ان فلسطینی لڑکوں جیسا ہی لگتا تھا۔

”میں تو ہراقلیطس نامہ سن کر تنگ آگئی ہوں اور اس کے یہ کتوں گدھوں اور۔“ ”جیانی باکس کی طرف اشارہ کیا۔“ ”دریاؤں والے اقوال میری سمجھ سے تو باہر ہیں۔“

”ایک منٹ!“ ”لطیف ذرا چونکا۔“ ”کتوں اور گدھوں والے اس کے اقوال ہوں گے مگر یہ دریا والا صرف اس کا قول نہیں بلکہ اس کی مشہور زمانہ فلاسفی ہے۔ Flux فلاسفی تم نے سن تو رکھی ہو گی؟“

”میں ہراقلیطس کا نام آج پہلی دفعہ سن رہی ہوں گجاکہ اس کی فلاسفی۔“

”اور نہ۔ تم نے بلکہ ہر کسی نے یہ فلاسفی سن رکھی ہے۔ یہ محاورہ تو تم جانتی ہو تاکہ پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی گزر چکا ہے؟“

”ہاں!“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ لطیف آگے ہو کر بتانے لگا۔

”یہ محاورہ دراصل ہراقلیطس کی اسی فلاسفی کا نچوڑ ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کوئی بھی شخص ایک ہی دریا میں دو دفعہ نہیں اتر سکتا۔ یعنی کہ جب انسان ایک دفعہ پانی میں قدم رکھ کر نکلتا ہے تو وہ پانی آگے بہہ جاتا ہے پانی اور انسان دونوں ہر لمحہ تبدیل ہوتے ہیں۔ وہ دوبارہ جغرافیائی لحاظ سے تو اسی دریا میں قدم رکھتا ہے مگر نہ وہ خود وہی پہلے والا انسان ہوتا ہے اور نہ وہ دریا پہلے والا ہوتا ہے۔ سمجھ آئی؟“

”ہاں!“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ اسے قطعاً سمجھ نہیں آئی تھی۔

”نہیں، تمہیں سمجھ نہیں آئی۔ کھو!“ ”جب استنبول میں پہلے دن تم نے باسفورس کا سمندر دیکھا تھا“

تب وہ سمندر نہیں تھا جو تم نے دیکھا۔ اب نہ تمہو ہو اور نہ سمندر وہی ہے۔ ہر چیز لمحہ بہ لمحہ بدل جاتی ہے ہر اقلیطس کی فلاسفی آف چیچنگ!“

”فلاسفی آف چیچنگ!“ حیا نے اذیت میں سر ہلاتے باکس اٹھایا۔ ”اور تمہیں پتا ہے چیچنگ میں پورے چھ حروف ہوتے ہیں۔“

”اور ہاں!“ مقسم نے ذرا جوش سے ڈسک پہ ہاتھ مارا۔

اور حوا و مرثیہ بلز پہ پڑھتے چند طلبا نے سر اٹھا کر دیکھا۔

”لاسٹ ٹائم!“ چیچنگ اسٹوڈنٹس! ”گلابرین نے کڑی نگاہوں سے اسے دیکھتے انگلی اٹھا کر وارننگ کی۔ مقسم نے فوراً ”سر جھکا دیا۔“

وہ دیے دے جوش سے حروف کی سلائیڈ ز اوپر نیچے کر رہی تھی یہاں تک کہ اس نے پورا لفظ چیچنگ لکھ لیا۔

”اب یہ کھل جائے گا۔“

مگر پزل باکس جامد رہا۔

”اس کا مطلب ہے کہ کوڈ کچھ اور ہے اور وہ کچھ ایسا ہے جسے صرف تم کھول سکتی ہو۔ کچھ ایسا جو صرف تمہیں ہی معلوم ہو گا۔“

”حیا! تم ہر اقلیطس کی مینا فزکس میں تو انٹرنلڈ نہیں ہو؟“ لطیف کچھ سوچ کر کہنے لگا۔

”فی الحال تو میں صرف ٹائم تقسیم جانے میں انٹرنلڈ ہوں۔ میرا خیال ہے میں تیار ہو جاؤں۔“ وہ ہار مانتے ہوئے باکس کیے اٹھ گئی۔

”ہم نے بھی ٹائم تقسیم جانا ہے اور ابھی گورسل ٹکٹے میں ڈیڑھ گھنٹہ تو ہے۔ تم تیار ہو جاؤ تو اکٹھے چلتے ہیں۔“

کڑی کا وہ پزل باکس اس نے اپنے ڈورم کے لاکر میں رکھا پھر اپنے کپڑے کھنگالنے لگی۔ جس افراتفری میں گئی تھی یہ یاد کماں تھا کہ لائبریری کو کپڑے نہیں دیے۔ اس وقت جو ایک واحد استری شدہ جوڑا میسر نہ تھا وہ اس کا سیاہ فرائگ تھا جس کی اوپری پٹی سنہری

سکوں سے بھری تھی۔ وہی جو وہ جہان کے استقلال اسٹریٹ میں دیے جانے والے ڈنر پہن کر گئی تھی۔ فی الحال وہ پچھو سے پہلے اپنی ان میزبان آئی کے گھر جا رہی تھی جنہوں نے پہلے روز ان کا کھانا کیا تھا۔ چونکہ وہ ایک طرح سے ڈی جے کے لیے ہی جا رہی تھی سو یہ کام والا فراک مناسب نہ تھا، لیکن وہ اوپر سیاہ کوٹ پہن لے گی تو کام چھپ جائے گا اور نیچے سے تو فراک سادہ ہی تھا اس نے لباس بدل کر بال کچھو میں باندھے پھر اپنے سنہری کلچ میں پاکستانی مسلم سا موبائل ڈالا۔ کلچ چھوٹا سا تھا اس میں ترک بھدا فون پورا نہیں آتا تھا، سو اس نے ترک فون کوٹ کی جیب میں رکھ دیا اور کلچ کی زنجیر کو ایک کندھے سے گزار کر دوسرے پہلو میں ڈال کر بڑی پن کے ساتھ فراک کی بیلٹ سے بٹھی کر دیا۔ سنہری سکوں کے کام میں سنہری ستاروں والا پرس بالکل چھپ سا گیا تھا۔ کم از کم اب کوئی اس کا پرس نہیں تو نہیں سکتا تھا۔

مسز عبداللہ کا پتا اس کے پاس تھا۔ بالے سے ان کا نمبر لے کر ان کو فون بھی کر دیا تھا۔ جب سے وہ ترکی آئی تھی ان کے گھر پلٹ کر نہیں گئی۔ اب اسے لازمی جانا چاہیے تھا۔

گورسل میں وہ درمیانی راستے والی نشست پہ بیٹھی تھی۔ راستے کے اس طرف مقسم اور اس کے ساتھ لطیف بیٹھا تھا۔ حیا کے بائیں طرف کھڑکی کے ساتھ والی نشست پہ ایک ترک لڑکی موجود تھی۔

”تمہارا فلوئڈا فلسطین کب پہنچے گا مقسم!“ وہ سیاہ کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالنے بیٹھی گردن موڑ کر اس سے مخاطب تھی۔

”جون میں پہنچ جائے گا۔“

”اسرائیلی اسے داخل تو ہونے دیں گے نا؟“

”امید تو ہے کیونکہ یہ فلوئڈا ترکی کا ہے اور اس میں بہت سے ممالک کے وفد ہیں۔“ جواب لطیف نے دیا تھا۔

”اور اگر اسرائیلیوں نے ایسا نہ ہونے دیا تو؟ آخری اسرائیل سے کسی بھی چیز کی توقع کی جاسکتی ہے۔“

”تو پھر یہ یاد رکھنا کہ جتنے بنی اسرائیل وہ ہیں اتنے ہم بھی ہیں۔ وہ سامنے دیکھو! وہ اسرائیلی ایجینسی ہے! مقسم کے اشارے پہ ان دونوں نے گردنیں اوچی کر کے دیگر اسکرین کے پار دیکھا، جہاں ایک جھنڈے والی عمارت دکھائی دے رہی تھی۔

”اگر فلوئڈا غزہ نہ پہنچا تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ یہ ایجینسی استنبول میں دوبارہ نظر نہیں آئے گی۔“

”میں تمہارے ساتھ ہوں۔“ لطیف نے اس کے شانے پہ ہاتھ رکھا۔

”سی ٹو!“ حیا نے فوراً کہا۔

”سی تھری!“ ساتھ بیٹھی ترک لڑکی نے فوراً انگلی اوپر کی۔ وہ بے اختیار ہنس دی۔

”ویسے مقسم! بلی کو اغوا کرنا زیادہ مناسب رہے گا نہیں؟“ لطیف کی بات پہ وہ سب ہنس پڑے تھے۔ اسے یاد تھا ڈی جے کو ان کی ٹالی سے دوستی کتنی بری لگتی تھی۔

ٹائم اسکوائر پہ مغرب اتر رہی تھی اور ہر طرف اندھیرا سا چھا رہا تھا۔ اسکوائر کی بتیاں ایک ایک کر کے جلنے لگی تھیں۔

”تم نے جدھر جانا ہے ہم تمہیں چھوڑ دیتے ہیں۔ اگلی مت جاؤ۔“ وہ دونوں بس سے اتر کر اس کے لیے رکے کھڑے تھے۔

”ترکوں کے ساتھ وہ کر تم بھی ترک بن گئے ہو۔ ان پر خلوص ترکوں سے راستہ پوچھو تو منزل تک پہنچا کر آتے ہیں۔“

”لہذا! آپ کو پتا ہونا چاہیے کہ ان پر خلوص ترکوں کے اس ملک میں ہر سال تقریباً پانچ مولزکیاں اغوا کر کے آگے بچ دی جاتی ہیں اور یہ ترکی کا سب سے منافع بخش کاروبار ہے۔“

”چھا اب ڈراؤ تو مت مجھے تھوڑی دور ہی جانا ہے۔“ وہ تینوں سڑک کے کنارے ساتھ ساتھ ہی چلنے لگے تھے۔

”تم اپنی آئی کے گھر جا رہی ہو؟“

”ہاں مگر مجھے ابھی اپنی ہوسٹ آئی کے گھر بھی جانا

ہے۔ کچھ دن بعد جب میں واپس آؤں گی تو اس پزل باکس کا حل ڈھونڈیں گے۔“

وہ تینوں باتیں کرتے ہوئے ٹھنڈی ہوا میں ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ مجسمہ آزادی ان کے پیچھے رہ گیا تھا۔



لاؤنج میں سوگوارت سی چھائی تھی۔ مسز عبداللہ اور ان کی سرخ بالوں والی بیٹی مرمیوم سی سامنے صوفوں پہ بیٹھی تھیں۔ حیا کے صوفے سے ذرا دور کارپٹ پہ مہر کی بیٹی عروہ کشن کا سہارا لیے نیم دراز رہیموٹ پکڑے لیوی پہ کارٹون دیکھ رہی تھی۔

”آپ کو پتا ہے ہم دونوں ہر ہفتے آپ کی طرف جکر لگانے کا پلان بناتے تھے مگر ہر دفعہ کچھ نہ کچھ روک لیتا اور اب اس نے تاسف سے سر جھکا۔“

”تم مجھے اسی روز بتا دیتیں تو کم از کم میں اسے دیکھ ہی لیتی پھر کلیئرٹس میں تمہاری مدد ہی کروا دیتی۔ تم کتنی پریشان رہی ہو گی!“

”مجھے تو اپنی آئی کو بتانے کا بھی ہوش نہیں تھا ایسا اچانک دھچکا لگا تھا کہ۔“ اس نے فقرہ اور حوا چھوڑا اور سر جھکا کر انگلی کی نوک سے آنکھ کا کنارہ پونچھا۔ مہر نے بہت فکر مندی سے اسے دیکھا۔

”تم بہت کمزور ہو گی ہو پہلے سے حیا! اور تمہاری رنگت بھی کم ہلا گئی ہے۔“

”بس۔ بخار ہو گیا تھا اور پھر سفر کی ٹکان!“ وہ اواسی سے مسکرائی۔ وہ واقعی بہت پڑمرہ اور تھکی تھکی سی لگ رہی تھی۔

”میں ذرا کھانے کا کچھ کر لوں۔“ مسز عبداللہ انہیں تو وہ بے اختیار کہہ اٹھی۔

”کھانا پچھو کی طرف ہے۔ میں بس چائے پیوں گی۔“

”پھر مجھے صرف دس منٹ دو۔“ وہ عجلت سے کہتی کچن کی جانب بڑھ گئیں۔ مہر بھی ان کے پیچھے جانے کے لیے اٹھی پھر عروہ کو دیکھا۔

”عروہ! تم حیا کو کمپنی دو اور فادر گاڈ سیک! حب کوئی مہمان آتا ہے تو لی وی نہیں دیکھتے۔“ اس نے جاتے جاتے خفگی سے بچی کو گھورا۔ عروہ گڑبڑا کر سیدھی ہوئی اور مڑ کر حیا کو دیکھا پھر سڑکی سے مسکرائی۔

”کوئی بات نہیں۔ تم بے شک کارٹون دیکھ لو۔ میں بور نہیں ہوں گی۔ ویسے کون سا کارٹون ہے یہ؟“ اسے کارٹون ذرا شناسا لگے تو آنکھیں سکیڑ کر اسکرین کو دیکھنے لگی۔

”کیشن ہلنٹ۔ آپ نے دیکھے ہیں کبھی؟“ عروہ دے بے خوش سے بتائی سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ ”ارے! یہ کیشن ہلنٹ ہیں؟ میرے فیورٹ!“ وہ ایک دم خوشی سے کتے صوفے کے نشست پہ آگے کو ہوئی۔

”مجھے یہ بہت پسند ہیں اور لہذا تو بہت ہی زیادہ ... عروہ! میری تو جان کھی کیشن ہلنٹ میں۔ میں بچپن سے ہی ان کی بہت جنونی فین رہی ہوں۔ جب یہ سارے ہلنٹس اپنی اپنی انگوٹھیاں فضا میں بلند کر کے فائر آرتھ ڈیڈ ڈائر چلاتے تھے تو میرے اندر اتنی انرجی بھر جاتی کہ مجھے لگتا میں ابھی اڑنے لگوں گی۔“

وہ چھوٹے بچوں سے کبھی بھی اتنی بے تکلف نہیں ہو پاتی تھی مگر یہاں معاملہ کیشن ہلنٹ کا تھا۔ ”پھر میرے ابا نے مجھے سمجھایا کہ آگ مٹی ہو اور پانی ہمارے اس سہارے کو بنانے والے چار ایلیمینٹس ہیں۔ تب پہلی دفعہ مجھے ان چار یونانی عناصر کا پتا چلا تھا۔“

”ہاں مجھے پتا ہے۔ ماما نے مجھے بتایا تھا کہ یہ یونانی عناصر ہیں۔“ ”مجھے بھی تب ہی ابا نے بتایا تھا کہ کس طرح یونانی فلسفیوں نے یہ چار عناصر باری باری پیش۔“ وہ کہتے کہتے ایک دم رکی۔ لمحے بھر کو اس کے اندر باہر بالکل شام چھا گیا۔

”یونانی عناصر!“ اس نے بے یقینی سے زیر لب دہرایا۔ اسے یاد تھا یہ عناصر یونانی فلسفیوں نے پیش

کیے تھے۔ کسی نے کہا دنیا پانی سے بنی ہے، کسی نے کہا ہوا سے۔ اور وہ ہر عنصر اس فلسفی کی پہچان بن گیا۔ ”ہر اقلیطس کا عنصر کون سا تھا؟“ وہ خود سے پوچھتی جیسے چونک اٹھی۔ عروہ خطرنگا ہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”عروہ! مجھے نیٹ چاہیے، ابھی اسی وقت! وہ بے چینی سے بولی تو عروہ سر ہلا کر اٹھی اور صوفے پر سے ایک آئی پوڈ اٹھا کر اسے دیا۔

”یہ مٹی کا آئی پوڈ لے لیں۔“ ”تھنکس!“ اس نے آئی پوڈ پکڑ کر اس کا گھل تھپتھپایا اور جلدی جلدی کو گل کھولنے لگی۔ ”تقریباً“ آدھ گھنٹے بعد جب وہ ان کو خدا حافظ کر کے باہر آئی تو سڑک کے کنارے چلتے ہوئے اس نے کوٹ کی جیب سے اپنا ترک فون نکالا اور تیزی سے مقسم کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔

”حیا! خیریت؟“ وہ فون اٹھاتے ہی ذرا فکر مندی سے بولا تھا۔ ”مقسم! تمہیں پتا ہے یونانی فلسفیوں نے زمین کی تخلیق کی وضاحت کرنے کے لیے کچھ عناصر پیش کیے تھے کہ زمین ان سے مل کر بنی ہے؟“ چند لمحے کی خاموشی کے بعد وہ آہستہ سے بولا۔

”حیا! میرے خیال سے تم ذرا تھک گئی ہو، تھوڑا سا ریس کر لو اس کے بعد تم نارمل ہو جاؤ گی۔“

”مقسم!“ اس نے جھنجھلا کر زور سے کہا۔ ”میں سنجیدہ ہوں۔ میری بات سنو! ہم خواجواہ اس نیپاگل آدمی کی سوانح عمری پڑھ رہے تھے ہمیں اس کی فلاسفی چاہیے تھی۔ اس دور کے ہر فلسفی نے اپنا ایک عنصر پیش کیا تھا اور اس کے خیال میں زمین کی ہر چیز اس عنصر سے بنی تھی۔ کسی نے کہا وہ پانی ہے، کسی نے کہا ہوا، اور یوں ان چاروں بلکہ پانچوں عناصر کی فہرست مرتب ہوئی تھی۔ ہر اقلیطس کا عنصر ”آگ“ تھا اور یہی اس کی پہچان تھا۔“

”فائر؟“ ”ہاں فائر ہر اقلیطس کی دائمی آگ۔ اس نے آگ

کی بنیاد پر اپنی فلاسفی آف چیئنج پیش کی تھی۔ مقسم مقسم! انسان ایک دریا میں دو دفعہ کیوں نہیں اتر سکتا؟ کیونکہ انسان اور دریا دونوں ہر اقلیطس کے خیال میں آگ سے بنے تھے اور دنیا میں سب سے زیادہ تبدیل ہونے والی چیز آگ ہے جو ہر لمحہ بدلتی ہے۔ اور جو ہر چیز کو بدل دیتی ہے۔ اس پرل باکس پہ لکھی بات ایک ہی لفظ کی طرف اشارہ کر رہی ہے جو ہے ”فائر۔“ وہ کالونی کے سرے پہ کھڑے ہو کر فون پہ کہہ رہی تھی۔ رات گہری ہو رہی تھی اور اسٹریٹ پوٹر جل اٹھے تھے۔

”مگر حیا! فائر میں تو چار حروف ہوتے ہیں۔ یہ کوڈ کیسے ہو سکتا ہے؟“ ”یہ کوڈ ہے بھی نہیں۔ اس کا مطلب ہے آگ، اصلی والی آگ، ٹیلا کالائزر، اسرائیلی آگ، یاد ہے تمہیں؟“

”وہ مائی!“ اسے ایک لمحہ لگا تھا سمجھنے میں۔ ”تمہارا مطلب ہے کہ اس نے آگ کی طرف اشارہ کیا ہے کیونکہ۔ کیونکہ اس خط کی طرح اس باکس پر بھی کچھ لکھا ہو گا۔“

”جو صرف آج دکھانے سے ظاہر ہو گا۔“ اس نے مسکرا کر کہتے ہوئے اس کی بات مکمل کی۔ ”خیریت ہے، یہ خیال مجھے کیوں نہیں آیا؟“ ”کیونکہ تم کالی تھک گئے ہو، ذرا آرام کر لو، پھر تم ٹھیک ہو جاؤ گے۔“

وہ جواباً ”ہنس دیا تھا۔“ ”پہلو پھر تم رات کو واپس آؤ گی تو اس باکس کو کھولیں گے۔“

”نہیں میں آج رات واپس نہیں آؤں گی۔ میں آنٹی کی طرف رکوں گی۔“

”تمہاری اپنی یا پھر وہ ہوسٹ آنٹی؟“ ”میں۔“ ”تقریباً اس کے لبوں میں رہ گیا۔ کسی نے اس کے گلے لگا فون زور سے کھینچا تھا۔ اسے مڑنے یا چیخنے کا موقع بھی نہیں مل سکا۔ کسی نے اس کے منہ پہ ہاتھ رکھا اور کوئی سوئی کی نوک تھی جو اس کی گردن کے

آس پاس کہیں کہیں تھی۔ لمحے بھر کا عمل تھا۔ اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرے بادل چھانے لگے۔ وہ چیخا چاہتی تھی۔ دل دماغ کے سن ہونے سے قبل جو آخری بات اس نے سوچی تھی وہ یہ تھی کہ کوئی اسے پیچھے کی طرف کھیٹ رہا تھا۔ اور پھر۔ ہر طرف اندھیرا تھا۔



اس نے دھیرے سے آنکھیں کھولیں۔ بدقت پلکیں اوپر کو اٹھی تھیں ان پہ جیسے بہت بوجھ سا تھا۔ ہر سواند حیرا تھا۔ گھبراہٹ اندھیرا ایسے پڑی تھی کہ گرد و بار سے لگی تھی اور گھٹنے سینے سے۔ جیسے ایک بہت تنگ و تاریک جگہ پر بہت سے سامان کے اندر کہیں پھنسی بیٹھی تھی۔

اس نے آنکھیں چند ایک بار جھپکائیں۔ منظر ویسا ہی رہا۔ اندھیرا تاریکی بس اتنا احساس ہوا کہ وہ کسی تنگ سے کمرے میں ہے، جہاں اس کے دونوں اطراف دھندلی چیزیں رکھی ہیں۔

اس نے کمینوں کے تل ذرا سا اٹھنا چاہا تو دائیں ہاتھ میں کھینچاؤ تھا۔ اس نے ہاتھ کھینچا ذرا سا لوہا نکھنکا۔ اس کی دائیں کلائی میں ہتھکڑی ڈلی تھی اور وہ دیوار سے بندھی تھی۔ اس نے زور سے کلائی کو جھٹکا مگر بے سود۔

اس کے سر اور کمر میں بے تحاشا درد ہو رہا تھا جیسے کوئی چوٹ لگی ہو۔ بمشکل وہ اپنے آپ پہ قابو پاتے ہوئے دوسرے ہاتھ کے سہارے ذرا سی سیدھی ہو کر بیٹھی۔ بائیں جانب کوئی بوجھ سا اس کے اوپر گرنے لگا۔ اس نے آزاد ہاتھ سے اسے برے دھکیلا تو وہ نرم سا بوجھ دو سری جانب ذرا سا لڑجک گیا۔

حیا نے گردن موڑی۔ سوڑکی ایک ٹیس بے اختیار اٹھی۔ اس کے لبوں سے کراہ نکلی۔ پیچھے دیوار لکڑی کے پھٹوں سے بنی تھی اور پھٹوں میں باریک سی درزیں تھیں۔ اب ذرا آنکھیں اندھیرے کی عادی ہوئیں تو اسے نظر آیا۔ ان درزیوں سے رات کی تاریکی

میں زردی روشنی جھانک رہی تھی۔ وہ بدقت چہرہ اس درز کے قریب لائی اور آنکھیں سکیڑ کر جھانکا۔

باہر ہر سو سمندر تھا۔ سیاہ پانی جو رات کے اس سپر زرد روشنیوں میں چمک رہا تھا۔ پل کی روشنیاں پہلے وہ پل ہی تھا۔ وہ باسنورس کے سمندر پہ بنے اس پل کے آس پاس ہی نہیں تھی۔ مگر وہ باسنورس برج نہیں تھا، وہ ذرا مختلف لگ رہا تھا یا شاید وہ ٹھیک سے دیکھ نہیں پا رہی تھی۔

بائیں طرف موجود بوجھ پھر سے اس پہ لڑھکنے لگا۔ اس نے کوفت سے اسے برے دھکیلا تو اس کا ہاتھ نم ہو گیا۔ وہ نم ہاتھ چہرے کے قریب لائی اور دور سے آتی روشنی میں دیکھنا چاہا۔ اسے نمی کا رنگ تو نظر نہیں آیا مگر وہ خون تھا۔

وہ متوحش سی ہو کر ہاتھ اپنے کپڑوں سے رگڑنے لگی۔ اس کا کوٹ اس کے جسم پہ نہیں تھا۔ جو واحد خیال اسے اس وقت آ رہا تھا۔ وہ بہت تکلیف دہ تھا۔ اسے عبدالرحمن پاشا نے اغوا کروالیا تھا۔

نور نور سے وہ اپنا ہاتھ سنہری سکوں سے رگڑ رہی تھی جب اس کی انگلیاں ذرا بھاری سی چیز سے ٹکرائیں۔ وہ ٹھہر گئی اور اسے ٹٹولا۔

اس کا چھوٹا سنہری کلچ جو فراک کی بیلٹ کے ساتھ نتسی تھا۔ اس کے سر میں درد سے ٹیس اٹھ رہی تھیں۔ ذہن میں اپنی اور پھپھو کی آخری گفتگو گونج رہی تھی۔ اس نے شام میں انہیں یقین دلایا تھا کہ رات کھانے پر وہ ان کے ساتھ ہوگی۔ اب جانے کون سادقت تھا، پھپھو نے اس کا انتظار کیا ہوگا اور اسے نہ پا کر کیا ان کے ذہن میں آیا ہوگا کہ وہ اغوا ہو گئی ہے؟

اس نے اپنے آزد ہاتھ سے کلچ کھولا۔ اندر اس کا پتلا سا پاکستانی موبائل رکھا تھا۔ انہوں نے اس کا فون کیوں نہیں لیا، وہ سمجھ گئی تھی۔ اس کا ترک فون کھینچ کر انہوں نے سمجھا ہوگا کہ وہ اسے رابطے کے ہر ذریعے سے محروم کر چکے ہیں اور فراک کے ساتھ نتسی کلچ پہ ہم رنگ ہونے کے باعث کسی نے غور

نہیں کیا ہوگا۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ اس کے پاس دو فون تھے۔ مگر عبدالرحمن پاشا کو تو معلوم تھا لیکن۔

اس نے اسکرین کو چھوا تو وہ روشن ہو گئی۔ بند کمرے میں مدھم سی سفید روشنی جل اٹھی۔ اس موبائل میں مہوش کی مندی کے روز ہی اس نے بیلنس ڈلوایا تھا اور یہ پاکستانی نمبر تھا جس کی رودنگ آت تھی۔ معلوم نہیں کتنے مہینے تھے ایک کل کے تو ہوں گے۔ اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ بیلنس چیک کیا۔ اس میں اتنے ہی روپے تھے کہ وہ ترکی کے کسی نمبر پہ تیس سیکنڈ کی کل کر سکتی بس۔ اتنی سی دیر میں بھی وہ جہان کو اپنی صورت حال سمجھا سکتی تھی۔

وہ جلدی جلدی فون بک نیچے کرنے لگی۔ ”جے“ میں جہان کا نمبر نہیں تھا اس نے ”سی“ میں دیکھا۔ وہاں بھی نہیں تھا۔ وہ ذرا حیرت سے سین پھپھو کا تلاش کرنے لگی۔ ان کا نمبر بھی غائب۔ بس پاکستانی نمبر تھے۔

”کیوں؟“ اس نے دیکھتے سر کے ساتھ سوچنا چاہا اور تب ایک جھماکے سے اسے یاد آیا۔ یہ پاکستانی موبائل تھا اور ترکی کے سارے نمبر اس نے اپنے ترک فون میں محفوظ کر رکھے تھے۔ اب وہ گھر فون کر کے اپنے اغوا کا نہیں بتا سکتی تھی اور نہ اتنا بیلنس تھا کہ وہ انہیں فون کر کے جہان کا نمبر لیتی۔ تیس سیکنڈ کی کل اسے ضائع نہیں کر سکتی تھی۔

اس نے آنکھیں بند کر کے سردیوار سے لگا دیا۔ وہ سوچنا چاہتی تھی، فرار کا کوئی رستہ، مدد کی کوئی صورت، اور تب ہی اس نے لکڑی کی اس دیوار کے پار وہ آوازیں سنیں۔ علی میں تیز تیز بولتا ایک آدمی جیسے دور سے چلتا ہوا اسی طرف آ رہا تھا۔

”پاشا تمہیں جان سے مار دے گا اگر اسے علم ہوا کہ تم اس کی لڑکی اٹھانے ہو۔“

”یہ بحری جہاز روانہ ہو جائے پھر میں یہاں سے بہت دور چلا جاؤں گا جہاں پاشا کے فرشتے بھی نہیں پہنچ سکتے۔“ دوسری آواز ذرا جھنجھلائی ہوئی تھی۔ وہ دونوں اسی دیوار کے پیچھے تھیں کر رہے تھے۔

”تم امید کرو گور تم اچھی امید کرو کیونکہ اگر پاشا کہے۔“ آوازیں دور جا رہی تھیں۔ اب وہ مبہم ہو گئی تھیں۔

اس نے ان کی باتوں پہ غور کرنا چاہا۔ وہ پاشا کا ذکر کر رہے تھے کچھ ایسا جو اس کے علم میں نہیں تھا۔ بحری جہاز کی روانگی اور پاشا کی لاعلمی۔ تو کیا پاشا کے کہنے پہ اغوا انہیں کی گئی تھی؟

وہ کتنی ہی دیر اپنے درد کرتے سر کے ساتھ سوچنے کی کوشش کرتی رہی مگر کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ اس نے ہاتھ میں پکڑے فون کو دیکھا۔

اس فون میں ترکی کا ایک ہی نمبر تھا۔ جب وہ ریسٹورنٹ میں اپنا ترک موبائل چھوڑ کر گئی تھی تو اسے اسی پاکستانی فون پہ پاشا نے کل کیا تھا۔ اس نے وہ نمبر محفوظ نہیں کیا تھا مگر وہ کل لاگ میں پڑا تھا۔ اس نے کپکپاتی انگلیوں سے لاگ کھولا۔ وہ خالی تھا۔ صرف ایک کل تھی جو ترکی آتے ہی ابانے اس نمبر پہ کی تھی۔ بلی لاگ ارم نے مٹا دیا تھا۔

اس کا سر گھومنے لگا۔ ہر طرف اندھیرا تھا، ہر راستہ مسدود، ہر روانہ بند، وہ یہ تیس سیکنڈ کی کل کس کو کرے؟ سارے ایمر جنسی نمبر ترک فون میں تھے اور ترکی کے دوسرے نمبر اسے ذہنی یاد نہیں تھے۔ فون نمبرز جیسا سلیمان کو کبھی ذہنی یاد نہیں رہتے تھے۔

بوجھ پھر سے اس پہ لڑھکنے لگا۔ اس نے موبائل کی روشنی اس پہ ڈالی اور ایک موبائل کل شل رہ گئی۔ وہ بے سنہری ہالوں والی ایک لڑکی تھی۔ جو اس پر گری تھی۔ اس کے منہ اور کندھے سے خون نکل رہا تھا۔ بغیر آستین کی قمیص سے جھلکتے اس کے سنہری بازو پہ کچھ لکھا تھا۔ اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے اس کے بازو پہ موبائل کی روشنی کی۔ وہاں سیاہ رنگ سے انگریزی میں لکھا تھا۔ ”Natasha“

”ناتاشا۔“ شاید اس کا نام تھا، اور وہ اس کے نام کا ایک بہ صورت سائیو تھا۔ جلا ہوا کوئی داغ۔

اس نے موبائل کی روشنی اور حلوہ روڈ والی اس چھوٹے سے ڈربے میں ہر طرف لڑکیاں تھیں۔ ایک

دوسرے کے اوپر گری ہوئیں۔ بے ہوش، بے سندھ بڑی کسی کے چہرے پہ نکل تھے تو کسی کے بازوؤں پہ خراشیں یا جھا ہوا خون تھا۔

خون کی بو اور سر میں اٹھتا شدید درد۔ اس کا جی ایک دم سے متلانے لگا تھا۔ اسے محسوس ہوا، وہ پھر سے ہوش کھو دے گی۔ اپنے ناکارہ فون کو کھلے کلچ میں ڈالتے ہوئے اس کی نگاہ اندر پڑے کارڈ پہ پڑی اس نے جلدی سے وہ کارڈ نکالا۔ اتصالات کا کائنات کارڈ جو انہوں نے ابو ظہبی میں خریدا تھا، مگر اب وہ بے کار تھا۔ اس نے اندر انگلیاں ڈال کر ٹٹولا اور پھر وہ تہہ شدہ کارڈ نکالا۔

کارڈ کو سیدھا کر کے اس نے گھٹنے پہ رکھا اور موبائل کی روشنی اس پہ ڈالی۔ آفوائٹ کارڈ پہ لکھے سیاہ الفاظ روشن ہوئے۔

”شیخ عہد بنیر۔“

نیچے ترکی کے تین نمبرز لکھے تھے۔ آفس، گھر اور موبائل کا۔ اس کا دل نئی امید سے دھڑکنے لگا۔ اسے ایکسٹنشن یاد نہیں آ رہی تھی۔ کوئی تاریخ تھی۔ کوئی نشان، کوئی مشہور واقعہ۔ اس نے آنکھیں بند کر کے یاد کرنے کی کوشش کی۔ اسے یہ تیس سیکنڈ کی کل ضائع نہیں کرنی تھی۔ مگر اسے یاد نہیں آ رہا تھا۔ سر میں اٹھتا درد اب ناقابل برداشت ہوتا جا رہا تھا۔

اس نے آنکھیں کھول کر دوبارہ کارڈ کو دیکھا اور کچھ سوچ کر موبائل نمبر ملایا۔ گھر اور فون کلن سے لگایا۔ ترک میں ریکارڈنگ چلنے لگی تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ فون بند ہے۔ اس نے ڈبچے دل کے ساتھ گھر کا نمبر ملایا۔

گھنٹی جا رہی تھی۔ وہ بے چینی سے لب کاٹتی سنے لگی۔ اس کی امید کا دیا بار بار جلتا بجھتا جا رہا تھا۔

بند کمرے میں خون کی عجیب سی بو پھیلی تھی۔ اس سے سانس لینا دشوار ہو رہا تھا۔ دوسری جانب گھنٹی ابھی تک جا رہی تھی۔

”ہیلز اللہ تعالیٰ، پلیز۔“ اس کی آنکھوں سے آنسو

کرنے لگے۔

”اسلام علیکم۔“ اسی لمحے فون اٹھایا گیا۔

”کون؟“ عثمان انگل؟“ وہ تیزی سے بولی۔

”آ۔۔۔ نہیں، میں ان کا بیٹا سفیر!“ وہ جو بھی تھا ذرا چونکا تھا۔

”میں حیا بول رہی ہوں۔ حیا سلیمان۔ میں عثمان انگل کے ساتھ آئی تھی۔ اتحاد ایئر لائنز۔ سبائیچ

یونیورسٹی۔ ایک ہیج اسٹوڈنٹ۔“ وقت کم تھا اور وہ اسے تعارف میں ضائع نہیں کر سکتی تھی۔

”کیا ہوا؟ آپ ٹھک تو ہیں؟“

”نہیں، مجھے ان لوگوں نے اغوا کر لیا ہے، یہاں پر کوئی کرا ہے میں اس میں بند ہوں یہاں چھ سات اور لڑکیاں بھی ہیں۔ پلیز کسی سے کہیں میری مدد کرے۔“

وہ تیز تیز بولتی گئی۔

”ایک منٹ۔ مجھے بتائیں آپ کس جگہ پر ہیں۔ کوئی آئیڈیا ہے آپ کو؟ کسی کمر کی وغیرہ سے باہر دیکھ سکتی ہیں؟“

”ہاں، یہاں باہر سمندر ہے، مجھے ایک فیری نظر آ رہا ہے اور لوہر ہل ہے، باسفورس برج۔ نہیں، یہ۔“

رابطہ کٹ گیا۔

اس نے بوکھلا کر اسکرین کو دیکھا اور پھر اس باریک درز سے جھلکتے منظر کو۔ اس نے باسفورس برج کی دیا

تھا جبکہ وہ باسفورس برج نہیں تھا۔ اب وہ پہچانی گئی۔ یہ سلطان احمد برج تھا۔ شہر کے دونوں حصوں کو

میلانے والا دو سراہل۔ اس نے اپنی لوکیشن ہی غلط بتائی تھی۔ اب؟

وہ بے بسی سے موبائل کو دیکھے گئی بیلنس ختم ہو گیا تھا اور اب وہ کل ریسیو کرنے سے بھی قاصر تھی۔

دروازے پر آہٹ ہوئی تلاکھنے کی آواز۔ اس نے جلدی سے فون کچ میں ڈال کر اسے بند کیا اور گردن

ایک طرف ڈھلکا کر آنکھیں موند لیں۔

دروازہ بھاری چرچاہٹ کے ساتھ کھلا۔ کوئی اندر آیا اس پر جبکہ اس کی جھکڑی چالی سے کھولی اور پھر اسے بازو سے کسی جانور کی طرح چھیٹے باہر لے جانے

لگا۔

اس کے لبوں سے بے اختیار کراہ نکلی۔

وہ آدمی اسے بڑے کمرے میں لایا اور اب کرسی پر بٹھا کر اس کے ہاتھ پاؤں کرسی سے باندھ رہا تھا۔

”مجھے چھوڑ دو، مجھے جانے دو۔“ وہ منمنائی تھی۔ اس نے جواباً ”ٹیپ کا ایک ٹکڑا دانت سے کٹ کر اس کے لبوں سے کس کر چکا دیا۔“

”مہ۔“ وہ گردن دائیں سے بائیں مارنے لگی۔

ٹیپ سے اس کی آواز گھٹ کر رہ گئی تھی۔ وہ توجہ دینے بتا لے لے ڈگ بھرتا ہا ہر چلا گیا۔

اس نے نگاہیں پورے کمرے پر دوڑائیں۔ وہ بڑا سا کمرہ تھا۔ ایک طرف بڑا صوفہ رکھا تھا اور دوسری

طرف آتش دان جس کے پاس وہ کرسی سے جکڑی بیٹھی تھی۔ آتش دان میں آگ بھڑک رہی تھی۔

ہر اقلیطس کی داکمی آگ۔ ساتھ ہی لوہے کی چند سلاخیں بڑی الاؤ میں دبک رہی تھیں۔ ان کے سرے

پہ انگریزی کے مختلف حروف لکھے تھے اور وہ حروف دھب دھب کر سرخ انگارے بن چکے تھے۔

آتش دان کے ایک طرف ایک چھوٹی اینٹیکٹیو رکھی تھی۔ اس میں چلتے انگاروں پہ ایک برتن میں شہد کی طرح کا گاڑھا سامان ابل رہا تھا۔ اس کی بو سارے

میں پھیلی تھی۔ شہد سے زیادہ بھورا مائع۔ وہ شاید دیکس تھی۔

اس نے گردن گرا دی۔ اس کی ہمت ختم ہوتی جا رہی تھی۔ وہ اب بہت دیر سے اس کمرے میں تھا

بڑی سچی اور یہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ اسے لگ رہا تھا اس نے وہ کل ضائع کر دی۔ پتا نہیں وہ

کون تھا اور اسے اس کی بات سمجھ میں آئی بھی تھی یا نہیں اور وہ کچھ کرے گا بھی یا نہیں۔ اگر وہ کھرفون

کر لیتی تو شاید مگر نہیں، کھرفون کرنے کی صورت میں بات پھیل جاتی اور اس سے تو بہتر تھا کہ وہ یہیں

بڑی رہتی۔ لیکن بات تو اب بھی پھیل جائے گی اور جو ڈکٹ جو بدنامی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اس کے

سامنے وہ بھولی بھری سی ویڈیو آگئی۔

شریفوں کا مجرا۔

”نہیں، پلیز اللہ تعالیٰ، پلیز میری مدد کریں۔“ وہ بھیگی آنکھوں کے ساتھ دعا مانگنے لگی۔ اس کی دعا پہلے

قبول نہیں ہوئی تھی شاید اب ہو جائے۔ شاید اب اس کی مدد کر دی جائے۔

آتش دان کے قریب ہونے کے باعث تپش اس تک پہنچ رہی تھی اور اس مسلسل حدت سے اس کے

پاؤں دھکنے لگے تھے وہ زرد الاؤ کو دیکھ رہی تھی جس کی سرخ لپٹیں اٹھ کر ہوا میں گم ہو رہی تھیں۔ گرمی

بڑھتی جا رہی تھی اس کا سارا وجود گویا آگ میں دبک رہا تھا۔ لمبے بال کمر اور کندھوں پہ بکھرے تھے وہ ان کو

سمیٹنے پہ بھی قادر نہیں تھی۔ اس نے پورا زور لگا کر کرسی کو پیچھے دھکیلتا چاہا، مگر وہ نہیں ہلی۔ سنے کی چند

بوندیں اس کی گردن اور پیشانی پہ چمک رہی تھیں۔ دفعنا، دروازہ کھلا۔ اس نے گردن موڑ کر دیکھا۔

ایک پستہ قد، چینی نقوش کا حامل شخص تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا بیک تھا۔ جسے اس نے کمرے میں

داخل ہوتے ہی میز پر رکھا پھر اس کی طرف آیا اور ایک ہاتھ سے کرسی کا سرخ اپنی جانب موڑا اور ہاتھ سے

ڈکٹ ٹیپ کا کنارہ پکڑ کر پیچ کراتا رہا۔

”آہ۔۔۔ ناشا!“ وہ قریب سے دیکھنے پہ کوئی دوسی لگتا تھا۔

”میں ناشا نہیں ہوں، پلیز مجھے جانے دو۔“ ایک امید سی بندھی کہ وہ اسے کسی اور کے دھوکے میں پکڑ لائے تھے۔

”ہاؤ یو آر ناشا۔۔۔ انگلش؟ انگلش؟ تل رائٹ، تل رائٹ!“ وہ اثبات میں سر ہلا کر مسکراتا ہوا اینٹیکٹیو کی

طرف بڑھ گیا۔

”پلیز مجھے جانے دو۔“ وہ اس کی پشت کو دیکھتے ہوئے منت بھرے لمحے میں بولی۔ وہ آگ کے سامنے

کھڑا تھا۔ تپش کا رستہ رک گیا۔ ذرا سا سکون ملا۔

”ہو ر کٹری، تو رست گرل، پور پپل!“ وہ نفی میں سر ہلا کر ایک سلاخ اٹھائے اسے الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا۔

”میرا باپ امیر آدمی ہے، وہ تمہیں تلوان کی رقم دے دے گا۔“

”سو ناشا، یو وائنٹ انگلش نیم؟“ وہ ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں کہتا اس کی طرف پلٹا۔ وہ جواب دینے پہ

ایک ٹک اس سلاخ کو دیکھے گئی جس پہ لکھا ”ایم“ دھب رہا تھا یا شاید وہ ”ڈبلو“ تھا۔

وہ سلاخ کیوں دھکا رہا تھا؟ کس لیے؟

ایک خوف سا اس کے اندر سر اٹھانے لگا۔ اسے بے اختیار اس کمرے میں بے سدھ بڑی لڑکی کا بازو یاد آیا۔ وہ بیٹو نہیں تھا۔ وہ بھر میں جل گئی تھی۔

”ہو وائنٹ انگلش نیم؟“ وہ اس کے بالکل سامنے آکھڑا ہوا تھا۔

”نہ۔۔۔ نہ۔“ وہ بے یقینی سے نفی میں سر ہلاتی۔

”ہاؤ دس از یور نیم؟“ وہ سلاخ کا دھکا لہوا اس کے قریب لایا۔

”نہیں۔۔۔ نہیں۔“ وہ گردن دائیں بائیں ہلاتی زور سے چلانے لگی۔ وہ اسے اس گرم لوہے سے

داغنے لگا تھا۔ اس کا چہرہ خوف و دہشت سے سفید پڑ گیا تھا۔

”ہو ر نیم!“ اس نے جتا کر کہتے سلاخ حیا کے بازو کے قریب کی جہاں فراک کی چھوٹی آستین ختم ہوتی

تھی۔ کندھے سے ذرا نیچے وہاں وہ سلاخ قریب لے گیا۔ اسے دیکھتے انگارے کی حدت محسوس ہوئی۔ وہ

ترپ کر ادھر ادھر سر مارنے لگی۔

”نہیں، پلیز۔۔۔ نہیں۔“

اس لمحے اس نے بہت دل سے دعا کی تھی کہ کوئی آجائے اور اس پستہ قد دوسی سے اسے نجات دلا دے۔

کوئی آجائے، چاہے وہ عبدالرحمن پاشا ہی کیوں نہ ہو۔ کوئی تو۔

دوسی نے دھکا ہوا لہوا اس کے بازو کے اوپری حصے پہ رکھ کر دبایا۔ وہ بری طرح سے جھلکا اٹھی۔ اس کے

حلق سے ایک دل خراش چیخ نکلی تھی مگر وہ اسی طرح زور دے کر سلاخ دبائے کھڑا تھا۔

اندر سے ماس جلنے لگا تھا۔ وہ دھج میں اتر جانے والی، زخمی کردینے والی بدترین جلن تھی۔ وہ چی رہی تھی وہ دور رہی تھی۔

چند لمحوں بعد اس نے سلاخ اٹھالی۔ وہ مکمل طور پر جل گئی تھی۔
روسی دوبارہ پلٹا اور سلاخ رکھ دی۔ اس کے دائیں بازو کے اوپری حصے پر سیاہ جلا ہوا حرف لکھا تھا۔
روسی واپس اس کے سامنے آکر اٹھا ہوا۔ حیائے متورم، سرخ نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا اور دہل کر رہ گئی۔
اس کے ہاتھ میں وہ سری سلاخ تھی جس پر HO لکھا تھا اور اوپر تلے لکھے دونوں حرف انکا دین چکے تھے۔
”نہیں۔ تمہیں اللہ کا واسطہ نہیں۔“ وہ وحشت سے تڑپتی خود کو پیچھے دھکیلتے گلی ٹکر سیوں نے اسے اتنی مضبوطی سے جکڑ رکھا تھا کہ وہ ہل بھی نہ پائی۔

”نہیں۔“ وہ خوف سے چلا رہی تھی۔ وہ مسکراتے ہوئے آگے بڑھا سیاہ داغے گئے حرف تلے سلاخ گاڑ دی۔
کھولتا ہوا گرم درد دہکتے انگارے، آگ اس کی تکلیف آخری حد کو چھونے لگی۔ وہ درد سے کھٹی کھٹی سی چیخ رہی تھی۔ اسے لگا وہ اس تکلیف سے مرنے والی ہے۔ وہ جسم کے اندر تک گھس کر جلا دینے والا درد تھا۔

چند لمحوں بعد اس نے سلاخ ہٹائی تو حیا کی گردن بے دم سی ہو کر ایک جانب ڈھلک گئی۔ اس کا تنفس آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ تکلیف سے وہ ہوش کھونے والی تھی۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا تھا مگر مزید رونے کی سکت وہ خود میں نہیں پاتی تھی۔

روسی اب تیسری سلاخ اٹھالایا تھا۔ اس پر RE لکھا تھا۔ حیائے تکلیف سے بند ہوتی آنکھوں سے اسے دیکھا۔ اس میں مزید کچھ کہنے کی سکت نہیں رہی تھی، اپنی ساری زندگی فلم کی طرح اس کی نگاہوں کے سامنے کھونے لگی۔ بچپن کے دن، یادیں اس کے ہاتھ کا گھر اس کی ٹانگیں اس کے لیے بالوں میں گھس پھیر

رہی تھیں۔ منظر بدل گیا۔ وہ اور وہ جیل کار کی پھیلی سیٹ پر بیٹھے تھے، اسکول بیک لیے، وہ اسکول جا رہے تھے، وہ جیل کچھ بتا رہا تھا اور وہ ہنس رہی تھی۔ پھر اس نے خود کو لبا کی بلا بیری میں دیکھا۔ ان کی ایک موٹی سی کتب کھول رہی تھی جس میں سوکھا پھول رکھا تھا۔
وہ اس نے خود ہی وہاں رکھا تھا۔ اب وہ تیار فرکانہ کو اپنے عید کے کپڑے، بیکٹر سے اٹھائے دکھا رہی تھی اور وہ اس کا جوش و خروش اور خوشی دیکھ کر مسکرا رہے تھے وہ جیل اس کے ساتھ لان میں بھاگ رہا تھا، ان کے آگے وہ خرگوش دوڑ رہے تھے وہ دوڑ دوڑ کر تھک گئی تھی۔ اس کے لیے بل کر رہے تھے۔
خرگوش گھاس پر دوڑ بھاگتے جا رہے تھے۔ سفید نرم نرم سے خرگوش۔

روسی نے گرم سلاخ اس کے بازو سے مٹس کی، ایک کھولن سی اس کے اندر اترتی گئی۔ اگلے ہی بل اس نے کرنٹ کھا کر سلاخ ہٹائی کیس فون کی گھنٹی بجی تھی۔

خرگوش غائب ہو گئے۔ درد ہر شے پر غالب ہو گیا۔ وہ پہلی دفعہ سے کئی گنا زیادہ شدید درد تھا کیونکہ سلاخ جلدی ہٹانے کے باعث جلد پوری نہیں جلی تھی اور حسیات باقی تھیں۔ اسے لگتا تھا اس کی ہمت ختم ہو گئی ہے، مگر وہ پھر سے دور رہی تھی۔

”فون؟ پور فون؟“ تواز کے تعاقب میں وہ آگے بڑھا اور اس کے فرائک کی سیٹ سے لگا پرس نوجا۔ سیفٹی پن ٹوٹ گئی، کپڑا پھٹ گیا۔ اس نے تیزی سے پرس کھولا اور فون نکالا۔ وہ زور زور سے سنج رہا تھا۔
شدید تکلیف میں بھی جو پہلی بات اس کے ذہن میں آئی تھی وہ یہی تھی کہ اس کا فون روٹ گیا تھا اور بیلنس ختم پھر فون کیسے بچا؟

روسی بھی بے یقینی سے اسے دیکھا، کبھی فون کو۔ پھر اس نے فون کلن سے لگایا۔ دوسری طرف سے کچھ کہا گیا۔ اس پر اس نے جلدی سے فون بند کیا اور پوری قوت سے اسے دیوار پر دے مارا۔ فون کی اسکرین چمکتا چور ہوتی زمین پر جاگری۔

”یو کاند سمون؟“ وہ وحشیوں کی طرح اس پر چھپتا اور گردن کے پیچھے سے بل دیوچ کر اس کا چہرہ سامنے کیا۔ حیائے نیم جاں، اٹھال آنکھوں سے اس کو دیکھا اور پھر اس کے منہ پر تھوک دیا۔

وہ بلبل کر پیچھے ہٹا۔ اس کے بال چھوڑے اور اٹکشی پی دھکتا برتن ہینڈل سے اٹھایا۔ کھولتی ہوئی ویکس۔

”یو یو یو!“ وہ غصے میں مغلظات بکنا اس کے قریب آیا اور برتن اس کے سر پر اونچا کیا۔
”نن۔ نو۔“ اس کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔ ”میرے بل۔“ اس کے لبوں سے بس اتنا ہی نکل پایا تھا کہ روسی نے برتن اس کے سر پر الٹ دیا۔

گرم کھولتی ہوئی ویکس تیزی سے اس کے بالوں کی مانگ پر گری اور ہر طرف سے نیچے لڑھکنے لگی۔ اس کی دلخراش چیخ نکلی۔ اچھے ماوے نے اس کے سر کی جلد کو گلا دیا تھا۔ بازو کا درد غائب ہو گیا، وہ وحشیانہ انداز میں زور زور سے چیخ رہی تھی، اپنے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی اور وہ بھی چیخ رہا تھا۔ اور تب اس نے زور سے اس کی کرسی کو دھکا دے کر الٹ دیا۔ وہ کرسی سمیت اوندھے منہ زمین پر جاگری۔ آتش دان کے بالکل قریب۔

کمرے میں دھواں سا بھرنے لگا تھا۔ ویکس اس کے سر پر جھننے لگا تھا۔ اس کا سر بے حد زنی ہو گیا تھا۔ آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔ اس کے منہ سے خون نکل رہا تھا۔ کمرے میں دھواں بڑھتا جا رہا تھا۔ آتش دان سے آگ کی لپٹیں لپک لپک کر اس کی طرف آرہی تھیں۔

اس نے زمین پر گرے گل فرش پر رکھے بند ہوتی آنکھوں سے اس دھندلے منظر کو دیکھا۔ دھواں اس کے اس پار کوئی اس روسی کا سر پکڑ کر دیوار سے مار رہا تھا۔ چپٹیں دھواں، آگ، خون۔ اس کا پورا جسم آگ میں دھک رہا تھا۔

جو آخری شے اس نے دیکھی وہ اس کا سیاہ فرائک کا دامن تھا، آگ کی ایک لپٹ نے اسے چھو لیا تھا۔ اس

نے سیاہ کپڑے کو زور شعلے میں بدلتے دیکھا۔ ہر طرف دھواں تھا اور وہ جانتی تھی کہ وہ مر رہی تھی۔ اس کے سفید خرگوش اس دھواں میں غائب ہو رہے تھے۔ وہ جل کر مر رہی تھی، ہر اقلیدس کی دانگی آگ ہر سو پھیل رہی تھی۔



اس نے دھیرے سے آنکھیں کھولیں۔ وہ سہرے سفید چھت اس کی نگاہوں کے سامنے تھی جس پر خوبصورت نقش و نگار بنے تھے۔ درمیان میں ایک قیمتی و نفیس فانوس لٹک رہا تھا۔

اس کا سر ایک نرم گداز تکیے پر تھا اور مٹھلیں کھل کر دن تک ڈالا تھا۔ اس نے ایک خلی خلی سی نگاہ کمرے پر دوڑائی۔ وسیع و عریض، پر نقش بند روم، ایک طرف دیوار گیر کمر کی کے آگے برابر کیے گئے سفید جالی دار پردے جن سے صبح کی روشنی چھن چھن کر اندر آرہی تھی۔

اس نے آنکھیں پھر سے موند لیں اور ان پر بازو رکھ لیا۔ ان گزرے دنوں میں سوتی جاگتی کیفیت میں وہ بہت روٹی تھی، بہت چلائی تھی۔ یہ کمرہ اس نے دیکھا تھا۔

وہ اوہری لائی گئی تھی۔ ہاتھ سے لگی ڈرپ اپنے بالوں میں نرمی سے چلتے اس بھوری آنکھوں والی لڑکی کے ہاتھ، وہ انجکشن، نیم بے ہوشی، اسے ٹوٹا ٹوٹا سا سبب یاد تھا اور اس ذوقی، ابھرتی نیند میں بھی وہ جانتی تھی کہ وہ یوک او امیں ہے، عبدالرحمن پاشا کے سفید محل میں۔

دروازے پر دھیرے سے دستک ہوئی اور پھر وہ ہلکی سی جھجھک کے ساتھ کھلا۔ قدموں کی نرم سی تواز بیڈ کے قریب آئی۔ اس نے آنکھوں سے بازو نہیں ہٹایا۔ وہ جانتی تھی کہ یہ کون تھی۔

”صبح بخیر! نیند پوری ہو گئی ہے تو اٹھ جاؤ، ناشتا کرو۔“

باقی آئندہ شمارے میں



محبت میں قریب کے طریقے اور ہوتے ہیں
مقدار اور ہوتا ہے، ستارے اور ہوتے ہیں
محبت مجلسی باتوں سے کب ہر دان چڑھتی ہے
جو تہذیبیں بدلتے ہیں وہ قہقہے اور ہوتے ہیں
دلوں میں جھانکنے والی نظر کچھ اور ہوتی ہے
نظر آتے نہیں جو، وہ تماشاے اور ہوتے ہیں

اعتبار

پھول کھلنے لگے
زخم سلنے لگے

ابتدائے محبت کے ہیں روز و شب
شبِ شبی شبی ایک احساس ہے
دھیمی دھیمی سی جاگی ہوئی پیاس ہے
اب کہیں بھی رہے
تو مرے پاس ہے

خالد معین

ہم اس کو دیکھ کر آنکھیں جھکالتے ہیں اس دے
کہ جو تصویر ہوتے ہیں وہ لمحے اور ہوتے ہیں
بھٹکنے کے سوا کیا کیجیے ان رگزاروں میں
جو منزل پر پہنچتے ہیں وہ رستے اور ہوتے ہیں
ہیں لگتا ہے محسن، زندگی ہم سے نہیں ہوگی
اکیلے پن میں زندہ رہنے والے اور ہوتے ہیں
محسن اسرار

سرود صنوبر شہر کے مرتے جاتے ہیں آٹنے میں یہ میرے سوا کون ہے؛
سارے پرندے ہجرت کرتے جاتے ہیں ایک تو میں ہوں، یہ دوسرا کون ہے
جھوٹی پہی تبسروں کی خواہش میں وہ بھی چپ ہے اگر، میں بھی چپ ہوں اگر
کیسے کیسے خواب بکھرتے جاتے ہیں تم بھی چپ ہوا اگر، بولتا کون ہے؛
کیسے کیسے یاروں کا بہروپ کھلا میں کہاں سے اُلجھتی چلی آئی ہوں
کیسے کیسے خول اُترتے جاتے ہیں دور ہوں میں اگر تو بس اکون ہے؛
رگیدوں کی خاموشی کو غور سے سن نقش بننے رہے، نقش مٹنے رہے
یوں ہے جیسے ماتم کرتے جلتے ہیں لوحِ دل پہ جو لکھا رہا، کون ہے؛
کبھی کبھی کوئی ایسا مسافر آتا ہے جب سے اذن تکلم ہوا ہے انہیں
رستے اپنے آپ سنورتے جاتے ہیں بولتے ہیں سب ہی، سوچتا کون ہے؛
احمد فراز صغریٰ یوسف

تلاقی

باب نے پیش میں آکر بیٹھے۔ کہا۔
”میں نے اپنا عیش و آرام غارت کیا، دن رات مشقت کر کے روزی کما تا رہا۔ ایک ایک پیسہ بجا کر رکھا، محض اس لیے کہ تمہیں میڈیکل کی تعلیم دلوں گا۔“

انہوں نے مسکین صورت بنا کر کھڑے ہوئے بیٹھے پر ایک نظر ڈالی اور پھر غصے میں کہنے لگے۔
”اور اب جبکہ تم ڈاکٹر بن چکے ہو تو تم کہہ رہے ہو کہ۔ اباجی! سگر سب چھوڑ دیجئے۔؟“

یا سکین ناز نوید۔ کلفٹن کراچی علیحدگی
عدالت میں علیحدگی کا کیس تین سال تک چلا۔
آخر کار میاں بیوی سے کفدات پر دستخط کروائے گئے۔

دستخط کرنے کے بعد بیوی نے شوہر سے کہا۔
”میں تمہیں بتائے دیتی ہوں کہ اگر تم نے الاؤنس کی ادائیگی میں ایک دن کی بھی تاخیر کی تو میں علیحدگی منسوخ کر کے تمہارے گھر آ بیٹھوں گی۔“

تبدیلی

بڑی عمر کے ایک صاحب نے اپنے دوست سے کہا۔
”زمانہ واقعی بہت بدل گیا ہے۔“
”تمہیں یہ احساس کیوں کر ہوا؟“ ان کے دوست نے پوچھا۔
”کل میں ایک یارٹی میں گیا، جہاں زیادہ تر نئے

شادی شدہ جوڑے تھے۔ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ عورتیں ادھر ادھر ٹولیوں کی صورت میں کھڑی سیاست بر باتیں کر رہی تھیں اور مرد کو نے کھدروں میں بیٹھے کھانے پکانے کی ترکیبوں کے بارے میں تبادلہ خیال کر رہے تھے۔“

سرت الطاف احمد۔ کراچی

حاصل کلام

وکیل استغاثہ نے گواہ پر جرح کرتے ہوئے کہا۔
”ہاں تو۔ رضوان صاحب دو فروری کو آپ مسز سعید کے گھر گئے تو انہوں نے کیا کہا؟“
”آجیکشن پور آنر۔“ وکیل صفائی نے فوراً مداخلت کی۔
”فاضل وکیل کو میرے موکل سے یہ سوال کرنے کا حق نہیں پہنچتا۔“
”کیوں نہیں پہنچتا؟“ وکیل استغاثہ نے جارحانہ لہجے میں کہا۔

اس کے بعد دونوں وکیلوں کے درمیان ایک گھنٹے تک بحث ہوئی رہی۔ وکیل استغاثہ نے بیسیوں قانونی حوالے دیے اور پچاسوں مثالیں پیش کیں، جن کی بنا پر اسے وہ سوال کرنے کا حق حاصل تھا۔ ان کے جواب میں وکیل صفائی بھی بیسیوں دلائل پیش کرتے رہے، جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ وکیل استغاثہ اپنی حیثیت کا ناجائز استعمال کر رہے ہیں۔ آخر کار جج صاحب نے وکیل استغاثہ کو سوال کرنے کی اجازت دے دی۔
وکیل استغاثہ نے گہری سانس لے کر گویا تازہ دم ہوتے ہوئے نئے سرے سے سوال کیا۔

”ہاں تو۔ رضوان صاحب۔ دو فروری کو آپ

مسز سعید کے گھر گئے تو انہوں نے کیا کہا؟“
”کچھ بھی نہیں۔ وہ گھر پر ہی نہیں تھیں۔“ گواہ نے سادگی سے جواب دیا۔

روایک۔ اسلام آباد

معصومیت

باہر کچھ کرنے کی زوردار آواز سن کر ایک کسان گھر سے باہر نکلا۔ اس نے دیکھا کہ سڑک کے کنارے گھاس کا ایک بڑا سا گٹھڑا ہے اور بارہ تیرہ سال کا ایک لڑکا قریب گٹھڑا منہ بسور رہا ہے۔

”پریشانی کی کوئی بات نہیں بر خوروار!“ کسان نے اسے تسلی دی۔ ”آؤ! میرے ساتھ اندر چلو، کھانے کا وقت ہو گیا ہے۔ اطمینان سے کھانا کھاؤ۔ ٹھنڈا پانی پیو پھر گٹھڑا اٹھالیں گے۔“

لڑکے نے بہت انکار کیا لیکن کسان اس کا ہاتھ پکڑ کر گھر میں لے آیا۔ کھانا کھانے کے دوران لڑکا بار بار کہتا رہا۔

”آج تو ابابغصے سے پاگل ہو جائیں گے۔ مجھے بہت ماریں گے۔“

کسان نے شفقت سے کہا۔ ”مانا کہ تمہیں درد ہو گئی لیکن اس میں تمہارا کیا قصور۔ اب کیوں ماریں گے تمہیں؟“

”اس لیے کہ وہ باہر گھاس کے گٹھڑے کے نیچے دبے ہوئے ہیں۔“ لڑکے نے معصومیت سے جواب دیا۔

طلعت اقبال۔ اسمیل ٹاؤن، کراچی

پریشانی

سحر کو دفتر میں ملازمت شروع کیے صرف ایک ہفتہ ہوا تھا۔ اپنے برابر کی میز پر ساھی کلرک کی اتری ہوئی صورت دیکھ کر اس نے ازراہ ہمدردی پوچھ لیا۔ ”کیا بات ہے؟ آپ کچھ پریشان نظر آ رہے ہیں؟“

”میں یہ سوچ کر پریشان ہو رہا تھا کہ جب ہم دونوں ہنی مون پر جائیں گے تو دفتر میں میرے اور آپ کے

حصے کا کام کون سنبھالے گا؟“

ساتھی کلرک نے تشویش زدہ لہجے میں کہا۔

”ہنی مون؟“ سحر کی آنکھیں پٹی کی پٹی رہ گئیں۔

”ہمارے درمیان تو ابھی صحیح طرح سے بات چیت

بھی شروع نہیں ہوئی ہے یہ آپ نے شادی اور ”ہنی

مون“ کے بارے میں کیسے سوچنا شروع کر دیا؟“

”فرض کرنے میں کیا حرج ہے؟“ ساتھی کلرک

نے ذرا سا شرمناک سر جھکاتے ہوئے کہا۔

گڑیا شاہ۔ کہوڑپکا

ثبوت

تیز رفتاری کے جرم میں ثار صاحب کا جلالن ہوا

اور انہیں مجسٹریٹ صاحب کے سامنے پیش کیا گیا۔

انہوں نے صحت جرم سے انکار کرتے ہوئے کہا۔

”جناب عالی! میں تو صرف بیس میل فی گھنٹہ کی

رفتار سے جا رہا تھا۔“

”کیا ثبوت ہے اس بات کا؟“ مجسٹریٹ نے دریافت کیا۔

”جناب والا! ثبوت کے طور پر صرف اتنا جان لینا

کافی ہے کہ میں اس وقت اپنے سرسراں جا رہا تھا۔“

افشاں فرقان۔ نئی حسن کراچی

خصوصی پرواز

بیس گھنٹے کے سفر روانہ ہونے والی مسافر پرواز کی

ایر ہو سٹس نے بھرپور انداز میں سب مسافروں کو خوش

آمدید کہا اور شیریں کبجے میں گویا ہوئی۔

”میں اپنے اوارے کی طرف سے تمام مسافروں کا

شکریہ ادا کرتی ہوں کہ آپ نے پرسکون اور محفوظ سفر

کے لیے ہماری کمپنی کا انتخاب کیا۔ آپ کو بتاتے چلیں

کہ ایک چھوٹی اور غیر معمولی خبر یہ ہے کہ بی بی سمکڑ اور

ملک پاؤڈر ختم ہونے کی وجہ سے چائے یا کافین دستیاب

نہیں ہوگی۔“ یہ سنتے ہی مسافر مرد آہیں بھرنے لگے۔

ایر ہو سٹس دوبارہ قائل مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

”ایک اور خبر یہ ہے کہ بیج اور ذر کا انتظام نہ کرنے

وقت تک قائم نہ فرماتے جب تک حضرت علیؓ سے مشورہ نہ فرمالتے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ انہیں انتہائی خیر خواہی اور اخلاص کے ساتھ مشورہ دیتے۔
جب حضرت عمرؓ نے بیت المقدس کی طرف سفر کیا تو تمام ائمہ خلافت برمدینہ میں ان ہی کو اپنا نائب بنایا۔ (علامہ شبلی نعمانی - الفائق)

گواہی

حضرت عمرؓ کے صاحبزادے حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں حضرت عمرؓ کی زبان سے جب بھی یہ جملہ نکلتا "میرا گمان اس طرح ہے" تو وہ گمان سچ ثابت ہو جاتا۔

آپ کے دور خلافت کا واقعہ ہے کہ ایک غیر معمولی شکل و شبابت کا آدمی آپ کے قریب سے گزرا۔ سیدنا عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسے دیکھ کر فرمایا۔ "میرا گمان ہے کہ یہ شخص دور جاہلیت میں کاہن تھا۔ اسے میرے پاس لاؤ۔"

جب اسے حضرت عمرؓ کے پاس لایا گیا تو آپؓ نے اس سے اپنے حنیال کی تصدیق چاہی اور اس سے سوال کیا۔

"ماضی میں وہ کیا کرتا تھا؟"

وہ کہنے لگا۔

"ماضی میں کاہن تھا۔"

حضرت عمرؓ نے اس سے سوال کیا۔

"ہمیں کوئی ایسی عجیب اور انوکھی بات بتاؤ جس کی خبر تمہیں تمہارے حمن نے دی ہو؟"

وہ کہنے لگا۔ "میں ایک دن بازار میں جا رہا تھا کہ میرا حوکل جی گھبراہٹا ہوا میرے پاس آیا۔ اس نے کہا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"جب اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے تو اسے (اس کے گناہوں کی) سزا جلد ہی دینا میں دے دیتا ہے (یعنی تکلیفوں اور آفات کے ذریعے اس کے گناہوں کی معافی کا سامان پیدا کر دیتا ہے۔)

اور جب اپنے بندے کے ساتھ بُرائی کا ارادہ کرتا ہے تو اس سے اس کے گناہ کی سزا (دنیا میں) روک لیتا ہے۔ یہاں تک کہ قیامت والے دن اس کو پوری سزا دے گا۔"

بردباری

حضرت علیؓ کرم اللہ وجہہ نے اپنے غلام کو آواز دی مگر اس نے جواب نہیں دیا۔ پھر پکارا مگر اس نے سنی نہ سنی کر دی۔ تیسری مرتبہ پکارا۔ جواب نہیں آیا تو آپؓ خود اس کے پاس گئے تو دیکھا۔ وہ لیٹا ہوا ہے۔ آپؓ نے دریافت فرمایا۔

"کیا تو نے میری آواز نہیں سنی؟"

وہ بولا۔ "سنی میرے آقا۔"

آپؓ نے پوچھا۔ "پھر تو نے جواب کیوں نہیں دیا؟" وہ کہنے لگا۔ "یہ اطمینان ہے کہ آپ سزا نہیں دیں گے لہذا کاہلی پیدا ہو گئی ہے مجھ میں۔" آپؓ نے فرمایا۔ "جاتے خدا کے لیے آزاد کیا۔"

حضرت علیؓ کی فراست

حضرت عمرؓ کسی بھی اہم معاملہ میں اپنی رائے اس

مشورہ

تعلیم سے فارغ ہونے والے ایک نوجوان نے ایک کامیاب بزنس میں سے کہا۔

"میں بھی کاروبار کرنا چاہتا ہوں اور کاروباری دنیا میں اپنا کوئی مقام بنانا چاہتا ہوں۔ آپ مجھے کوئی مشورہ دیجئے کہ مجھے سب سے پہلے کیا کرنا چاہیے؟"

"بیٹا! سب سے پہلے تو اپنی کلائی پر بندھی ہوئی یہ گھڑی بچ دو۔ اور ان پیسوں سے الارم والا کوئی اچھا سا کلاک خرید لو۔" کامیاب بزنس میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

شہنشاہ اقبال کراچی

اصلاح

"میں اور میرے بہترین دوست ارشد نے جب یہ بڑھا کہ تمہارا سچا اور حقیقی دوست وہ ہے جو تمہیں تمہارے عیبوں سے آگاہ کرے۔ تو ہم نے اس پر عملدرآمد کا فیصلہ کیا۔"

"اس سے تم دونوں کو اپنی اصلاح کرنے میں کافی مدد ملی ہوگی۔"

"میں کچھ کہہ نہیں سکتا کیونکہ پچھلے پانچ سال سے ہماری بول چال بند ہے۔"

ترنم اعجاز۔ کراچی

ناگزیر

ممتاز صاحب کو ایک سنسان گلی میں ایک ڈاکو نے روک لیا اور پیشانی پر پستول رکھ کر بولا۔

"تمہارے پاس جو کچھ ہے نکال دو ورنہ بھیجا باہر نکال دوں گا۔"

"نکال دو۔" ممتاز صاحب نے بے پروائی سے کہا۔ "آج کے دور میں انسان بھیجے کے بغیر زندہ رہ سکتا ہے۔ پیسے کے بغیر نہیں۔"

(بشری غنی۔ نارتھ کراچی)

بکرا

کے سلسلے میں ہماری معذرت قبول فرمائیں۔ اگر ہم مطلوبہ سامان خریدنے جاتے تو ممکن تھا کہ ہماری پرواز لیٹ ہو جاتی۔ لہذا ہم نے آپ کے قیمتی وقت کو اہمیت دی انسان گھر میں جا کر بھی کھالی سکتا ہے۔ یہ سنتے ہی وہ مسافر جن کا بھوک سے برا حال تھا انتہائی غصے میں ہوئے۔

"ارے! اس جہاز میں کیا پینے کا پانی بھی نہیں ہے؟" ایر ہو سٹل ایک کافر اوائے کے ساتھ فکرا کر بولی۔

"اس بارے میں آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے پاس ایک ڈیڑھ لیٹر منسل وائر موجود ہے۔"

یہ سنتے ہی مسافروں نے غصے کے عالم میں کہا۔ "اسے گلاس میں ڈالو اور شرم سے ڈوب مو۔" یہ سن کر ایر ہو سٹل کا چہرہ چمک اٹھا۔ اس نے گردن جھکا لی اور بار بھرے کعبے میں کہا۔

"آپ لوگ کتنے اچھے ہیں۔ آپ کے تعاون کا بہت بہت شکریہ۔ اگر آپ پینے کے لیے پانی مانگ لیتے تو ہمیں کتنی پر اہم ہوتی۔"

صفیہ اعوان مہوش اعوان۔ ایک

بہادری

کالج کی ٹیم جین الصوبائی تقرری مقابلے میں حصہ لینے جارہی تھی۔ ٹیم میں شامل ایک مقرر نے جانے سے پہلے جوش کے عالم میں باتیں کرتے ہوئے اپنے ساتھیوں سے کہا۔

"یہ تقرری مقابلہ محض تقرری مقابلہ نہیں ہے، یوں سمجھو یہ صوبے بھر کے نوجوانوں کے درمیان ذہانت کی جنگ ہے۔"

"بے شک۔" ایک کلاس فیلو نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "اور تمہاری بہادری دیکھو کہ ہتھیار کے بغیر یہ جنگ لڑنے جا رہے ہو۔"

میتا عابد۔ کورنگی کراچی

”کیا آپ کو خبر ہے کہ جنات ایک انقلاب کے آنے کے بعد نہایت خوف زدہ اور ناامید سے ہونے لگے ہیں۔ وہ اپنا رخت سفر باندھ چکے ہیں“
سیدنا عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کی تائید کی اور فرمایا۔

”یہ سچ کہتا ہے۔ ایک مرتبہ میں ان کے بتوں کے پاس سویا ہوا تھا۔ اپنا تک ایک شخص آیا۔ اس نے بتوں کے نام پر وہاں ایک بھڑا ذبح کیا۔ پھر وہاں کسی نے زور سے چیخ ماری۔ یہ چیخ اس قدر بلند تھی کہ اس سے بلند چیخ میں نے اپنی زندگی میں پہلے کبھی نہیں سنی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا: ہائے ہم مارے گئے۔ ایک صاحب الرائے اور نفیع شخص آگیا ہے۔ جولا لہ لا اللہ (اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں) کا اعلان کرتا ہے“

حضرت عمرؓ کہتے ہیں: میں وہاں سے چل دیا۔ پھر پھر عرصے بعد ہم نے سنا کہ ایک نبی کا ظہور ہوا ہے جولا لہ لا اللہ (اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں) کہتا ہے۔
(صحیح بخاری حدیث 3866)

خلیفہ کا حال،

ایک دن حضرت عمر فاروقؓ ارشاد فرما رہے تھے۔ وہ اس وقت خلیفہ تھے اور ان کا حال یہ تھا کہ ان کے تہ بند میں بارہ بیوند لگے ہوئے تھے۔
(امام احمد قیس 121)

فیصلہ،

ایک تاجر کی پھیلی ہوئی گھڑی جس میں چار سو دینار تھے۔ اس نے اعلان کر دیا جو اسے تلاش کر کے لائے گا اس کو اس پھیلی ہوئی رقم کا نصف حصہ دے دیا جائے گا۔ یہ پھیلی ایک عزیز ملاج کو ملی۔ وہ اسے لے کر انعام کی طرح میں تاجر کے پاس پہنچا لیکن پھیلی دیکھ کر تاجر کی نیت بدل گئی۔ اس نے ملاج سے کہا۔ اس پھیلی میں نہایت قیمتی زمرہ بھی تھے۔ کیا وہ بھی اس کے اندر ہیں؟

ملاج یہ سن کر گھبرا گیا لیکن یہ بھی سمجھ گیا کہ یہ دھوکا

کر رہا ہے اور چاہتا ہے کہ اسے کچھ دینا پڑے۔ وہ تاجر سے پھیلنے لگا۔ آخر یہ دونوں لڑتے ہوئے فیصلے کے لیے قاضی کے پاس پہنچے۔ ملاج نے قسم کھا کر قاضی سے کہا کہ اسے پھیلی میں دیناروں کے سوا کوئی اور چیز نہیں ملی۔

اب قاضی نے مالک سے پوچھا۔
”بتاؤ وہ زمرہ کیسے تھے؟“

مالک نے جواب تو دیا لیکن اس کی اوٹ پٹانگ باتیں سن کر قاضی نے سمجھ لیا کہ جھوٹ بول رہا ہے اور انعام سے بچنا چاہتا ہے۔ اس نے فیصلہ دیتے ہوئے کہا۔
”یہ نزاع پھیلی لایا ہے۔ اس میں زمرہ نہیں، ہذا یہ تیری نہیں ہو سکتی تو اپنی فیصلے کے لیے پھر سے اعلان کرو“
پھر قاضی نے ملاج سے مخاطب ہو کر کہا۔

”یہ پھیلی چالیس روز تک امتیاض سے رکھو۔ اگر اس کا کوئی دوسرا سچا دعویٰ دار نہ پیدا ہو تو یہ تیری ہے“

علم کی اہمیت،

ایک دولت مند شخص لونان کے ایک عالم کے پاس پہنچا اور اس سے درخواست کی۔
”آپ میرے بچے کی تعلیم و تربیت اور نگہداشت اپنے ذمے لے لیجیے۔“

عالم نے کہا: ”معاوضہ کیا دو گے؟“
امیر نے کہا: ”فرمائیے کیا لیں گے آپ؟“
وہ بولا: ”پانچ سو تفریق سیکے“
یہ سن کر امیر کی یہودیوں جڑھ گئیں۔ اس نے اس رقم کو بہت بڑا معاوضہ سمجھ کر ذمہ غصے کے ساتھ کہا۔
”اس سے کم رقم میں تو میں ایک غلام خرید سکتا ہوں“
عالم نے کہا: ”ضرورت خرید لیجیے، تاکہ آپ دو غلاموں کے مالک بن جائیں“

سخاوت،

حسن بن سہل خلیفہ مامون کا وزیر بہت سخی تھا۔ بے دھڑک لوگوں کو عطیات دیتا۔ ایک مرتبہ ایک

اعرابی نے اسے کھا۔
”اے حسن! یہ راستہ احسان کا نہیں جو تو نے اختیار کر رکھا ہے۔ کیا تجھے نہیں معلوم کہ اسراف میں کوئی بھلائی نہیں؟“

حسن نے اعرابی کو جواب دیتے ہوئے کہا۔
”کیا تجھے نہیں معلوم کہ بھلائی اور نیکی میں اسراف ہوتا ہی نہیں؟“

کمزور عشق،

مولانا روئی ایک دن خرید و فروخت کے سلسلے میں بازار تشریف لے گئے۔ ایک دکان پر جا کر وہ دُک گئے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ایک عورت سودا سلفے لے رہی ہے۔ سودا خریدنے کے بعد اس عورت نے رقم ادا کرنا چاہی تو دکان دار نے کہا۔

”عشق میں حساب کتاب کیسا؟ پیسے کی بات چھوڑو اور گھر جاؤ۔“

اصل میں یہ دونوں عاشق اور معشوق تھے۔ مولانا روئی اس کی بات سن کر عشق کھا کر گر پڑے۔ دکان دار سخت گھبرا گیا۔ اس دوران وہ عورت وہاں سے چلی گئی۔ خاصی دیر بعد جب مولانا روئی کو ہوش آیا تو دکان دار نے پوچھا۔

”مولانا صاحب! آپ کیوں بے ہوش ہو گئے تھے؟“
مولانا روئی نے جواب دیا: ”میں اس بات پر بے ہوش ہوا کہ تم دونوں میں عشق اتنا قوی اور مضبوط ہے کہ آپس میں کوئی حساب کتاب نہیں جبکہ اللہ کے ساتھ میرا عشق اتنا کمزور ہے کہ میں تسبیح کے دانے بھی گن گن کر گناہوں: غزوہ، اقلہ، کراچی

مطالعہ،

مطالعہ غم اور اداسی کا بہترین علاج ہے۔
(شیخ سعدی)
اچھی کتابوں کا مطالعہ زندہ اور بیدار رکھنے کے لیے ضروری ہے۔ (امام غزالی)
مطالعہ سے آدمی کی وحشت اور دیوانگی ختم ہو

جاتی ہے۔
(عظیم لقمان)
طالب علم جو ایک کتاب پڑھتا ہے وہ اعلا جو دو کتابیں ایک ساتھ پڑھتا ہے وہ اوسط اور جو تین کتابیں ایک ساتھ پڑھتا ہے وہ مبہل ہے۔

نیلم شہزادی۔ کوٹ مومن سرگودھا

غور کیجیے،

دُعا دستک کی طرح ہے۔ مسلسل دستک سے دروازہ کھل ہی جاتا ہے۔
جب آپ کو محسوس ہو کہ آپ کی طبیعت کو ذکر خدا سے غبت ہو گئی ہے تو سمجھ لو کہ اللہ آپ کو پسند کرنے لگا ہے۔

یادیں محبت کرنے والوں سے زیادہ دغا دار ہوتی ہیں کیونکہ محبت کرنے والے تو چھوڑ جاتے ہیں مگر یادیں ہمیشہ ساتھ رہتی ہیں۔

رحم،

* اگر خیال کی اصلاح ہو جائے تو خوف دُور ہو سکتا ہے۔ ماضی کی غلطیوں پر توبہ کرنی چاہئے تو خوف دُور ہو جاتا ہے۔ اللہ کی رحمت پر بھروسہ کر لیا جائے۔ اس کے فضل سے مایوسی نہ ہونے دی جائے تو خوف نہیں رہتا۔ کوئی رات ایسی نہیں جو ختم نہ ہوئی ہو۔ کوئی غلطی ایسی نہیں جو معاف نہ کی جاسکے کوئی انسان ایسا نہیں جس پر رحمت کے دروازے بند ہوں۔ رحم کرنے والے کا کام ہی یہی ہے کہ رحم کرے۔ رحم اس کے فضل کو کہتے ہیں۔ جو انسانوں پر ان کی غامیوں کے باوجود کیا جائے اور یہ رحم ہوتا ہی رہتا ہے۔ کسی کو خوف زدہ نہ کیا جائے۔

(داصف علی داصف)

نوال افضل گھمن۔ بکرات



شاعری کا بول چال

نوال افضل گھمن

عجبت درد کی صورت
غزل کے بوجھ سے جب ٹوٹنے لگتے ہیں شلنے تو
ان پر ہاتھ رکھتی ہے
کسی ہمدرد کی صورت
گزر جاتے ہیں سارے قافلے جب دل کی بستی سے
خوشی میں تیرتی ہے دیر تک
یہ گرد کی صورت
عجبت درد کی صورت

محترم و محترم اعتبار ساجد کی غزل آپ کی خدمت
میں حاضر ہے۔
مجھے ایسا لطف ملا کیا جو ہجر حقانہ وصال تھا
میرے موسموں کے مزاج داں، تجھے میرا کتنا خیال تھا
کہیں خون دل سے لکھا تو تھا تیرے سال بھر کا سانچہ
وہ ادھوری دائری کھو گئی وہ بچلے کون سا سال تھا
کسی اور جہے کو دیکھ کر تیری شکل ذہن میں آگئی
تیرا نام لے کر ملا اُسے اُسے حافظے کا یہ حال تھا

کبھی موسموں کے سیراب میں کبھی بامِ درد کے قلاب میں
وہاں عمر میں نے گزار دی جہاں سانس لینا محال تھا
کبھی تو نے غور نہیں کیا کہ یہ رنگ کیسے اُجڑ گئے
کوئی میر جیسا گرفتہ دل تیرے ملنے کی مثال تھا
تیرے بعد کوئی نہیں ملا جو یہ حال دیکھ کے پوچھتا
مجھے کس کی آگ جھلسا گئی تیرے دل کو کس کا حال تھا

شاعری اُداس شاموں میں اُداس لمحوں میں یا
پھر کسی ناخوش گراموں کی بے مدد صورت سی صبحوں
سیرِ پردوں میں کوئی یاد دل میں پھول بن کر کھیلے یا درد
کا ناسور بن کر روح میں سرایت کرے تو پھر حساس
دل شاعری کا سہارا لیتے ہیں۔
سب سے پہلے اجداد اسلام اجد کی محبت سے
شرامات کرتے ہیں۔

محبت اداس کی صورت
پیا سی پنکھڑی کے جونٹ کو سیراب کرتی ہے
مٹوں کی آستینوں میں انوکھے رنگ بھرتی ہے
سمکے جھٹنے میں گنگنائی، مسکرائی، جگمگاتی ہے
محبت کے دنوں میں دشت بھی محسوس ہوتا ہے
کسی فردوس کی صورت
محبت اداس کی صورت
عجبت اداس کی صورت
دلوں کی سرزمین پہ گھر کے آتی ہے ادب برستی ہے
چمن کا ذرہ ذرہ جھومتا ہے سکراتا ہے
اذل کی بے غموشی میں سبز سر اٹھاتا ہے
محبت ان کو بھی آباد اور شاداب کرتی ہے
جو دل میں قبر کی صورت

محبت اداس کی صورت
محبت آگ کی صورت
مجھے سینوں میں ملتی ہے تو دل بیدار ہوتے ہیں
محبت کی پیش میں کچھ عجب اسرار ہوتے ہیں
کہ جتنا یہ بھرتی ہے، غرض جاں بھرتی ہے
دلوں کے ساحلوں پر جمع ہوتی ہے اور بکھرتی ہے
محبت جھال کی صورت
محبت آگ کی صورت
محبت خواب کی صورت

آج کل ہماری نوجوان نسل کی — موبائل میسجز
میں سب سے ٹاپ پر بات ہوتی ہے محسن نقوی صلیب
کی۔ ان کی ایک شاندار سی غزل ماحولِ خدمت ہے۔
سے اس کو فرصت ہی نہیں وقت نکالے محسن
ایسے ہوتے ہیں بھلا چاہنے والے محسن؛

کھو گئی صبح کی امید اور اب لگتی ہے
کہ ہم نہیں ہوں گے جب ہوں گے اگلے محسن
حاکم وقت کہاں، میں کہاں، بدل کہاں
کیوں نہ خلقت کی زبان پر لگائیں تاملے محسن

جون ایلیا کی شاعری میں سادگی بھی ہے، پرکاری بھی۔
وہ بڑی بڑی باتیں بڑے سادہ الفاظ میں کہہ جاتے ہیں۔
نیا اک رشتہ پیدا کیوں کریں ہم
پھر مڑنا ہے تو جھگڑا کیوں کریں ہم

خوشی سے ادا ہو رسمِ دُردی
کوئی ہنگامہ برپا کیوں کریں ہم

نہیں ہے دُنیا کو جب پروا ہماری
تو پھر دُنیا کی پروا کیوں کریں ہم

برہنہ ہیں سرِ بازار تو کیا
بھلا اندھوں سے پردہ کیوں کریں ہم

احمد فراز کو جیتے جی ایسی شہرت ملی ہے جو افسانہ
لگتی ہے۔ زیادہ اہم بات یہ ہے کہ فراز کی شاعری کے
اوصاف اور محاسن کی بنیادوں تک پہنچنے کی کوئی
باضابطہ کوشش ابھی تک نہیں ہوئی۔ غیر معمولی شہرت
اور بے تحاشا مقبولیت اس شاعری کا حجاب بن کر رہ
گئی ہے۔ احمد فراز کی ایک منفرد انداز کی غزل۔
وہ جو آجائے مجھے آنکھوں میں ستارے لے کر
جانے کس دلیں گئے خواب ہمارے لے کر

جھاؤں میں بیٹھے والے ہی تو سب سے پہلے
ہیر گرتا ہے تو آجاتے ہیں آدے لے کر

وہ جو آسودہ ساحل ہیں انہیں کیا معلوم
اب کے سورج آئی تو پلٹے گی کنارے لے کر

ایسا لگتا ہے کہ ہر موسم ہجراں میں بہار
ہونٹ رکھ دیتی ہے شاخوں پہ تمہارے لے کر

شہر والوں کو کہاں یاد ہے وہ خواب فروش
پھر تارہا ہے جو گلیوں میں غبارے لے کر

نقدِ جاں صرف ہوا کلفتِ ہستی میں فراز
اب جو زندہ ہیں تو کچھ سانس اُدھار لے کر

آخر میں ایسا تعارف
میں نوال افضل گھمن صلیب گرامت سے متوازا آگے
نقد کرنا یا نوالہ کے جٹ زمیندار گھرانے سے تعلق ہے۔
انگریزی ادب میں ماسٹر ز جاری ہے۔ میرا انتخاب پسند
آیا یا نہیں، طے ضرور دیکھئے گا۔

افتخار عارف کے اشعار کے ساتھ اجازت چاہوں گی۔
عشق کیسا کہ بھر و سا بھی نہیں تھا شاید
اس سے میرا کوئی رشتہ بھی نہیں تھا شاید

خاک اُڑتے ہوئے بازاروں میں دیکھا ہے
میں کبھی گھر سے نکلتا بھی نہیں تھا شاید

زیست کہنے کے سب انداز اسے از بر تھے
مجھ کو مرنے کا سلیقہ بھی نہیں تھا شاید





عبدل اظہر

”کیسے ہیں۔ اور یہ بتائیں کہ ہر آرے کتنا ہے کہ اس کاروگرام سب سے زیادہ سنا جاتا ہے۔ حقیقت کیا ہے۔ کس طرح ہوتا ہے؟“

”جی! میں ٹھیک ہوں اور یہ بہت اچھا سوال کیا کہ بتا کیسے چلتا ہے اور سچ بات بتاؤں کہ میں ایسا نہیں سمجھتا، لیکن میں جس مارکیٹ کو ٹارگٹ کر رہا ہوں اس میں سب سے زیادہ پروگرام میرا ہی سنا جاتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ مجھے یہ بات کیسے پتا چلتی ہے تو اس کے تین چار طریقے ہوتے ہیں۔ ایک تو ہے ”فیس بک“ ”میری فیس بک“ میرے پرستاروں کی تعداد ساڑھے تین ہزار ہے۔ جب باقی لوگوں سے اس کا موازنہ کرتا ہوں تو پتا چلتا ہے کہ کسی کے آٹھ سو ہیں تو کسی کے چودہ سو ہیں۔ کسی کے مولہ سو تو اس سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ میرا پروگرام زیادہ سنا جاتا ہے۔ پھر دو سر اذریہ لوگ ہیں جن سے مجھے فیڈ بیک ملتا ہے۔ میں کہیں میٹنگ میں جاؤں یا کہیں بھی جاؤں لوگ بے ساختہ کہتے ہیں۔ آپ عبدل اظہر ہیں۔ لوگ مجھے آواز سے پہچان لیتے ہیں اور مجھے روزانہ ہی فیڈ بیک مل جاتا ہے۔ اور پھر جیسے میرے احباب ملتے ہیں تو وہ

میں اتفاقہ آگئی ہوں اور اللہ کا کام کرم ہے کہ اس نے مجھے اس میں بھی کامیاب کر دیا ہے۔“

”تم نے مجھے اپنے پہلے انٹرویو میں کہا تھا کہ تمہارے گھر والے راضی نہیں تھے کہ تم اس فیلڈ میں آؤ۔ اب گھر والوں کی رائے بدلی کہ نہیں؟“

”ہاں! اب سب راضی خوشی ہیں۔ ابتدا میں کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ کیونکہ میں اپنے خاندان کی واحد لڑکی ہوں جو اس فیلڈ میں آئی۔ میرے والد کا میرے بچپن میں ہی انتقال ہو چکا تھا۔ ساری ذمہ داری والدہ نے اٹھائی۔“

”شوہز میں اگر لڑکیاں بہت بدل جاتی ہیں۔ میں نے بہت سی لڑکیوں کو سب کے سامنے سکرین پر دیکھا ہے۔ تم؟“

”ارے نہیں! مجھے اپنی حدود پتا ہیں۔ سکرین نوشی اور اس طرح کی دوسری باتوں سے دور رہتی ہوں اور ویسے بھی اپنے کام سے کام رکھتی ہوں۔ اللہ تعالیٰ مجھے بری عادتوں سے محفوظ ہی رکھے۔ میں اندر سے ایک مشقی لڑکی ہوں۔“

”گنڈ اس مشقی لڑکی کو اگر شادی کے بعد شوہز میں کام کرنے کی اجازت نہ ملی تو؟“

”اجازت نہ ملی تو کوئی مسئلہ نہیں۔ میں شوہز چھوڑ دوں گی۔ کیونکہ لڑکی کے لیے اس کا گھر اس کا شوہر اور اس کے بچے سب سے زیادہ اہم ہوتے ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ میرے ساتھ ایسا نہیں ہو گا اور ہو بھی گیا تو کوئی مسئلہ نہیں۔“

”تو پھر پسند کو ہی ترجیح دو گی؟“

”جو مقدر میں ہو گا وہی ہو گا۔ شادی بیاہ کا معاملہ تو خالصتاً اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ جو وہ کرے گا ہمارے حق میں وہی بہتر ہو گا۔ بس میری دعا ہے کہ جو بھی میرا شریک سفر ہو وہ میرے حق میں بہتر ہو۔ ایمان دار پڑھا لکھا اور قلمی ہو۔ انڈر اسٹینڈنگ ہو۔“

”ہماری دعا ہے کہ تمہیں ایسا ہی شریک سفر ملے۔“

دستک دستک دستک

شاین رشید

مباشر

”کیسی ہو؟“

”ٹھیک ٹھاکہ! اللہ کا شکر ہے۔“

”آپ تو خیر ہے؟ ہم سب امید سے ہیں تمہاری پہچان سن گیا ہے۔ لیکن یہ بتاؤ کہ اس پروگرام کے لیے تمہارا انتخاب کیسے ہوا؟“

”بہت ہی اتفاقہ اس پروگرام میں آگئی۔ ہوا یوں کہ کسی کام کے سلسلے میں ڈاکٹر نوٹس بٹ کے پاس جانے کا اتفاق ہوا۔ اور ہر ادرہ کی باتوں کے بعد اچانک ہی ڈاکٹر صاحب نے کہا تم ”ہم سب امید سے ہیں“ کی ہوسٹ بنو گی؟ میں نے کہا کہ شاید آپ مذاق کر رہے ہیں۔ کہنے لگے، نہیں! میں سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں اور جب انہوں نے فورس کیا تو میں نے کہا کہ ٹھیک ہے جیسے آپ کہیں اور یوں میں ”ہم سب امید سے ہیں“ کی ہوسٹ بن گئی۔“

”اس پروگرام کو نیم سیاسی پروگرام کہیں تو غلط نہ ہو گا۔ تو اس کے لیے سیاست کی شدید بھی ضروری ہے۔ تمہیں ہے سیاست سے دلچسپی؟“

”سچ بات بتاؤں۔ مجھے سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ لیکن جب مجھے یہ پروگرام ملا تو اس کو اچھے طریقے سے کرنے کے لیے میں نے تھوڑی بہت سیاست میں دلچسپی لینا شروع کی تاکہ اس پروگرام کو اچھے طریقے سے کر سکوں۔ اور اب آپ کو کبھی ایسا نہیں لگتا ہو گا کہ مجھے سیاست سے دلچسپی نہیں ہے۔“

”سیاست سے دلچسپی کے لیے کیا کر لی ہو مطالعہ یا

”ملاقاتیں؟“

”نہیں۔ نہیں! نہ مطالعہ نہ ملاقاتیں۔ باقاعدگی کے ساتھ نیوز چینلز پر خبریں دیکھتی ہوں اور خبروں سے مجھے کافی اندازہ ہو جاتا ہے کہ سیاست کیسی چل رہی ہے۔“

”اپنا یہ پروگرام خود کھا کبھی؟ اور کتنے پروگراموں کا معاہدہ ہوا تھا؟“

”بالکل جی۔ اپنا پروگرام ضرور دیکھتی ہوں اور مجھے بہت مزا آتا ہے اپنا پروگرام دیکھ کر۔ ابتدا میں تیو پروگرام یعنی تین ماہ کا معاہدہ ہوا تھا۔ لیکن سب کو میرا انداز انا پسند آیا اور اتنی تقریفیں ای میلز آئیں اور ہر جگہ سے اتنے اچھے ریماں کس ملے تو پھر اس پروگرام کو کیسے چھوڑ سکتی تھی۔ ہاں جب لوگ کہیں گے کہ چھوڑ دو تو چھوڑ دوں گی۔“

”اتنی عزت۔ اتنی شہرت۔ کبھی سوچا کہ میں بہت بڑی چیز ہو گئی ہوں؟“

”نہیں کبھی نہیں۔ اور کیوں ایسا سوچوں۔ اس میں میرا کیا کمال ہے۔ یہ سب کچھ خدا نے مجھے دیا ہے۔ میں اس کی شکر گزار ہوں۔ میں ایسا سوچ کر ان نعمتوں کو کھونا نہیں چاہتی کیونکہ ناشکری خدا کو سخت ناپسند ہے۔“

”ہو شنگ ماڈلنگ اور اکاری کس خانے میں اپنے آپ کو فٹ سمجھتی ہو؟“

”اپنے فنی سفر کا آغاز میں نے ماڈلنگ سے کیا تھا۔ لیکن درحقیقت مجھے اکاری کا ہی شوق تھا اور میں اپنے آپ کو اکاری کے خانے میں ہی فٹ سمجھتی ہوں اور جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا کہ ہو شنگ میں تو

بھی بتاتے ہیں کہ ہماری کہنی میں روزانہ تمہارا پروگرام سب لوگ سنتے ہیں اور لُچ میں تمہارے پروگرام کے ٹاپک پہ ہی ڈسکس کر رہے ہوتے ہیں۔ اس طرح بتا چلتا رہتا ہے۔

”کمر شکنز سے بھی اندازہ ہوتا ہو گا؟“

”جی بالکل! ایڈز بھی سب سے زیادہ میرے ہی پروگرام کو ملتے ہیں اور جب میڈیا بائنگ ہاؤسز کہتے ہیں کہ جی ہمیں عدیل اظہر کے پروگرام کے لیے ایڈز دینا ہے۔ تو اس کا مطلب ہے واقعی مجھے بہت لوگ سنتے ہیں۔“

”آپ شاید بیوی پہ بھی آتے ہیں؟“

”جی بالکل! میں آتا ہوں بیوی پہ مگر بہت کم۔ بیوی پہ بہت مخصوص پروگرام کرتا ہوں۔ بیوی سے اسپورٹس کے لائیو پروگرام کرتا ہوں اور چونکہ بیوی بیوی بہت کم دیکھا جاتا ہے اس لیے زیادہ تر لوگوں نے میری جگہ نہیں دیکھی ہوگی۔ اور آج کل نہیں بلکہ ایک زمانے سے بیوی بیوی اسپورٹس کے لائیو پروگرام کر رہا ہوں۔“

”شہر میں نہیں، لیکن اندرون شہر تو بیوی بہت دیکھا جاتا ہے۔“

”جی بالکل۔ مانسہرہ، ٹوبہ ٹیک سنگھ، فیصل آباد وغیرہ اور ایسے ہی بے شمار چھوٹے چھوٹے شہر اور دیہات میں گاؤں میں بیوی بیوی دیکھا جاتا ہے اور اس کا اندازہ مجھے آنے والی امی مہلڑ سے ہوتا ہے اور بڑے شہروں میں ان لوگوں کی امی مہلڑ آتی ہیں جہاں گھروں میں کیبل دیکھنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ اور بیوی بیوی پہ ایک مخصوص ٹیم ہے جس کے ساتھ میں کام کرتا ہوں۔ بیوی بیوی میں شاید شعیب رضوی اسپورٹس پروگرام کی ہیڈ ہیں۔ وہ مجھے بلاتی ہیں تو مجھے جانا پڑتا ہے کیونکہ میں ان کو منع نہیں کر سکتا۔ اور اس طرح بیوی کا تھوڑا بہت شوق پورا ہو جاتا ہے۔“

”دیگر چینل یہ کیوں نہیں آتے؟“

”اس لیے کہ ٹائم نہیں ہے۔ یا تو پھر یہ ہو کہ انسان مکمل طور پر بیوی کی طرف آجائے مگر ایسا میں کر نہیں سکتا۔ کیونکہ میں جاب بھی کرتا ہوں جو کہ فل ٹائم ہے۔ بس میں ایک ہی ایکٹیوٹی کے لیے ٹائم نکال سکتا ہوں اور وہ صرف اور صرف ریڈیو ہے۔ اگر اس سے زیادہ میں نے کام شروع کر دیا تو پھر میری فیملی لائف ڈسٹرب ہو جائے گی۔“

”اس کا مطلب ہے کہ چھٹی کا دن فیملی کے ساتھ ہی گزر رہا ہو گا؟“

”جی بالکل! چھٹی کا سارا دن فیملی کے ساتھ گزرتا ہے۔ ہمارے صاحب زادے بہت خوش ہوتے ہیں کہ آج ان کے ”بلیا“ گھر پر ہیں۔ چھٹی کے دن کہیں نہ کہیں ضرور جاتے ہیں اور ہفتہ کی شب تو گھر سے باہر کھانا کھانے بھی ضرور جاتے ہیں۔ اور اتوار کے دن زیادہ تر تو ڈراموں اور لڈ چلے جاتے ہیں یا پھر کسی رشتے دار کے یہاں چلے جاتے ہیں۔“

”سارا ہفتہ کام اور پھر اتوار کو گھومنا پھرنا۔ آرام کرنے کو دل نہیں چاہتا کیا؟“

”میری ذاتی طور پر خواہش ہوتی ہے کہ میں گھر پر رہوں۔ خاص طور پر اتوار کے دن۔ کیونکہ سارا ہفتہ کام کر کے کلنی سکھن ہو جاتی ہے۔“

”کہاؤں پروگرام کے ساتھ مڑا آتا ہے یا سنگل پروگرام میں؟“

”مجھے کہاؤں پروگرام میں بھی مڑا آتا ہے اور سنگل میں بھی۔ کہاؤں پروگرام کرنے کے لیے جس کے ساتھ ہم پروگرام کر رہے ہیں اس کے ساتھ کیمسٹری کا ہونا بہت ضروری ہے۔ میری، سیکنہ اور دانش کی کیمسٹری بہت زبردست ہے۔“

”عدیل اظہر آپ سے بات کر کے بہت اچھا لگا۔“



گھٹا کی سیوندی میرے دل کا چھلکا

مہرِ الطاف احمد کراچی
کھڑے ہیں مگر سب سے پہلے کھڑے ہیں
زمانے کو ہم راستہ دینے والے
نیلِ شہزادی کوٹ مومن
نہم اس کو پاتے ہوئے خود کو کھونے لگتے ہیں
بہت سے وقت اک ساتھ ہونے لگتے ہیں
ہم اپنے عشق میں شاید ابھی اُدھوے ہیں
بلا جواز پریشان ہونے لگتے ہیں

ایمن فاطمہ گوجرانوالہ
مجھ سے کچھ بھی نہیں کہا اس نے
ہم سفر اور جن لیا اس نے
عائشہ ندیم کشنچ پیر محل
دیا جلا کر گئے تھے ہم تو
تمام گھر میں دھواں دھواں ہے
عالیہ توصیف حویلی بہادر شاہ
کہیں الفاظ خالی ہو گئے ہیں
کہیں لبجوں میں ویرانی بہت ہے
تسللِ وقت کا جاری ہے اب تک
یہ دنیا اب بھی امرکا کی بہت ہے

آنند مقدس فیصل آباد
دھواں یار کے لمحے شمار کیا کرتے
دو ایک پل تھے جنہیں بے حساب لگتے تھے
روینہ کوثر ملتان
ہر ایک خواب ہو گیا، خیال جاگتے رہے
جواب بی لیے مگر سوال جاگتے رہے
کوئی جواز دھونڈتے خیال ہی نہیں رہا
تمام عمر بونہی بے خیال جاگتے رہے

عائشہ رانجھا کھنڈ سیال (ڈسک)
ذرا سی دیر میں دل میں اترنے والے لوگ
ذرا سی دیر میں دل سے اتر بھی جاتے ہیں

مدیر شہزاد بکٹ۔ ایم۔ ایل
راہ ہستی کے اس جلتے سفر میں
تمہاری یاد کا سایہ بہت ہے
اقرا نوید اوکاڑہ
تسلیم عشق تھا سب اس کے ساتھ ہونے تک
خمسال وردہ آیا نجات ہونے تک
ملا تھا، بحر کے رستے میں صبح کی مانند
پھوٹ گیا تھا مسافر سے رات، ہونے تک

شازیہ رانا پاک پتن شریف
علم و حکمت کا جنہیں شوق ہو وہ آئیں نہ ادھر
فلسفہ عشق میں کچھ بھی نہیں حیرت کے ہوا
عائشہ رانجھا کھنڈ سیال
یہ شہر نقیڈ گراں، یہاں نہ شیشہ نہ سنگ
کوئی بھی نقش یہاں معتبر نہیں ہوتا
خدا دراز کرے عمر مومنِ طوفان کی
سمندرِ دل میں کوئی در بدر نہیں ہوتا

تمرا، اقرا کراچی
اہل دل اور بھی ہیں اہل وفا اور بھی ہیں
ایک ہم ہی نہیں دنیا سے خفا اور بھی ہیں
شامہ عنایت چغتائی بلتھ ٹاؤن
تھا بہت غدا اور اکیلے ہم شبِ غم بھی میری طویل تر
میری زندگی بھی سرب اور میری آنکھ تر بڑی دیر تک
یہاں ہر طرف ہے عجب سماں بھی خود پسند بھی خود نما
دل بے قرار کو نہ مل سکا کوئی چارہ گر بڑی دیر تک

نوال افضل گھمن بکرات
ایک لمحہ ملا تھا کھونے کو
زندگی کی بات کیا کرتے



ابھی موڈ نہیں ہے

ہماری فلمی صنعت کام نہ ہونے کے باعث دیرینہ سنسن بڑی رہتی ہے۔ بھلا ہو ہماری فلمی ہیروئنوں کا کہ وہ اسٹینڈل کی چمکیں بڑیاں چھوڑ کر کچھ نہ کچھ ہلچل مچائے رکھتی ہیں۔ اب چاہے ان چنگاریوں کی زد میں کوئی آئے یا کسی کا ٹیٹھن جل اٹھے، ان کا مقصد تو محض سستی شہرت حاصل کرنا ہوتا ہے۔ خاص طور پر دینا ملک اور میرا ان کے پاس شہرت حاصل کرنے کے لیے اسٹینڈل ہی تو ہیں۔ (دونوں میں ایک اور مشترک چیز "شہمت پائل" بھی ہیں۔) میرا نے آج کل میدان مارا ہوا ہے اور وہ خبروں میں پوری طرح سے "مہن" ہیں۔ میرا بے حد مودب اداکار ہیں، سودا اپنے

سینئرز کو خاصا مان دیتی ہیں، خاص طور پر ریماکو۔ لہذا وہ ان کے نقش قدم پر چلنا ضروری سمجھتی ہیں۔ (آپ اسے نقل کرنا بھی کہہ سکتے ہیں۔) ریمانے ہرن کے نیچے گود لیے تو میرا نے بھی لے ڈالے۔ ریمانے امریکی ڈاکٹر کا انتخاب کیا تو میرا نے فوراً امریکی پائلٹ نوید پرویز سے منگنی کر ڈالی۔ مگر جناب! جلد ہی نوید پرویز کے والد منظر نامے میں کودے اور پرمکساری۔ "یہ شادی نہیں ہو سکتی اے سو بنیا!" پھر تو بیان بازی کا ایک بازار کرم ہو گیا، جس میں نوید پرویز ان کے والد اور میرا کے ساتھ ان کی والدہ بھی کود پڑیں۔

نوید پرویز ان دنوں بنگلہ دیش میں تھے، مگر ان پر پاکستانی ساتھ میرا کا جادو ایسا سرچڑھ کے بولا کہ وہ فوراً پاکستان آ پہنچے اور میرا کی حمایت میں ایک پریس کانفرنس کر ڈالی۔ بیٹے کو ہاتھ سے جاتا دیکھ کر راجہ پرویز نے فوراً "پینٹر ابدال" (بانی بجلی والے نہیں، بلکہ میرا کے متوقع سسر) اور انہوں نے جولائی کے آخر میں اداکارہ میرا اور نوید پرویز کے نکاح کا اعلان کر دیا۔ اس پر میرا بدک گئیں کہ وہ فی الحال شادی کرنے کے موڈ میں نہیں ہیں اور موڈ ہو بھی کیونکر کہنا گیا ہے، میرا کچھ عرصے سے لاہور میں نوید پرویز کے ساتھ ان کے ٹاؤن شپ والے گھر میں میم ہیں۔ (اب ان دونوں کی شادی ہو چکی ہے یا وہ ایسے ہی رہ رہے ہیں، یہ خود میرا جانیں یا نوید پرویز۔ ہم تو بس اتنا جانتے ہیں کہ ہمارے مذہب و روایات میں ایسی گنجائش نہیں۔)

ششماہی



رسائل اور جرائد کی دنیا میں آپ نے ہفت روزہ اور ماہنامہ وغیرہ کی اصطلاح تو سنی ہوگی۔ کچھ پرچے سر باہی اور ششماہی بھی نکلتے ہیں تو کچھ پرچے اپنا سالنامہ نمبر بھی بڑے اہتمام سے نکالتے ہیں، تاہم ایوارڈ کی دنیا میں ایسی اصطلاحات نہیں پائی جاتیں کہ ایوارڈز تو عرف عام میں سال بھر کی شاندار کارکردگی کا صلہ ہی سمجھے جاتے ہیں۔ اسی لیے ایک بار ایوارڈ حاصل کرنے کے بعد فنکار اگلا سارا سال بے چین رہتے ہیں کہ دیکھیں! آئندہ سال ایوارڈ کا تلج کس کے سر پر جتا ہے۔ لیکن جناب! ایک ایوارڈ ایسا بھی ہے کہ جسے حاصل کرنے والے سے زیادہ دینے والے بے چین رہتے ہیں۔ اسی لیے تو وہ ایوارڈ کی تقریب سال میں دو مرتبہ کرتے ہیں۔ گویا یہ ایوارڈ سال بھر کی نہیں، بلکہ چھ ماہ کی کارکردگی پر دیے جاتے ہیں۔ یہ ایوارڈ ہیں "بولان ایوارڈ" (کیوں نہ انہیں "ششماہی ایوارڈ" کا نام دے دیا جائے) بولان ایوارڈ کے منتظمین کو اکثر حکومتوں سے سرپرستی نہ کرنے کا گلہ رہا ہے۔ کئی مرتبہ یہ ایوارڈ بند کرنے کا ارادہ بھی ظاہر کیا گیا، تاہم ترج حالات تو وہی ہیں۔ (بلکہ شاید پہلے سے بھی بدتر) لیکن یہ ایوارڈ سال میں دو مرتبہ دیے جا رہے ہیں تو یہ یقیناً خوش کن امر ہے۔

(کاش! کسی سرکاری سرپرستی کے بغیر وطن عزیز

کے سارے مسائل بھی اسی طرح حل ہو جائیں)

ٹیلنٹ کی سرپرستی بدلتی

خوش قسمتی سے ہمارے ملک کی سرزمین بے حد زرخیز ہے۔ زراعت کے اعتبار سے بھی اور صلاحیتوں کے لحاظ سے بھی۔ لیکن یہ شتم ظریفی ہے یا ہماری کوتاہ نظری کہ ہمارا ٹیلنٹ ہمیں بھارتی رپر میں لپٹا ہوا ملتا ہے تو ہم تب ہی اس کی قدر کرتے ہیں۔ ابھرتے ہوئے گلوکار نعمان جاوید بھی ایسی ہی مثال ہیں۔

ہمارے وطن میں ان کے نام سے عام شائقین موسیقی ابھی آشنا تک نہیں، تاہم موصوف دو عدد بھارتی فلموں میں اپنی آواز کا جلاو جگا چکے ہیں۔ (بس ہم ہی سوئے رہے) نعمان نے حال ہی میں یہاں ایک ویڈیو البم بنائی ہے جو ریلیز ہو چکی ہے۔ اس البم میں ان کے ساتھ فریہ پرویز بھی شامل ہیں۔ تاہم خبر یہ ہے کہ نعمان جاوید اور فریہ پرویز کا دو گانا ایک بھارتی فلم میں جا رہا ہے۔ دیکھیں ہمارے ٹیلنٹ کی یہ بدلتی سرپرستی کب تک جاری رہتی ہے۔

پہلی مرتبہ

ہیرک شاہ ہماری فلموں کے معروف اداکار ہیں۔ کچھ عرصہ قبل وہ ایک معروف ٹی وی چینل کے یوگرام



☆ میں شریک ہوئے تو دنیا ملک کے لیے خوب بولے انہوں نے دنیا سے محبت کا اعتراف کرتے ہوئے اس بات کا اعلان کیا کہ وہ اب بھی ان سے شادی کرنے کے لیے تیار ہیں۔ اس سے جہاں اور کئی دل ٹوٹے ہوں گے وہیں غالباً ان کی بیگم نے بھی نوکس لیا ہوگا جب ہی تو شادی کے بعد وہ پہلی مرتبہ کسی تقریب میں بہرک کے ساتھ نظر آئیں۔ گزشتہ دنوں لاہور میں "ایشین کچل انکسپنس ایوارڈ" کی تقریب منعقد ہوئی۔ اس میں بہرک شاہ کو بھی ایوارڈ ملتا تھا۔ اس موقع پر بہرک کی بیگم بھی ان کی خوشی میں شریک ہونے (یا شاید ان پر نظر رکھنے) موجود تھیں۔ دلچسپ امر یہ ہے بیگم بہرک شاہ نہایت مذہب انداز میں مکمل ڈھکی چھپی نظر آئیں۔ (ہائیں! لیکن بہرک کی پسند تو ہے)

(حرف راز۔ اوریا مقبول جان)

☆ اداکارہ میرا سے میرے بیٹے کیپٹن نوید کو خطروہ ہے مجھے خدشہ ہے کہ اداکارہ میرا اپنے بھائی احسن اور والدہ شفقت زہرا کی مدد سے میرے بیٹے کیپٹن نوید کو اغوا کر لیں گی یا اس کو جانی نقصان پہنچا سکتی ہیں۔

(کیپٹن نوید کے والد کی وزیراعلیٰ پنجاب کو درخواست) مٹا ملک ریاض حسین سے ہمارے دیرینہ خاندانی تعلقات ہیں۔ ملک ریاض سیلف میڈ آدمی ہیں۔

(مسلم لیگ ق کے صدر چوہدری شجاعت حسین) ☆ اس میں کوئی شک نہیں کہ پاکستان کرپشن میں

ڈوبا ہوا ہے۔ وہاں جو تپاش کرنے والے سے اقتدار کے ایوان میں اعلیٰ ترین مسند پر بیٹھی ہوئی شخصیت تک سب ہی کرپٹ ہیں۔

(انڈی پینڈینٹ۔ رابرٹ ہلسک)

"کراچی میں بھتہ وصول کرنے والوں میں تمام ہی قسم کے لوگ شامل ہیں جن کی سرپرستی سیاسی جماعتیں اور اسٹیبلشمنٹ کرتی ہے مسئلہ یہ ہے کہ اب بھتہ لینے والے اسٹیبلشمنٹ ہولڈرز بڑھ گئے، جھگڑا اسی بات پر ہے"

(توصیف احمد خان)

○ لال مسجد اور اکبر بگٹی کا خون جس کے سر ہو ہم اس شخص سے کیسے اتھلا کر سکتے ہیں۔ (عمران خان کا برکھادت کو انٹرویو)



کچھ ادھر ادھر سے

☆ کراچی میں سندھیوں کی ایک ریٹی براندھند فارنگ سے 11 افراد مارے گئے۔ یہی وہ تشدد ہے جو شر کو بر غل بنائے رہتا ہے۔

☆ پاکستان کے ایک فیشن شو میں بھارتی اداکارہ کترینا شرک کرنا چاہتی تھی لیکن اسے دیرا اس شرط پر مل رہا تھا کہ اسے ایک حاضر منسٹر کے ساتھ ڈنر کرنا ہوگا۔ کترینا نے انکار کر دیا تو اسے دیرا نہیں دیا گیا۔

☆ پاکستان کے الیکٹرانک میڈیا کا سب سے مظلوم شکار "اسلام" ہے۔ وہ اسے جب جس وقت اور جہاں چاہے ٹھیسٹ گئے درمیان میں لے آتا ہے۔ ایک گھنٹے کا تمنا لگتا ہے۔ میرے ملک کے سارے لوگ علماء کو پکڑ پکڑ کر لایا جاتا ہے جن سے ان تمام ظالمانہ اور جاہلانہ رسوم کو جن سے اسلام کا دور کا بھی واسطہ نہیں اسلام اور مولوی کے کھاتے میں ڈال کر بدنامی کی مر لگادی جاتی ہے۔

(حرف راز۔ اوریا مقبول جان)

حضرت عزیر علیہ السلام

حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے سو سال کے بعد دوبارہ زندہ کیا تھا وہ حضرت عزیر علیہ السلام ہی تھے۔

حضرت وہب بن منبہ رحمۃ اللہ سے روایت ہے کہ عزیر علیہ السلام ایک دانہ اور مٹی آدمی تھے۔ ایک دن اپنے گھیتوں میں ان کی دیکھ بھال کے لیے تشریف لے گئے۔ واپسی پر ایک کھنڈر کے پاس سے گزر رہے تھے کہ وہاں کی شدید گرمی سے بچنے کے لیے کھنڈر میں چلے گئے۔ آپ اپنے گدھے سے نیچے اتر آئے۔

آپ کے پاس ایک ٹوکری میں انجیر اور ایک ٹوکری میں انگور تھے۔ آپ نے ایک دیران عمارت کے سائے میں بیٹھ کر اپنا پالہ لیا۔ پالے میں انگوروں کو نچوڑ کر رس نکال لیا۔ پھر آپ گئے پاس جو خشک روٹی تھی وہ لے کر رس میں ڈال دی تاکہ وہ نرم ہو جائے تو کھالیں۔

پھر آپ دیوار سے پاؤں لگا کر چت لیٹ گئے۔ آپ کی نظر چھت پر پڑی۔ دیکھا کہ چھت تو قائم ہے لیکن اس کے نیچے زندگی گزارنے والوں کی صرف بوسیدہ ہڈیاں موجود ہیں۔ تب فرمایا۔

ترجمہ: اس کی موت کے بعد اللہ تعالیٰ اسے کس طرح زندہ کرے گا؟

(البقرہ 2/259)

یہ شک کے طور پر نہیں بلکہ تعجب کے طور پر فرمایا تھا اللہ تعالیٰ نے موت کا فرشتہ بھیجا۔ اس نے آپ کی روح قبض کر لی اور آپ سو سال تک فوت شدہ حالت میں رہے۔ اس ایک صدی کی مدت میں بنی اسرائیل

کو طرح طرح کے واقعات پیش آئے۔

جب سو سال گزر گئے تو اللہ تعالیٰ نے حضرت عزیر علیہ السلام کی طرف ایک فرشتہ بھیجا۔ اس نے آپ کا دل پیدا کیا تاکہ آپ سمجھ سکیں اور آنکھیں پیدا کیں تاکہ سب کچھ دیکھ کر سمجھیں کہ اللہ تعالیٰ مردوں کو کس طرح زندہ کرے گا۔ پھر آپ کے دیکھتے دیکھتے آپ کا جسم مبارک مکمل کیا گیا۔ ہڈیوں پر گوشت پوست اور بال بن گئے، پھر جسم میں روح ڈالی گئی اور آپ یہ سب کچھ دیکھ اور سمجھ رہے تھے۔ جب آپ اٹھ کر بیٹھ گئے تو فرشتے نے آپ سے کہا۔

"آپ کتنا عرصہ یہاں رہے؟" آپ نے فرمایا۔ "ایک دن ٹھہرا ہوں یا اس سے بھی کم۔"

کیونکہ وہاں سے پہلے یہاں رکے تھے اور جب اٹھے تو شام کا وقت تھا۔ ابھی سورج غروب نہیں ہوا تھا۔

فرشتے نے کہا۔ "آپ یہاں ایک سو سال رہے ہیں۔ اپنے کھانے پینے کو دیکھیے!"

یعنی وہ خشک روٹی اور انگور کا رس دیکھا تو وہ دونوں چیزیں اسی طرح تھیں۔ رس خراب نہیں ہوا تھا اور روٹی ابھی تک خشک تھی نرم نہیں ہوئی۔

اسی لیے فرمایا۔ "بالکل خراب نہیں ہوا۔" یعنی اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ انجیر اور انگور بھی تازہ حالت میں تھے۔ آپ کے دل میں خیال آیا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ تو فرشتے نے کہا۔ "اپنے گدھے کی طرف دیکھیے!"

دیکھا تو اس کی صرف بوسیدہ ہڈیاں پڑی تھیں۔ فرشتے نے ہڈیوں کو آواز دی تو وہ ہر طرف سے اٹھ کر آ گئیں۔ فرشتے نے انہیں عزیر علیہ السلام کے سامنے اپنے اپنے مقام پر جوڑا۔ پھر ان پر رکیں اور پیٹھے لگائے۔ پھر ان پر گوشت آگیا۔ پھر جلد اور بال پیدا ہو گئے۔ پھر فرشتے نے پھونک ماری تو گدھا آسمان کی طرف سر اور کان اٹھا کر بولنے لگا۔ وہ سمجھا کہ قیامت آگئی ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

ترجمہ: ”اور اسے گدھے کو بھی دیکھ! ہم تجھے لوگوں کے لیے ایک نشانی بناتے ہیں اور تو دیکھ! ہم ہڈیوں کو کس طرح جوڑتے ہیں؟ پھر ان پر گوشت چڑھاتے ہیں؟“

یعنی گدھے کی ہڈیوں کو دیکھ، کس طرح ایک دوسری کے ساتھ جڑتی چلی جا رہی ہیں۔ جب پورا ڈھانچا بن گیا تو فرمایا۔

اب دیکھ! ہم اس پر کس طرح گوشت چڑھاتے ہیں۔ ”جب یہ سب ظاہر ہو چکا تو آپ کہنے لگے۔“

”میں جانتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز قادر ہے۔“ آپ گدھے پر سوار ہو کر اپنے محلے میں آئے تو لوگوں نے آپ کو نہ پہچانا اور آپ کو بھی کوئی شناسا چہو نظر نہ آیا۔ آپ کو اپنے گھر کا بھی پتا نہیں چل رہا تھا۔ چلتے ہوئے کسی اور طرف نکل گئے۔ آخر اپنے گھر پہنچے تو دیکھا وہاں ایک اندھی پانچ بڑھیا بیٹھی ہوئی ہے جس کی عمر ایک سو بیس سال ہو چکی تھی۔ وہ آپ کی لونڈی تھی۔ جب آپ گھر سے نکلے تھے تو وہ بیس سال کی تھی۔ آپ نے اس کو پہچان لیا۔ آپ نے اس سے کہا۔

”اللہ کی بندی! کیا عزیر کا گھر یہی ہے؟“ اس نے کہا۔ ”ہاں! یہی عزیر علیہ السلام کا گھر ہے!“ یہ کہہ کر وہ رو پڑی، پھر بولی۔

”موتوں سے کسی نے عزیر علیہ السلام کا نام بھی نہیں لیا۔ لوگ انہیں بھول گئے۔“

آپ نے فرمایا۔ ”میں ہی عزیر ہوں۔ اللہ نے مجھے سو سال مرہ حالت میں رکھنے کے بعد دوبارہ زندگی دے دی ہے۔“

اس نے کہا۔ ”سبحان اللہ! عزیر علیہ السلام تو سو سال سے لاپتہ ہیں۔ ہمیں ان کا کوئی سراغ نہیں ملا۔“ آپ نے فرمایا۔ ”میں ہی عزیر ہوں۔“

وہ بولی ”عزیر تو مستجاب الدعوات تھے۔ ان کی دعا سے بیماروں کو شفا ہو جاتی تھی لہذا آپ عافرا میں کہ اللہ جیسے آنکھیں دیے دے تاکہ آپ کی زیارت کر سکیں۔ اگر آپ واقعی عزیر علیہ السلام ہیں تو میں آپ کو پہچان لوں گی۔“

آپ نے دعا کر کے اس کی آنکھوں پر ہاتھ پھیرا تو اس کی آنکھیں روشن ہو گئیں۔ آپ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا۔

”اللہ کے حکم سے اٹھ کر کھڑی ہو!“

اللہ نے اس کی ٹانگیں درست کر دیں۔ وہ تندرست ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے آپ کے چہو مبارک پر نظر ڈالی اور بولی۔

”میں گواہی دیتی ہوں کہ آپ عزیر علیہ السلام ہی ہیں۔“

وہ بنی اسرائیل کے چوہاں اور ان کی مجلس میں گئی۔ مجلس میں عزیر علیہ السلام کا ایک بیٹا موجود تھا جو ایک سو اٹھارہ سال کا بوڑھا تھا۔ آپ کے پوتے جو مجلس میں موجود تھے وہ بھی سب بوڑھے تھے۔ اس نے انہیں پکار کر کہا۔

”یہ دیکھو! عزیر علیہ السلام تشریف لے آئے ہیں۔“ انہیں یقین نہ آیا۔ اس نے کہا۔

”میں تمہاری فلاں لونڈی ہوں۔ عزیر علیہ السلام کی دعا سے مجھے بصارت مل گئی اور میں چلنے پھرنے کے قابل ہو گئی ہوں۔ وہ فرماتے ہیں کہ اللہ نے ان کو سو سال کے بعد زندہ کر دیا ہے۔“

لوگ اٹھ کر آپ کے پاس آئے اور دیکھنے لگے۔ آپ کے بیٹے نے کہا۔

”ابا جان کے کندھوں کے درمیان ایک تل تھا۔“ آپ نے کندھوں سے پکڑا ہٹایا تو وہ علامت موجود تھی۔

لوگوں نے کہا۔

”ہماری قوم میں عزیر علیہ السلام کے موا کسی کو

توریت زبانی یاد تھیں تھی۔ تحریری نسخہ بخت نصر نے نذر آتش کر دیا۔ اب کسی کسی آدمی کو توریت کے تھوڑے تھوڑے اجزاء یاد ہیں۔ آپ ہمیں دوبارہ توریت لکھ دیں۔“

حضرت عزیر علیہ السلام کے والد نے بخت نصر کے زمانے میں توریت ایک محفوظ مقام پر چھپا دی تھی جس کا علم عزیر علیہ السلام کے موا کسی کو نہ تھا۔ آپ لوگوں کو وہاں لے گئے اور وہ نسخہ نکال دیا۔ اس کے ورق بوسیدہ ہو گئے تھے اور الفاظ مٹ گئے تھے۔

آپ ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ بنی اسرائیل آپ کے ارد گرد جمع تھے۔ آسمان سے دو شباب آئے اور آپ کے پیٹ میں داخل ہو گئے۔ فوراً آپ کو یومی توریت یاد ہو گئی اور آپ نے نئے سرے سے لکھ کر بنی اسرائیل کو دی۔ اسی لیے بنی اسرائیل نے آپ کو اللہ کا بیٹا قرار دیا۔ یہ واقعہ سواد (عراق) کے علاقے میں دیر حزقیل کے مقام پر پیش آیا۔ آپ کی وفات مائرا آباد میں ہوئی۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مطابق قرآن پاک میں۔ اور تاکہ ہم تجھے لوگوں کے لیے نشانی بنائیں۔“

میں ”لوگوں“ سے مراد ہے ”بنی اسرائیل“ کیونکہ جب آپ اپنے بیٹوں کے ساتھ بیٹھے ہوتے تھے آپ تو جوان ہوتے تھے اور آپ کے بیٹے بوڑھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ جب فوت ہو گئے تھے تو آپ کی عمر چالیس سال تھی۔ پھر جب آپ کو اللہ تعالیٰ نے دوبارہ زندہ کیا تو آپ کی حالت وہی جوانی والی تھی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ بخت نصر کے زمانے کے بعد زندہ ہوئے۔

حضرت عزیر علیہ السلام کا زمانہ نبوت

مشہور قول کے مطابق عزیر علیہ السلام بنی اسرائیل کے نبی تھے اور آپ کا زمانہ حضرت داؤد و سلیمان علیہ السلام اور ذکر کیا دینی علیہ السلام کے درمیان کا ہے۔ بنی اسرائیل میں کسی کو توریت یاد نہیں تھی۔ تب اللہ تعالیٰ نے آپ کو اللہ کے ذریعے

سے توریت سکھادی اور آپ نے حرف بہ حرف لکھوا دی۔

ابن عساکر رحمۃ اللہ نے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ایک روایت نقل کی ہے کہ آپ نے حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھا کہ یہودیوں نے عزیر علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا کون قرار دیا؟ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آپ کا توریت زبانی لکھنے کا واقعہ بیان کیا اور فرمایا۔ ”بنی اسرائیل کہتے تھے حضرت موسیٰ علیہ السلام تو ہمارے پاس بغیر لکیت کتاب (توریت) نہ لائے، عزیر علیہ السلام بغیر تحریر کے توریت لے آئے۔ اس لیے بعض لوگوں نے انہیں ”اللہ کا بیٹا“ کہہ دیا۔ اسی لیے بعض علماء نے فرمایا کہ توریت کا تواتر عزیر علیہ السلام کے زمانے میں منقطع ہو گیا۔

حضرت حسن رحمۃ اللہ کا قول ہے کہ حضرت عزیر علیہ السلام اور بخت نصر ایک ہی دور میں تھے۔ صحیح بخاری میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ”ابن مریم علیہ السلام کے ساتھ سب سے قریبی تعلق میرا ہے۔ انبیائے کرام ایک باپ کی اولاد ہیں۔ میرے اور ان (عیسیٰ) کے درمیان کوئی نبی نہیں۔“

حضرت وہب بن منبہ رحمۃ اللہ فرماتے ہیں۔ ”حضرت عزیر علیہ السلام کا زمانہ حضرت سلیمان علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے درمیان ہے۔“

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”ایک نبی کسی درخت کے نیچے ٹھہرے۔ انہیں ایک چوٹی نے کاٹ لیا۔ آپ نے ان چوٹیوں کو نکلا کر آگ سے جلوا دیا۔ اللہ تعالیٰ نے وحی فرمائی کہ ”کیوں نہ ایک ہی چوٹی کو سزا دی؟“

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حسن بصری رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ واقعہ حضرت عزیر علیہ السلام کا ہے۔ (واللہ اعلم)





موم کے پیکوان

خالد جیلانی

بھیل پوری

اجزا :
آلو
سیو
بھنی چنے کی دال
ہرا دھنیا
ہری مرچ
ابلے کالی چنے
لیموں کا رس
پاڑی
ترکیب :

آدھا کلو
ایک پائو
ایک پائو
آدھی چمٹھی
چار عدد
دک
چار کھانے کے چمچے
چھ عدد

ڈش میں سیو، چنے کی بھنی ہوئی دال، ابلے ہوئے کالی چنے اور آلو (ابل کر چوکور کاٹ لیں) ڈالیں۔ پاڑی کو چورا کر کے ڈال دیں، پھر ہرا دھنیا اور ہری مرچیں کتر کر ڈالیں اور لیموں کا رس ملا کر چمچے سے خوب اچھی طرح مکس کر لیں۔

ایک کپ دہی میں ایک چائے کا چمچ چینی، آدھا چائے کا چمچ کٹنا ہوا زیرہ اور حسب ذائقہ نمک ملا کر چینی بنا لیں۔
ایک کپ اہلی کے گودے میں ایک چائے کا چمچ چینی، آدھا چائے کا چمچ کٹی ہوئی مرچ اور حسب ذائقہ نمک ملا کر اہلی کی چینی بنا لیں۔
ان دونوں چینیوں کو بھیل پوری کے اوپر ڈال کر ہلکے ہاتھ سے مکس کریں اور مزے دار بھیل پوری سے لطف اٹھائیں۔

مکھنی ملائی ہانڈی

اجزا :
چکن
لسن اور ک پیٹ
پیاز بڑی
کریم
مکھن
سفید مرچ پاؤڈر
ایک کلو
دو کھانے کے چمچے
تین عدد
ایک کپ
چار کھانے کے چمچے
دو چائے کے چمچے

کٹنا زیرہ
لیموں کا رس
ہرا دھنیا
نمک
تیل
ترکیب :
بغیر مڈی کے چکن میں زیرہ، آدھی کریم اور حادی، سفید مرچ، لسن اور ک پیٹ، لیموں کا رس، ہری مرچ (کاٹ کر) اور ایک چوتھائی کپ تیل ڈال کر مکس کریں اور دو گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ اب یا تو اسے سج کر کے کوئلے کا دم دے دیں۔
الگ پتیلی میں باقی تیل گرم کریں۔ پیاز کو پیس کر بھونیں، پھر بقیہ دہی، نمک، ایک چمچ سفید مرچ ڈال کر فراکی چکن بھی ڈال دیں۔ تیل الگ ہو جائے تو کریم مکس کر کے پانچ منٹ کے لیے ہلکی آگ پر دم پر رکھ دیں۔

ڈش میں نکالتے وقت مکھن ڈال دیں اور کتری ہوئی ہری مرچ اور ہرے دھنیے سے سجاوٹ کر کے پیش کریں۔

خوبانی کا میٹھا

اجزا :
خوبانی
انجیر
الپانچی پاؤڈر
فریش کریم
ترکیب :
خوبانی اور انجیر میں دو کپ پانی اور الپانچی پاؤڈر ڈال کر آدھے گھنٹے تک ہلکی آگ پر پکا لیں۔ ٹھنڈا ہونے پر میٹھا کر لیں۔ ڈش میں نکال کر فریش کریم سے سجاوٹ کریں اور ٹھنڈا کر کے پیش کریں۔
(گرم کھانے کی صورت میں کریم نہ ڈالیں)
فالے کا شربت

اجزا :
فالے
چینی
کالا نمک
لیموں کا رس
پودینے کے پتے
ترکیب :

آدھا کلو
ایک پائو
ایک چائے کا چمچ
دو کھانے کے چمچے
چند عدد

فالے دھو کر آدھے گھنٹے کے لیے پانی میں بھگو دیں۔ پھر پانی سے نکال کر میٹھا کر لیں اور بیج الگ کر لیں۔ گودے میں کالا نمک اور چینی ڈال کر گرائنڈ کر لیں۔ پانی ملا کر ایک بار اور گرائنڈ کریں، پھر گلاسوں میں نکالنے سے قبل لیموں کا اس بھی شامل کر دیں۔ پیش کرتے وقت پودینے کے پتوں سے سجاوٹ کریں۔
گرمیوں کا فرحت بخش مشروب تیار ہے۔
ڈبل روٹی کا حلوہ

اجزا :
بڑی ڈبل روٹی
چینی
بادام پتے
سبز الائچی
کشمش
سحی

2 عدد
3 پائو
حسب ضرورت
8 عدد
آدھی پیالی
1 پیالی

چینی میں ایک لیٹر پانی ڈال کر خوب جوش دیں تاکہ ایک تار کا قوام بن جائے، پھر ٹھنڈا کر لیں۔ ڈبل روٹی کو توتے پر ہلکا سا سینک کر باریک ٹکڑے کر لیں۔ ایک کڑائی میں سحی گرم کریں۔ الائچی، کٹے ہوئے بادام پتے اور کشمش ڈال دیں۔ جب کشمش پھول جائے تو ڈبل روٹی کے ٹکڑے ڈال دیں۔ سرخ ہو جائیں تو شیرہ ڈال دیں۔ شیرہ اتنا ہونا چاہیے کہ ڈبل روٹی ڈوب جائے۔ چمچے سے خوب مکس کریں اور چاندی کے کورتق لگا کر پیش کریں۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام آپکو تمام ڈائجسٹ

ڈائریکٹ ڈاؤنلوڈنگ لنک کے ساتھ

ڈاؤنلوڈ کرنے کی سہولت دیتا ہے

آج ہی وزٹ کریں

www.paksociety.com

ہٹا جو کا آٹا وہی اور نمائز کا گودا برابر مقدار میں لے کر پیسٹ بنالیں۔ چہرے پر لگائیں اور پھر بیس منٹ بعد ٹھنڈے پانی سے دھو لیں۔ یہ ماسک دھوپ سے سنولائی ہوئی جلد کی رنگت بحال کرتا ہے۔

☆ صندل پاؤڈر اور تھوڑے سے عرق گلاب کا ہلکا پیسٹ بنا کر چہرے، گردن اور جلد کے تمام کھلے حصوں پر لگالیں۔ یہ پیسٹ سترن سن بلاک کا کام دے گا۔

☆ پودینے کی تازہ پتیاں پیس کر چہرے پر لگالیں۔ چند روز منٹ بعد سادہ پانی سے دھو لیں۔ جلد کی رنگت بحال اٹھے گی۔

ہٹا پودینے کی تازہ پتیاں چار گلاس پانی میں ابل لیں۔ ٹھنڈا کر کے ایک بڑی اسپرے بوتل میں بھر لیں۔ سارا دن تھوڑی تھوڑی دیر بعد چہرے پر اسپرے کرتی رہیں۔ جلد نکھری نکھری نظر آئے گی۔ چاہیں تو بوتل کو فریج میں رکھ لیں، ورنہ کسی بھی ٹھنڈی جگہ رکھ سکتی ہیں۔

☆ کھیرے کا رس، لیموں کا رس، ایلو ویرا کا گودا، کھانے کا ایک ایک چمچ لے کر اس میں چائے کا ایک چمچ شہد بھی شامل کر دیں۔ اچھی طرح ملا کر چہرے پر لگالیں۔ بیس منٹ بعد سادہ پانی سے دھو لیں۔ جلد صاف شفاف اور ہموار نظر آئے گی۔

☆ تھوڑی سی ہلدی، لیموں کے رس میں ملا کر چہرے پر لگائیں۔ بیس منٹ بعد ہلکے ہاتھوں سے رگڑ کر اتار لیں اور پھر چہرہ سادہ پانی سے دھو لیں۔ رنگت نکھر جائے گی۔

☆ پودینے کی پتیاں یا صندل پاؤڈر یا صنوبر یا تھام کے پتوں میں سے کوئی ایک چیز اپنے غسل کے پانی میں ڈال لیں۔ اس پانی سے غسل آپ کو ایک فرحت بخش احساس عطا کرے گا۔

☆ تھوڑی سی دہی میں ہلدی ملا کر چہرے پر لگالیں۔ خشک ہو جائے تو ہاتھ کیلے کر کے نرمی سے رگڑتے ہوئے اتار لیں۔ پھر سادہ پانی سے چہرہ دھو لیں۔ یہ عمل جلد کو صاف شفاف کرتا ہے۔



ادارہ
حضور علیہ السلام

موسموں کی تبدیلی اور شدت ہماری صحت اور مزاج پر خاصی اثر انداز ہوتی ہے۔ خاص طور پر ہماری جلد نازک ہونے کے باعث موسم کے اثرات بہت جلدی قبول کرتی ہے۔ لہذا موسم کو مد نظر رکھتے ہوئے جلد کی مناسب دیکھ بھال بے حد ضروری ہے۔

موسم گرما میں دھوپ اور گرم ہوا میں جلد کو سنولا دیتی ہیں۔ اس موسم میں سن بلاک کا استعمال لازمی ہے۔ عام خیال یہ ہے کہ سن بلاک صرف گہرے باہر نکلتے وقت ہی لگایا جائے، تاہم یہ درست نہیں۔ آپ گھر میں ہوں یا باہر، موسم کی حدت جلد پر اثر انداز ہوتی ہے۔ لہذا دن کے وقت روزانہ سن بلاک ضرور لگائیں۔ گہریلو خواتین خاص طور پر چولے کے پاس جانے سے پہلے سن بلاک لازمی لگائیں۔

ذیل میں سن بلاک اور گھر میں آسانی سے تیار ہونے والے چند ماسک بتائے جا رہے ہیں، جن کا استعمال آپ کی جلد کو موسم گرما میں بھی شگفتہ اور تروتازہ رکھے گا۔

ہٹا ایک چھوٹے نمائز کا گودا نکال کے چہرے پر لگالیں۔ بیس منٹ بعد سادہ پانی سے دھو لیں۔ یہ عمل روزانہ بھی کیا جاسکتا ہے۔ اس سے دھوپ اور گرمی سے جھلسی ہوئی جلد نکھر جاتی ہے۔